قاضی عبدالودود
کا
۱۹۳۶ء
معیار
خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

قاضی عبدالودود

کا

# معیار

۱۹۳۶ء

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

# قاضی عبدالودود

کا

# معیار

ماہنامہ پٹنہ

مکمل فائل کی عکسی اشاعت

ایک تجزیاتی اشاریے کے ساتھ

خدا بخش لائبریری، پٹنہ

۱۹۸۸ء

خدابخش لائبریری کی طرف سے شائع کردہ ادیب (الٰہ آباد) اور صبح اُمید
(لکھنؤ) کے انتخابات کی پیشکش کی مانند **معیار** کے مکمل فائل کی
یہ عکسی اشاعت بھی اپنے اصل سائز ۲۰×۳۰/۸ کے بجائے کمتر سائز
۱۸×۲۲/۸ میں پیش کی جارہی ہے۔ اس فرق کے ساتھ، بقیہ تمام د
کمال مواد من وعن شائع ہو رہا ہے۔

# پیشگفتار

یہ ماہنامہ 'معیار' (پٹنہ) کے مکمل فائل کی عکسی نقل پیش خدمت ہے، جو قاضی عبدالودود صاحب نے ۱۹۳۶ء میں ۴۴ سال کی عمر میں نکالا اور جو مارچ سے جولائی، اگست تک چھ ماہ میں ۵/۶ پرچے نکل کے اسی سال بند ہو گیا۔ اس کے بند ہونے میں خریداروں کی کمی کو اتنا دخل نہ رہا ہوگا، جتنا قاضی صاحب کی اس مسلسل علالت کو جس کا سلسلہ ۱۹۳۴ء، قیام یورپ، سے شروع ہو گیا تھا جب ڈاکٹروں نے ان کے پھیپھڑے میں خرابی تشخیص کی تھی جس کے سبب انہیں چھ مہینے سوئزرلینڈ میں مونتانا کے سینی ٹوریم میں علاج کے لیے قیام پذیر ہونا پڑا اور ہندوستان واپسی پر بھی ڈاکٹر انہیں یہی بتاتے رہے جس کے سبب وہ ۱۹۴۷ء تک دلجمعی سے کوئی کام نہ کر سکے اور بھوالی (نینی تال)، آگرہ اور پونا کے سینی ٹوریم میں صحت کی جستجو کرتے رہے۔ تا آنکہ ایک ماہر ڈاکٹر نے ۱۹۴۷ء میں پورے جسم کو چیک اپ کرنے کے بعد وثوق سے بتایا کہ یا تو پھیپھڑے میں خرابی تھی ہی نہیں اور تشخیص غلط ہوتی رہی یا بالآخر کم از کم اس وقت تک وہ مرض قطعی طور سے ختم ہو چکا تھا۔

'معیار' نے اپنے لیے جو حدود متعین کیے تھے ان میں رہ کر ۱۹۳۶ء میں اس نے ایک ادبی اور تحقیقی جریدے کا وہ معیار پیش کیا جو یورپ کے اعلیٰ ادبی مجلات کے پیش نظر رہتا تھا۔ اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کے لیے بیشتر پرچہ ایڈیٹر کو خود ہی لکھنا پڑتا تھا جس کے لیے تنوع کی خاطر مختلف قلمی نام بھی اختیار کرنے پڑتے تھے۔

اس وقت قاضی صاحب کی دلچسپیاں صرف تحقیق تک محدود نہ تھیں، اگرچہ خصوصی مرکز اس وقت بھی 'تحقیق' ہی تھا۔ غالب اور آوارہ گرد اشعار[2] کی بات 'معیار' میں بار بار اور متعدد عنوانوں سے

---

۱۔ "مرزا غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں کتب ذیل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں" الخ

۲۔ "دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار — گلچیں نگاہ تو ز داماں گلہ دارد
در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا — نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

یہ اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کیے تھے ... فارسی اشعار کے ایک مجموعہ میں یہ اشعار 'عشرتی' کے نام سے نظر آئے" الخ۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ برسوں بعد معاً ۱۹۵۱ء میں اس کی جستجو کو اختتام تک پہنچا کر اور لکھا کہ یہ غزل نصرت/نصرتی کی ہے۔

چھڑتی رہی۔ **مخطوطات** کے مطالعہ سے حاصل شدہ **نوادر** سامنے لائے جاتے رہے۔ قدیم شعرا کے سوانح کے سلسلے میں یا تاریخ پیدائش و وفات کے بارے میں، یا تاریخ تصنیف کے تعین کے مسئلے پر تحقیق و جستجو ہوتی رہی۔ ترتیب متن اور صحت متن کی بات بھی بار بار آتی رہی۔ کتابوں پر تفصیلی تنقید کے مواقع پیدا ہوتے رہے، خالص ادبی و شعری تنقید کے گوشے نکلتے رہے[1] —— لیکن تنقید میں طنز کے ساتھ توازن برقرار رکھا جاتا رہا۔ اگرچہ اپنی بات اور اپنے نظریات پوری شدت کے ساتھ سامنے لائے جاتے رہے

'معیار' کے بعد جب قاضی صاحب دوبارہ علم و ادب کے میدان میں آئے، تو صرف تحقیق کے ہو رہے۔ 'معیار' کے دور میں ایسا نہ تھا۔ ڈراما اور **افسانوی** ادب سے ان کی دلچسپی کے ثبوت میں 'معیار' میں چھپنے والے دوسروں کے ہی نہیں ان کے اپنے مترجم اور طبع زاد دونوں قسم کے افسانے پیش کیے جا سکتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز ہی ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے کیا جب ان کا پہلا افسانہ آگرہ اخبار میں شائع ہوا۔ 'معیار' میں ان کا طبع زاد افسانہ 'ہونہار نوجوان' اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس کا ماڈل کیمبرج کے ایک پنجابی ساتھی طالب علم (خورشید احمد) ہیں —— افسانہ کا حاصل یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ 'ترقی' کرتے ہیں جو دوسروں کا استعمال اور استحصال کا گُر جانتے ہیں۔

جاسوسی ادب (جس سے ان کی دلچسپی آج بھی جاری ہے۔ گرچہ یہ تعجب خیز امر ہے کہ وہ 'مجرم' کو جاسوسی دنیا پر ترجیح دیتے ہیں) کے سلسلے میں 'معیار' میں ایک بار لکھا تھا: "سرکونن ڈائل کے بہت سے افسانے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ مترجمین کو اب فریمین کی طرف متوجہ ہونا چاہیے" (ص ۲۸۲)۔ 'غزل'، اس کی ہیئت اس کے مشتملات، اس کی زبان اور طرز ادا، ان سب میں گہری دلچسپی تھی جو 'معیار' کے صفحات میں بھی جھلکی پڑتی تھی، اس کے باوصف کہ انھوں نے پابندی لگا دی تھی کہ شعرائے حال کی غزلیں قطعاً شائع نہ ہوں گی۔ — غزل کی زبان میں ہندیت مرجح ہے یا فارسیت، اس بارے میں لکھتے ہیں —— "آجکل کے اکثر مشہور غزلگو فارسیت کو ہندیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ غالب و مومن کے بعد داغ نے دہلی میں اور شاگردان آتش و ناسخ نے لکھنؤ میں فارسیت کے سیلاب کو

---

۱۔ حکیم محمد سیماب کے شعری حصے پر تنقید کا انداز (ص ۲۹) جو بعد میں عندلیب شادانی اور نیاز۔ ماہر القادری نے اپنایا۔

روکنا چاہا تھا۔ طرزِ جدید میں حالی بھی ان لوگوں کے ہمخیال تھے لیکن بیسویں صدی میں کلامِ غالب کو وہ مقبولیت نصیب ہوئی کہ فارسیت کا بول بالا رہا اور اس کے آگے "ہندیت" کا چراغ نہ جل سکا۔"

غزل کے الفاظ کیسے ہوں اس کے بارے میں قاضی صاحب کی رائے یہ تھی کہ :

"غزل میں ایسے الفاظ کا استعمال جو اخبار نویس بے تامل استعمال کر سکتے ہیں، غزل کی نزاکت انکی متحمل نہیں ہو سکتی .... ہزاروں الفاظ جو بجائے خود صحیح ہیں اور نثر تو نثر قصیدہ و مثنوی میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں، غزل میں نہیں کھپ سکتے" اور ہماری رائے میں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم غزل کو اسکی خصوصیت سے محروم کر دیں" ( اتنا لکھ کر مثالیں دی ہیں کہ "حقیقتہً" "نسبتہً"، "خلقتہً"، "رسمًا" وغیرہ ہماری رائے میں غزل میں ان سے احتراز لازم ہے۔ مزید الفاظ کی جو مثالیں دی ہیں وہ یہ ہیں: نکماپن، جمودِ دل، تنقید، تبلیغ، مادیت، تنظیم، مطمح، لغت، تاریخ )۔

اور غزل کے مستملات کے بارے میں ایک غزل گو کو سامنے رکھ کر لکھا ہے کہ :

—— " ( یہ ) غزلیں رکیک اور مبتذل مضامین سے یکقلم پاک ہیں۔ ان کے اشعار میں چند ہی ایسے ہیں جو ایک حیادار نوجوان اپنے والدین کے سامنے نہ پڑھ سکتا ہو، (کذا) یا تیرھویں صدی کا باپ اپنی دوشیزہ لڑکی کے سامنے نہ سُنا سکتا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اشعار کا یہ معیار کہاں تک صحیح ہے؟"

—— " مادیت کو غزل سے بالکل خارج نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کہتا ہے : "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"

"معیار" کے ایڈیٹر کے قلم سے غزل کے بارے میں مندرجہ بالا بیانات اور "معیار" کی پالیسی کے طور سے یہ اعلان کہ "شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری روش کیخلاف ہے" اگر انکی بہائی میں کیمرج ہی سے نکلنے والے اردو غزل کے مشہور ناقد کے لیے انسپریشن کے متعدد اسباب میں سے ایک سبب بن گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہو گی۔ ۱۹۴۰ء میں قاضی صاحب سے پہلی ملاقات کے ذکر میں کلیم صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ : —— " یوں تو میں ان کے نام سے واقف تھا، "معیار" جو وہ نکالا کرتے ہیں اس کے دو شمارے میں نے دیکھے تھے، ان کی قابلیت کی شہرت تھی لیکن ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا" ( معاصر، دوو نمبر )

طنز، جو قاضی صاحب کی تحریر میں اب بھی چپکے سے در آتا ہے ( اگرچہ وقت اور جگہ بچانے کے لیے اب وہ اس کے استعمال میں اسراف نہیں کرتے ) کیا یوں کہا جائے کہ جب تاگزیر ہو اب اسی وقت

اس سے کام لیتے ہیں) 'معیار' میں جا بجا مناسب و برمحل مواقع میں اس کا استعمال ملتا ہے اور یہ بڑا لطیف طنز ہوتا ہے۔

ایک قدیم دیوان کے ایڈیشن کی ترتیب و اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "دکن کی اکثر مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی حسن ظاہر سے بہرۂ وافر رکھتی ہے ... دیباچہ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ متن کی درستی کس اصول کی بنا پر کی گئی ہے ... یہ نسخہ جتنا چاہیے اتنا صحیح نہیں لیکن دوسرے اداروں سے جو کتابیں نکلتی رہتی ہیں ان کے مقابلہ میں زیادہ غلط بھی نہیں ... الحاقی کلام کم داخل ہے۔"

ایک نئے رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"(اس) کے 'مقاصد' مسلمانوں میں اصلاحیں لانا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزلوں کی اشاعت کس طرح مسلمانوں کی اصلاح میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔"

ایک مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں:

"(مضمون نگار کو اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے مخاطب اس مضمون سے برا نہ مان جائیں۔ برخلاف اس کے ہماری رائے ہے کہ سید صاحب کی ہر دلعزیزی میں اس مضمون کی اشاعت سے معتد بہ اضافہ ہو جانے [illegible] ہے۔"

ایک رسالے کے افسانہ نمبر میں شامل ایک افسانہ کے بارے میں جو طبع زاد کے طور پر پیش کیا گیا جبکہ واقعۃً وہ ایک انگریزی افسانہ سے ماخوذ تھا جو چند سطریں لکھی ہیں ان میں تو طنز و لطافت کی اس سطح پر پہنچ گیا ہے کہ مجھے اس امر کی توثیق کرانی پڑی کہ واقعۃً یہ طنزیہ عبارت ہے۔ لکھتے ہیں:

"نو افسانوں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ طبع زاد ہیں۔ ان میں کم سے کم ایک انگریزی سے ماخوذ ہے۔ اسلم صاحب نے تمہید اپنی طرف سے بڑھا دی ہے مگر نام بدل دیے ہیں اور ایسی باتیں جو خاص انگریزی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں حذف کر دی ہیں۔ لوگ اسے سرقہ کہیں گے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی کو اسلم صاحب پر اعتراض کا حق نہیں! کیا ہمارے یہاں ابتدا ہی سے یہ رسم جاری نہیں؟ کیا سعد اللہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ ریختے میں فارسی کے مضامین باندھو؟ اور کیا ہمارے شعرا کا آج تک اس ہدایت پر عمل نہیں ہے؟ افسانہ نگاروں کے لئے ایک دوسرا معیار کیوں قائم کیا جائے؟"

ایک رسالے پر، جس میں اغلاط بکثرت تھے، تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر اوسط فی صفحہ دو بھی رکھا جائے تو اغلاط کی تعداد ۲۲۴ ہوتی ہے۔ رسالے کا صحیح چھپوانا اگر ممکن نہیں تو غلط نامہ ہی شامل کر دیا ہوتا، پڑھنے میں اتنی اُلجھن تو نہ ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غلطنامے کی صورت دیکھتے ہی بھڑک اٹھتے ہیں لیکن سننے میں آیا ہے کہ اب اس کا علاج بآسانی ہو جاتا ہے۔" (ص ۲۷۲)

———— ایک شاعر پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہوئے ان کے اشعار کا جو 'پوسٹ مارٹم' کیا ہے، اس میں جا بجا یہ رنگ ملے گا، جس کا نمونہ مندرجہ ذیل تحریر تبصرے میں موجود ہے:

"ایک ہی سا ہے نظامِ عشق کا ماضی و حال ؎ میری تجویزِ وفا ناکام تھی، ناکام ہے

"یہ عشق کا ذکر ہے یا کسی انجمن میں کسی تحریک کے نامنظور ہونے کا؟"

جس محنت سے یہ ماہنامہ مرتب ہوتا تھا، جب تک اس کے مشتملات، خصوصاً مستقل عنوانات تفصیلاً نہ پڑھا جائے، اس کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ مقالات، نظموں، افسانوں، تمثیلوں (ڈراموں)، مراسلات اور استفسارات کے علاوہ جن میں دوسرے بھی حصہ لیا کرتے تھے، معروضات، تعارف، تصحیحِ اغلاط، آثارِ ادبیہ (= نوادر)، غالب (= غالبیات)، مطبوعاتِ جدیدہ (= تبصرہ)، اقتباسات (اہم مضامین، خطبات وغیرہ کے)، محکمہ (= استفسارات)، اوراقِ پارینہ (= نوادر)، یادرفتگاں (= تعزیتی نوٹ)، صوبہ بہار (یا بہار و بنگالہ) ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین ———— اور عالمِ ادب اس رسالے کے وہ مستقل عنوانات تھے، جن کے لیے ایڈیٹر کو اچھی خاصی محنت کرنی پڑتی تھی۔ مخطوطات، تازہ مطبوعات اور رسائل کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر کے ان کے ضروری نوٹ بنانے ہوتے تھے۔ اکثر ان پر رائے بھی دینی ہوتی تھی! اور یہ سب کچھ سلیقے اور توازن کے ساتھ ہوتا تھا۔ معاصرین پر جائز تنقید بھی ہوتی تھی۔ ان کے کام، محنت، صلاحیت اور اہلیت کا جو جس قدر مستحق ہوتا اعتراف بھی کیا جاتا۔ ایسے معاصرین جن کی تحریروں کا "معیار" میں بطورِ خاص نوٹس لیا گیا، ان کی تعداد خاصی ہے۔ ایسے تمام نام اشاریہ میں اشخاص کے عنوان سے جمع کر دیے گئے ہیں۔

معاصروں کا کھل کے اعتراف، ان کی تعریف و توصیف (ہر اچھے کام کی تحسین اور

اعتراف قاضی صاحب اب بھی کرتے ہیں مگر لکھت میں ایسی چیزیں کم لاتے ہیں۔ لفظ، نظریہ ہے کہ یہ پہلو تو سب کے سامنے ہے ہی، وہ پہلے جو عام طور سے نظر نہیں آسکتا اس پر روشنی ڈالنا زیادہ ضروری ہے)؛ زبان و بیان میں نسبتاً زیادہ شگفتگی، نسبتاً کم بحرزی؛ جا بجا لطیف طنز کا استعمال؛ تحقیق کے ساتھ ساتھ ادب کی دوسری اصناف سے بھرپور دلچسپی، ان کا مطالعہ اور ان پر رائے زنی: "تازہ کتابوں پر" جن میں ہر صنف شامل تھی تفصیلی، تخلیقی تبصرے؛ اردو کے تقریباً تمام اہم رسائل کے مختار مشتملات کا خلاصہ اور جہاں ضروری ہو تنقید یا تحسین؛ ——— اور سب سے بڑھ کر اردو میں تحقیق کا ایک نیا معیار سامنے لانا، ان سب امور نے 'معیار' کو (اپنے قائم کردہ حدود کے اندر) اردو کا ایک بھرپور پرچہ بنا دیا تھا۔ جس کے صرف چھ پرچے شائع ہوئے لیکن اس کے باوجود وہ ایک ایسا معیار قائم کر گیا جسے ۱۹۳۶ء کے ۴۴ سال گزرنے کے بعد بھی نمونہ بنایا جاسکتا ہے۔

یہ 'معیار' کی سرسری سرگزشت ہوئی۔ اس سے آگے کی تفصیلی بات اشاریہ میں ملے گی جہاں سب سے پہلے تو 'معیار' میں شامل قاضی صاحب کی تحریروں کا تجزیاتی انڈکس بنانے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ وہ بھی ہمہ جہتی اور ہر پہلو پر حاوی نہیں کہی جاسکتی ——— (کہ اس کے لئے مزید مطالعہ کے واسطے خود 'معیار' کے مکمل فائل کا عکس ہی آپ کی خدمت میں پیش ہے)۔ اس کے بعد بقیہ مضمون نگاروں کے ناموں کے ساتھ ان کی تحریروں کا انڈکس ہے۔ امید ہے اس اشاریہ سے اس پیشکش کے استعمال میں سہولت ہوگی اور ایک نظر میں 'معیار' کے متعدد پہلو سامنے آجائیں گے۔

اشاریہ کے بعد، معیار کے لکھنے والوں کا دو ایک سطری مختصر تعارف بھی دیا جارہا ہے۔

عابد رضا بیدار

●●

انجمن ترقی اردو (شاخ پٹنہ) کا رسالہ

# معیار


مرتبہ

قاضی عبدالودود

بانکی پور



مارچ ۱۹۳۶ء

انجمن ترقی اردو، شاخ پٹنہ کا ادبی رسالہ

# معیار

مرتب:۔ قاضی عبد الودود
معاون:۔ محمد شرف عالم آرزو جلیلی

## ضروری گزارش

کسی رسالے کی کامیابی کے لیے چار عناصر کا اشتراک عمل اور ان عناصر میں بعض خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔ اول نکالنے والے یعنی وہ لوگ جن سے رسالے کے انتظامی معاملات اور مالیات کا تعلق ہے، ان میں شوق فضول و جرأت رندانہ کے ساتھ ساتھ یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ رسالے کے لیے کافی سرمایہ جمع کر سکیں ورنہ اس کی بنیاد متزلزل رہے گی۔ دوسرے مرتبین۔ ان میں علم کے ساتھ صحیح قوت نقد بھی ضروری ہے ورنہ ان کی حیثیت محض ڈاک کے کارکنوں کی ہوگی جو بلا تمیز رطب و یابس جو کچھ ان کے پاس آئے گا دوسروں تک پہنچا دیں گے، اس میں زبان کا خون ہو جائے تو انہیں بحث نہیں۔ اور غلط معلومات کی اشاعت ہو تو انہیں پروا نہیں۔ لاہور کے ایک رسالے نے ابھی چند سال ہوئے رومانیہ کی آبادی ۱۰ کروڑ بتائی تھی، یہ مثال مستثنیات میں نہیں بلکہ کثیر الوقوع ہے۔ تیسرا عنصر رسالے کے قلمی معاونین ہیں کوئی رسالہ محض مرتب کے زور قلم سے نہیں چل سکتا۔ اگر مرتب کو اتنا وقت مل سکے کہ ماہ بماہ رسالے کو اپنے مضامین سے بھرتا رہے، جب بھی ایک قلم وہ تنوع نہیں پیدا کر سکتا جس کے لوگ رسائل کے مضامین میں خواہش مند ہیں۔ چوتھا عنصر جو اہمیت میں کسی سے کم نہیں خریدار ہیں، ہر رسالہ آرزو مند ہے خریدار تعداد میں زیادہ اور خوش معاملہ ہوں، معیار اپنے خریداروں سے ایک اور صفت کا طالب ہے اور صحت ذوق ہے۔ کسی رسالے کا معیار بلند رکھنا یا اسے پستی پر کھینچ لانا خریداروں کا کام ہے۔

**خریداروں سے** (۱) معیار ماہوار رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال میں سردست صرف چھ پرچے نکلا کریں گے۔ یہ پرچے جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر، نومبر میں کم از کم ۱۱۲ صفحوں پر شائع ہوا کریں گے، بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہوں گے ۴۰ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، دسمبر میں شائع ہوا کریں گے۔ سال بھر میں معیار تصاویر و سرورق کے علاوہ کم از کم ۸۷۰ صفحات پیش کیا کریگا۔

(۲) سالانہ قیمت للعہ فی پرچہ ۱۲ اور نمونے کا پرچہ ۱۲ کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔ کچھ پرچے معمولی کاغذ پر نمونتہً بھیجنے کے لیے چھپائے گئے ہیں، قیمت فی پرچہ ۸ اگر دفتر سے منگانا ہو تو ۸ کے ٹکٹ بھیجیے۔ جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ بھیجنے چاہئیں۔

**مضمون نگاروں سے** (۱) معیار خالص ادبی رسالہ ہے، جو اصحاب اس کی قلمی اعانت کا ارادہ رکھتے

سالانہ چندہ
للعہ

# معیار
بانکی پور

فی پرچہ ۱۲ر
ایجنسی ایڈیشن (معمولی کاغذ) فی پرچہ ۸ر

جلد ۱ | مندرجات بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

# معروضات

از قاضی عبدالودود

ادب قومی خصوصیات کا آئینہ دار ہے، ایک نسل سے دوسری نسل میں انہیں منتقل کرتا ہے اور قوم میں اتحادِ خیال پیدا کرتا ہے۔ قومی سیرت پر ادب کا جو گہرا اثر پڑتا ہے اس کا اعتراف وہ جماعت بھی کرتی ہے جو وائلڈ کی طرح ادب کو فنِ تعمیر سے مشابہ سمجھتی ہے، اور وہ جماعت بھی جو والٹر پیٹر کی طرح ادب کا منتہائے کمال اسے قرار دیتی ہے کہ یہ موسیقی میں ضم ہو جائے۔ قومی زندگی میں ادب کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اقتضا تھا کہ ہندوستانی زبان میں بہ کثرت رسالے ادب کو اپنا موضوعِ خاص بنا لیتے، لیکن باوجود اس کے کہ جہاں تک رسائل کی تعداد کا تعلق ہے ہندوستانی مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں سے بہت پیچھے نہیں ہے، اس زبان میں انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے سہ ماہی رسالے اردو کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر رسالہ ایسا نہیں جو ادب کے سوا کسی اور موضوع سے سروکار نہ رکھتا ہو۔ اردو نے ہندوستانی زبان اور ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا خود اپنے فقدانِ بصیرت کا اعلان کرنا ہے۔ اس کے محققانہ مضامین اور عالمانہ تبصرے ہماری زبان میں آپ اپنی نظیر ہیں، لیکن نظم کے سوا تخلیقی ادب کے اور اصناف کے نمونے اگر اس نے پیش کیے ہیں تو وہ النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں، اس لیے انجمن ترقی اردو (شاخ پٹنہ) کو ایک ایسا رسالہ نکالنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو صرف ادب اور زبان سے متعلق تحقیقی مضامین اور مطبوعاتِ جدیدہ کے تبصرے شائع کرنے پر قناعت نہ کرے، بلکہ تخلیقی ادب کے نمونے بھی بالالتزام پیش کرتا رہے۔ معیار اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ معیار نے بظاہر اپنا دائرۂ عمل بہت تنگ کر لیا ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو ادب بھی اتنا وسیع ہے جس قدر انسانی زندگی ہے، اور رومی شاعر کے الفاظ میں ادب کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ "میں انسان ہوں، اور کسی شے سے جس کا تعلق انسانوں سے ہے بے تعلق نہیں ہو سکتا"۔ ہمارا خیال ہے کہ خالص ادبی رسالے میں بھی تنوع پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس خاص موضوع پر اگر دس رسالے بھی بیک وقت نکلیں تو ہر رسالہ اپنی انفرادی شان قائم رکھ سکتا ہے۔ معیار کے افتتاحی مضمون میں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوتا کہ ہم کس قسم کے ادب کی ترویج کے خواہاں ہیں، لیکن افسوس ہے کہ دوسرے مضامین نے اتنی جگہ لے لی کہ اب بتفصیل اظہارِ خیال کی بالکل گنجائش نہیں اور ہم مجبوراً اسے کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ہم صرف اسی قدر عرض کریں گے کہ معیار اجتہاد کو تقلید پر ترجیح دیتا ہے، قواعدِ فن کو منزل من السماء نہیں سمجھتا اور ان میں تدریجی تغیرات کا حامی ہے۔ غلبہ یافتہ جماعتوں کا ادب کو اپنی اغراض کا تابع بنانے کی کوشش کو پسند نہیں کرتا، اور صنعت کاروں کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی کا طلبگار ہے۔ ادب میں یہ کسی طرز کا پابند نہیں بلکہ اس کا اصولِ عمل ہے کہ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے۔ ذوقیات و معنویات میں فرانس، انگلستان، روس کا اعلان معیار کے نزدیک بھی اسی قدر معتبر ہے جتنا کہ مارکس پرست کی رائے میں تجارت سے بڑھ کر صنعت کار کے لیے تخلیقِ حسن تبلیغِ عقائد سے زیادہ مقدم ہے، اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو خیالات کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں، صنعت کاروں میں شمار نہیں ہو سکتا۔

---

# تعارف

از قاضی عبدالودود

اس عنوان کی اصلی غرض مندرجات معیار کے متعلق ضروری معلومات کی فراہمی اور لکھنے والوں کے نقطۂ نظر کی توضیح ہے۔ اس مرتبہ عنوانات رسالہ کی تشریح بھی اسی عنوان کے تحت کر دی گئی ہے۔

۱۲ معروضات ۱۳ اقتباسات و ۱۴ استفسارات: یہ عنوانات تشریح کے محتاج نہیں' استفسارات کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ اگر جواب وصول ہوئے تو وہ بھی شائع کر دیے جائیں گے' اور ایسے سوالات جن کے جواب تھوڑی سی محنت سے متداول کتابوں میں مل سکتے ہیں درج نہ ہوں گے۔ مرزا غالب کی غزل دیوان معروف میں اس وجہ سے ملی کہ معروف نے اس کو مخمس کیا ہے۔ یہ غزل اشعار کے ایک قدیم مجموعے "چمن بے نظیر" میں بھی پائی جاتی ہے۔

۱۵ آثار ادبیہ یہ عنوان اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ قدیم نظم و نثر کا وہ حصہ جو ادبی' تاریخی یا لسانی نقطۂ نظر سے قابل قدر اور عام ناظرین کی رسائی سے باہر ہے' منظر عام پر لایا جا سکے۔

مخمس مصحفی کی شان نزول یہ ہے کہ مصحفی اور انشا میں جب بگاڑ ہوا' اور طرفین سے ہجو بازی کی نوبت آئی تو سلیمان شکوہ نے انشا کا ساتھ دیا۔ سچ یا جھوٹ کسی نے شہزادے کے کان میں پھونک دیا کہ مصحفی نے آپ کی ہجو کہی ہے' اسی الزام سے اپنی بریت میں مصحفی نے اپنا مشہور قصیدہ رائیہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

مزاج شاہ ہو یوں منحرف تو مجھ کو بھی    یہ چاہیے کہ کروں شکوہ اس کا پیش وزیر

آصف الدولہ سے استغاثہ کرنے کا ارادہ قوت سے فعل میں آیا' اور مصحفی نے یہ مخمس اور اس کے ساتھ ایک قصیدہ آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مخمس کا ایک مصرعہ مشکوک رہ گیا ہے' دیوان چہارم کے کسی صحیح نسخے تک کسی صاحب کی رسائی ہو تو وہ توجہ فرمائیں۔

آصف الدولہ کی غزل اور اس کا جواب دونوں دیوان جہان صنعت یعنی زرافشاں (نسخہ قلمی عجائب خانہ برٹش لندن) سے ماخوذ ہیں' شمس النسا بیگم دلہن بیگم کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کے باپ انتظام الدولہ' دادا قمرالدین خان اور نانا (غالباً) صمصام الدولہ خان دوراں تھے۔ آصف الدولہ کے ساتھ ان کی شادی فیض آباد میں بڑی دھوم

دھام کے ساتھ ۱۱۹۴ھ میں ہوئی۔ شجاع الدولہ کی زندگی میں چونکہ آصف الدولہ کی کسی اور شادی کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا، قیاس ہے کہ میر حسن نے اپنی مثنوی میں جو معیار میں شائع ہو رہی ہے اسی شادی کی کیفیت بیان کی ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو مثنوی کا سالِ تصنیف بھی ۱۱۹۴ھ ہو گا، اور اس حساب سے یہ مثنوی رموز العارفین اور گلزارِ ارم سے پرانی ہے۔ کلیاتِ حسن کے جس نسخے سے یہ ماخوذ ہے وہ انجمن ترقی اردو کے لیے ابھی حال میں نقل ہوا ہے اور غلطیوں سے بھرا ہوا ہے۔ قیاسِ تصحیح کے متعلق ہم ان اصحاب سے اظہارِ رائے کی درخواست کرتے ہیں جن کی نظر سے کلیات کے دوسرے نسخے گزر چکے ہیں۔

+ **غالب:** یہ عنوان مرزا غالب کے لیے مخصوص ہے، یا تو ان کی غیر مطبوعہ نظم و نثر اس کے تحت شائع ہوگی یا ان کی زندگی اور شاعری کے کسی نہ کسی پہلو سے بحث کی جائے گی۔ تین خطوط جو اس بار ہم شائع کر رہے ہیں، ہمیں جناب عرشی ناظم کتب خانۂ ریاست رام پور سے ملے ہیں، اور ہم اس عنایت کے لیے ان کے نہایت ممنون ہیں۔

+ **افسانے:** افسانوں کے لیے طبع زاد یا ترجمے کی قید نہیں، لیکن ترجمے کے لیے کسی مسلم الثبوت مصنف کا افسانہ منتخب کرنا چاہیے، واقعات میں من مانی ترمیم سے بچنا چاہیے اور مقامات و اشخاص افسانہ کے نام وہی رہنے دینے چاہییں جو اصل میں ہیں۔ مترجم کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ افسانے کا اصل عنوان کیا ہے، کس زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے، اور مصنف کا کیا نام ہے۔ مختصر کہانیوں کے علاوہ طویل افسانوں کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جائے گا، گومتی، سانپ، اور غم کدہ علی الترتیب گومتی، دی مین اینڈ دی اسنیک اور غرفۃ الاحزان کے تراجم ہیں۔

± **تمثیل:** یہ شرح صدر، سکون، لاں تیریز، کا ترجمہ ہے۔

± **نظم:** شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں بھی جدتِ تخیل لازمی ہے۔ ان قیود کی وجہ سے بخوبی ممکن ہے کہ ہم کبھی کبھی نظمیں بالکل نہ شائع کر سکیں، اگر کوئی پرچہ نظم سے خالی رہا تو ہم اس کی جگہ کسی دوسرے عنوان کے تحت غیر زبان کے مستند شعرا کے کلام کا ترجمہ شائع کیا کریں گے۔

شکستِ پندار کے مصنف پریم پجاری صاحب شاعری پیشہ نہیں، لیکن عروض و قافیہ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نظم میں بعض قوافی ان اصحاب کو کھٹکیں گے جو اب تک قدیم قواعد کی خود بھی سختی سے پابندی کرتے ہیں، اور دوسروں سے بھی کرانا چاہتے ہیں، پریم پجاری کا مسلک ان اصحاب سے جداگانہ ہے اور وہ قدیم قواعد میں ترمیم کے حق میں ہیں۔ ان کا ایک خط ہمارے پاس موجود ہے جس میں بعض مشکوک قوافی کے جواز کی دلیل پیش کی ہے اور اپنے مسلک کی توضیح کی ہے، اگر ضرورت ہوئی تو ہم اسے شائع کر دیں گے۔

± **مقالات:** ادب کے مالہ و ماعلیہ سے بحث کی جائے تو فلسفے کی حدود میں قدم رکھنا ناگزیر ہے، عملِ تخلیق، یا ادب کی اثر اندازی کا ذکر آئے تو نفسیات سے دوچار ہونا لازمی ہے، اور اگر یہ بیان آ جائے کہ کن حالات

میں کسی خاص زبان کے ادب نے نشو ونما پائی' یا کون سے اسباب اس کی ترقی یا زوال کا باعث ہوئے' تو تاریخ سے واسطہ پڑنا یقینی ہے۔ معیار خالص ادبی رسالہ ہے' لیکن اور علوم بالا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور اگر تو تھا تو تھا ہم ان کی حدود میں قدم رکھیں تو ہمیں مداخلت بیجا کا الزام نہ دیا جائے۔ یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ گو معیار کا موضوع خاص ادب اردو ہے لیکن دوسری زبانوں کے ادب سے متعلق مضامین بھی اس میں شائع ہوا کریں گے' ہم ان ذوقی و معنوی تحریکات سے جو ہندوستان اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کو متاثر کر رہی ہیں' یا آئندہ متاثر کریں گی' اپنے ناظرین کو باخبر رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ مصنفین اردو کے حالات بالالتزام معیار میں درج ہوا کریں گے۔ اور ممالک غیر کے مستند مصنفین کا دنیائے اردو سے تعارف کرانا بھی ہم اپنے فرائض میں داخل سمجھتے ہیں۔

وفات آبرو: نکات الشعرا کے جس نسخے کا حوالہ دیا گیا ہے' وہ طبع اول ہے' طبع ثانی نہیں۔ تذکرہ یکجگرکا ذکر فہرست میں ۲۴۴ کے تحت ص ۴۴۳ پر ہے۔

دیوان جوشش کا قلمی نسخہ عبدالرشید صاحب خلف شوق مرحوم نے ہمیں چھپوانے کے لیے مستعار دیا ہے۔ اس عنایت کے لیے ہم ان کے نہایت ممنون ہیں۔

دریائے لطافت کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ یہی کتاب ہے جو قواعد اردو میں کسی ہندوستانی نے لکھی ہے' لیکن یہ خیال ضرور ہے کہ صفیر مرحوم سے آزاد کے دعوے کی تردید نہ ہو سکے گی ہم اس پرانے جھگڑے کو زندہ نہ کرتے' لیکن ابھی حال میں لکھنؤ کے ایک رسالے میں نورالحسن صاحب مولف نوراللغات کا ایک مضمون ہماری نظر سے گزرا جس میں انہوں نے بھی ازراہ تقلید صفیر' یہ دعویٰ کیا ہے کہ دریائے لطافت انشا نے اصلاح ناسخ سے مستفید ہو کر لکھی ہے۔ ان سبز در اصل قن بسر ہے' مصحفی کی اس سے کیا مراد ہے' ہم نے اس کا مفصل ذکر اس مقالے میں کیا تھا جو چند سال قبل ہم نے اورینٹل کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ ہم اس مقالے کا وہ حصہ جو ناسخ اور مصحفی کے تعلقات سے متعلق ہے اسی سال شائع کریں گے

++ بہار: صوبہ بہار سے متعلق ادبی' تاریخی' اثری مضامین اس عنوان کے تحت درج ہوا کریں گے۔

سید حادستہ کاتب کو لکھنے کے لیے دیا گیا تھا کہ مصنف کے سال ولادت کا علم ہوا (سہواً اول کاتب سے دوبارہ لکھوا دیا گیا ہے) کتاب کا سال تصنیف ۱۱۰۰ھ بتایا گیا ہے' اگر مصنف کا سال ولادت ۱۰۶۵ھ ہے جیسا کہ مصنف تذکرۃ الصالحین نے لکھا ہے' تو ۱۰۸۱ھ میں مصنف کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتی' اور یہ بالکل قرین قیاس نہیں کہ گیارہویں صدی میں اس عمر کا کوئی شخص تصنیف کے لیے اردو کو منتخب کرتا جو اس عہد کی تصنیفی زبان نہ تھی اور صرف نثر ہی نہیں' بلکہ نظم بھی اس زبان میں لکھتا۔ کتاب کے خاتمے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تاہل کی زندگی اختیار کرنے کے بعد یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے۔ حالانکہ مصنف کے حالات جو تذکرۃ الصالحین میں درج ہیں' ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ تاہل کا زمانہ ۱۰۸۱ھ کے بہت بعد ہوگا۔ ہم نے جناب تمنا کو اس خدشے سے آگاہ کر دیا ہے' لیکن ابھی

تک ان کا جواب وصول نہیں ہوا ہے۔ اس رسالے کے متعلق تنقیح طلب سوالات حسب ذیل ہیں (۱) مصنف کی ولادت کب ہوئی؟ (۲) یہ رسالہ کب لکھا گیا؟ (۳) کیا یہ واقعی انہیں بزرگ کی تصنیف ہے جن کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے؟ (۴) اگر نہیں تو اصلی مصنف کون ہے، اور غلط انتساب کی کیا وجہ ہے؟ رسالے کی مذہبی حیثیت سے اہمیت ہو یا نہ ہو ادبی حیثیت سے اس بات کا فیصلہ ہو جانا ضروری ہے کہ یہ کب لکھا گیا ہے۔ اگر یہ واقعی گیارہویں صدی کا لکھا ہوا ہے تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس صوبے میں نثر و نظم اردو کا اس سے قدیم تر نمونہ اس وقت تک دستیاب نہیں ہوا ہم چاہتے ہیں کہ وہ اصحاب جو متاخرین صوفیہ کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں علی الخصوص متوسلین خانقاہ عمادیہ و خانقاہ مجیبیہ اس رسالے کے متعلق اپنے خیالات ظاہر فرمائیں۔

+ **اوراق پارینہ:** یہ عنوان اشاعت زیر نظر میں نہیں ملے گا، اس لیے کہ جو مضامین اس عنوان کے تحت شائع ہو سکتے تھے وہ مقالات کے اندر آ گئے۔ اس عنوان کی غرض کمیاب مطبوعات و مخطوطات کا تفصیلی بیان ہے۔ آئندہ سے اس قسم کے مضامین کے لیے ایک خاص باب ہوا کرے گا۔

+ **ہماری زبان:** اس عنوان کے لیے اشاعت زیر نظر میں جگہ نہ نکل سکی، ماہ مئی سے اس کا آغاز ہوگا۔ اس عنوان کے تحت زبان اردو کے متعلق ہر قسم کے تحقیقی مضامین شائع ہوا کریں گے۔ اردو میں بہ کثرت الفاظ ایسے ہیں جن کا املا مختلف فیہ ہے۔ یا ان کا املا بالعموم غلط لکھا جاتا ہے، سیکڑوں محاورات اور الفاظ ہیں جن کے متعلق ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا کہ استعمال بجا ہے یا نہیں، فصیح صرف و نحو کے بہت سے قواعد بھی ابھی تک طے نہیں ہوئے، غرض یہ کہ بہ کثرت مسائل ایسے ہیں جو بحث طلب ہیں، اور یہ باب قائم کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ بالالتزام ان باتوں کے متعلق بحث ہوتی رہے۔

++ **مطبوعات جدیدہ:** کتابوں کے تبصروں میں ہم یا ہمارے معاون حتی الوسع انصاف اور دیانت سے کام لیتے ہیں لیکن نہ مرتبین معیار منزہ عن الخطا ہیں اور نہ معیار کے معاونین، اس لیے بہ خوبی ممکن ہے کہ بغیر اس کے کہ ہمارے ارادے کو اس میں دخل ہو، انصاف کے خلاف کچھ باتیں قلم سے نکل جائیں، واقعات کی غلطیاں ہو جائیں یا یہ کہ مصنف کے نقطۂ نظر کو صحیح طور پر سمجھنے سے ہم قاصر رہیں اس لیے ہم یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم بہ خوشی مصنفین یا دوسرے ذمہ دار اصحاب کو اس کا موقع دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے تبصروں سے اختلاف ظاہر کریں۔

اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کی اہم مطبوعات پر اس عنوان کے تحت نظر ڈالی جائے گی، لیکن ابھی ہمارے انتظامات مکمل نہیں ہوئے ہیں۔

دیوان معروف کی تصحیح زیادہ تر قیاس پر مبنی ہے، اس میں جو مدد ہمیں جناب ریاض حسن خاں صاحب خیال سے ملی ہے اس کا ہم شکر گزاری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں۔ اس دیوان میں ابھی اور اغلاط رہ گئے ہیں، ان کی طرف آئندہ توجہ کی جائے گی۔

+ محکمہ : ادارہ معیار یا معاونین معیار کو نہ یہ دعوےٰ ہے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں اور نہ یہ وہم ہے کہ ان سے غلطی نہیں سرزد ہو سکتی۔ یہ عنوان صرف اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ دوسروں کو یا خود نگارندوں کو اس کا موقع دیا جائے کہ مندرجات معیار پر اضافہ کریں یا ان کی غلطیوں کی اصلاح کر سکیں۔ محکمہ فورم کا ترجمہ ہے۔ شعرانے یہ لفظ اس مفہوم میں بکثرت استعمال کیا ہے۔

++ سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین : مختلف رسائل میں ادب اردو کے متعلق جو مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ان کا علم صرف اسی شخص کو ہو سکتا ہے جو کل رسائل کا بالالتزام مطالعہ کرتا رہے اور چونکہ ہر شخص کو اس کا موقع نہیں ملتا بکثرت ایسے مضامین نکلتے رہتے ہیں جن سے عام طور پر لوگ بے خبر رہتے ہیں، ہم نے یہ باب اس خیال سے قائم کیا ہے کہ صرف اس کے مطالعے سے ہمارے ناظرین کو دوسرے رسائل کے تحقیقی مضامین کی واقفیت ہوتی رہے اور وہ بہ شرط ضرورت ان کی طرف رجوع کریں۔ بعض صورتوں میں مضامین کے عنوانات مضمون نگاروں کے نام اور ان مضامین کے متعلق مختصر اظہار رائے پر قناعت کی جائے گی لیکن بعض مضامین کے ہم خلاصے بھی پیش کریں گے۔ رائے کی غلطی یا صحت سے ہمیں بحث نہیں لیکن واقعات کی کوئی غلطی اگر نظر آئی تو اس کی طرف ہم اپنے ناظرین کی توجہ منعطف کرانا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی غرض دوسرے رسائل کی تحقیر نہیں بلکہ محض تحقیق حق ہے۔ طوالت کے ڈر سے ہم نے صرف اختلاف ظاہر کرنے پر قناعت کی ہے۔ بہ شرط ضرورت ہم وجوہ اختلاف پیش کرنے اور ایسے دعووں کا ثبوت دینے کے لیے بھی آمادہ ہیں۔

++ عالم ادب : کتابوں اور مصنفوں کے متعلق ہر قسم کی اطلاعات اس عنوان کے تحت درج ہوا کریں گی۔ اس باب کی کامیابی مصنفین اور ناشرین کے اشتراک عمل کے بغیر ناممکن ہے، اور ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی سرگرمیوں سے ہمیں باخبر رکھا کریں۔

± تصویر : عبدالحق صاحب کی تصویر دوسرے رسائل میں پہلے بھی شائع ہو چکی ہے لیکن یہ تصویر ابھی حال میں لی گئی ہے اور غالباً کسی دوسرے رسالے میں نہیں نکلی، موصوف کی تصویر ہندوستانی اکاڈمی کی کانفرنس (منعقدہ جنوری) کے شعبۂ اردو کے صدر، ناظم انجمن ترقی اردو، اور مسلم الثبوت انشا پرداز کی حیثیت سے شائع کی جا رہی ہے۔ ان کے مختصر حالات زندگی اگر گنجائش نکل سکی تو اسی پرچے میں ورنہ آئندہ شائع ہوں گے

---

++ اس سے مراد ہے کہ یہ ابواب بلا استثنا کل پرچوں میں ہوں گے + اس سے مراد ہے کہ ضمیموں کے علاوہ یہ ابواب کل پرچوں میں ہوں گے۔ ± اس سے مراد ہے کہ ہر پرچے میں ان ابواب کا پایا جانا لازمی نہیں گو یہ کوشش کی جائے گی کہ کوئی پرچہ (بعض صورتوں میں بہ شمول ضمیمہ اور بعض میں بہ استثنائے ضمیمہ) اس سے خالی نہ رہے۔

**آثارِ ادبیہ :-**

(۱) مخمس مصحفی۔ (۲) غزل آصف الدولہ و جواب شمس النسا بیگم۔ (۳) مثنوی میر حسن۔

## مخمس مصحفی در استغاثہ بجناب آصف الدولہ

۱ اول تو مدح گوئے پیمبر ہے مصحفی ۲ پھر نغمہ سنج مدحت حیدر ہے مصحفی

۳ مسکین فقیر ہے تونگر ہے مصحفی ۴ ملک سخن کا صاحب افسر ہے مصحفی

۵ سب جانتے ہیں اس کو کہ بے شر ہے مصحفی

۶ اس کا دہن ہے یہ کہ کرے شاہ کی ہجا ۷ ہے سب یہ اس غریب پہ انشا کا افترا

۸ بغض اپنا وہ نکالے ہے لے شہ کا آسرا ۹ کس واسطے کہ اس کا سخن اس پہ ہے رسا

۱۰ فکر غزل میں لاکھوں سے بہتر ہے مصحفی

۱۱ واقف ہیں میر سوز بھی خوب اس کے حال سے ۱۲ کچھ مطلع ہیں میر بھی اس کے کمال سے

۱۳ نفرت ہے اس کو ایسے تو قال مقال سے ۱۴ لیکن عجب نہیں یہ زمانے کی چال سے

۱۵ گر سب کہیں کہ تیغ کے درخور ہے مصحفی

۱۶ بے جائے عدل آصف دوراں تری جناب ۱۷ رکھتا ہے عرض تجھ سے یہ مداح بوتراب

۱۸ پہنچے یہ اپنی داد کو اور ہوئے کامیاب ۱۹ تا سب کہیں کہ سچ ہی ہے یہ بات بے حساب

۲۰ اب بھی نہیں کسی کا ثنا گر ہے مصحفی

۲۱ آیا تھا لکھنؤ کو سمجھ کر یہ جائے امن ۲۲ گوشے میں پا شکستہ پڑا تھا برائے امن

۲۳ اخبار میں لکھا ہی کیا ماجرائے امن ۲۴ بگڑی نظر تجھے ہے اب اس کو ہوائے امن

۲۵ جو حکم ہو سو کیجیے کہ مضطر ہے مصحفی

۲۶ اس کا نہ کوئی یار نہ یاور ہے اس جگہ ۲۷ نے خویش و اقربا نہ برادر ہے اس جگہ

۲۸ ہر کیا کہے جو حادثہ اس پر ہے اس جگہ ۲۹ ہر سو اسی کی ہجو کا دفتر ہے اس جگہ

۳۰ ناحق مغلظات کا مصدر ہے مصحفی

۳۱ ایسی ہی بحثیں ہوئیں گر شہر میں عیاں ۳۲ اہل کمال کاہے کو کوئی رہے گا یاں

۳۳ کیا والے کا شعر و سخن میں کوئی زباں ۳۴ ہوئیں گی شاعروں کی یہ رسوائیاں جہاں

۳۵ اس ہجو سے سخت مکدر ہے مصحفی

۳۶ شاعر جو آپ اس سے کرے ابتدائے ہجو ۳۷ لکھوا کے بھیجے شعر و غزل از برائے ہجو

۳۸ کیا مدح یہ جواب میں لکھے بجائے ہجو ۳۹ اس کی سنے نہ اپنی پھر اس کو سنائے ہجو

۴۰ کیا شاعری میں اتنا محقر ہے مصحفی

۴۱ پوچھو تو یاں جواب ہے ہر اک سوال کا ۴۲ پر تب جو محکمہ ہو کہیں قیل و قال کا

۴۳ جب حرف درمیان میں آیا قتال کا ۴۴ پھر گیا کمال نظم ظہیر و کمال کا

۴۵ حاصل کہ ہم فنوں میں سدا وہ ہے مصحفی

---

۱۵ مخمس کا متن دو نسخوں کی مدد سے درست کیا گیا ہے، نسخہ کتبخانہ مشرقیہ ۔ خ اور نسخہ ملکہ فضل علی خاں صاحب ۔ ف ۔ خ میں عنوان اس طرح ہے، مخمس در خطاب نواب وزیر الممالک آصف الدولہ مرحوم بہ امام ہجو و هجا از انشا در حالت قلق گذشتہ در بیان متہم شدن ہجو گفتن شاہزادہ عالمیان مرزا سلیمان شکوہ بہادر و انکار آں و استغاثہ نمودن بر جناب نواب آصف الدولہ بہادر مغفور ۔ ۱۶ شہ یا شاہ سے مراد سلیمان شکوہ ہیں، حالانکہ شاہ عالم زندہ تھے اور سلیمان ولی عہد بھی نہ تھے ۔ ۱۷ میر سوز آصف الدولہ کے اُستاد مشہور ہیں، مصحفی کے حسن کلام کے معترف تھے ۔ تذکرہ ہندی ص ۱۱۱ ۔ ۱۸ میر آصف کے درباری شاعروں میں تھے : ”بر فقیر بسیار مہربانی می فرماید“ تذکرہ ہندی ترجمہ میر ص ۲۴ مصحفی خود بھی میر کے مداح تھے، لیکن کبھی کبھی چوٹ بھی کر جاتے تھے، ایک قصیدے کا شعر ہے ۔ آئیں نظر نہ مجھ سے فن شعر میں یہ تو ۔ سودا نہیں پہ بیٹھے تو ہیں سودا کی جگہ میر، ۔ کلیات سودا، نولکشوری ص ۱۱ ۔ ۱۹ ف بے حساب کی جگہ انتخاب ۔ دونوں صورتوں میں مصرع غلط معلوم ہوتا ہے ۔ ۲۰ خ مجھے اب بجائے اب ان کو ۲۱ تذکرۂ خازن الشعرا (مصنفہ محمد میرن جان محمدی الہ آبادی ۔ سیدو اجلی تخلص ہے) جس کی تاریخ اختتام ۱۲۰۰ھ ہے، سید انشا کا جو ترجمہ درج ہے وہ رسالۂ اردوئے معلیٰ علی گڑھ بابت ۱۹۱۳ء میں نقل کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ نے انشا کو لکھنؤ سے نکال دیا تھا، لیکن پھر واپس بلا لیا، کسی دوسرے تذکرے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ ۲۲ انشا سے جھگڑے میں مصحفی کی واقعی بڑی رسوائی ہوئی تھی، ایک معاصر تذکرہ نگار صاحب مخزن الغرائب (دفتر اول قلمی ترجمہ انشا) کا قول ہے کہ صرف گدھے پر چڑھا کر تشہیر کرانا باقی رہ گیا تھا ۔ ۲۳ ف اہل کمال کا ہے گو رہنے لگا بعد مصحفی کہتے ہیں کہ انشا نے ابتدا کی، لیکن انشا بھی یہی کہتے ہیں ”قسم می خورم اکنوں کہ مرا ہیچ ز ہجو تو مرو کار نبود و نیست ۔ ولے از طرف گشت شروع این ہمہ اقوال مزخرف“ آب حیات طبع نہم ص ۳۱۹ ۔

# غزل آصف الدولہ

تری تیغ جب ہم علم دیکھتے ہیں ... وہیں سر کو اپنے قلم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں ... خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
شتابی سے آ ورنہ میرے مسیحا ... کوئی دن کو راہِ عدم دیکھتے ہیں
ملے تم ہو میرے رقیبوں سے جاکر ... ہمیں ہیں کہ سو سو ستم دیکھتے ہیں
بہت جھوٹے وعدے کیے تم نے ہم سے ... بھلا ہم تو تیری قسم دیکھتے ہیں
تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب ... پڑے راستہ صبح دم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف ... تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

# جواب شمس النسا بیگم

خوشی دل میں جب اپنے کم دیکھتے ہیں ... اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں
نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں ... نہ آنکھوں میں ہم اپنی نم دیکھتے ہیں
تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب ... پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں
نگاہِ کرم جس جگہ پر کرے تو ... ہم اشجارِ باغِ ارم دیکھتے ہیں
کرم سے ترے شاد و خرم ہیں یہ سب ... مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں
زیادہ ہو یعقوبؑ سے غم ہمارا ... جو ہم تجھ کو یوسف سے کم دیکھتے ہیں
تبسم بلب ہیں تماشائی یہ مردم ... ہم اپنی ہی آنکھوں میں نم دیکھتے ہیں
تمھیں کیا غرض ہے جو آؤ یہاں تک ... ہمیں آن کر اب قدم دیکھتے ہیں
کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے کی ... اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں
کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں ... تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ ... نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

## مثنوی میر حسن (غیر مطبوعہ)

شام کو میں فکر میں بیٹھا تھا کل
یعنی تھی میرے تئیں فکر غزل
یک بیک ہاتف[1] نے دی آواز یوں
آج کے دن فکر میں بیٹھا ہے کیوں
گھر سے باہر ٹک[2] نکل اے بے خبر
چل ذرا قدرت خدا کی سیر کر
فکر و غم ہے آج تو سب سے بعید
شام میں ظاہر ہے یاں صبح امید
سن کے یہ مژدہ اٹھا میں یک بیک
سیر کرتا جوں گیا بازار تک
دیکھا رستوں میں اک انبوہ ہجوم
تب کہا میں نے کہ کیسی ہے دھوم
اک لگا کہنے یہ میلا چل بے خبر
چل ہمارے ساتھ تو بھی سیر کر
ساتھ ساتھ اس کے گیا میں بھی وہاں
جس جگہ تھا عیش و عشرت کا مکاں
دیکھتا کیا ہوں کہ بے حد و قیاس
روشنی کا تھا ٹھٹ دریا کے پاس
لے زمیں سے آسماں تک ہے بلند
سے روشن ہو چراغ اس کا دو چند
اس طرح[3] روشن تھا واں ہر اک چراغ
عرش پر جس کا لگتا تھا داغ

تھا شعاع روشنی کا بس وفور
شام سے لے صبح تک تھا وقت نور
نیچے اوپر جلتے تھے جوں جوں چراغ
تھا عدو کو داغ بر بالائے داغ
دود اس کا ہوتا تھا جوں جوں بلند
آتش حسرت پہ تھا دشمن سپند
کیا بیاں اس کا کروں میں سر بسر
طوطی تقریر کے جلتے ہیں پر
روشنی اس طرح کی ہوتی ہے کد
اک سرا جس کا ازل اور اک ابد
روشنی کچھ اک نہ تھی اس جا عیاں
اس میں آتش بازی کا بھی تھا سماں
اک چراغاں کا نہ تھا تنہا ظہور
موج زن ریتی میں تھا دریائے نور
کاسۂ مہتاب تھا اس کا حباب
نور سے لبریز مثل آفتاب
حلقۂ دود چراغاں تھا بھنور
لہر گوٹے[4] کی سی اس میں سر بسر
بلتنیں دونوں طرف مثل کنار
زیب بخش موج دریا وار پار
روشنی کے جھاڑ جو ہیں اس میں یوں
نخل مرجاں نکلے ہے دریا سے جوں

دیکھ روشن اس میں کاغذ کے کنول
جل گئے غیرت سے پانی میں کنول
جنبش ہر شعلۂ شمع و چراغ
موج دریا کے تئیں کرتی ہے داغ
بیچ میں جب اس کے چھٹتے تھے انار
نور کی سی لہر تھی فوارہ دار
ہاتھی آتشبازیوں کے چھٹتے جب
نور کوہ طور تھا نظروں میں تب
مور اس کے اس میں چھوٹے اس نمط
چھوٹتی ہیں جس طرح دریا میں بط
جس کو گلشن چکر کہے ہیں دود تھا
وجد میں آتش کا دل تھا برملا
بس کہ چھٹتے تھے ستارے بے شمار
آسماں کی سی زمیں پر تھی بہار
پھلجھڑی، چھچھوندر، گل ریز و انار
کرتے جاتے تھے طبق گل کے نثار
یہ بھی گل اس واسطے در کار تھے
اس میں بھی روشن ہوا پر بار تھے
تھیں نہ روشن مورتوں کی ٹٹیاں
مردم ناری تھے یہ جلوہ کناں
متصل چھٹتی تھی از بس پھلجھڑی
نور کی بارش کی گویا تھی جھڑی

[1] قلمی نسخۂ ق میں موجود نہیں ہے [2] ق میں ہیکلا ہے [3] ق اس روشن تھا واں ہر اک چراغ [4] ق لہر گوٹی کی سی

نے زمیں تھی اور نہ تھا وہ آسماں
اور ہی روشن ہوا تھا اک جہاں

ایسی آتشبازی چھٹتی ہے کہیں
آسماں ہو جس کے آگے گل زمیں

آتشیں گل دیکھ یہ اور یہ چراغ
آسماں کا دل ہوا تھا باغ باغ

جس طرف جاتی تھی واں مدِ نگاہ
جوشِ گلبازی سے پاتی تھی نہ راہ

دیکھ کر اس وقت یہ سوجھی دلیل
ایسی ہی ہوئے گی گلزارِ خلیل

سیکڑوں لاکھوں تماشائی ہزار
روشنی کے گرد تھے پروانہ وار

بس کہ تھی سیرِ ہوائی کی ہوا
شوق میں دیدہ ہوائی سب کا تھا

نور کے دریا کو یوں ثابت کیا
اور سن لے اس کا مجھ سے ماجرا

تھے شناور اس کے تو اس میں عیاں
بجرے تھے چنڈول و بیچ بادباں

مور پنکھی پالکی اور اسپ ناؤ
فیل زریں پر ترنگ تھا یوں بناؤ

تو کہے دریا میں تھا کوہ طلا
یا کہ بادل تھا سنہری شام کا

فیلوں پر زریں نہ تھیں عماریاں
ابر میں تھے نور کے قبے عیاں

یا مگر اس روشنی ہی کے سبب
سیر کو آئے تھے مل کر روز و شب

برق کے مانند سب زریں لباس
ہنستے پھرتے تھے خوشی سے آس پاس

پھرتے تھے سب بادلا اوڑھے تاش
کیا سپاہی کیا غنی کیا خواجہ تاش

بادلے میں غرق سب اسباب تھا
پانی اس دریا کا جوں سیماب تھا

کھا پچھیاں ساچق کی جب آئیں نظر
یوں ہی ٹھہری دل پہ اپنے سر بسر

نور کے دریا سے بھر بھر کر گھڑے
سر اُپر لے لے فرشتے ہیں کھڑے

دیکھنا ان مشکوں کی آب و تاب
کوہ میں دریا ہوا تھا آپ آب

کشتیاں یوں تھیں جواہر کی رواں
جس طرح دریا میں تیریں کہکشاں

سبز فانوسوں کی اس میں تھی جھلک
جس طرح پانی پہ سبزے کی لہک

رنگ کے شیشے نہ تھے اس میں دھرے
دل ابھوں کے تھے وہ عشرت سے بھرے

دیکھ آرائش کے تختے مردماں
کہتے تھے یہ دیکھ لو باغِ رواں

باغ اس خوبی کو پہنچے ہے کہیں
یہ تماشا ہم نے دیکھا بس یہیں

کیسے گل جوہی چنبیلی موگرا
سیوتی شب بو گلاب اور موتیا

جعفری صد برگ عباسی بشام
اشرفی گل لالہ نرگس ہوں تمام

چشمِ گیتی نے نہ دیکھا زینہار
موسمِ ہر گل کی ہوئے اک بہار

گرچہ تھے وہ دہر میں مانند کے گل
پر مفصل مجھ سے سن اس جز کا کل

رنگ کو کب گل کے ہوئے ہے قرار
یہ وہ گل ہیں جن کی دائم ہو بہار

تھے رواں تختوں پہ اربابِ نشاط
عیش کی ہر طرف بچھتی تھی بساط

دیکھ کر وہ ناچ ان کا راگ رنگ
مشتری تھی وجد میں اور زہرہ دنگ

نوبت نقارخانہ کی صدا
چھا گئی تھی ارض سے لے تا سما

جتنے تھے نغز سرا استاد تھے
سب ہنر نوکِ زباں پر یاد تھے

اس قدر شہنائی والے خوش نوا
جس کو کہیے لحنِ داؤدی ادا

شعلوں کے ہر طرف روشن تھے جھاڑ
تو کہے وہ تھے تجلی کے پہاڑ

اس میں نوشہ کا کروں میں کیا بیاں
نورِ حق تھا اس تجلی میں عیاں

قلمی میں اسی طرح ہے۔ ۵۵ قلمی میں گھن پکار کی جگہ سرف گھنچ ہے۔ جناب خیال کی رائے ہے کہ گھن چکر ہونا چاہیے۔ یہیں بھی ممکن ہو

دیکھ کر یہ دھوم اور یہ عز و شاں
میں نے پوچھا ایک سے کیا ہو بیاں
کس کی یہ شادی ہوا اور کس کی یہ فوج
جوش ملتے کس پہ دریا کی ہے موج
تب کہا اک شخص نے تو اس قدر
حال سے ہے کیا جہاں کے بے خبر
ہو وہ نواب اک شجاع الدولہ نام
دھاک سے رنبے ہو جس کی روم و شام
قدرت و قوت میں لاثانی ہے وہ
عدل اور انصاف کا بانی ہے وہ
صاحبِ شمشیر[illegible] اور باب کرم
ہے خزف سے جس کے آگے لعل کم
مغز فطرت اور دماغ عقل و ہوش
چشم ہمت اور چراغ ہوش و گوش
مہر گستر عدل افزا ظلم کاہ
بندگان عالی و نور اللہ
نکتہ سنج و نکتہ پرور نکتہ داں
ماہ خوبی رونق افزائے جہاں

تیغ میدانِ شجاعت روز رزم
ماہ رخشانِ وجاہت روز بزم
دشمنوں کے واسطے برق غضب
دوستوں کو مایۂ عیش و طرب
عادل ایسا عہد میں جس کے سدا
شمع سے بچ کر چلے باد صبا
دست و بازو میں یہ قوت ہو اگر
تیغ مارے کوہ پر وہ کھینچ کر
دو کرے اس کوہ کو یوں اس کی دھار
تیر جائے جس طرح صابن میں تار
اور سخاوت میں تو ہو وہ یکہ تاز
جس کو چاہے دم میں کر دے بے نیاز
کیا کروں میں اس کا وصف باریا
بند ہوتی کب قلم سے ہے ہوا
ہو سلیماں جاہ اور دارا حشم
جس کا ہے افلاک اک ادنیٰ خدم[illegible]
شان و شوکت کا کروں میں کیا بیاں
قیصر و خاقاں سے ہوں خادم جہاں

قائم اس کا حق رکھے جاہ و جلال
اس کے دشمن کو رکھے نت پائمال
اس کے ہے فرزند اک عالی جناب
آصف الدولہ بہادر ہے خطاب
نیک طینت اور پاکیزہ صفات
اس کی شادی ہے یہ اور اس کی برات
عیش و عشرت کا ہر اک جا ذکر ہے
آج فکر و غم کو اپنی فکر ہے
سن کے بولا یوں دعا یہ حسن
نت رہے روشن وہ شمع انجمن
حق رکھے روشن چراغ اس کا سدا
جس نے اک عالم کو روشن کر دیا
شعر کا بھی غرض طرفہ ہے یہ فن[illegible]
تا ابد جس کا رہے روشن یہ من[illegible]
زر کی کچھ اس سے نہیں مجھ کو طرف
گر قبول افتد زہے عز و شرف

---

[illegible] یہ مصرع اسی طرح ہے [illegible] ق میں "گلبازی سے" کی جگہ "گلنا ہی سے" ہے [illegible] ق میں اسی طرح ہے [illegible] ق میں لفظ کا چھوٹا ہوا ہے [illegible] ق میں "کوہ زمیں دریا ہو تھا آب آب" جناب خیال کی رائے میں "کوہ زمیں" کی جگہ "کوہ بن" ہونا چاہیے۔ [illegible] ق میں "وہ" چھوٹ گیا ہے [illegible] ق "جوں ہی جنبیلی مونگرا" جناب خیال کی رائے ہے کہ لفظ کیتکی ابتدا میں بڑھانا چاہیے۔ متن میں اسی طرح درج ہے، لیکن جاہی جوہی اور جنبیلی موتیا، بھی ہو سکتا ہے [illegible] ق جعفر صد عباسی تمام۔ دونوں مصرعوں میں تمام ہے جو صریحاً غلط ہے، ایک میں تعجب نہیں کہ بنام ہو [illegible] ق "سو سمر ہر گل کی ہو اک بہار"، ناموزوں [illegible] ق غرض سے لے تا سماں، صریحاً غلط ہے [illegible] ق صاحب شمشیر اور ارباب کرم، صریحاً غلط ہے [illegible] ق "جس کا ہے افلاک ایک ادنیٰ خم"، متن جناب خیال کی رائے کے مطابق ہے [illegible] ق تا ابد جس کا رہے روشن یہ فن، دونوں مصرعوں میں فن قافیہ نہیں ہو سکتا۔ متن قیاسی تصحیح ہے

غالب

# میرزا غالب کے غیر مطبوعہ خطوط

(۱)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان عزیز از جان منشی بیل چند کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ کیوں صاحب ہم تو تم کو اپنا فرزند سمجھیں اور تمہارا یہ حال کہ مراسم فرزندی بجا نہیں لاتے۔ خط لکھنا تم نے یک قلم موقوف کر دیا اور بھائی بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں ہے۔ نہ طاقت باقی ہے نہ حواس درست ہیں۔ آج کے نواب صاحب کے خط میں دو جگہ غلطیاں ہوئیں مجھ سے لکھا کچھ چاہتا ہوں لکھ کچھ جاتا ہوں۔ بھیا اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا۔ کل بچا پرسوں مرا۔

اس خط کا جواب مجھکو جلد لکھواؤ۔ اس میں یہ لکھو کہ احسان حسین خاں اور ان کے بھائی مظفر حسین خاں جو لکھنؤ سے آئے ہیں نواب صاحب کی سرکار سے ان کا کیا درماہہ مقرر ہوا ہے اور تعظیم و توقیر کا کیا رنگ ہے۔ دربار میں جو آتے ہیں تو بیٹھتے کہاں ہیں۔ اس خط کے جواب کا طالب غالب ۱۱ر جون

۲

برخوردار نور چشم منشی بیل چند میر منشی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ اگلے مہینے میں اگست سنہ ۱۸۶۱ کی تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی اُس کا روپیہ ابتک نہیں پٹا۔ میں تو جس دن ہنڈوی آتی ہے اُسی دن یا دوسرے دن اپنے مختار کار کے ہاتھ کہ وہ بھی مہاجن ہے بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اُس مختار کار کو جس کے ہاں ہنڈوی آتی ہے اُس نے روپیہ اب تک نہیں دیا۔ ۸ ستمبر کو وہ ہنڈوی بیچ کر روپیہ میں نے لیا تھا اور آج اٹھارہ ہے۔ مختار کار کو روپیہ اُس نے اب تک نہیں دیا۔ جس سے تم نے ہنڈوی لکھوائی ہے اُس کو تم تاکید کرو کہ یہاں کے مہاجن کو روپیہ دینے کی تاکید لکھے تاکہ مختار کار کا روپیہ پٹ جاوے۔ غالب

۳

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی بیل چند صاحب میر منشی سلمہ اللہ تعالےٰ۔ بعد دعائے دوام حیات و ترقی درجات معلوم فرمائیں۔ اگرچہ از روئے خطوط حضور صحت و عافیت حضور معلوم ہوئی ہے لیکن یہ کہیں سے نہیں سُنا کہ غسل صحت کیا یا کس دن کریں گے۔ آپ سے فقیر کا سوال ہے کہ مجھکو لکھیے کہ حضرت غسل کس دن فرمائیں گے۔ اور اگر موافق میری آرزو کے نہا چکیں ہوں تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔ خیر و عافیت کا طالب غالب۔

۲۵ر دسمبر ۱۸۶۳ء

# افسانے



## گوتمی

مصنفہ ایون یونین (مترجمہ منصور احمد صاحب)

ہمالیہ کے دامن میں ایک سرسبز و شاداب خطے کے درمیان ایک آباد گاؤں تھا جس کے ایک غریب لیکن شریف خاندان میں گوتمی پیدا ہوئی۔

اس کا قد سرو کی طرح بلند تھا اور پہلی نظر میں وہ کسی قدر دبلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سانولے اور ہنس مکھ چہرے اور اس کی سادہ　　حلیم طبیعت نے اس کے ہمسایوں کو بیباک بنا دیا تھا۔ اور انھوں نے اس کے نام کے ساتھ ایک اور حرف کا، از لقب کا اضافہ کر دیا تھا وہ اسے "گوتمی دبلی" کہا کرتے تھے۔ لیکن گوتمی اس سے ناراض نہ ہوتی تھی۔ ہر حکم و خندہ پیشانی سے بجا لاتی تھی۔ اور ہر حکم کو وہ ایسے الفاظ کے ساتھ قبول کرتی تھی۔ جیسے:-

"بہت اچھا میرے آقا۔ میں ابھی یہ کام کرتی ہوں!
بہت اچھا بیگم صاحبہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گی۔"

گوتمی بہت دانشمند لوگوں میں سے نہ تھی۔ لیکن اس نے کبھی کوئی بے دانشی کی بات بھی نہ کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت باتیں نہ کرتی تھی اور صبح سے شام اپنے کام میں مصروف رہتی تھی۔ اس کا لباس　　غریبانہ ہوتا تھا، اور ہمیشہ ایک ہی قسم کا، لیکن ہمیشہ صاف ستھرا۔

ایک دن ایک نوجوان نے جو خوبصورت اور امیر تھا، اور اس علاقے کے بادشاہ کا بیٹا تھا اسے ایک دریا کے کنارے پر دیکھا　　وہ اس وقت اپنی بہنوں اور بھائیوں کے کپڑے دھو رہی تھی۔ شاہزادے کے دل میں خیال آیا کہ یہ لڑکی بڑی عاقل اور فرمانبردار ہے۔ لیکن کوئی اس کا ہاتھ بٹانے والا نہیں۔ ماں باپ بھی نہیں۔

اس نے خیال کیا۔

اس کے ماں باپ کہتے ہوں گے "اس کا کیا علاج۔ گوتمی نہ ہمارے بچوں میں سب سے زیادہ ہوشمند ہے۔ نہ حسین ہے۔ وہ ہماری لڑکی معلوم ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک دائی۔ اس سے کون شادی کرے گا؟ جلد یا بدیر جو شخص بھی اس سے شادی کرنا چاہے گا یہ اُسے قبول کر بیٹھے گی۔ کیونکہ وہ انکار کرنا نہیں جانتی۔ کاش یہ آدمی بے رحم نہ ہو اور اُس بچے کو جو اس لڑکی سے پیدا ہو بہترین تربیت دلائے۔

بادشاہ کا بیٹا یہ باتیں سوچ رہا تھا اور گوتمی کپڑے دھو کر سورج کی کرنوں سے چمکتے ہوئے پانی میں بیٹھی نہا رہی تھی۔

اپنے تمام کپڑے اُتار کر اس نے چھاتی سے گھٹنوں تک ایک چادر
لپیٹ رکھی تھی اپنے سیاہ بال پھیلائے وہ دانتوں سے اپنے
دانت صاف کر رہی تھی اور اپنے سانولے پنڈے پر پانی
ڈال رہی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ شاہزادہ درختوں کی
جھلملیوں میں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر اُس نے گوتمی کو
آواز دی، اور اس کے پاس جا کر مسکراتے ہوئے نہایت
لطف آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

"تم کتنی دل آویز ہو گوتمی، اور دُبلی بالکل نہیں جیسا کہ
لوگ تمہیں کہتے ہیں۔ سیدھا سادھا لباس پہننے والی بلند
قامت لڑکیوں کو لوگ ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔ گوتمی میں نے
سُنا ہے تم بہت فرمانبردار ہو۔ آؤ چپ چاپ میری آغوش
میں آجاؤ۔ اس وقت دریا کی تنہائی میں ہماری
ہم آغوشی کو دیکھنے والا کوئی نہیں"!

گوتمی شاہزادے کے اظہار آرزو پر شرما گئی اور
آہستہ آواز میں کہنے لگی!

ہاں میرے پیارے آقا، میرا سر تسلیم آپ کی مرضی
کے آگے خم ہے!

شاہزادہ۔ جب گوتمی کے حُسن سے محظوظ ہو چکا تو
اس نے دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی ہے!
اور اس کی آنکھیں، اگرچہ اُن میں فکر و خیال کی کوئی نئی
جھلک پیدا نہیں ہوئی پھر بھی پہلے سے زیادہ سحر آگیں نظر
آرہی ہیں۔ اس کے بعد وہ دریا کے کنارے درختوں
کے جھنڈ میں اکثر ملا کرتے، اور جب کبھی شاہزادہ حکم دیتا
گوتمی وہاں موجود ہوتی۔ اس نے کبھی سرتابی نہیں کی، اور
نہ بہت زیادہ ملنے جلنے سے اس کی فروتنی اور دلربائی
میں فرق آیا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ گوتمی کو اپنا جسم ایک بچے
کے وجود سے بوجھل معلوم ہونے لگا۔

اس وقت شاہزادے نے اسے اپنی کنیزوں میں
داخل کر لیا۔ گوتمی اپنے غریبانہ ساز و سامان سمیت
محل میں داخل ہو گئی۔ اور زمانہ گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ
ولادت کا دن آپہنچا۔ اُس دن محل میں ہیمنت نے کہا،
گوتمی دستور کے مطابق جب کسی بیگم کے ہاں بچہ
پیدا ہونے والا ہوتا ہے تو وہ اپنے باپ کے گھر چلی جاتی ہے
لیکن تم بیگم نہیں ہو بلکہ کنیز ہو۔ اس لیے اپنے ماں باپ کے
گھر نہ جاؤ اور اُس حد سے تجاوز نہ کرو جو موزوں اور
مناسب ہے۔

گوتمی نے اسے سلام کیا، اٹھی اور محل کے بڑے دروازے
سے باہر نکل گئی۔

پاس ہی ایک نہر بہتی تھی۔ اس کے چوبی پل پر سے گزر کر
اس نے دیکھا کہ ایک بڈھا! ہاتھ میں کچکول لیے ایک درخت
کے نیچے بیٹھا ہے۔ یہ ایک اندھا فقیر تھا جس نے ایک میلے
سے چیتھڑے سے اپنا ستر چھپا رکھا تھا، اور جس کے بازو
ٹانگیں، سینہ اور چمکتی ہوئی پیٹھ تپتی ہوئی دھوپ اور
بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

فقیر نے اسے ٹھہرا لیا اور تجربہ کار بڈھوں کی طرح
اپنی بے نور آنکھیں اوپر اٹھا کر اس طرح مسکرا دیا کہ اس کی
مسکراہٹ میں رمز و التفات دونوں موجود تھیں۔

اس نے کہا،

گوتمی میں تجھے دیکھ نہیں سکتا، مگر میں تیرے
آنے کو محسوس کر رہا ہوں۔ گوتمی، جس راہ پر تو جا رہی ہے

خدا اسے تیرے لیے مبارک کرے"۔

گوتمی نے جھک کر فقیر کے قدموں کو چوما اور اپنے راستے پر آگے بڑھ گئی۔ اسی راستے میں دھوپ سے تپتے ہوئے جنگل میں اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا، جس کا خیر مقدم اس نے خوشی کے آنسوؤں سے کیا۔ بچے کو آغوش میں لئے وہ شاہزادے کے محل میں واپس آگئی وہ اس ننھی سی جان کو جو روز بروز نشوو نما حاصل کر رہی تھی اور ہوش و شعور میں ترقی کر رہی تھی دیکھتی، چومتی، مس کرتی، سینے سے لگاتی اور وفور مسرت میں آپے سے باہر ہو ہو جاتی۔ ❊

اگرچہ گوتمی شاہزادے کو بہت عزیز تھی، اور اگرچہ آنکھوں میں سرمہ اور چہرے پر غازہ مل کر اس کے بالوں کو سونے کے تاروں میں گوندھ کر دلہنوں کا سا زرق برق لباس پہنا کر [illegible] کی بارش میں باجے گاجے کے ساتھ اسے شاہی محل میں لے جایا گیا اور وہ شاہزادے سے وابستہ ہو گئی۔ لیکن یہ الفاظ اس سے کسی نے نہ کہے "گوتمی! میرا جذب دل تجھے پھر کھینچ لایا ہے"۔

بچے کی پیدائش کے بعد گوتمی نے نہایت صبر کے ساتھ نوجوان شہزادے کی سرد مہری کو برداشت کیا۔ وہ ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہنے کی کوشش کرنے لگی: تاکہ اتفاقی ملاقات بھی شاہزادے کو تکلیف یا جبر کا احساس نہ ہو۔ ❊

وہ محل کے احاطے کے اندر حوض کے کنارے ایک کٹیا میں رہا کرتی، اور ان ہنسوں کی پرورش اس نے اپنے ذمہ لے لی جو حوض میں کنول کے پھولوں اور اودی سبزے کے درمیان تیرتے رہتے تھے۔

اسی طرح وہ کچھ مدت تک نہایت خوش رہی، اور خوشی کے معین لمحات کے بعد غم کی مشکل گھڑیاں گزارنے کے بعد، اور گیروے کپڑے پہننے والوں میں شامل ہو کر اس تنہا سچے راستے پر چلنے کے لیے نامعلوم طور پر تیار ہوتی رہی جو قسمت کے پردے کے پیچھے اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ ❊

مبارک ہیں وہ جن کے دلوں میں عجز و انکسار ہے اور جو دنیاوی بندھنوں کو توڑ چکے ہیں

جنھیں کائنات کی کسی چیز سے الفت نہیں ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں بے پایاں مسرت کا راج ہے اور وہ ایک پرندے کی طرح ہیں جس کے کندھوں پر اپنے پروں کے سوا اور کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ ❊

# سانپ

مصنفہ امبروز بیرس
مترجمہ تشنائی

"یہ تحقیق شدہ امر ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس سے کوئی صاحب عقل اب انکار نہیں کرتا کہ سانپ کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے، اتنی زبردست کہ باوجود اپنی خواہش اور ارادے کے انسان اس کے زیر اثر آ جاتا ہے اور اس کی جانب کھنچ کر اس کا شکار ہو جاتا ہے۔"

ہارکر برٹن ڈریسنگ گاؤن اور زیر پا پہنے آرام دہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ مور یسٹر کی کتاب "سائنس کے عجائبات" میں سے مندرجہ بالا سطور پڑھ کر وہ مسکرایا۔ "اس میں عجیب بات صرف یہی ہے" اُس نے اپنے دل میں کہا "کہ مور یسٹر کے زمانے کے صاحب عقل ایسی واہیات باتوں پر یقین رکھتے تھے جنھیں آج کل کے جہلا بھی مہمل سمجھتے ہیں۔"

خیالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیونکہ برٹن غور و خوض کرنے کا عادی تھا۔ اور بغیر اپنی آنکھوں کا رخ بدلے ہوئے اس نے غیر ارادی طور پر کتاب نیچے کر دی۔ جیسے ہی کہ کتاب اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی کمرے کے ایک تاریک گوشے میں کسی چیز نے اس کی توجہ ماحول کی طرف منعطف کر دی۔ اُس کی مسہری کے نیچے اندھیرے میں روشنی کے دو نقطے تھے، ایک دوسرے سے تقریباً ایک انچ علیحدہ۔۔۔

ممکن ہے کہ یہ نقطے اس گیس کے لیمپ کے عکس ہوں جو اس کے اوپر لوہے کی کانٹی سے آویزاں تھا۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کسی چیز نے۔ کسی احساس نے، جس کا تجزیہ کرنے کا خیال اسے نہیں ہوا، اس کو مجبور کیا کہ کتاب نیچی کر کے اس چیز کو دیکھے جسے اُس نے پہلے دیکھا تھا۔ روشنی کے نقطے اب بھی وہیں تھے۔ ان کی روشنی پہلے سے تیز ہو گئی تھی۔ ان میں ایک ہلکی سبزی مائل چمک تھی جسے وہ پہلے نہ دیکھ سکا تھا۔ اس نے سوچا کہ ان نقطوں نے حرکت کی تھی۔ اس سے قریب تر ہو گئے تھے۔ وہ اب بھی اتنے اندھیرے میں تھے کہ معمولی توجہ سے ان کی حقیقت نہیں ظاہر ہو سکتی تھی۔ وہ پھر مطالعے میں مشغول ہو گیا۔ یکایک کتاب کی ایک عبارت نے کسی خاص خیال کو اُبھارا جس سے وہ چونکا اور تیسری مرتبہ اس نے کتاب اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹائی۔ اور اس کا ہاتھ صوفے کے کنارے سے لٹک گیا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر الٹتی ہوئی زمین پر اس طرح گری کہ اس کی پشت اوپر تھی۔

برٹن بیٹھ کر غور سے مسہری کے نیچے تاریکی میں دیکھ رہا تھا۔ جہاں نقطے تیز روشنی سے چمک رہے تھے۔ وہ متوجہ ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں اب متجسس تھیں۔ وہ مسہری کے

سے نیچے ایک بڑا سا سانپ نظر آیا۔ دشمن کے نقطے اس کی آنکھیں تھیں! اس کا نکر وہ سر گنڈلی کے اندر والے حلقے سے نکل کر باہر والے حلقے پر رکھا ہوا۔ ۔ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چوڑے خوفناک جبڑے اور اس کی پیشانی اس کی نظروں کے مرکز توجہ کو ظاہر کر رہی تھیں۔ آنکھیں اب صرف دشمن نقطے نہ تھیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں ایسے معنی خیز انداز سے دیکھ رہی تھیں جس سے کینے کا اظہار ہوتا تھا۔

## ۳

کسی جدید شہر کی خواب گاہ میں سانپ کی موجودگی کوئی عام واقعہ نہیں کہ اس کی توجیہ بیکار ہو۔ بارکر بریٹن جو ۳۵ سال کا کنوارا، کاہل، ہردلعزیز، دولتمند، تندرست، اور علم کا دلدادہ تھا وہ، دور دراز کے غیر مانوس ملکوں کے سفر سے حال ہی میں سان فرانسسکو واپس آیا تھا۔ ہوٹلوں میں ٹھہرنے سے اسے فطری نفرت تھی اور اس لیے اس نے اپنے دوست اور سائنس کے ممتاز ماہر ڈاکٹر ڈروننگ کی دعوت بخوشی قبول کر لی۔ ڈاکٹر ڈروننگ کا بڑا قدیم وضع کا مکان شہر کے غیر معروف حصے میں تھا۔ اس کی ساخت سے مغرورانہ سنجیدگی ہویدا تھی۔ یہ اپنے بدلے ہوئے ماحول سے التفات کرنے پر آمادہ نہ تھا اور اس بیگانگی کی وجہ سے جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی اس میں موجود تھی۔ خصوصاً ایک بازو جو نمایاں طور پر بے جوڑ اور مقصد کے لحاظ سے بھی ویسا ہی باغی تھا۔ کیونکہ یہ ڈاکٹر ڈروننگ کے عجائب خانے معمل اور وحوش خانے کا مجموعہ تھا۔ یہیں وہ اپنی فطرت کی علمی افتاد کو ان مخلوقات کے مطالعہ حیات سے آسودہ کرتا جن سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اور اس کی یہ دلچسپی "نچلے طبقے" تک محدود تھی کیونکہ "اونچے طبقے" والوں کو اس کے وحوش خانہ میں پہنچنے کے لیے اپنے کو "مینڈک اور سانپ" کی خاصیت سے موصوف کرنا پڑتا۔ اس کے علمی مشاغل کا میلان کیڑے مکوڑے اور رینگنے والے جانوروں کی طرف تھا۔ اسے فطرت کے "گنواروں" سے الفت تھی اور وہ اپنے آپ کو علم حیوانات کا ذولاؔ[1] سمجھتا تھا۔ اس کی بی بی اور بیٹیاں چونکہ اس کے اس "اعلیٰ ذوق" میں شریک نہ تھیں اس لئے وہ "سانپ گھر" کی دلچسپیوں سے بالکل محروم تھیں۔ اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں اگرچہ ڈاکٹر نے انھیں اجازت دے دی تھی کہ وہ اس کی دولت کے ذریعے اپنے ماحول کی عظمت و شوکت اور اپنی آرائش و زیبائش میں سانپوں سے بڑھ جائیں۔

آرائش کے لحاظ سے "سانپ گھر" میں ایسی سخت سادگی تھی جو اس کے رہنے والوں کے خیال کے موافق تھی، ان میں سے بہتوں کے لیے وہ آزادی موزوں نہیں ہوتی جو زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ ان میں یہ تکلیف وہ خصوصیت تھی کہ وہ زندہ تھے۔ لیکن اپنے کمروں میں انھیں صرف اس قدر ذاتی آزادی حاصل تھی کہ وہ ایک دوسرے کو کھا نہ جا سکیں۔ اور بریٹن ہشیار کر دیا گیا تھا کہ

[1] ذولا۔ فرانسیسی۔ ادیب۔ اس کے ناول زیادہ تر ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے متعلق ہوتے تھے۔ (مترجم)

بحقیقت، روایت کی حد سے بڑھ چکی تھی کہ ان میں سے بعض بسا اوقات مکان کے ایسے حصے میں پائے گئے تھے جہاں ان کے لیے اپنی موجودگی کی وجہ بتانی مشکل ہوجاتی۔ "سانپ گھر" کی کراہیت انگیز موجودگی کے باوجود بھی ـــ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ ہی روز بعد اسے بالکل ہی بھول چکا تھا ـــ "ڈرورنگ ولا" کی سکونت اس کی طبیعت کے موافق تھی۔

۳

تعجب اور حقارت کے سوا مسٹر بریٹن نے اور کچھ محسوس نہ کیا۔ اس کا پہلا خیال گھنٹی بجاکر نوکر بلانے کا ہوا۔ لیکن باوجود اس کے کہ گھنٹی کا فیتا بالکل نزدیک ہی لٹک رہا تھا اس نے اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، اسے یہ شک ہوا کہ اس کی اس حرکت سے ڈر جانے کا شبہ ہوسکتا تھا حالانکہ وہ مطلقاً خوف زدہ نہ تھا۔ بہ نسبت خطرے کے اُسے اِس موقع کے بھونڈے پن کا زیادہ احساس تھا، جو قابل نفرت مگر مہمل تھا۔

یہ سانپ اس جنس سے تھا جس سے بریٹن ناآشنا تھا۔ اس کے طول کا وہ صرف قیاس ہی کرسکتا تھا۔ اس کا سب سے نمایاں حصہ جسم اس کے بازو جتنا موٹا تھا۔ اگر یہ خطرناک تھا تو کیونکر؟ کیا زہریلا تھا؟ یا گلا گھونٹنے والا؟ خطرات فطرت سے ہشیار کرنے والی علامتوں کا علم بھی اِس وقت اُس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ اُس نے کبھی ایسا معمہ حل نہیں کیا تھا۔

اگر خطرناک نہیں تو کم از کم اس کی موجودگی ناگوار خاطر ضرور تھی۔ وہاں اس کی ضرورت نہ تھی یہ بے تمیزی تھی۔ نگینہ انگوٹھی کے لایق نہ تھا! ہمارے زمانے اور ہمارے ملک کے وحشیانہ ذوق نے بھی اس جگہ کو، جنگل کی اس وحشی ہستی کے لیے موزوں نہ بنایا تھا اگرچہ اس ذوق نے کمرے کی دیواروں کو تصویروں سے اور کمرے کے فرش کو فرنیچر سے اور فرنیچر کو آرایش کے سامانوں سے بھر دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کیسا روح فرسا خیال تھا۔ اُسی ہوا میں سانس لینا جس میں ایک سانپ سانس لے رہا ہو!

انھیں خیالات نے اسے کچھ کرنے پر آمادہ کیا۔ یہی وہ عمل ہے جسے ہم "فکر و فیصلہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم دانا یا نادان ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح خزاں کی پتیاں زمین یا جھیل کی سطح پر گر کر اپنی ہم جنسوں سے زیادہ یا کم ذہانت کا ثبوت دیتی ہیں انسانی افعال کا راز بالکل کھلا ہوا ہے۔ کوئی چیز ہمارے اعصاب میں تشنج پیدا کردیتی ہے۔ کوئی مضائقہ ہے اگر اسی اعصابی تغیر کا نام "قوت ارادی" رکھ دیں۔؟

بریٹن کھڑا ہوگیا۔ اور بغیر سانپ کو بھڑکائے پیچھے ہٹتے ہٹتے دروازے سے باہر نکل جانے کے لیے تیار ہوا لوگ اسی طرح بڑوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ بڑائی "طاقت" ہے اور طاقت "خطرہ" ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بغیر کسی رکاوٹ کے اُلٹے پاؤں چل کر وہ آسانی سے دروازے تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر سو دبی اس کا تعاقب کرے تو اسی ذوق نے جس نے دیواروں کو نقش و نگار سے بھر دیا تھا۔ خونخوار مشرقی ہتھیاروں کو بھی دیواروں سے آویزاں کردیا تھا اور وہ انھیں میں سے ایک ہتھیار کو

موقع کی مناسبت کے لحاظ سے اُٹھائے سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اس عرصے میں سانپ کی آنکھیں اور بھی زیادہ دبے رعنا حقارت سے چمکنے لگیں۔ !

برٹن نے پیچھے ہٹنے کے لئے دہنا پاؤں زمین پر سے اُٹھا لیا۔ اس وقت اُسے اس فعل سے سخت نفرت ہوئی
"میں بہادر کہلاتا ہوں!" اُس نے آپ ہی آپ کہا۔
"تو کیا بہادری غرور اور شیخی کے سوا اور کچھ نہیں؟ چونکہ کوئی میری بزدلی کا شاہد نہیں، اس لئے میں پیچھے ہٹ جاؤں؟"

(۴)

دہنا ہاتھ کرسی کی پشت پر رکھے اور پاؤں اُٹھائے وہ اپنا توازن قائم کر رہا تھا "مہمل" اس نے بلند آواز سے کہا میں اتنا بڑا بزدل نہیں کہ خود اپنے نزدیک خوف زدہ معلوم ہونے لگوں" اس نے پھرتی سے گھٹنے کو موڑ کر اس نے اپنا پاؤں نیچے اور دوبارہ اُٹھایا اور اس کو زمین پر رکھ دیا۔ دوسرے پاؤں سے ایک انچ آگے۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ ایسا کیوں کر ہوا۔ بائیں پاؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ پھر دہنے پاؤں کے آگے تھا۔ کرسی کی پشت پر جو ہاتھ تھا وہ کرسی کو پکڑے ہوئے تھا۔ بازو سیدھا تھا کچھ پیچھے کی طرف۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کرسی کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ سانپ ابھی تک پہلے کی طرح کنڈلی کے اندر والے حلقے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ سانپ نے حرکت نہ کی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں اب بجلی کے شعلے تھیں جن سے بے شمار شعاعیں نکل رہی تھیں۔

برٹن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ پھر اُس نے ایک پاؤں آگے بڑھایا پھر دوسرا۔ کرسی کو گھسیٹتے ہوئے۔ جو آخر کار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر زور سے گری۔ وہ کراہا۔ سانپ نے نہ تو حرکت کی نہ اُس کی آواز ہی سنائی دی۔ لیکن اُس کی آنکھیں دو خیرہ کن سورج تھیں جنھوں نے خود اُس کو چھپا لیا تھا۔ ان آنکھوں سے تیز اور شوخ رنگوں کے دائرے نکل رہے تھے جو پھیل پھیل کر صابن کے بلبلوں کی طرح پھوٹ جاتے تھے۔ وہ برٹن کے چہرے تک پہنچتے معلوم ہوتے اور معاً انتہائی دوری پر چلے جاتے۔ وہ کہیں ڈھول کی مسلسل ڈھب ڈھب سن رہا تھا جس کے ساتھ دور سے موسیقی کا ایک جھونکا بھی آجاتا۔ بیلے کے نغمے کی طرح حیرت انگیز شیرینی لے ہوئے۔ اُس نے سمجھا کہ یہ میمن کے مجسمے کا "نغمہ صباحی" ہے اور سوچا کہ وہ نیل کے ساحل پر کھڑا بڑے اشتیاق سے صدیوں کی خاموشی میں سے غیر فانی نغمہ سن رہا ہے۔ موسیقی بند ہو گئی۔ بلکہ رفتہ رفتہ کم ہو ہو کر گھٹتے ہوئے طوفان کے کڑکوں کی گڑگڑاہٹ ہو کر رہ گئی۔ اس کے سامنے ایک منظر تھا۔ بارش اور آفتاب سے چمکتا ہوا اس پر قوس قزح کی محراب تھی۔ جس کے عظیم الشان خم میں سیکڑوں شہر معلوم ہو رہے تھے۔ بیچ میں ایک بڑا سانپ تاج پہنے اپنا سر اُٹھائے ہوئے تھا اور اپنی مُردہ ماں کی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ یکایک یہ پُر اَسرار، دلکش منظر تیزی اور آہستگی سے اوپر اُٹھتا معلوم ہوا۔ تھیٹر کے پردے کی طرح۔ اور خلا میں غائب ہو گیا۔ کوئی چیز بڑے زور سے اس کے چہرے اور سینے پر لگی۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ناک اور خراش

پائے ہوئے ہونٹوں سے خون نکل رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے سکتہ سا ہو گیا اور آنکھیں بند کیے چہرہ زمین پر رکھے وہ پڑا رہا۔ چند لمحات میں اُسے ہوش آ گیا اور اس وقت اس نے محسوس کیا کہ گرنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں دوسری طرف ہو گئی تھیں اور اس طرح وہ طلسم ٹوٹ گیا تھا جو اُسے مسحور کیے ہوئے تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اپنی نگاہیں دوسری طرف کیے ہوئے وہ پیچھے ہٹ سکے گا۔ لیکن یہ خیال نہایت ہیبت ناک تھا۔ سانپ اس کے سر سے صرف چند فیٹ کے فاصلے پر ہے۔ شاید اچھل کر اُس کی گردن میں اپنی کنڈلی لپیٹ دینے کی تیاری میں۔ اور وہ سانپ کو دیکھ نہیں رہا ہے۔ اس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اُن مقناطیسی آنکھوں کو دیکھا اور پھر اُن کی گرفت میں آ گیا۔ سانپ اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ احساس پر اب سانپ کا اثر کچھ کم ہو گیا تھا۔ چند لمحے قبل کے عالیشان خیالی مناظر اب پیش نظر نہیں تھے اس کی چپٹی بھوؤں کے نیچے اس کی سیاہ گولیوں کی سی آنکھیں اُسی طرح چمک رہی تھیں جیسے پہلے۔ انتہائی متانت کے اظہار کے ساتھ گویا کہ اس جانور نے اپنی کامیابی کا یقین کرتے ہوئے مسحور کر لینے والی ترکیبوں کا استعمال ترک کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اب ایک خوفناک منظر شروع ہوا۔ بیرنٹن نے جو اپنے دشمن سے ایک گز دور زمین پر پڑا ہوا تھا۔ کہنیوں کے بل جسم کے اوپر کا حصہ اُٹھایا۔ اُس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اور اس کے پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کا چہرہ جس پر خون کے دھبے تھے۔ بالکل سفید تھا۔

آنکھیں انتہائی حد تک کھلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر کف تھا۔ اور آہستہ آہستہ زمین پر گر رہا تھا۔ اس کے جسم میں زور زور سے لرزش ہوتی تھی۔ اُسی طرح جیسے سانپ پیچ و خم کھاتا ہے۔ وہ کمر کے بل جھک گیا اور اپنے پاؤں کو ادھر ادھر ہلانے لگا۔ ہر حرکت پر وہ سانپ کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے کہ اپنے کو پیچھے کی طرف دھکیلے لیکن کہنیوں کے بل آگے ہی بڑھتا گیا۔

## ۵

ڈاکٹر ڈرورنگ اور اُس کی بی بی دارالمطالعہ میں بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر کی طبیعت اس وقت بے حد موزوں تھی۔ "میں نے ابھی ایک شخص سے" اوفیو فاگس" کا نمونہ حاصل کیا ہے۔" "اور یہ ہے کیا!" اس کی بی بی نے بے پروائی سے پوچھا؟

"کیوں! خدا کی پناہ! کیسی جہالت! میری پیاری جس آدمی کو شادی کے بعد اس کا یقین ہو جائے کہ اُس کی بی بی یونانی زبان نہیں جانتی اُسے طلاق دینے کا حق حاصل ہے۔ اوفیو فاگس ایک سانپ ہے جو دوسرے سانپوں کو کھا جاتا ہے۔"

"میں اُمید کرتی ہوں کہ یہ تمہارے سب سانپوں کو کھا جائیگا۔" وہ لیمپ کو ہٹاتے ہوئے بے پروائی کے لہجے میں بولی۔ "لیکن یہ دوسرے سانپوں کو پکڑتا کس طرح ہے۔ غالباً ان کو مرعوب کر کے؟"

"یہ بالکل تمہاری جیسی بات ہے پیاری۔" ڈاکٹر نے کہا تم جانتی ہو کہ سانپ کی مقناطیسیت کی طرف

اشارہ کرنا بھی میرے نزدیک کتنا احمقانہ خیال ہے!"
گفتگو ایک زبردست چیخ سے منقطع ہو گئی جو خاموش مکان میں اس طرح گونجی جیسے شیطان قبر میں سے گرج رہا ہو۔ پھر ایک ہیبت ناک صفائی سے آواز آئی۔ وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر گھبرایا ہوا۔ اس کی لبی زرد اور خوف زدہ۔ قبل اس کے کہ آخری چیخ کی گونج ختم ہوئی ہو۔ ڈاکٹر کمرے کے باہر تھا۔ وہ دو سیڑھیوں کو ترچھا ہوا وہ دو بلیز میں آیا۔ بریٹن کے کمرے کے سامنے اُسے چند نوکر ملے جو اوپر کی منزل سے آئے تھے۔ سب مل کر بغیر دروازہ کھٹکھٹائے اندر گھس گئے۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ بریٹن پیٹ کے بل زمین پر مردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر اور بازو وں کا کچھ حصہ مسہری کی پٹی کے نیچے چھپا تھا۔ اُنھوں نے جسم کو باہر کھینچا اور چت کر دیا۔ چہرہ خون آلودہ تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں گھور رہی تھیں۔ "غشی کی حالت میں مرگیا۔" خوف ناک نظارہ"! ڈاکٹر نے جھک کر اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جھکنے پر اس کی نگاہ مسہری کے نیچے گئی۔ "او خدا"! اس نے کہا۔ "یہ یہاں کیسے آگیا؟" اُس نے مسہری کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور سانپ کو کھینچ کر باہر پھینک دیا۔ اس کی کنڈلی ابھی تک بندھی ہوئی تھی۔ یہ زمین پر کرخت کھنکتی آواز کے ساتھ پھیلتا ہوا دیوار سے جا کر لگا۔ اور بے حس و حرکت ہو کر پڑا رہا۔ یہ ایک مصنوعی سانپ تھا جو بھوسا بھر کر بنایا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جوتے کے دو بٹن سے بنی تھیں۔ +

---

سلہ "یہ اپنے بسے ہوئے ماحول سے ......" یہ ترجمہ بالکل لفظی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اردگرد کے مکانات میں نئی وضع کے مطابق تیز ہو گیا تھا لیکن یہ مکان اپنی پرانی وضع پر قائم تھا، اور اپنی قدامت پسندی پر نازاں تھا۔ سلہ "یہ حقیقت روایت کی حد سے بڑھ چکی تھی"..... یعنی محض سنی سنائی بات نہ تھی بلکہ مشاہدے سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی۔ سلہ "اور اپنی مردہ ماں کی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا" یہ لفظی ترجمہ ہے ـــ اور مفہوم صاف نہیں ہے۔ سلہ "کہ وہ پیچھے ہٹ سکے گا" اُردو میں غالباً وہ کی جگہ میں اور سکے گا کی جگہ سکوں گا ہونا چاہئے۔ لیکن انڈائرکٹ نیریشن بھی اُردو میں رواج پا رہا ہے۔ سلہ "یہ بالکل تمہاری جیسی بات ہے" یہ بھی لفظی ترجمہ ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ ایسی بات ہے جس کی توقع تمہیں سے کی جا سکتی ہے۔

مترجم

# غمکدہ

مصنفہ مصطفےٰ لطفی منفلوطی

مترجمہ سید احمد صبا عروج قادری

جمیل، میرا دوست تھا، میں اس سے محبت کرتا تھا، میں اُس پر فریفتہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ بڑا حسین یا پرہیزگار تھا بلکہ اس کے اتقاد و جمال و دلکش سے کہیں زیادہ اس کے غلغلہ انداز ادبی کمال نے مجھے اس کا شیدا بنا دیا تھا۔ اس کی موجودگی میرے لئے باعث تسکین بن گئی تھی۔ میں ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا اور اس کی سحر بیانی سے محظوظ ہوتا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے بھی وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو میں گھبرا اُٹھتا تھا۔ ایک عرصے تک میں اس کے ساتھ رہا۔ وہ مجھ سے خوش تھا اور میں اس سے!

اچانک میں ایک شدید ضرورت کی وجہ سے قاہرہ سے باہر چلا گیا، ہم دونوں میں برابر مراسلات جاری رہے، کچھ دنوں بعد اس نے خط لکھنا چھوڑ دیا، میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب نہیں آیا۔ پھر تو طرح طرح کے خطروں نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ ناچار میں اسی حیرت و پریشانی میں قاہرہ لوٹ آنے پر مجبور ہو گیا، لیکن افسوس کہ میرا دوست مجھے نہ ملا۔ میں نے قاہرہ کی اُن تمام گلیوں کی خاک چھانی، جہاں اُس کے دیدار کی امید تھی، لیکن محض بیکار، اُس کے محلے کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ عرصے سے مفقود الخبر ہے۔ میں نے اُس کی تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن افسوس کہ بے سود! جب میں نا اُمید ہو گیا کہ وہ اب نہیں ملے گا۔ تو میری آنکھیں نمناک ہو گئیں، اور میں رنج و غم، اور حزن و الم کی سراپا تصویر بن کر رہ گیا۔ میرے اور آنسوؤں کی وہی شخص قدر کر سکتا ہے جس کا کوئی دوست بچھڑ گیا ہو اور جس کا دل آتشِ فراق سے جل چکا ہو۔

---

مہینے کی آخری تاریخ تھی، لیلیٰ شب کی تاریک و طویل زلفیں ہر طرف بکھر گئی تھیں۔ قاہرہ کے کتب خانے میں واپس جا رہا تھا راستہ بھول گیا، بھٹکتا ہوا میں ایسی جگہ پہونچا جو اس قدر غیر معروف اور خوفناک تھی کہ گویا میں اجنبیوں کی بستی میں آ گیا تھا تاریکی اتنی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک ایسے سیاہ دریا میں غوطے لگا رہا ہوں جو دو پہاڑوں کے درمیان موجیں مار رہا ہو یکایک خطرناک موجوں نے مجھے گھیر رکھا تھا، میں کھڑا ہوا اپنی رہائی کی تدبیریں سوچ رہا تھا کہ اتنے میں ایک دھیمی سی آواز فضا میں گونجی جو بے کسی کی صدائے خفیف میرے کانوں سے ٹکرانے لگی۔ اس خوفناک اور ویران گلی میں کسی کی موجودگی تعجب سے خالی نہ تھی مگر میں نے یہ عہد کیا تھا کہ حتی الوسع ہر مصیبت زدہ کی مدد کروں گا۔ اس لئے میں اس آواز کی طرف لپکا اور اس دروازے پر پہنچ گیا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے کنڈی ہلائی لیکن صدائے بر نخواست۔ ناچار زور کی شدت سے کنڈی ہلانی پڑی۔ اب دروازہ کھلا۔ ایک دس برس کی لڑکی ہاتھ میں ٹمٹماتی ہوئی شمع لئے مجھے میری طرف

تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ وہ پھٹے ہوئے کپڑوں میں ایسی معلوم ہو رہی تھی جس طرح چاند ابر کے منتشر ٹکڑوں میں نظر آتا ہے۔ "کیا یہاں کوئی مریض ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس لڑکی نے زور سے ایک ٹھنڈی سانس لی، قریب تھا کہ دل کی رگیں پھٹ جائیں۔ پھر اُس نے کہا "مہربان من آیئے اور میرے قریب مرگ باپ کی مدد کیجیے۔" شمع لیے ہوئے وہ آگے بڑھی، اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک بالاخانہ پر پہنچی اس میں داخل ہوتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہستی سے نیستی، اور زندگی سے موت کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ بالاخانہ مزار اور پلنگ پر لیٹا ہوا مریض "مردہ" معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے جس میں سانس کی اس طرح آمد و رفت ہے جس طرح لکڑی کے بنائے ہوئے مجسمے میں ہوا آتی جاتی ہے۔ میں مریض سے قریب ہو گیا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا، اس کے بعد انتہائی پست آواز سے کہا "الحمد للہ کہ میں نے اپنے دوست کو پا لیا" میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرا کلیجا سینے سے باہر نکل آئے گا اور میرا دل شدت الم سے پھٹ جائے گا۔ میرا دوست مل گیا تھا مگر افسوس کہ وہ دو گھڑی کا مہمان تھا۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہا۔ قبرستان کا سا سکوت مطلق۔ ہم سب خاموش تھے، بالکل خاموش جیسے ہمیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے کہا۔ جمیل! جمیل! تمہاری یہ حالت! آہ زمانہ کی بوقلمونیوں نے تمہارے ساتھ ایسا ناروا برتاؤ کیا! بتاؤ تم اتنے دنوں کہاں رہے، اور ایسی حالت کیوں ہے؟" وہ اٹھنے لگا لیکن اٹھ نہ سکا۔ میں نے ہاتھوں کے سہارے اس کو اٹھا کر بٹھا دیا۔

---

جمیل نے ٹھنڈی سانس لی اور کہنا شروع کیا! "دس سال کی طویل مدت گذری کہ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے مکان کے پہلو میں ایک اور مکان تھا جس میں ایک مختصر مگر دولتمند کنبہ بسا ہوا تھا۔ برکھا رت کی ایک بہار آفریں شام تھی، میں اپنے بالاخانے پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے والے مکان کے دریچے پر پڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک پیکر جمال و مجسمہ حسن دوشیزہ عالم محویت میں شام کا لطف اٹھا رہی ہے۔ میرے دوست یقین کرو کہ وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے آسمان سے کوئی حور اتر آئی ہو یا سنگ مرمر کے خوبصورت مجسمے میں خون دوڑا دیا گیا ہو۔ جب وہ چلی گئی۔ تو میرے منہ سے ایک آہ آتشیں نکل گئی جس نے میرے دل و جگر کو جلا ڈالا۔ میں اُس کا گرفتار محبت ہو گیا۔ اور بے قرار رہنے لگا۔ میں نے اُس کو شیشہ میں اتارنے کی انتھک کوششیں کیں۔ لیکن ہمیشہ وہ مجھ سے بچتی رہی۔ میرے ترکش کے تمام تیر ختم ہو چکے تھے۔ صرف ایک باقی رہ گیا تھا۔ (آہ یہ وہی تیر تھا جس نے میری اور اس کی زندگی کو برباد کر دیا) میں نے اس سے کہا کہ گھبراؤ نہیں میں تم سے نکاح کر لوں گا۔ آہ میرا یہی آخری حربہ تھا جس نے اس معصومہ کو گھائل اور اس کی عفت کو برباد کر دیا۔ اب یہ حالت ہو گئی تھی کہ میں اُس کا گرفتار تھا اور وہ میری پرستار، غرض تھوڑے ہی دنوں میں میری ہوسناکیوں نے اس کی نسوانیت کے وہ تمام مخفی خزانے لوٹ لیے جن پر ایک عورت کو ناز ہو سکتا ہے اور وہ صحیح معنی میں دولت مند کہی جا سکتی ہے۔ ابھی

ایک ہی ماہ گزرا تھا کہ میں نے محسوس کر لیا کہ وہ حاملہ ہو چکی ہے۔ جہاں میرے نفس اور ضمیر میں جنگ چھڑ گئی کہ وعدہ نکاح پورا کرنا چاہیے یا نہیں، میرے ضمیر کی شرافت یہ کہہ رہی تھی کہ زبان ہار جانے کے بعد غداری بدترین لعنت ہے۔ اور میرے نفس کی خباثت اس پر تلی ہوئی تھی کہ اس کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جانا چاہیے، آخر کار میرا بے وفا نفس دل کی آواز پر غالب آ گیا۔ اور میں اُس کو چھوڑ کر وہاں چلا گیا۔ جہاں تم مجھ سے ملا کرتے تھے۔ ایک طویل مدت تک مجھے اس دوشیزہ کی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن ڈاکیا مجھے یہ خط دے گیا۔ جمیل نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک زرد رنگ کا میلا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

---

## خط

........" اگر میں اس خیال سے تم کو خط لکھنا چاہتی کہ ٹوٹے ہوئے عہد اور گزری ہوئی محبت کی تجدید کروں تو ہرگز ایک سطر ایک لفظ ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتی تھی۔ اس لئے کہ میں تمہارے جیسے پیماں شکن اور وفا ناشناس انسان کے عہد و پیمان، اور تم جیسے بوالہوس اور بندۂ نفس کی جھوٹی محبت کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ اس کا تذکرہ کیا جائے یہ چہ جائیکہ اس کی تجدید و توثیق کی خواہش، یا اس پر حسرت و افسوس کا اظہار ہو ——— تم جانتے ہو کہ جس وقت مجھے چھوڑ کر تم چلتے ہوئے میرے پہلو میں ایک آگ تھی جو سُلگ رہی تھی، اور ایک بچہ تھا جو تڑپ رہا تھا۔ لیکن تم نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور منہ چھپا کر بھاگ گئے۔ آہ تمہارے دل نے اتنی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ کہ میری بدبختی پر ایک سرسری نظر ڈال دیتے حالانکہ اس بدبختی کا باعث تمہیں تھے، اور تمہارے ہاتھوں نے اتنی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ سکیں حالانکہ اس اشک مسلسل کا دریا تمہارے ہی ہاتھوں رواں ہوا تھا۔ پھر میں کیسے سمجھوں کہ تم شریف آدمی ہو۔ بلکہ میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہو رہی ہوں کہ تم انسان نما حیوان ہو جس میں دنیا بھر کی خباثت، درندگی اور بہیمیت کا اجتماع ہے۔ اور تم حیوانیت مطلق کے مظہر تم ہو ——— تم اپنے دعویٰ محبت میں جھوٹے تھے، میری سادگی سے تم نے ناجائز و ناروا فائدہ اُٹھایا۔ تم صرف اپنے خبیث نفس کے پجاری تھے، اور صرف ہوس رانی کے لئے تم نے ایک معصوم، پاک باز اور کمزور ہستی کو لوٹا، بگاڑا اور تباہ کیا تمہاری مثال اس رہزن کی ہے جو رہبر بن کر لوٹتا ہے اور اس لیڈر کی سی ہے جو بھولی بھالی قوم کو بہکا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتا ہے۔ اگر تم بندۂ ہوس نہ ہوتے تو کبھی میرا چہرہ بھی نہ دیکھتے ——— تم نے خیانت کی اور نکاح کا سبز باغ دکھا کر دھوکا دیا۔ شاید تمہارے نفس نے مجھ جیسی مجرم عورت سے نکاح کرنا پسند نہ کیا۔ لیکن سوچو کہ میں مجرم کس کی وجہ سے بنی۔ کیا یہ جرم تمہارا نہ تھا؟ واللہ اگر تم نہ ہوتے تو میں کبھی مجرم نہ بنتی۔ میں نے اپنے بچانے کی ساری کوششیں صرف کر دی تھیں لیکن میں کب تک کوشش کرتی۔ عورت تھی، کمزور تھی۔ اور ناتجربہ کار، آخر بے قابو ہو گئی۔ جس طرح چھوٹا بچہ جابر و ظالم ڈاکوؤں کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔ آہ تم نے میری عصمت و عفت برباد کر دی۔ میں ذلیل ہو گئی۔ میرا دل طرح طرح کی مصیبتوں میں گھر گیا۔ میری عاصیانہ زندگی کا ایک ایک دن پہاڑ ہو گیا۔ اور موت کوسوں دور نظر آنے لگی۔ اس عورت کی بدقسمتی میں کیا شب

ہو سکتا ہے جو نہ کسی کی بی بی بن سکتی ہو، نہ ماں، آہ میں کسی کے سامنے سر اُٹھانے کے قابل بھی نہ رہی، ہر وقت میری گردن جھکی رہتی ہے دل جلتا، جگر پگھلتا ہے اور سینے میں آگ لگی رہتی ہے۔ لوگوں کے خوف اور اپنی رسوائی کے ڈر سے بستر پر تنہا بالکل تنہا سسکتی رہتی ہوں ذرا تنہائی میں سوچنا تو سہی۔ یہ مصیبتیں کس کی لائی ہوئی ہیں؟ تم نے میری راحت چھین لی، کیونکہ اس حادثے کے بعد میں روپوش ہونے پر مجبور ہو گئی۔ مجھے اپنے بہترین محل، دولت مند اور ناز برداروالدین راحت و آسائش کے تمام سامانوں کو بادل ناخواستہ الوداع کہنی پڑی۔ اپنی زندگی کے بقیہ دن کاٹنے کے لیے ایک ایسی گلی میں چلی آئی جس کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ تنگ و تاریک کوٹھری میں نت نئی مصیبتوں کے ساتھ بقیہ ایام حیات گزار رہی ہوں۔ آہ مجھے یہ بھی خبر مل گئی کہ میرے مہربان والدین کو میرے غم فراق نے ہلاک کر دیا۔ ذرا دل پر ہاتھ تو رکھو کر اس قتل کا ذمہ دار کون ہے؟ — تم نے مجھے بھی مار ڈالا اس لیے کہ شراب زندگی کے یہ تلخ گھونٹ جو تم نے اپنے ہاتھوں سے مجھے پلائے ہیں، اور عرصہ حیات کے یہ طویل آلام جو تم نے دعوت دے کر مجھ پر مسلط کرائے ہیں۔ وہ اپنی آخری حد تک پہونچ چکے ہیں۔ میں بستر مرگ پر دراز ہوں، اور میری مثال اس جلے ہوئے فتیلے کی ہے جو چند منٹ میں خاکستر ہو جائیگا۔ اللہ نے میری دعا قبول کرلی ہے۔ چند ساعتوں کی مہمان ہوں اور تھوڑی دیر میں اپنی تمام خون شدہ آرزوؤں کے ساتھ ختم ہو جاؤنگی۔ —— میرے قاتل جمیل میں نے تم کو یہ خط اس لیے نہیں لکھا ہے کہ تجدید محبت کروں۔ یا اپنے حال پر متوجہ کروں، ارے اب میرا کیا؟ چراغ سحری ہوں تھوڑی دیر میں ہمیشہ کے لئے گل ہو جاؤں گی۔

میں نے یہ خط اس لیے لکھا ہے کہ اپنی امانت لے جاؤ، تمہاری بیٹی دس سال کی ہو چکی ہے۔ زندگی بھر میں اس کی ناز برداری کرتی رہی۔ اب اس کی بدنصیب ماں مر رہی ہے۔ دنیا میں تمہارے سوا اس کا کوئی پرسان نہیں، اگر میری محبت تمہارے دل میں نہ رہی تو کوئی شکایت نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کم از کم تمہارا دل شفقت پدری سے خالی نہ ہوگا۔ آؤ اور اپنی لخت جگر کو لے جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی اپنی ماں کی طرح بدبختی کا شکار ہو جائے۔ اچھا رخصت!

میں نے خط تمام بھی نہ کیا تھا کہ جمیل کو دیکھا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو رخسار پر بہہ رہے تھے۔ خط پڑھ چکنے کے بعد میں نے پوچھا میرے دوست پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ جمیل نے کہا، کہ خط پڑھتے پڑھتے میرے بدن میں کپکپی پیدا ہوگئی اور غم و اندوہ سے میرا کلیجا پھٹنے لگا۔ میں دوڑا ہوا اس بدنصیب عورت کی منزل پر پہونچا (اور یہ وہی مکان ہے جس میں اس وقت مجھے دیکھ رہے ہو) دیکھا کہ اسی پلنگ پر وہ پڑی ہے اور روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ یہ لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی ہے اور تلخ ترین رونا رو رہی ہے۔ یہ منظر دیکھکر میں نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوگیا۔ غشی کی حالت میں مجھے نظر آیا کہ میرے جرائم سینما کی تصویروں کی طرح خوفناک شکلوں میں مبدل ہوکر میرے سامنے کھڑے ہیں۔ بہت سے ہیبت ناک شیر ہیں جن میں سے کوئی تو مجھ پر دانت تیز کر رہا ہے اور کوئی پنجے تان رہا ہے۔ ہوش آنے کے بعد

میں نے قسم کھائی کہ اب ہمیشہ اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں رہوں گا۔ اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیل کر میں بھی اُسی طرح مروں گا۔ جس طرح وہ بدنصیب عورت مری تھی۔ میرے دوست! اب میری سمجھ میں آیا کہ خدا کی اس ضعیف لیکن نازک مخلوق، عورت کو ستانا کسقدر ہولناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ یہ کہتے کہتے جمیل کی زبان بند ہو گئی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور اپنے بستر پر گر پڑا آہ اس کی روح نکل چکی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے بھی ہوش نہ رہا۔ پھر میں نے اس کے دوستوں اور ملنے والوں کو بلا بھیجا اور سب لوگوں نے مل کر جمیل کو سپرد خاک کر دیا۔ اس دن سے زیادہ نہ تو میں کبھی رویا اور نہ وہ لڑکی۔ +

خدا جانتا ہے کہ میں یہ داستان غم لکھ رہا ہوں اور رو رہا ہوں۔ میں عمر بھر جمیل کا وہ جملہ کبھی نہ بھولوں گا۔ جو مرنے کے وقت اس کی زبان سے نکلا تھا (ابنتی یا صدیقی) "میری بچی، اے میرے دوست"

تمثیل :-

# سکون

مصنفہ موریس میٹرلنک
مترجمہ آرزو جلیلی

## افراد تمثیل

باغ میں
بوڑھا آدمی
اجنبی
مارتھا } بوڑھے کی پوتیاں
میری }
ایک کسان
لوگوں کا مجمع

مکان میں
باپ }
ماں }
دو لڑکیاں } خاموش ہستیاں
بچہ }

ایک پرانا باغ جس میں شاہ بلوط کے درخت نصب ہیں۔ اس کے پیچھے ایک مکان جس کی منزل کے تین دریچے روشن ہیں۔ ان دریچوں سے ایک خاندان کے افراد صاف نظر آ رہے ہیں۔ جو لیمپ کے گرد بیٹھے ہیں باپ آتش دان کے قریب بیٹھا ہے۔ ماں بازو کو میز پر ٹیکے ہوئی، فضا پر اپنی نظریں جمائے ہے۔ دو کم سن لڑکیاں سفید لباس پہنے، بیٹھی ہوئی کشیدہ کاڑھ رہی ہیں۔ کمرے کی پرسکون فضا میں، وہ محو خیال ہیں اور مسکرا رہی ہیں۔ ایک بچہ اس طرح سویا ہوا ہے کہ اس کا سر ماں کے بائیں بازو پر ہے۔ جب ان میں سے کوئی اٹھتا، چلتا، یا اشارہ کرتا ہے۔ تو یہ حرکت سنجیدہ اور شکست معلوم ہوتی ہے۔ گویا فاصلے یا دریچے کے شفاف شیشوں کی وجہ سے اس حرکت میں روحانیت پیدا ہو گئی ہو۔

(بوڑھا آدمی اور اجنبی باغ میں ہوشیاری سے داخل ہوتے ہیں)

**بوڑھا آدمی۔** ہم لوگ باغ کے اس حصے میں ہیں جو مکان کے پیچھے ہے۔ وہ کبھی یہاں نہیں آتے ہیں دروازے دوسری طرف ہیں۔ جو بند ہیں اور دریچے بھی بند ہیں۔ اگر مکان کے اس طرف دریچے نہیں ہیں اور میں نے روشنی دیکھی ...... ہاں وہ اب تک لیمپ کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ یہ اچھا ہے۔

کہ انھوں نے ہماری آواز نہیں سُنی۔ ماں یا لڑکیاں اگر باہر آگئی ہوتیں۔ تو ہم کیا کرتے۔؟

**اجنبی۔** اب ہم کیا کریں گے۔؟

**بوڑھا آدمی۔** پہلے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ سب مکان کے اندر ہیں یا نہیں۔ ہاں میں باپ کو آتش دان کے قریب بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ وہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ اس کے گھٹنے پر پڑے ہوئے ہیں۔ ماں اپنے بازو میز پر ٹیکے ہوئے ہے۔

**اجنبی۔** وہ ہمیں دیکھ رہی ہے۔

**بوڑھا آدمی۔** نہیں وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ رہی ہے اس کی آنکھیں جامد ہیں۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتی۔ ہم بڑے بڑے درختوں کے سائے میں ہیں۔ لیکن قریب جاؤ اور پھر مردہ لڑکی کی دو بہنیں بھی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ کشیدہ کاڑھ رہی ہیں۔ اور ننھا بچہ سو گیا ہے۔ گوشے میں جو گھڑی ہے اس میں نو بج گئے ہیں ......

انھیں اس کا وہم بھی نہیں کہ بُری خبر آنے والی ہے اور وہ بالکل خاموش ہیں۔

**اجنبی۔** اگر ہم باپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کریں۔ اور اس کو اشارہ کریں؟ اس نے اپنا سر اس طرف پھیرا ہے۔ میں کسی دریچے پر دستک دوں؟ ان میں سے کسی ایک کو اوروں کے پہلے یہ خبر سننی ہی پڑے گی۔

**بوڑھا آدمی۔** میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں کسے انتخاب کروں۔ ہمیں بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔ باپ بوڑھا اور مریض ہے۔ ماں بھی۔ اور بہنیں بہت کم سن ہیں اور سب اس سے ایسی محبت کرتے تھے جیسی محبت وہ پھر کبھی نہیں کر سکیں گے ......

میں نے اس سے زیادہ خوش و خرم گھرانا نہیں دیکھا۔ ... نہیں نہیں دریچے کے قریب نہ جاؤ۔ اس سے زیادہ بُرا کام ہم نہیں کر سکتے۔ بہتر ہے کہ ان کو ہم یہ خبر بہت سنجیدگی سے سنائیں۔ اس طرح کہ گویا یہ ایک معمولی واقعہ ہے۔ اور ہمیں بہت غمگیں نہیں نظر آنا چاہیے۔ ورنہ انھیں احساس ہوگا۔ کہ ان کے غم کو ہمارے غم سے بڑھ کر ہونا چاہیے۔ اور پھر وہ نہیں سمجھ سکیں گے کہ وہ کیا کریں ......... چلو ہم باغ کی دوسری طرف چلیں۔ ہم دروازے پر دستک دیں گے۔ اور اس طرح اندر چلے جائیں گے کہ گویا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

پہلے میں اندر جاؤں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر متعجب نہیں ہوں گے۔ میں اکثر شام کو ان کو دیکھنے جایا کرتا ہوں۔ کبھی پھول اور پھل لیکر اور کبھی ایک دو گھنٹا اُن کے ساتھ گزارنے کے لے۔

**اجنبی** تم مجھے کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ تنہا جاؤ۔ میں اس وقت تک انتظار کروں گا جب تم مجھے پکارو۔ انھوں نے مجھے کبھی نہیں دیکھا ہے میں تو محض ایک راہی۔ ایک اجنبی ہوں۔

**بوڑھا آدمی۔** بہتر ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ ایسی بدقسمتی جس کا اعلان ایک ہی آدمی کرتی ہے۔ بہت زیادہ

نمایاں اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے راستے میں یہ سوچا تھا کہ اگر میں اکیلے اندر جاؤں تو مجھے فوراً ہی بولنا پڑے گا۔ وہ سب کچھ چند الفاظ میں سمجھ جائیں گے۔ پھر میرے کہنے کے لئے کوئی بات باقی نہیں رہے گی۔ اور میں اس خاموشی سے گھبراتا ہوں جو اُن آخری الفاظ کے بعد طاری ہوتی ہے۔ جو کسی مصیبت کا اعلان کرتے ہیں۔ اس وقت کلیجا پھٹنے لگتا ہے۔ اگر ہم دونوں ساتھ جائیں تو میں پیچیدہ طریقے سے کام شروع کروں گا۔ مثلاً میں اُن سے کہوں گا۔ "لوگوں نے اُسے ایسے پایا۔ ویسے پایا۔ وہ چشمے کے دھارے پر بہہ رہی تھی۔ اور اُس کے ہاتھ یوں بٹے ہوئے تھے:

**اجنبی۔** اس کے ہاتھ لپٹے ہوئے نہیں تھے۔ اُس کے بازو اُس کے دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔

**بوڑھا آدمی۔** دیکھو! باوجود کوشش کے ہم گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ اور اصل مصیبت کی طرف سے دھیان ہٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر میں تنہا اندر جاؤں تو میں اُن سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ہی الفاظ کا بڑا خوفناک اثر ہوگا۔ اور پھر خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہوگا۔ لیکن اگر ہم باری باری اُن سے بولیں تو وہ ہماری باتیں سنیں گے۔ اور خبر سے مقابل ہونا بھول جائیں گے۔ یہ نہ بھول جاؤ کہ وہاں پر ماں بھی ہوگی۔ اور یہ کہ اُس کی زندگی محض ایک دھاگے سے لٹک رہی ہے۔ بہتر ہے کہ غم کی

پہلی موج اپنی طاقت غیر ضروری الفاظ پر صرف کرے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ بدنصیبوں کے گرد لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق جمع ہونے دیا جائے۔ بہت سے غیر متعلق لوگ بھی غم کے کچھ حصے کو بغیر محسوس کیے ہوئے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ بغیر کوشش۔ بغیر شور وغوغا کے روشنی یا ہوا کی طرح غم دور ختم ہو جاتا ہے۔

**اجنبی۔** تمہارے کپڑے بھیگے ہوئے ہیں اور پتھر پر اُن میں سے پانی ٹپک رہا ہے۔

**بوڑھا آدمی۔** صرف میرے لبادے کا دامن پانی سے بھیگ گیا تھا۔ تمہیں سردی محسوس ہو رہی ہوگی۔ تمہارا کوٹ کیچڑ سے لت پت ہے۔ اس قدر اندھیرا تھا کہ میں راستہ میں غور نہیں کر سکا تھا۔

**اجنبی۔** میں اپنی کمر تک پانی میں گیا تھا۔

**بوڑھا آدمی۔** میرے آنے کے بہت پہلے ہی تم اُس کو نکال چکے تھے؟

**اجنبی۔** میں نے اُس کو تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے نکالا تھا۔ میں دیہات کی طرف جا رہا تھا۔ اپنی نظریں دریا پر جمائے چلا جا رہا تھا کیوں کہ سڑک کے مقابلے میں دریا زیادہ روشن تھا۔ اتنے میں میں نے کسی عجیب چیز کو آبی پودوں کے قریب دیکھا......
میں اُس کے نزدیک گیا اور میں نے اُس کے بال دیکھے جو پانی پر بہہ رہے تھے۔ اُس کے سر کے گرد گول حلقہ بنائے ہوئے تھے اور پانی کی روانی کے ساتھ اِدھر اُدھر رُخ بدلتے رہتے تھے۔

(کمرے کے اندر دونوں لڑکیاں اپنے منہ

(دریچے کی طرف پھرتی ہیں)

**بوڑھا آدمی۔** تم نے "اُس" کی دونوں بہنوں کے بال کو اُن کے شانوں پر لہراتے دیکھا؟

**اجنبی۔** اُنھوں نے اپنے سر ادھر پھیرے تھے۔ اُنھوں نے اس طرف صرف اپنے سر پھیرے تھے۔ شاید میں بہت بلند آواز سے بول رہا تھا۔

(دونوں لڑکیاں پھر اُسی طرح بیٹھ جاتی ہیں جیسے وہ پہلے بیٹھی تھیں۔)

وہ پھر اُس طرف پھر گئی۔ میں۔ میں کمر بھر پانی میں گیا اور جب میں نے کسی طرح اُس کا ہاتھ پکڑا اور آسانی سے اُس کو کنارے کھینچ لایا۔ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی اُس کی بہنیں۔

**بوڑھا آدمی۔** میرا خیال ہے کہ وہ اُن سے زیادہ خوبصورت تھی ....... میں نہیں جانتا کہ میں نے کیوں ہمت ہار دی .......

**اجنبی۔** "ہمت" سے تمہارا کیا مطلب؟ ہم نے سب کچھ کیا۔ جو انسان کر سکتا تھا۔ وہ ایک گھنٹے کے پہلے ہی مر چکی تھی .......

**بوڑھا آدمی۔** آج صبح وہ زندہ تھی۔ میں نے گرجا سے باہر آتے وقت اُس سے ملاقات کی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں جا رہی ہوں۔ اپنی دادی اماں کو دیکھنے دریا کے اُس پار جا رہی تھی۔ جس دریا کے کنارے تم نے اُسے پایا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اُسے پھر کب دیکھ سکوں گا...... وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اور یکایک وہ مجھ سے جدا ہو گئی۔ مگر اب میں غور کرتا ہوں اور میں نے اُس وقت نہیں غور کیا تھا۔ کہ وہ اس طرح مسکرائی تھی جس طرح وہ لوگ مسکراتے ہیں جو خاموش رہنا چاہتے ہیں یا وہ لوگ جو ڈرتے ہیں کہ کوئی ان کی بات نہیں سمجھے گا...... امید بھی اُسے تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پوشیدہ تھیں۔ وہ شاذ و نادر ہی میری طرف دیکھتی تھی۔

**اجنبی۔** بعض کسانوں نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے اُسے سہ پہر کے وقت دریا کے کنارے سرگرداں دیکھا تھا۔ اُنھوں نے سمجھا کہ وہ پھولوں کی تلاش میں تھی...... ممکن ہے کہ اس کی موت ........

**بوڑھا آدمی۔** کوئی کہہ نہیں سکتا ..... کوئی جان ہی کیا سکتا ہے؟

وہ غالباً اُن لوگوں میں سے تھی۔ جو گفتگو کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہر شخص کے سینے میں اپنے زندہ رہنے کی ایک سے زیادہ دلیلیں پوشیدہ رہتی ہیں......

تم روح کی گہرائیوں کو اُس طرح نہیں دیکھ سکتے جس طرح تم اس کمرے کے اندر کی چیزوں کو دیکھ سکتے ہو۔ وہ سب یکساں ہیں۔ وہ صرف معمولی باتیں کرتے ہیں۔ اور کوئی خواب بھی نہیں دیکھتا کہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہوا ہے۔ تم مہینوں تک ایسے شخص کے ساتھ رہتے ہو جسے اب دنیا سے تعلق نہیں باقی رہا۔ اور جس کی روح اس طرف مائل نہیں ہو سکتی۔ تم اُس کو بغیر سوچے ہوئے جواب دیتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کیا ہوتا ہے۔

وہ بے جان ڈھانچوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں اور ان
کی روحوں میں بہت سے خیالات گزرتے رہتے ہیں۔
وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں؟ وہ اُسی طرح
رہ سکتی تھی۔ جس طرح دوسرے رہتے ہیں وہ اپنے
موت کے دن کہہ سکتی تھی "آج صبح پانی برسے گا"
یا ہم کھانا کھانے جا رہے ہیں۔ میز پر تیرہ آدمی
ہوں گے" یا "ابھی پھل نہیں پکا ہے" وہ مسکرا کر
ان پھولوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں جو مرجھا
چکے ہیں۔ اور اندھیرے میں روتے ہیں۔ آسمانی فرشتہ
بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ جو دیکھا جا سکتا تھا۔ اور انسان
کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ جب تک معاملہ ہی ظاہر ہو جائے
...... کل شام کے وقت وہ روشنی میں اپنی
بہنوں کی طرح بیٹھی تھی۔ اور تم ان بہنوں کو اس طرح
نہ دیکھ سکتے اگر یہ واقعہ نہ ہوا ہوتا ........
میں تو گویا اُسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں ...... قبل
اس کے ہم اس کو سمجھ سکیں ہماری معمولی زندگی میں
کوئی نیا واقعہ ہونا چاہیے۔ وہ دن رات تمہارے
ساتھ رہتے ہیں اور تم انھیں حقیقت میں اُس وقت
تک نہیں دیکھ سکتے جب تک کہ وہ اس دنیا کو
ہمیشہ کے لیے الوداع نہ کہہ دیں۔ پھر بھی اُس کی
کیسی ننھی اور عجیب وغریب روح ہوگی۔
کیسی ننھی، بے لوث اور گہری روح جو کچھ کہہ سکتی
ہوگی۔ جو اُس نے کہا ہوگا اور جو کچھ کر سکی ہوگی۔
جو اُس نے کیا ہوگا۔

**اجنبی۔** دیکھو وہ کمرے کی خاموشی میں مسکرا رہے ہیں.....

**بوڑھا آدمی۔** وہ مطلقاً پریشان نہیں ہیں۔ وہ آج
اُس کی واپسی کے منتظر نہیں ہیں ......

**اجنبی۔** وہ بے حس و حرکت بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ مگر
دیکھو باپ اپنی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتا ہے....

**بوڑھا آدمی۔** وہ اُس بچے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔
جو اپنی ماں کے سینے پر سویا ہوا ہے۔

**بوڑھا آدمی۔** وہ اب کپڑے نہیں سی رہی ہیں۔ گہری
خاموشی ہے ........

**اجنبی۔** انھوں نے سفید ریشم کے رومال کو گرا
دیا ہے۔

**بوڑھا آدمی۔** وہ بچے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

**اجنبی۔** وہ نہیں جانتے کہ دوسرے انھیں دیکھ
رہے ہیں۔

**بوڑھا آدمی۔** ہم پر بھی اُن کی نگاہ ہے۔

**اجنبی۔** انھوں نے اپنی نظروں کا رخ اوپر کی طرف
کیا ہے۔

**بوڑھا آدمی۔** پھر بھی وہ نہیں دیکھ سکتے ہیں۔

**اجنبی۔** وہ بظاہر خوش نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی کوئی
بات ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا۔

**بوڑھا آدمی۔** وہ اپنے کو خطرے کی زد سے باہر سمجھتے
انھوں نے دروازے بند کر لیے ہیں۔ اور جنگلوں
میں لوہے کی چھڑیں ہیں۔ انھوں نے پرانے مکان
کی دیواروں کی مرمت کرالی ہے۔ اور شاہ
بلوط کے تینوں دروازوں میں کنڈیاں ٹھکوا دی ہیں
انھوں نے ہر اُس ہونے والی بات کو محسوس کر لیا ہے۔

جو محسوس کی جا سکتی ہے۔

**اجنبی**۔ ابھی یا تھوڑی دیر کے بعد ہم اُن سے ضرور کہہ دیں گے۔ شاید کوئی آجائے اور یکایک کہہ دے۔ جس وقت ہم اُس مردہ لڑکی کے پاس سے چلے تھے تو وہاں پر کسانوں کا مجمع تھا۔ اگر اُن میں سے کوئی آئے اور دروازے پر دستک دے ........

**بوڑھا آدمی**۔ مارتھا۔ اور میری لاش کی حفاظت کر رہی ہیں۔ کسان درختوں کی شاخوں سے ایک پلنگ تیار کر رہے تھے۔ اور میں نے اپنی بڑی پوتی سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ روانہ ہوں تو وہ جلدی سے آکر مجھے خبر کر دے۔ اُس کے آنے تک انتظار کرو۔ وہ میرے ساتھ جائے گی! کاش ہم ان لوگوں کو اس طریقہ سے نہ دیکھ سکے ہوتے! میں نے سمجھا تھا کہ دروازے پر دستک دینے۔ سادگی سے مکان کے اندر داخل ہو جانے اور چند فقروں میں انھیں کہہ دینے کے سوا اور بات ہی کیا ہے؟ .......

مگر میں بہت دیر سے اُنھیں دیکھ رہا ہوں۔ لیمپ کی روشنی میں وہ ........

(میری داخل ہوتی ہے)

**میری**۔ وہ آرہے ہیں۔ دادا جان۔

**بوڑھا آدمی**۔ تم ہو! وہ کہاں ہیں؟

**میری**۔ وہ آخری سڑک کے کنارے ہیں۔

**بوڑھا آدمی**۔ وہ چپ چاپ آرہے ہیں۔

**میری**۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ وہ دھیمی آواز میں کلام کریں۔ مارتھا اُن لوگوں کے ساتھ ہے۔

**بوڑھا آدمی**۔ بہت لوگ ہیں، کیا؟

**میری**۔ ساری بستی کے لوگ جنازے کے پاس ہیں۔ وہ شعلیں لے کر آئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ شعلیں گل کر دیں۔

**بوڑھا آدمی**۔ وہ کس راستے سے آرہے ہیں؟

**میری**۔ وہ چھوٹے راستوں سے آرہے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں۔

**بوڑھا آدمی**۔ اب وقت ہو گیا کہ ....

**میری**۔ آپ نے اُن سے کہہ دیا، دادا جان؟

**بوڑھا آدمی**۔ تمھیں سمجھنا چاہیے کہ ہم نے ان سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ وہ ابھی تک لیمپ کی روشنی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیکھو میری بچی دیکھو! تم دیکھو گی کہ زندگی کیا چیز ہے۔

**میری**۔ آہ! وہ کس قدر مطمئن نظر آتے ہیں! مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں انھیں خواب میں دیکھ رہی ہوں۔

**اجنبی**۔ دیکھو! میں نے دونوں بہنوں کو چونکتے ہوئے دیکھا۔

**بوڑھا آدمی**۔ وہ اُٹھ رہی ہیں ....

**اجنبی**۔ میرا خیال ہے کہ وہ دریچوں کے قریب آرہی ہیں۔

(اس وقت ایک بہن پہلے دریچے کے پاس اور دوسری بہن تیسرے دریچے کے پاس جاتی ہے۔ اپنے ہاتھوں کو شیشوں پر رکھ کر وہ تاریکی پر نظریں جما دیتی ہیں۔)

**بوڑھا آدمی**۔ درمیانی دریچے کے قریب کوئی نہیں آتی ہے۔

**میری**۔ وہ باہر کی طرف دیکھ رہی ہیں، وہ کچھ سُن رہی ہیں۔

**بوڑھا آدمی۔** بڑی بہن کچھ نہیں دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔

**اجنبی۔** دوسری بہن کی آنکھوں سے خوف نمایاں ہے۔

**بوڑھا آدمی۔** ہوشیار رہو کون جانتا ہے کہ انسان کے اردگرد کتنی دور تک روح حلقہ کئے ہوئے ہے

(طویل خاموشی۔ میری۔ بوڑھے کے سینے سے چمٹ جاتی ہے اور اس کا بوسہ لیتی ہے)

**میری۔** دادا جان۔

**بوڑھا آدمی۔** آنسو نہ بہاؤ، میری بچی۔ ہماری باری بھی آئے گی۔

(وقفہ)

**اجنبی۔** وہ نظریں جمائے ہوئے ہیں ........

**بوڑھا آدمی۔** غریب ہستیاں! وہ کچھ بھی نہیں دیکھیں گی اگر وہ سو ہزار سال تک بھی دیکھتی رہیں۔ رات بہت اندھیری ہے۔ وہ ادھر دیکھ رہی ہیں اور مصیبت اُدھر سے آ رہی ہے۔

**اجنبی۔** یہ اچھا ہے کہ وہ اس طرف دیکھ رہی ہیں۔ کوئی چیز ہے جسے میں پہچانتا نہیں۔ میدان کی طرف سے ادھر آ رہی ہے۔

**میری۔** یہ لوگوں کا مجمع ہے۔ وہ سب بہت دور ہیں۔ اس لئے ہم انہیں صاف نہیں دیکھ سکتے۔

**اجنبی۔** وہ راستے کے پیچ و خم پر قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔ چاندنی میں پھر وہ نظر کے سامنے آگئے۔

**میری۔** وہ کتنی کثیر تعداد میں نظر آ رہے ہیں۔ جب میں آ رہی تھی اُسی وقت شہر کے اطراف و جوانب سے لوگ آ رہے تھے ...... وہ بہت پر پیچ راستے سے آ رہے ہیں۔

**بوڑھا آدمی۔** پھر بھی آخرکار وہ پہنچ ہی جائیں گے۔۔ میں بھی انہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ میدان سے گزر رہے ہیں۔ وہ اسقدر چھوٹے نظر آتے ہیں کہ سبزہ زار میں اور اُن میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ تم یہ تصور کر سکتی ہو کہ وہ بچے ہیں جو چاندنی رات میں کھیل رہے ہیں۔ اگر وہ لڑکیاں انہیں دیکھیں تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھیں۔ جہاں تک اُن کا جی چاہے وہ بے خبر رہیں۔ مگر مصیبت قدم بہ قدم قریب آ رہی ہے۔ اور گزشتہ دو گھنٹوں میں بڑھتی ہی گئی ہے۔ وہ اسے ٹھہرنے کا حکم نہیں دے سکتیں۔ اور جو اُسے لا رہے ہیں۔ اُس کو روکنے سے قاصر ہیں۔ مصیبت نے اُن پر بھی قابو پا لیا ہے۔ اور اب انھیں اُس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ وہ اپنی منزل سے واقف ہے۔ اور اُسی طرف گامزن ہے مصیبت آن تھک ہے اور اُس کا ایک ہی مقصد ہے انھیں اپنی پوری طاقت سے اُس کی مدد کرنی ہوگی۔ وہ مغموم ہیں مگر وہ قریب تر آ رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں رحم ہے۔ مگر انھیں مجبوراً آگے بڑھنا ہی پڑتا ہے۔

**میری۔** بڑی بہن نے اب مسکرانا ختم کر دیا ہے۔ دادا جان!

**اجنبی۔** وہ دریچے کے پاس سے ہٹ رہی ہے۔

**میری۔** وہ اپنی ماں کے بوسے لے رہی ہے۔

**اجنبی۔** بڑی بہن بچے کے بالوں پر بغیر اس کو جگائے

ہاتھ پھیر رہی ہے۔

**میری** ۔ آہ! باپ بھی چاہتا ہے کہ وہ اس کا بوسہ لیں۔

**اجنبی** ۔ اب خاموشی ہے ..........

**میری** ۔ وہ اپنی ماں کے پہلو میں واپس آگئی ہیں۔

**اجنبی** ۔ اور باپ اپنی نظریں گھڑی کے رقاص پر جمائے ہوئے ہے۔

**میری** ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغیر سمجھے ہوئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ عبادت میں مشغول ہیں۔

**اجنبی** ۔ غالباً وہ اپنی روحوں سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

(وقفہ)

**میری** ۔ ان سے آج رات کو نہ کہیے دادا جان!

**بوڑھا آدمی** ۔ دیکھو اب تم بھی ہمت ہار رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ تمہیں اُن کی طرف نہ دیکھنا چاہیے تھا۔ میرا سن تراسی سال کا ہے۔ مگر یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے زندگی کی حقیقت کو سمجھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں مجھے عجیب و غریب کیوں معلوم ہوتا ہے۔ وہ روشنی میں بیٹھے ہوئے کس سادگی سے رات کا انتظار کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم اپنے گردوں کے اندر انتظار کرتے ہیں۔ اور پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اُنھیں دوسری دنیا کی بلندی سے دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میں ایک بات جانتا ہوں جو وہ ابتک نہیں جانتے ہیں۔ میرا خیال صحیح ہے میری بچی؟۔ بتاؤ کہ تم بھی اسقدر زرد کیوں ہو گئیں؟ شاید کوئی بات ایسی ہے جسے ہم الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتے اور جو ہمیں رُلا دیتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ زندگی میں کوئی چیز اس قدر غم آفریں بھی ہوتی ہے۔ یا یہ کہ وہ اُن لوگوں کو خوف زدہ کر سکتی ہے۔ جو اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر کچھ نہ بھی ہوا تھا۔ جب بھی میں انھیں اسقدر سکون کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ کر ڈر جاتا۔ انھیں اس دنیا پر بہت زیادہ بھروسا ہے۔ وہ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے اور دشمن کے درمیان صرف شیشے کے پردے حائل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ چونکہ انھوں نے دروازے بند کرلئے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے روح کے اندر ہوتا ہے۔ اور اُن کے دروازے پر ہی دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہیں اور وہ خواب میں بھی نہیں دیکھتے کہ بہت سے دوسرے لوگ زندگی سے اُن کی بہ نسبت زیادہ واقف ہیں۔ اور یہ کہ میں غریب بوڑھا آدمی ۔ اُن کے دروازے سے دو قدم پر کھڑا اُن کی خوشی کو اپنے ضعیف ہاتھوں کی ہتھیلی میں ایک مجروح چڑیا کی طرح دبائے ہوئے ہوں اور اپنی مٹھیوں کو کھولنے کی ہمت نہیں کر سکتا ......

**میری** ۔ اُن پر رحم کیجیے، دادا جان!

**بوڑھا آدمی** ۔ ہم اُن پر رحم کرتے ہیں، میری بچی۔ مگر ہم پر کوئی رحم نہیں کرتا۔

**میری** ۔ اُن سے کل کہیے دادا جان! روشنی ہو جانے پر ان سے کہیے گا تو وہ اس قدر مغموم نہ ہوں گے۔

**بوڑھا آدمی۔** میری بچی! غالباً تمہارا خیال صحیح ہے۔ رات بھر اس معاملے کو اسی طرح رہنے دینا بہتر ہوگا۔ دن کی روشنی مصیبت کا تریاق ہے …… مگر وہ کل ہم سے کیا کہیں گے۔؟ بدقسمتی لوگوں کو حاسد بنا دیتی ہے۔ جن پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ اجنبیوں کی موجودگی میں اس کی واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے نامعلوم ہاتھوں میں چھوڑ دینا نہیں چاہتے۔ بظاہر انھیں یہ محسوس ہوگا کہ ہم نے اُن سے کوئی چیز چھین لی ہے۔

**اجنبی۔** اس کے علاوہ اب وقت گذر چکا۔ میں عاؤں کی آواز سن رہا ہوں۔

**میری۔** وہ آ پہنچے۔ وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے گزر رہے ہیں۔

(مارتھا داخل ہوتی ہے)

**مارتھا۔** میں آگئی میں نے یہاں تک اُن کی رہبری کی میں نے اُن سے سڑک پر ٹھہرنے کے لیے کہا۔

(بچوں کا شور و غوغا سنائی دیتا ہے)

آہ بچے ابتک رو رہے ہیں۔ میں نے انھیں منع کر دیا تھا۔ کہ وہ نہ آئیں۔ مگر وہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں اور اُن کی مائیں میرا حکم نہیں مانتیں۔ میں جاؤنگی اور انھیں کہہ دوں گی۔ نہیں۔ اب انھوں نے بیٹھنا چھوڑ دیا ہے۔ سب کچھ تیار ہے؟۔ میں وہ چھوٹی انگوٹھی لیتی آئی ہوں۔ جو اُس کے پاس تھی۔ بچے کے لے پھول بھی لائی ہوں۔ میں نے خود اُسے آرام کرنے کے لے تختے پر لٹایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو رہی ہے۔ اُس کے بالوں نے مجھے بہت پریشان کیا۔ میں انھیں سلجھا نہ سکی۔ میں نے اُن سے مارگریت کے پھول جمع کرنے کے لیے کہا۔ افسوس ہے کہ اور قسم کے پھول نہ مل سکے۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ اُس کے پاس کیوں نہیں ہیں؟ (وہ دریچوں کی طرف دیکھتی ہے) وہ رو نہیں رہے ہیں! وہ …… آپ نے اُن سے نہیں کہا! ۔

**بوڑھا آدمی۔** مارتھا! تمہاری روح زندگی سے معمور ہے تم نہیں سمجھ سکتیں ………

**مارتھا۔** میں کیوں نہیں سمجھ سکتی (وقفے کے بعد سنجیدہ شکایت کے لہجے میں) آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دادا جان۔

**بوڑھا آدمی۔** مارتھا تم نہیں جانتیں ………

**مارتھا۔** میں جاکر ان سے کہہ دوں گی۔

**بوڑھا آدمی۔** تھوڑی دیر کے لیے یہیں پر ٹھہر جاؤ۔ میری بچی۔

**مارتھا۔** آہ مجھے اُن پر کس قدر رحم آتا ہے۔ اب انھیں بے خبر نہیں رکھنا چاہیے۔

**بوڑھا آدمی۔** کیوں نہیں؟

**مارتھا۔** میں نہیں کہہ سکتی کہ کیوں نہیں۔ مگر اب یہ ممکن نہیں!

**بوڑھا آدمی۔** یہاں آؤ میری بچی ……

**مارتھا۔** وہ کس قدر صابر ہیں!

**بوڑھا آدمی۔** یہاں آؤ میری بچی

مارتھا۔ (اُس کی طرف مڑکر) آپ کہاں ہیں دادا جان!
میں بہت افسردہ ہوں۔ میں آپ کو دیکھ نہیں سکتی ہوں
میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

بوڑھا آدمی۔ اُدھر نہ دیکھو جب تک کہ وہ سب کچھ
جان نہ جائیں ......

مارتھا۔ میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں ......

بوڑھا آدمی۔ نہیں مارتھا۔ یہیں پر ٹھہرو۔ اپنی بہن
کے ساتھ ٹھہر کے اس پرانے بنچ پر مکان کی
دیوار سے ٹیک کر بیٹھو۔ اور اُدھر دیکھو نہیں
تم بہت کم سن ہو۔ تم کبھی اس واقعے کو بھول
نہ سکو گی۔ تم نہیں جانتیں کہ انسان کا چہرہ کیسا
ہوتا ہے۔ جب اُس کی آنکھوں میں موت کا
گزر ہوتا ہے۔ شائد وہ بھی رونے لگیں گے ......
اُدھر مڑ کر نہ دیکھو۔ شائد کوئی آواز ہی نہ ہو۔ اگر
کوئی آواز نہ ہو تو اس کا لحاظ رکھو کہ تم اُدھر مڑکر
نہ دیکھو۔ کسی کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی کہ غم کون سا
راستہ اختیار کرے گا۔ روح کی گہرائیوں سے
چند سسکیاں نکلیں گی۔ اور بس۔ میں خود نہیں
جانتا کہ جب میں اُن کی آواز سنوں گا تو کیا
کروں گا۔ وہ اس دنیا کی ہستیاں نہیں ہیں۔ میری
بچی۔ میرے جانے کے قبل میرا بوسہ لے لو۔

(دعا کی آواز بہ تدریج قریب تر آگئی۔
مجمع کا ایک حصہ باغ میں آجاتا ہے۔ کانا پھوسی
اور دبے پاؤں چلنے کی آواز آتی ہے۔)

اجنبی۔ (مجمع سے) یہیں ٹھہرو۔ دریچے کے قریب
نہ جاؤ۔ وہ کہاں ہیں۔

ایک کسان۔ کون؟

اجنبی۔ اور لوگ۔ جنازہ اٹھانے والے۔

کسان۔ وہ اس راستے سے آرہے ہیں۔ جو دروازے تک
گیا ہے۔

(بوڑھا آدمی چلا جاتا ہے۔ مارتھا
اور میری اپنی پیٹھ دریچوں کی طرف کرکے بنچ پر
بیٹھ گئی ہیں۔ مجمع میں کانا پھوسی کی دھیمی آواز
سنائی دیتی ہے)

اجنبی۔ ہش۔ بولو نہیں۔

(کمرے کے اندر دونوں بہنوں میں جو
زیادہ لمبی ہے وہ دروازے تک جاتی ہے اور
کھٹکا لگا دیتی ہے۔)

مارتھا۔ وہ دروازہ کھول رہی ہے۔

اجنبی۔ نہیں بلکہ اسے بند کر رہی ہے۔

(وقفہ)

مارتھا۔ دادا جان کمرے کے اندر داخل نہیں ہوئے ہیں۔

اجنبی۔ نہیں۔ پھر وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہے۔ لوگ
حرکت نہیں کر رہے ہیں۔ اور بچہ ابھی تک
سویا ہوا ہے۔

(وقفہ)

مارتھا۔ میری ننھی بہن۔ ہاتھ میری طرف بڑھاؤ۔

میری۔ مارتھا!

(وہ ایک دوسرے کا پیار کرتی ہیں۔
اور بوسہ لیتی ہیں۔)

**اجنبی۔** اُس نے دستک دے دی ہوگی۔ ان بچوں نے اپنے سر بہ یک وقت اٹھا لئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔

**مارتھا۔** آہ۔ آہ میری ننھی بہن۔ میں بھی مشکل سے گریہ وزاری کو روک سکتی ہوں۔

(وہ اپنی بہن کے شانے پر سر جھکا کر سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہیں۔)

**اجنبی۔** اس نے پھر دستک دی ہوگی۔ باپ گھڑی دیکھ رہا ہے۔ وہ اُٹھتا ہے ........

**مارتھا۔** بہن بہن۔ مجھے بھی اندر جانا چاہیے۔ اُنھیں اکیلے چھوڑنا نہیں چاہیے۔

**میری۔** مارتھا۔ مارتھا۔

(مارتھا کو روک لیتی ہے)

**اجنبی۔** باپ دروازے کے قریب ہے۔ وہ کھٹکے کو اُٹھا رہا ہے۔ وہ اُسے ہوشیاری سے کھول رہا ہے۔

**مارتھا۔** اوہ۔ تم نہیں دیکھتے ........

**اجنبی۔** کیا؟

**مارتھا** جنازہ لانے والے ........

**اجنبی۔** اُس نے دروازے کا صرف ایک حصہ کھولا ہے۔ سوائے میدان کے ایک ٹکڑے اور چشمے کے میں اور کچھ نہیں دیکھتا ہوں۔ وہ اپنا ہاتھ دروازے پر رکھتا ہے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے۔ وہ غالباً کہہ رہا ہے "آہ یہ تم ہو" وہ اپنے بازو اٹھاتا ہے۔ وہ پھر ہوشیاری سے دروازہ بند کر دیتا ہے۔ تمہارا دادا کمرے کے اندر داخل ہوگیا ہے۔

(مجمع دریچے کے قریب آگیا ہے)

مارتھا اور میری اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہتی ہیں۔ پھر اُٹھ جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے قریب ... مجمع کے ساتھ دریچے کے قریب جاتی ہیں۔ بوڑھا آدمی کمرے کے اندر آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دونوں بہنیں اُٹھتی ہیں۔ ماں بھی اُٹھتی ہے اور بچے کو ... سے اُس آرام کرسی پر لٹا دیتی ہے جس پر سے وہ اُٹھتی ہے۔ اس طرح کہ باہر سے بچہ کمرے کے بیچ میں سویا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ ماں بوڑھے آدمی سے ملنے کے لئے بڑھتی ہے اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ اُس سے ہاتھ ملا سکے، اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتی ہے۔ ایک لڑکی اس کا لبادہ ... چاہتی ہے۔ اور دوسری اس کو ایک آرام کرسی پیش کرتی ہے۔ مگر بوڑھا آدمی اشارے سے انکار کرتا ہے۔ باپ اظہار تعجب کے ساتھ مسکراتا ہے۔ بوڑھا آدمی دریچوں کی طرف دیکھتا ہے۔)

**اجنبی۔** وہ اُن سے کہنے کی ہمت نہیں کرتا۔ وہ ... طرف دیکھ رہا ہے۔

(مجمع میں دبی آوازیں)

**اجنبی۔** ہش۔

(بوڑھا آدمی دریچے کے باہر ... دیکھ کر جلدی سے اپنا منہ ادھر پھیر لیتا ہے۔ ... لڑکی اب تک اس آرام کرسی پر بیٹھی ...

کرہی ہے۔ وہ آخر کار بیٹھ جاتا ہے اور دایاں ہاتھ چند دفعہ اپنی پیشانی پر رگڑتا ہے)

اجنبی۔ وہ بیٹھ رہا ہے.....

(کمرے کے اندر جو لوگ بیٹھے ہیں۔ وہ بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اس عرصے میں باپ بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آخر کار، بوڑھا آدمی بولتا ہے اور اس کی آواز ان لوگوں کو متوجہ کر دیتی ہے۔ لیکن باپ اس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے۔ بوڑھا آدمی پھر بولنا شروع کرتا ہے۔ اور بہ تدریج سب لوگ احساس خوف سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ یکایک ماں چونکتی ہے اور کھڑی ہو جاتی ہے)

ارتھا۔ اُف! ماں سمجھنے لگی ہے!

(وہ اس طرف سے منہ پھیر لیتی ہے اور اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔ مجمع میں پھر بھنبھناہٹ شروع ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہیں۔ بچے روتے ہیں کہ انھیں اوپر اٹھا لیا جائے تاکہ وہ بھی دیکھ سکیں۔ بہت سی مائیں ایسا ہی کرتی ہیں جیسا کہ بچے چاہتے ہیں۔)

جنبی۔ ہش! اُس نے اُن سے ابھی نہیں کہا ہے....

(ماں بوڑھے آدمی سے بیقراری میں سوالات کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ چند الفاظ اور کہتا ہے۔ تب یکایک سب کے سب اٹھتے ہیں۔ اور اس سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سر کو آہستہ سے ہلا کر اثبات کا اشارہ کرتا ہے۔)

اجنبی۔ اُس نے اُن سے کہہ دیا۔ اُس نے اُن سے یکایک کہہ دیا!

مجمع کی آوازیں۔ اُس نے اُن سے کہہ دیا! اُس نے اُن سے کہہ دیا

اجنبی۔ میں کچھ بھی نہیں سُن رہا ہوں۔

(بوڑھا آدمی بھی اٹھتا ہے اور بغیر اُس طرف دیکھے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو اس کے پیچھے ہے۔ ماں باپ اور دونوں لڑکیاں دروازے کی طرف دوڑتی ہیں۔ دروازہ کھولنے میں باپ کو دقت محسوس ہوتی ہے۔ بوڑھا آدمی ماں کو باہر جانے سے روکنا چاہتا ہے)

مجمع کی آوازیں۔ وہ باہر نکل رہے ہیں! وہ باہر نکل رہے ہیں!

(باغ میں۔ مجمع کے اندر ہل چل۔ سوائے اجنبی کے، جو ور بچوں کے قریب کھڑا رہتا ہے، سب لوگ مکان کی دوسری جانب جاتے ہیں۔ اور نظروں سے اُجھل ہو جاتے ہیں۔ کمرے کے اندر کھلنے والا دروازہ آخر کار بالکل کھل جاتا ہے۔ سب لوگ ایک ساتھ باہر نکل جاتے ہیں۔ سامنے تاروں بھرا آسمان، میدان اور چشمہ دیکھا جا سکتا ہے۔ بچہ جو کمرہ کے بیچ میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ آرام کرسی پر چین سے سوتا رہتا ہے۔ تھوڑا وقفہ)

اجنبی۔ بچہ نہیں جاگا۔!

(وہ بھی چلا جاتا ہے)

---

# نظم

# شکستِ پندار

از پریم پجاری

پھر فصلِ برشگالی
مخمور سی مسرت
ذوقِ نظر کو دعوت
ہر گوشۂ چمن ہے
رنگینیاں فضا میں
دل گدگدا رہا ہے
کافور سی گھٹا ہے
پھولوں کی انجمن میں
جھرلے میں جلوہ فرما
یہ نازشِ تمنا
یا جنبشِ حسیں میں
فطرت نے جبکہ چاہا
انوارِ صبح لا کر
موسیقیِ حزیں میں
جب یہ تمام اجزا
کس کی مجال دیکھے
سیمائے صاف روشن
ماتھے پہ سرخ بندی
جلتے ہیں جو لٹے میں
یہ انکھڑیاں خدایا
آفاق کی نظر میں

ساشاطۂ جہاں ہے
ہر شے پہ چھا رہی ہے
دیتے ہیں سبزہ و گل
قوسِ قزح کا دامن
تحلیل ہو گئی ہیں
یہ رنگ و بو کا عالم
دن اسقدر سہانا
اک گل نیا کھلا ہے
اک حسن کی جوانی
لیتی ہے جبکہ جھونکا
گہوارہ حسن کا ہے
اک معجزہ دکھانا
کچھ بجلیاں ملائیں
شامل کیا تبسم
باہم ہوئے مرکب
اس کو نگاہ بھر کے
سجدہ گہ نظر ہے
گردن میں سبز مالا
اس طرح گوشوارے
کس قہر کی حسیں ہیں
تسخیر ہیں یہ آنکھیں

پھر پیکرِ جمالی
رعنا عروسِ فطرت
عہدِ نیاز و الفت
ہر تختۂ سمن ہے
مخموریاں ہوا میں
آنکھوں میں چھا رہا ہے
نیرنگ سے کسی نے
اک گوشۂ چمن میں
نظارہ سوز جلوہ
اڑتی ہوئی پری کا
پروازِ اولیں میں
اچھی طرح ٹٹولا
پھر بجھتوں میں یکسر
شعریت حسیں میں
تب یہ حسین فتنہ
گر بے خیال دیکھے
سادہ بیاضِ گردوں
وہ زہرۂ فلک سی
جس طرح جھلملائیں
کاجل نہیں لگایا
عشاق کی نظر میں

یہ تیرہ خاکداں ہے
پھر مسکرا رہی ہے
لیتے ہیں سبزہ و گل
صد ماہتاب خرمن
تبدیل ہو گئی ہیں
جام و سبو کا عالم
روئی ہے صبح گویا
جھولا پڑا ہوا ہے
بربانِ لن ترانی
ہوتا ہے اسپہ دھوکا
طیارہ حسن کا ہے
اپنا ہر اک خزانا
رنگینیاں بسائیں
داخل کیا ترنم
ان سے ہوا مرتب
رہ جائے آہ بھر کے
اک خندۂ سحر ہے
گردِ قمر یہ ہالا
وقتِ سحر ستارے
ویسے ہی سرمگیں ہیں
تقدیر ہیں یہ آنکھیں

بس کہ رباعیت کی
جادو ہے نام ان کا
بیتاب ولولوں کے
یا پر فراز سینہ
یا حسنِ سحر نگیں تھا
الفاظ و حرفِ سینہ
یہ ولولہ نہیں ہے
ہلکی سی اک اداسی

تفسیر ہیں یہ آنکھیں
کہتے ہیں موہنی بھی
طوفاں سے بھر گیا ہے
نازِ شباب سمجھو
خواہانِ خود نمائی
شکست و آبگینہ
جو گیت گا رہی ہے
چہرے سے آشکارا

روحِ نسائیت کی
شغل مدام ان کا
شاید اسی سبب سے
نازِ شباب کیسا
بس یہ اٹھان گویا
ایں ہست علم سینہ
غم بھولتا نہیں ہے
ہے دل کی ترجمانی

تصویر ہیں یہ آنکھیں
افسوں بھی رہزنی بھی
سینہ ابھر گیا ہے
رازِ شباب سمجھو
ہے شانِ خود نمائی
گنجینہ در سفینہ
غم کو بھلا رہی ہے
پر درد گداز نغمہ

## نغمہ

بھیگی ہوئی ہوائیں
اک دل نشیں ادا سے
شبہائے تار و تنہا
تم آؤ گے تو کچھ بھی
اللہ کیا کہوں میں
تنہائیوں نے لوٹا
بولا ہے عاجزی سے
اب میں خفا نہیں ہوں

پھریاں سی چل رہی ہیں
کوئل کا کوک اٹھنا
باکار کر رہی ہوں
تم سے نہیں کہوں گی
الفت کی چیرہ دستی
سامانِ دلنوازی
آئینِ خود پسندی
او روٹھ جانے والے

فریاد کی صدائیں
اس نشتریں صدا سے
اک موتیوں کی مالا
یہ ہار ہیں تمہارے
غائب پرست ہوں میں
مدت ہوئی کہ ٹوٹا
اس وقت کوئی دیکھے
آ میں تجھے منا لوں

دل سے نکل رہی ہیں
یاں دل میں ہوک اٹھنا
تیار کر رہی ہوں
گردن میں ڈال دوں گی
غائب ہے خود پرستی
پندار بے نیازی
میری نیاز مندی
آ تو مجھے منا لے

---

## مقالات:۔



# سال وفات آبرو

از قاضی عبدالودود

آبرو کے معاصر اور قریب العصر مصنفین[1] کے لکھے ہوئے شعرائے اُردو کے جو تذکرے اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں، وہ آبرو کے سال وفات کی تعیین سے قاصر ہیں، زیادہ سے زیادہ جو ان تذکروں سے معلوم ہو سکتا ہے یہ ہے کہ آبرو عہد[2] محمد شاہ کے شاعر تھے، اور اس بادشاہ کے زمانۂ حکومت کے ختم ہونے سے قبل ہی سفر آخرت اختیار[3] کر چکے تھے، یہی وجہ تھی کہ اشپرنگر[4] نے آبرو کے سال وفات کی تعیین کی کوشش نہیں کی، اور ان کے زمانۂ حیات کی انتہائی حد مقرر کرنے پر قانع رہا۔ دتاسی[5] کو بھی اس سے زیادہ کامیابی نہ ہو سکی، لیکن ... [illegible] فہرست نگار اور فرانسیسی مورخ کے جو یہاں کمی رہ گئی تھی، وہ ایک انگریز قاموس نگار بیل[6] نے پوری کر دی۔ ۱۱۶۱ اور ۱۱۶۱ھ کو جو اشپرنگر کے نزدیک آبرو کے زمانۂ حیات کی انتہائی حد سے زیادہ نہ تھا، آبرو کا سال وفات

---

[1] یعنی زمانۂ محمد شاہ، واحمد شاہ، وعالمگیر ثانی و شاہ عالم کے مصنفین قلمی کتابوں کے ساتھ اگر کتب خانے کا نام نہ ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ کتب خانۂ مشرقی بانکی پور کی ہیں [2] نکات الشعرا میرص ۹ "غرض مستغنی وقت خود بود کہ عہد محمد شاہ باشد"
[3] گلزار ابراہیم قلمی "بعہد محمد شاہ فردوس آرام گاہ رحلت نمود" [4] فہرست ص ۱۹۶ اشپرنگر نے اپنی فہرست کتب خانۂ شاہان اودھ کے ساتھ ۱۴ تذکروں کا خلاصہ بھی شائع کیا ہے۔ وہ تذکرے حسب ذیل ہیں۔ مخزن نکات قائم، نکات الشعرا میر، تذکرہ گردیزی، تذکرہ شورش، گلزار ابراہیم خلیل، تذکرہ ہندی مصحفی، تذکرہ عشقی، تذکرہ سرور،

قرار دے دیا۔ بیلی کے ماخذوں کا ہمیں صحیح علم نہیں، لیکن اتنا یقینی ہے کہ نکات الشعراء اور ذکر میر کے مطالعے کا اسے اتفاق نہیں ہوا تھا، ورنہ اسے یہ معلوم ہوتا کہ آبرو میر کے دہلی آنے سے قبل وفات پا چکے تھے، اور میر ۱۱۵۵ھ اور ۱۱۵۸ھ کے درمیان دہلی آئے ہیں۔ بیلی کی غلطی پر تو چنداں تعجب نہیں، بخوبی ممکن ہے کہ محض سہواً ۱۱۵۰ھ کے قبل لکھنے کی جگہ ۱۱۶۰ھ لکھ گیا ہو، لیکن حیرت یہ ہے کہ ہمارے عہد کے مصنفین مثلاً نظامی اور بیلی نے بلا تامل بیلی کے قول کو قبول کر لیا، اور اشپرنگر اور بیلی کے بیانات میں جو اختلاف ہے، اس پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ بیلی کے قول کو غلط ثابت کر دینے اور آبرو کے زمانۂ حیات کی آخری حد کو ۱۱۵۵ھ تک پہنچا دینے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس سے آگے بڑھ کر آبرو کے سالِ وفات کی تعیین کر سکتے ہیں یا نہیں، حسنِ اتفاق سے یہ بآسانی ممکن ہے، اور شعرائے اردو کے تذکروں میں جو بات نہ مل سکی تھی وہ شعرائے فارسی کے تذکروں میں مل سکتی ہے۔ ان تذکروں میں سب سے پہلے تذکرۂ خوشگو کا نام لینا چاہیے، اس کا مصنف آبرو کا دوست اور خواجہ تاش تھا، اور اس کا بیان ذاتی علم پر مبنی ہے، ذیل میں ہم بجنسہ آبرو کا ترجمہ تذکرۂ خوشگو سے نقل کرتے ہیں اس سے صحیح تاریخ وفات معلوم ہونے کے علاوہ آبرو کے متعلق اور بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں، خوشگو کے بعد بچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرۂ گل رعنا میں، اور علی ابراہیم نے صحفِ ابراہیم میں آبرو کا سالِ وفات درج کیا ہے، یہ ماننے کی قوی وجہ موجود ہے کہ ان دونوں کا بیان خوشگو سے ماخوذ ہے۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ آبرو کے معاصر اور قریب العہد مصنفین نے شعرائے اردو کے جو تذکرے لکھے ہیں، وہ آبرو کے سالِ وفات کی تعیین نہیں کرتے، اور یہ صحیح بھی ہے، لیکن عہد اکبر ثانی کے

---

گلشن ہند لطف، تذکرۂ عشق میرٹھی، مجموعۂ نغز قاسم، عیار الشعراء کا، گلشن بیخار شیفتہ، گلشن بے خزاں باطن۔

[55] تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی طبع دوم، جلد اول ص ۱۰۰۔ متعدد قدیم تذکرے جن کے حوالے دتاسی نے دیے ہیں ان کے لیے اشپرنگر کا ممنون ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا ماخذ صرف اشپرنگر ہی ہے۔ بہت سی کتابیں، سرکاری رپورٹیں، کتب خانوں کی فہرستیں جو فہرست اشپرنگر کے بعد شائع ہوئی ہیں دتاسی کے پیش نظر تھیں، اور بعض قدیم تذکروں تک بھی جن کے مطالعے سے اشپرنگر محروم رہا تھا، اس کی رسائی تھی، مثلاً مسرت افزا، مجمع الانتخاب اور دیوان جہاں۔

[56] اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری طبع ۱۸۹۴ ص ۱۵۔ [57] نکات الشعراء ص ۹، "می گویند کہ طبع شوخ داشت"۔ اگر میر کو خود آبرو سے ملنے کا موقع ملا ہوتا تو جملے کو "می گویند" سے شروع نہ کرتے، آرزو آبرو کے قریبی رشتہ دار اور استاد تھے، میر صاحب آرزو کے گھر میں مقیم اور ان کی بہن کے سوتیلے بیٹے تھے، اگر آبرو بقید حیات ہوتے تو میر کو ان سے ملنے کا موقع ضرور تھا۔

[58] ذکر میر ص ۹۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امیر الامراء صمصام الدولہ خان دوران کے میدان جنگ میں مقتول ہونے کے بعد دہلی آئے ہیں، صمصام الدولہ نادرشاہ سے لڑتے ہوئے ۱۱۵۱ھ میں مارے گئے ہیں۔ [59] نکات الشعراء ص ۱۰۲ و ۱۰۳ ترجمہ عارف علی خان عاجز "وے دوازدہ سالہ شدہ باشد کہ در شاہجہان آباد تشریف داشت، بندہ شور او شنیدہ بودم"

# دیوانِ جوشش

از: قاضی عبدالودود

مستند تذکروں میں[۱] جوشش تخلص کے دو شاعروں کا ذکر ہے، ایک کا نام محمد روشن لکھا ہے اور دوسرے کا محمد عابد۔ یہ تذکرہ نگاروں کی غلطی ہے، محمد عابد جوشش کے برادر اعیانی کا نام تھا، یہ بھی اچھے شاعر تھے، اور دل تخلص کرتے تھے۔ محمد روشن جوشش کے بعض شعر بھی ارباب تذکرہ نے دل کی طرف منسوب کر دیے ہیں، اور وہ دیوان جوشش میں موجود ہیں۔ کاتب دیوان نے کتاب کے ایک سادہ صفحے میں مصنف کا نام روشن علی بھی لکھا ہے، اس کی سند اس وقت تک تذکرہ حسن کے سوا کسی اور تذکرے میں نہیں ملی، علی ابراہیم خلیل اور محمد وجیہ الدین عشقی نے محمد روشن کے علاوہ کوئی اور نام نہیں بتایا۔ میر حسن نے بھی جوشش کے ترجمے میں محمد روشن ہی نام لکھا ہے، محمد عابد دل کے ترجمے میں ضمناً جوشش کا ذکر آیا ہے تو البتہ ان کا نام میاں روشن علی بتایا ہے۔ دیوان سے مصنف کے حالات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے، ایک قطعہ تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم ۱۲۱۹ھ تک ضرور زندہ تھے، یہ بھی حال کھلتا ہے کہ بہت آسودہ حال نہ تھے اور اہل دول کے سامنے دست طلب دراز کرنے میں انھیں کوئی تامل نہ ہوتا تھا، ایک بار نکاری جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ معاصرین میں ثروت، بسمل اور فدوی (غالباً مفتی غلام مخدوم پھلواروی، رجب علی ساکن پٹنہ، اور محمد علی دہلوی) کے مصرعوں کو غزل کے مقطعوں میں اخذ کیا ہے:

| | |
|---|---|
| مصرعِ ثروت نے جوشش مست و دیوانہ کیا | دشت دشت و بیشہ بیشہ شیشہ شیشہ ہے شراب |
| مصرع بسمل پہ جوشش ایک مرتے ہیں نہیں | ورنہ یاں کس کو نہیں ہے اپنی اپنی جان عزیز |
| نقش دل پر مصرع فدوی ہے جوشش جوں نگیں | اب نکلتا خوش نہیں آتا کہیں گھر سے مجھے |

کاتب اور زمانۂ کتابت۔ خاتمے کی عبارت یہ ہے "تمام شد بتاریخ چہار دہم شہر شعبان سنہ ۱۲۳۰ھ فصلی بمکان شیخ قمر علی صاحب محلہ گھگھو پور من محلات شہر پٹنہ، بوقت گذشت یک پاس شب تحریر یافت، جملہ اوراق این کتاب ز نگار یک صد و بنجاہ و یک، اند شمار غزل کلام جوشش بخطِ منجلی ختم شد از بندہ سبحان علی — من نوشتم صرف کردم روزگار، بعد من خواہد بماند یادگار، من سبحان علی ولد شیخ وصومن، ساکن موضع نیمی پرگنہ غیاث پور ضلع پٹنہ ۱۲۳۰ء"

کاتب کا حال جو ان کے خلف الرشید مولوی ظہیر احسن شوق نیموی مرحوم نے اپنی کتاب یادگار وطن میں[۲] لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں بمقام نیمی پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۹۶ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ کاتب نے کتاب صحیح

---

۱۔ گلشن بیخار شیفتہ مطبوعہ نولکشور طبع دوم ص ۵۰، ۲۔ سخن شعراء نساخ، ص ۱۲۱ و ۱۲۲، ۲۔ ص ۲۹ تا ۳۵

میں لکھی، غلطیاں کثرت سے ہیں۔ املا کی بھی غلطیاں موجود ہیں، ان کے عہد کا املا آج کل کے املا سے مختلف بھی ہے، اس سے مفصل بحث مقدمۂ دیوان میں کی جائے گی۔ کتاب کی ضخامت۔ کاتب نے خاتمے میں لکھا ہے کہ اوراق کی تعداد ۱۵۰ ہے۔ میرا خیال ہے کہ کاتب نے قصائد کو دیوان سے الگ لکھا تھا، اور قصائد کے اوراق اس کے علاوہ ہیں، شوق مرحوم نے کتاب کی ضخامت انیس جزو بتائی ہے، جس کے ۱۵۲ ورق ہوتے ہیں۔ آج کل اس کتاب کے اوراق کی تعداد قصائد ۲۰، دیوان ۱۳۷ = ۱۵۷ ہے، میری رائے میں قصائد کے جو اوراق غائب ہیں، ان سے قطع نظر کر کے دیوان کے ۱۳ ورق ضائع ہو گئے ہیں۔

قصائد۔ چار مکمل قصیدے، اور پانچویں کے چند شعر ہیں، پہلا قصیدہ جس ورق سے شروع ہوا ہے اس کے اوپر اور نیچے کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا تھا، شوق مرحوم نے کاغذ چسپاں کر دیا ہے اور بسم اللہ، قصیدے کا عنوان مطلع کے بعض الفاظ اور درمیان سے چند شعر خود لکھے ہیں، بہت ممکن ہے کہ یہ پہلا ورق نہ ہو اور شوق مرحوم نے اسے پہلا ورق بنا دیا ہو۔ پانچویں قصیدے کے صرف ۹ شعر ہیں، اشارۂ کاتب سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اور اشعار تھے، اس قصیدے کے کتنے اشعار ضائع ہوئے، نہیں کہا جا سکتا، اس کی بھی خبر نہیں کہ اس کے بعد اور بھی قصائد تھے یا نہیں، قیاس کہتا ہے کہ امام حسنؑ کے بعد کم از کم امام حسینؑ کی شان میں تو ضرور قصیدہ لکھا ہوگا۔ اہل دول کی شان میں بھی لکھا ہو تو عجب نہیں۔

قصیدۂ اول نعت، اشعار ۳۵، دوم حضرت علیؑ کی شان میں اشعار ۴۹، سوم ایضاً ۷۶، چہارم امام حسنؑ کی شان میں ۶۵، پنجم ۹؟

قصیدۂ اول سے: جو کوئی درگہِ عالی کا تیرے ہو زوار ۔۔۔ لگے پلک سے پلک اس کی بہر آئینہ وار

ہر ایک زینہ وہ ہے کہ رشکِ پایۂ عرش ۔۔۔ لامکان مقرب کا واں نہیں ہے گزار

دوم سے: صفائے ۔۔۔ ست نہ کیا چاہیے گر دل کو خیال ۔۔۔ عکس رکھتا ہے یہ ہر ایک کے آئینہ مثال

اقوال میں ہے نہ رکھ چشم توقع اس سے ۔۔۔ پست ہمت ہے نہ کر اس کی بزرگی پہ خیال

سوم سے: نقش کو تیرے کے تو صفحۂ دل سے کر حک ۔۔۔ دیکھ لے جلوۂ حق ارض سے لے تا بہ فلک

چہارم سے: عطا کیا ہے مجھے حق نے وہ دلِ روشن ۔۔۔ کہ رشکِ شمعِ حرم ہے میانِ ظلمتِ تن

دیا وہ دیدہ شناسائے معنی و الفاظ ۔۔۔ کہ روشنی اس کی بدولت ہوا سوادِ سخن

عنایت ایسی ہی کی زبانِ تیز بیاں؟ ۔۔۔ کہ تیغِ قاطعِ برہان ہے درمیانِ دہن

ہوا ہے وہ سر شوریدہ مرحمت مجھ کو ۔۔۔ کہ میرا دشت و بیابانِ عشق ہے مسکن

پنجم سے: یہ چرخِ کہنہ تو ہے اس طرح کا صاف ضمیر ۔۔۔ کہ مثلِ آئینہ ہوتا نہیں ہے عکس پذیر

غرض ششم سے: غرض کسی کی ترقی سے نے تنزل سے ۔۔۔ وزیر بادشہ ہو یا ہو بادشاہ وزیر

دیوان[1] قصائد کے بعد ایک صفحہ سادہ ہے جس پر دیوان جوشش لکھا ہے۔ دوسرے صفحے سے غزلیات شروع ہوتی ہیں۔ یہ ورق شوق مرحوم کا لگایا ہوا اور لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد کے پانچ اوراق کے ٹکڑے ضائع ہو گئے تھے۔ شوق مرحوم نے انھیں بھی درست کیا ہے اور کسی صفحے میں، کسی میں ۳ شعر خود لکھ کر لگائے ہیں۔ دسویں ورق پر ۱۲ کا ہندسہ دیا ہوا ہے اور اس کے بعد وہ تک اسی حساب سے چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابتدا کے دو ورق غائب ہو گئے ہیں، اور اصل میں اس دیوان کا افتتاحی شعر ہے جو دل کہ جلوہ گاہ ہو وہ اس کے نور کو جو مشتاق وہ نہیں ہے تجلی طور کا، نہیں بلکہ یہ ہے ؎ کس طرح سے اوصاف ہو خلاق جہاں کا ٭ قدرت قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا

[1] شوق مرحوم نے دیوان کے اوراق ضائع ہونے کے متعلق یادگار وطن میں کچھ نہیں لکھا۔ اس دیوان کے متعلق ان کی طویل تحریر کے اقتباسات درج ذیل ہیں (ص ۳۰ تا ۳۱): "اس دیوان کو جناب والد مرحوم نے ۔۔۔ نقل کیا ہے۔ ہر صفحے میں ۱۷ شعر ہیں۔ ۱۹ جزو میں تمام کیا ہے۔ اس دیوان میں قصائد بھی ہیں۔ آخر میں ایک آدھ تاریخ بھی ہے جس سے ثابت ہے کہ میر و میرزا کے ہمعصر تھے ۔۔۔ افسوس کہ دیوان کی نایابی سے عظیم آباد کے شعرا بھی جوشش سے واقف نہیں۔ جناب شاد عظیم آبادی نے نوائے وطن میں جوشش کا ذکر تک نہیں کیا۔ سبب کیا؟ وہی گم نامی اور اس دیوان کی نایابی۔ ورنہ ضرور جوشش کو راسخ مرحوم کے پہلو بہ پہلو جگہ دیتے۔ بہرکیف یہ دیوان ہر چند پرانا ہے مگر کلام پاکیزہ اور استادانہ ہے۔ میں نے اس دیوان کو بہت قدر کے ساتھ اپنے کتب خانے میں جگہ دی ہے۔" شوق مرحوم کا یہ قول صحیح نہیں کہ ہر صفحے میں ۱۷ شعر ہیں۔ کسی صفحے میں ۱۴، کسی میں ۱۵، کسی میں اس سے بھی کم۔ کم ہی صفحے ہوں گے جن میں ۱۷ شعر ہیں۔ شوق مرحوم نے کتاب پر کہیں کہیں حاشیے بھی لکھے ہیں، اور کہیں کہیں کاتب کی غلطی کی اصلاح بھی کر دی ہے۔ جوشش نے ایک غزل میں طور کا قافیہ شور باندھا ہے۔ اس پر لکھتے ہیں، "حور، طور وغیرہ کے ساتھ شور ایسے قوافی اساتذہ کے کلام میں جا بجا موجود ہیں۔ البتہ اکثر فصحا نے حال احتیاط رکھتے ہیں۔"[2] جوشش نے علی ابراہیم خاں کو اپنے دیوان کا جو انتخاب بھیجا تھا وہ انھوں نے غالباً بجنسہ شائع کر دیا تھا۔ گلزار ابراہیم نسخۂ قلمی کے الفاظ یہ ہیں: "ہنگام تدوین این تذکرہ ابیات منتخبہ دیوان خود در سنہ ۱۱۹۳ھ براقم آثم فرستاد کہ ثبت تذکرہ نماید۔" یہ اشعار اسی مطلع سے شروع ہوتے ہیں، اور اس غزل کے اور اشعار بھی ہیں۔ از انجملہ یہ شعر ہے ؎ عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت ٭ جو تاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا ٭ دیوان میں یہ غزل تو موجود نہیں، لیکن کتاں کے قافیے کا شعر بتغیر داخل ہے اور گلزار کے اشعار میں ہے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ شعر مطلع سر دیوان ہوگا۔ گلزار ابراہیم میں ردیف الف کی دو غزلوں کے منتخب شعر اور بھی ہیں۔ یہ غزلیں بھی دیوان میں نہیں ہیں۔ یہاں پر یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بعض غزلیں جو دیوان اور گلزار ابراہیم دونوں میں ہیں، لیکن گلزار کے بعض شعر دیوان میں نہیں، مثلاً ایک عالم کی جاں خراش ہے یہ ٭ ادب یا قلم تراش ہے یہ ٭ یا جوشش مت رو دل و جگر کو ٭ کس کس کا تو غم کرے گا۔ گلزار ابراہیم مطبوعہ ص

ان دو دو ورقوں کے علاوہ میری رائے میں ۱۴ اوراق اور حسب تفصیل ذیل غائب ہیں (۱) اوراق ۲۷ و ۳۷ و ۴۷ ۔ ورق ۸۱
مصرع پر تمام ہوتا ہے ۔ سر ار کھتے ہیں مستاں شیشہ و پیمانہ پہلو میں ۔ کاتب کا اشارہ ہے کہ بعد کا ورق نہ ہو
مژگاں سے شروع ہونا چاہیے لیکن وہ اس مقطع سے شروع ہوتا ہے ۔ غرور بندگی دل سے اٹھا دے خاکساری کر
خدا ملتا نہیں جوشش کسی کو خودنمائی میں ۔ (۲) ورق ۹۲ ، مصرع آخر ورق ۱۰۱ ۔ مہرباں نامہرباں ہم پر بھلا آخر یہ
خلاف اشارہ کاتب بعد کا ورق دوسری زمین کے مقطع سے شروع ہوتا ہے ، پہلا مصرع ٹھیک پڑھا نہیں جاتا ، دوسرا
ہے جو کوئی اپنے فعل سے یاں منفعل نہ ہو (۳) ورق ۱۰۶ و ۱۰۷ ، مصرع آخر ورق ۱۰۵ ۔ اسے جو خدا بھا جتا ہے ہوتا ہے
بعد کا ورق اشارہ کاتب کے خلاف شعر ذیل سے شروع ہوتا ہے ، پہلا مصرع اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا ۔ دوسرا ہے مری
تعجب نہیں جیسا ہی عجب ہے ۔ (۴) اوراق ۱۱۵ تا ۱۲۳ ، مصرع آخر ورق ۱۱۰ ۔ ہم خانہ بردوشوں کا جوشش
ہم سفر ہووے ، بعد کا ورق کاتب کے اشارے کے خلاف یوں شروع ہوتا ہے ، پہلا مصرع ٹھیک نہیں پڑھا جاتا
دوسرا ہے کس کی مجال ہے جو ترے روبرو رہے (۵) ورق ۱۲۹ ، ورق ۱۳۷ کا آخری مصرع ۔ خدا جانے یہ
الفت کیا کرے گی ، بعد کا ورق خلاف اشارہ کاتب مصرع ہذا سے شروع ہوتا ہے ۔ کس کو میں منصف بناؤں تنگ آپ ہی
انصاف سے ۔ غزلوں کے کل اشعار ۷۵۴۳ ہیں ، ان کے علاوہ ۷ اشعار ہیں جنھیں لکھ کر کاتب نے قلمزد کر دیا ہے ، نسخہ
منقول عنہ میں ان کے متعلق کوئی ہدایت درج ہو ۔ ان اشعار میں سے چند درج ذیل ہیں ۔

کس طرح نظر اپنی رخِ یار پہ ٹھہرے ۔۔۔ خورشید کو تکنے نہیں مقدور کتاں کا
کیا مسجد و میخانہ میں کیا دیر و حرم میں ۔۔۔ تھا مد نظر تو ہی اگر مد نظر تھا
بتانِ سنگدل کی بزم میں تو قہر ہوئی پیدا ۔۔۔ ہماری آہ بے تاثیر میں تاثیر ہوئی پیدا
لگے [illegible] ملامت چلنے عاشق ہوتے ہی اس پر ۔۔۔ یہ کیا تقصیر تھی جو ساتھ ہی تعزیر ہوئی پیدا

غزلیات کے بعد ۱۴ متفرق اشعار ہیں ، پہلے شعر کا مصرع اول یہ ہے ۔ دیکھی ہو جس نے یار تری زلف خواب میں
(۴) رباعیاں ہیں ، پہلی رباعی یہ ہے ۔ سارے خدائی کی خبر زیر گلیم ٭ انعام یتیمی ہیں گرے در یتیم
احمد ہے بلا میم محمد میرا ٭ ذات اس کی بلا شبہ شکر ذات کریم

اے دل جو تجھے ہے ہوسِ مے خواری ٭ ہر بزم میں اتنی ہی رہے ہشیاری
ہر چند کوئی پلائے تھوڑی سی پیجیے ٭ تا ہو نہ خط جام خط بیزاری
اے واقف اسرار خبر لے میری ٭ ہوں دکھ میں گرفتار خبر لے میری
بیماری صعب نے ستایا ہے مجھے ٭ یا حیدر کرار خبر لے میری

۲ بند مخمس برزاہد و دعوت نہ کنم سوئے بہشت ۵ بند مخمس غزل ۔ اے بادشہ خوباں داد از غم تنہائی ۔

۷ بند مخمس سے نہ اتنہ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے۔ ۶۲۔ اشعار مثنوی ہجو نکاری ب ہے یہ چرخ کینہ دوں پرور و دشمن خاندان اہلِ ہنر + اتفاقاً نکاری جاتا ہوا جگہ پسند نہ آئی۔ ہجو کہیں کسی خاص شخص کا ذکر نہیں آیا۔

۷۰۔ اشعار مثنوی ہزل نقل کبوتر باز سے اک محلے میں تھے کبوتر باز + اپنے فن میں بھوں سے تھے ممتاز +

۱۹۔ اشعار مثنوی ہزل نقل افیونی سے اک افیمی کی نقل کرتا ہوں + نقل کرتے بھی اس کی ڈرتا ہوں +

۱۷۔ اشعار مثنوی در وصف مغنیہ نورتن سے اے صاحب حُسن و خلق تجھ سا + پیدا نہ کوئی ہوا نہ ہوگا +

۷۔ اشعار قطعہ تاریخ وفات میرزا وارث علی نالاں۔ مادہ تاریخ میر وارث علی نالاں ۱۱۹۹ھ

۱۰۔ اشعار قطعہ تاریخ وفات محمد علی خاں، مشتاق۔ مادہ تاریخ سے اب گیا مشتاق ارم میں ۱۲۰۲ھ

ذیل میں دیوان کی چند غزلیں اور منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں ـــ

جن دنوں سینہ ہمارا جلوہ گاہ طور تھا
یہ تجلی خیز دل خجلت دہ صد طور تھا

کیوں نہ شاکی ہو نیاز عشق ناز حسن سے
لے کے دل کو پھیر دینا کون سا دستور تھا

اٹکھیلیوں سے چلنے کا تجھ کو مزا ملا
تیری بلا سے خاک میں کوئی ملا ملا

منت تاثیر لے آہ سحر گاہی نہ کر
پر جو تجھ سے ہو سکے اس میں تو کوتاہی نہ کر

منزل اول ہی میں رہ جائیگی تھک کر کہیں
رہروان عشق کی اے عقل ہمراہی نہ کر

گاہ گاہ ہے تجھ بھی جایا کر کہ ہو راحت نصیب
آتش دل رات دن پہلو میں سلگاہی نہ کر

اے چرخ بے کسی پہ ہماری نظر نہ کر
جو کچھ کہ تجھ سے ہو سکے تو درگزر نہ کر

اس حسن صندلی کی ثنا اور تیرا منھ
دیوانہ کیوں ہوا ہے تو یہ درد سر نہ کر

غیرت یہ مقتضی ہے کہ اے غنچہ باغ میں
مرجھا ہی جا پہ منت باد سحر نہ کر

راغب نہ ہو طبیعت گو حور روبرو ہو
اپنی یہ آرزو ہے دنیا ہو اور تو ہو

گر آرزو ہے دل میں اتنی ہی آرزو ہے
تاراج بے نیازی اقلیم آرزو ہو

راہ طلب میں اس کی واماندگی کہاں تک
اے پائے سعی کاہل سرگرم جستجو ہو

بے رشتہ نگہ ہے بے سوزن مژہ ہے
چاک جگر ہمارا کس طرح سے رفو ہو

شیخ حرم کا طالب اے بت میں کس طرح ہوں
میری کنشت دل میں جب جلوہ ساز تو ہو

عریانی پر ہماری مت طعنہ زن ہو زاہد
یہ دلق وہ نہیں جو محتاج شست و شو ہو

جوشش بہار ہستی اک آن میں خزاں ہے
جوں گل نہ اس چمن میں پابند رنگ و بو ہو

آشنا جب کاکل مشکیں سے دست شانہ ہو
یہ دلِ صد چاک دیوانہ بھلا ہو یا نہ ہو

نہیں جاتا کچھ اس اندوہ گیں کو
یہاں سے لے چل اے وحشت کہیں کو

اے رشکِ آفتاب ترا کیونکہ دید ہو
پھرتی ہے درمیاں سے نظر ناامید ہو

الم کیا کیا نہ ہم پر گردشِ ایام سے گزرے
تعلق دل سے اُٹھ جائے تو کیا آرام سے گزرے

وہ دنیا، گر نظر آتا نہیں جس کے لیے ہم نے
دل و دیں سے اُٹھایا ہاتھ ننگ و نام سے گزرے

نہ منھ اس کا نظر آیا کبھی نے زلف ہاتھ آئی
ہم ایسی صبح سے باز آئے ایسی شام سے گزرے

نہ رونے کے ہے قابل نہ لائق آہ کرنے کے
ہوئے ناکارہ ہم اے ضعف اب سب کام سے گزرے

مسلماں جن میں ہو کچھ کفر ہے شیخ صاحب کو
یہی اسلام ہے جوشش تو اہلِ اسلام سے گزرے

آئے دو چار باتیں دل آزار کر چلے
کیا خوب تم عیادتِ بیمار کر چلے

اور دل کی سنتے پائے نہ اپنی سنا چلے
کیا آئے اس جہاں میں ہم اور کیا چلے

غیروں پہ لطف ہے ترا اک نگہ کرم بھی
یاں اک نظرِ لطف کے مشتاق ہیں ہم بھی

جوں نقشِ قدم تو ہوئے پامالِ خلائق
دیکھیں گے ان آنکھوں سے کبھی اس کے قدم بھی

اس دل سے تو جانے کی نہیں دیر کی الفت
بالفرض اگر ہم نے کیا طوفِ حرم بھی

خندہ اس سے ادھر برق اُدھر ابر ہے گریاں
شادی ہے زمانے میں تو ہے ساتھ ہی غم بھی

اُس کے لبِ میگوں کا لکھوں وصف تو جوشش
لغزش ہی میں آجائے ابھی پائے قلم بھی

سحر کا وقت ہے اور پی چکا ہوں جام کئی
ابھی نہ گھر سے نکل ہیں خدا کے کام کئی

گل اور لالہ و سرو و صنوبر و شمشاد
ترے غلاموں میں نامی ہیں یہ غلام کئی

میں یہ [illegible] تیغِ نگہ کی خوں ریزی
کئی سسکتے ہیں اور ہو گئے تمام کئی

ادھر ہے عشوہ و غمزہ اُدھر ہے ناز و ادا
کھڑے ہیں آگے ترے بہرِ اہتمام کئی

پھرا نہ ایک بھی جیتا گلی سے قاتل کی
گئے ہیں لے کے مرا نامہ و پیام کئی

یہ سچ ہے کہ اور بھی ہیں جو تم یاد کرو گے
میرے دلِ ناشاد کو کب شاد کرو گے

چشمِ خوں بار کی اپنے وہ تراوش نہ رہی
ابرو مژگاں میں کسی نوع کی کاوش نہ رہی

خلق ہم جب سے ہوئے درد و الم سے کام ہے
یہ سمجھتے ہی نہیں آرام کس کا نام ہے

چمن میں یار بن رہنے کو تو کیا ہے رہا کیجے
ولیکن جی نہیں لگتا ہمارا اس کو کیا کیجے

کیا بہارِ حسن پر موقوف میرا عشق ہے
جب تلک جیتا ہوں میں ہوں اور تیرا عشق ہے

# دریائے لطافت

از ق ح و

آزاد[1] یہ اعتراف کرنے کے بعد کہ گلکرسٹ نے قواعد اردو ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ لکھی، آگے چل کر اسی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ "اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۲۲۲ھ میں قواعد اردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے"۔ یہ تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ کہ گلکرسٹ کی کتاب کو تقدم زمانی حاصل ہے، دریائے لطافت کو قواعد اردو کی پہلی کتاب قرار دینا آزاد ہی کا حصہ تھا شاید انھیں خود ہی اس کا احساس ہوا[2] کہ دونوں بیان صحیح نہیں ہو سکتے، چنانچہ جب انشا کا حال لکھنے لگے تو انھوں نے اس دعوے میں ترمیم کر دی اور صرف یہ کہنے پر قناعت کی کہ "یہ پہلی کتاب قواعد اردو کی ہے جو ہمارے اہل زبان نے اردو میں لکھی ہے"۔ میر فرزند احمد صفیر بلگرامی جو اپنے عہد کے باخبر شاعر اور قابل قدر مصنف تھے آزاد کے دعوے کو نہ اس کی اصلی شکل میں تسلیم کرتے ہیں نہ ترمیم شدہ شکل میں۔ ان کا اعتراض ہے کہ صرف[3] قواعد گلکرسٹ ہی نہیں بلکہ شمس البیان مصنفہ طپش دہلوی بھی دریائے لطافت سے پہلے شائع ہو چکی ہے، اور چونکہ طپش کو اہل زبان کے زمرے میں نہ شامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، آزاد کا دعوے غلط ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ صفیر مرحوم نے اپنا زور قلم بیکار صرف کیا ہے۔ گلکرسٹ کے تقدم کا اقرار خود آزاد کو ہے، اور ایک گلکرسٹ پر کیا موقوف ہے قواعد اردو کے متعلق بکثرت کتابیں اہل فرنگ نے د سے پہلے لکھی تھیں۔ ان کا ذکر گریرسن نے اپنے ایک فاضلانہ مقالہ میں کیا تھا۔ مدت ہوئی رسالۂ ایشیاٹک سوسائٹی میں چھپا تھا، اور اب گریرسن کی یادگار، زندۂ تصنیف لسانیاتی جائزہ ہندوستان میں شامل ہے۔ رہی شمس البیان، اس میں شک نہیں کہ زمانے کے لحاظ سے وہ بھی مقدم ہے، لیکن وہ سرے سے قواعد کی کتاب ہی نہیں، اس کا موضوع محاورات و مصطلحات ہیں، اور اس کا علم خود صفیر مرحوم کو بھی تھا۔ پھر یہ ثابت کر دینے سے کہ شمس البیان د سے پہلے شائع ہو گئی تھی، آزاد کا قول کیونکر باطل ہو گیا۔ اور انشا کی طرف سے نقارۂ فخر پر جو چوب ہاتھوں نے لگائی تھی اس کی آواز کیونکر دب گئی۔؟

اصل یہ ہے کہ صفیر مرحوم کی غرض یہ نہ تھی کہ گلکرسٹ اور طپش کے جائز حقوق غاصب انشا سے واپس دلوا لیے جائیں بلکہ اپنے استاذ الاستاذ ناسخ کی طرف سے بہ بانگ دہل یہ اعلان کرنا تھا کہ اردو ناسخ کا مقبوضہ علاقہ ہے، اور اس میں کسی دوسرے کی مداخلت گوارا نہ ہوگی۔ ناسخ نے اگر انا ولا غیری کا دعوے کیا ہو تو اس کی ہمیں خبر نہیں۔

---

[1] آب حیات طبع نہم ص ۲۹۔ [2] آب حیات ص ۲۰۰۔ [3] جلوۂ خضر جلد ۲۔ ص ۲۴۱ تا ۲۴۲۔

کیونکہ کسی معاصر تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن صفیر مرحوم جہاں تک اصلاح زبان اردو، و انضباط قواعد اردو کا تعلق تھا، ناسخ کے علاوہ کسی کا نام بھی اس سلسلے میں سننا پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ وہ یہ لکھنے سے اپنے کو باز نہ رکھ سکے کہ گو انشا کو اصلاح ناسخ کے مطابق اپنے کلام کی درستی کا موقع نہ ملا۔ لیکن د کا مادہ[1] ناسخ کے طرز کلام سے حاصل ہوا۔ انشا کی سمجھ میں جس قدر آیا اُس قدر، قواعد پر ان کو عبور ہوا، اور جو سمجھ میں نہ آیا اول جلول طرح سے لکھ دیا۔"

صفیر مرحوم نے اپنے دعوے کی بنیاد[2] مصحفی کے دیوان ششم کے دیباچے اور ایک قطعے پر رکھی ہے۔ دیباچے میں ناسخ کا نام موجود ہے۔ اور قطعہ میں ایک ن بسر شخص کی طرف اشارہ ہے جس سے اہل اردو نے فیض پایا ہے۔ دیباچے کے الفاظ یہ ہیں: "حمد نعمت الوان ایں خوان بہ شیخ ناسخ مقسوم گشت۔ تخلص خود را اسم با مسمےٰ انگاشتہ، بحور ریختہ گویان سادہ کلام در عرصۂ قلیل خط النسخ کشید"۔ ظاہر ہے کہ اس قول کا تعلق تجدید زبان سے نہیں بلکہ تجدید طرز سے ہے، رہا قطعہ اس میں سرے سے ناسخ کی طرف اشارہ ہی نہیں۔ مفصل طور پر اس کے متعلق آئندہ لکھا جائیگا۔ یہاں پر ہم صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہماری نظر سے مصحفی کے کل دواوین اور اکثر تصانیف نثر گزری ہیں، لیکن ایک لفظ بھی ایسا نہ ملا جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ مصحفی ناسخ کو زبان اردو کا مصلح و مجدد سمجھتے تھے، ہاں یہ اعتراف مصحفی نے کئی جگہ کیا ہے کہ ناسخ نے سادہ گوئی ترک کر کے معنی بندی اختیار کی تھی، اور اس طرز کو مقبول عام بنا دیا تھا، یہاں تک خود مصحفی بھی جو معنی بندی کو سخت ناپسند کرتے تھے، با دل ناخواستہ ناسخ کے تتبع پر مجبور ہوئے تھے۔ راقم کا خیال ہے کہ ناسخ کی اصلاح زبان کو زیادہ از ضرورت اہمیت دی گئی ہے، یہ صحیح ہے کہ ناسخ کو صحت الفاظ کا اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ خیال تھا، اور وہ آزادی جو نظم میں دوسرے شعرا اپنا حق سمجھتے تھے اس سے انھوں نے اپنے کو بطیب خاطر محروم کر لیا تھا، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اردو کوئی مصنوعی زبان نہیں، جسے ایک یا چند آدمیوں نے گڑھ لیا ہو اور اس کے قواعد و ضوابط جب جی چاہے بدلتے رہتے ہوں، اردو زندہ زبان ہے اور دوسری زندہ زبانوں کی طرح ہمیشہ معرض تغیر میں رہتی ہے، جس طرح سودا و میر کے عہد میں، آبرو و مضمون کی زبان ایک حد تک بدل گئی تھی، اسی طرح انشا کے زمانے میں، سودا و میر کی زبان بدل چلی تھی، مزید براں یہ کہ دہلی کے سیاسی زوال کی وجہ سے زبان کا مرکز لکھنؤ ہو چلا تھا، اور پچاس برس کے عرصے میں ایسے محاورات اور روزمرے یہاں پیدا ہو گئے تھے جن کی دہلی والوں کو خبر بھی نہ تھی، لیکن انشا کے وقت تک لکھنؤ نے دہلی کے خلاف علانیہ علم بغاوت بلند نہیں کیا تھا، اور دہلی و لکھنؤ کی زبان کا اختلاف اس قدر نمایاں نہ تھا، جتنا ان کے بعد ہوا، دریائے لطافت کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے ہمیں زبان کے سیلان اور تغیر پذیری کا اچھی طرح احساس ہو جاتا ہے، اگر عشرۂ سوم کے اوائل کے بجائے یہ کتاب

[1] حلوۂ خضر جلد ۲ ص ۲۷۲-۳ [2] حلوۂ خضر ص ۳۶۴ تا ۳۶۷۔

عشرۂ چہارم کے اواخر میں لکھی جاتی تو باوجود اس کے کہ اس کے قواعد زبان حال سے قریب تر ہوتے، لیکن، اس کی اہمیت کم ہو جاتی۔ جو سودا و ناسخ کے درمیانی دور کی تصنیف کی حیثیت سے اسے حاصل ہے، رہا یہ سوال کہ ناسخ کا انضباط قواعد اردو سے کیا تعلق ہے، اس کا جواب ہم کسی دوسرے موقع پر دینے کی کوشش کریںگے، یہاں یہ انشا کو تقلید ناسخ کے الزام سے بچانے کے لیے صرف اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ جن لوگوں کی نظر سے دیوان ناسخ کے قدیم نسخے گزرتے ہیں، ان کی رائے ہے کہ ۱۲۳۲ھ تک ناسخ کی زبان وہی تھی جو مصحفی اور انشا کی تھی، سید انشا کی کتاب ۱۲۲۲ھ میں لکھی گئی ہے، ناسخ سے استفادہ بالکل خارج از بحث ہے۔

زبان سے متعلق قدما کی تصانیف میں جو غیر معمولی اہمیت د کو حاصل ہے، اس کا اندازہ کر کے آج سے کچھ کم ۹۰ سال پہلے کاکوری کے ایک بزرگ مولوی مسیح الدین علی خاں بہادر نے جو اس زمانے میں مرشد آباد میں مقیم تھے، وہیں کے مطبع آفتاب عالمتاب میں اس کتاب کو طبع کرایا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خود لکھنؤ نے جو عہد ناسخ میں شعر کی معنوی خوبیوں کے مقابلے میں زبان کی درستی کی طرف زیادہ مائل تھا، اس کتاب کو قابل اعتنا نہ سمجھا، اس کا سبب سوا اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اہل لکھنؤ کا حاسۂ تاریخی (ہسٹوریکل سنس) بہت کمزور تھا، اپنے عہد کی زبان سے انھیں ضرور دلچسپی تھی، لیکن یہ سوال کہ زبان اُردو نے کن ارتقائی منازل سے گزر کر موجودہ صورت اختیار کی ہے، ان کے لئے بے معنی تھا، مولوی مسیح الدین علی خاں کی ژرف نگاہی کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے کسی حد تک سہی، کتاب کی اہمیت کو سمجھا، اور اس کی ترتیب و تہذیب کا بھی معقول انتظام کیا،

انجمن ترقی اردو کی عنان انتظام جب ہمارے فاضل دوست عبدالحق صاحب کے ہاتھ میں آئی، تو ان کی نظر انتخاب پر بھی پڑی، اور انھوں نے ۱۹۱۶ء میں اسے انجمن کی طرف سے شائع کیا، لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ شاید انجمن کا ابتدائی زمانہ تھا، اور کچھ اس وجہ سے کہ جو مطبوعہ نسخہ انجمن میں تھا، اس میں وہ غلط نامہ جو مرتبین نسخہ مرشد آباد نے شامل کیا تھا، نہ تھا، نسخۂ مطبوعہ انجمن میں بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ نسخہ مرشد آباد = م، اور نسخہ انجمن = ن کا مقابلہ کرنے سے حسب ذیل اختلافات کا پتا چلتا ہے۔

۱۔ احمد علی گوپاموی کی تمہید، ن میں نہیں ہے،

۲۔ انشا کا خطبہ ن میں نہیں ہے۔

۳۔ دروازۂ اول کے ابتدا کی عبارت بقدر ۲/۱ ص ن میں نہیں ہے۔

۴۔ منطق عروض و قوافی کا بیان جو قتیل کا لکھا ہوا ہے ن میں نہیں ہے۔

۵۔ م میں جو اغلاط رہ گئی تھیں، ان کی تصحیح کے لیے ۴ صفحات کا غلط نامہ شامل کتاب کیا گیا تھا، ن میں اس کے

---

لہ مقدمۂ مثنوی ناسخ شائع کردہ کتابستان الٰہ آباد۔

بالکل خارج نہیں اٹھایا گیا، اور مر کی اغلاط اپنی جگہ پر رہیں۔

۶- جا بجا سے الفاظ اور عبارات فحش یا مبتذل ہونے کی وجہ سے متن میں خارج کی گئی ہیں اس میں تو چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن جن مقامات سے الفاظ خارج کیے گئے ہیں وہاں اس عمل کا کوئی نشان نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے یہ کہ کاتب کی غلطی کی وجہ سے بعض مقامات پر ضروری الفاظ خارج ہو گئے ہیں، جس سے مصنف کے منشا کے خلاف مطلب پیدا ہو گیا ہے۔ ان اختلافات کو دیکھ کر، اور کتاب کی اہمیت کا احساس کر کے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ کتاب پر بالتفصیل نظر ڈالی جائے اور جو اغلاط رہ گئی ہیں، ان کی تصحیح بھی ضمناً کر دی جائے، لیکن ایک مضمون کی وسعت اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ پہلے مضمون میں ہم کتاب کی تقسیم و تبویب احمد علی کی تمہید، انشا کے خطبے، دردانۂ اول کی ابتدائی عبارات اور کتاب کی ظاہری حالت سے بحث کریں گے۔

م- تقطیع کے معمولی سفید کاغذ پر، ٹائپ میں چھپا ہے۔ سرورق کے بعد ۶ ص پر احمد علی گوپاموی کی تمہید ہے، ۴ ص پر فہرست مضامین ہے، اصلی کتاب اس کے بعد شروع ہوتی ہے، جو ۴۷۶ ص پر ہے، ۴ ص غلطنامے کے اس کے علاوہ آخر میں ہیں۔ انشا کا خطبہ ۸ ص میں ہے، حصہ منطق نوشتہ قتیل ۳۰۹ سے شروع ہو کر ص ۳۹۸ پر ختم ہوتا ہے، حصہ قافیہ و ردیف ص ۳۹۹ تا ۴۱۵، حصہ صنائع و بدائع و اقسام نظم ص ۴۱۵ تا ۴۷۰۔ خاتمہ جو ان میں موجود ہے ۴۷۰ تا ۴۷۶۔ کتاب میں بالعموم ۱۸ سطریں ہر صفحے میں ہیں۔

سرورق دریائے لطافت | در علم صرف و نحو زبان اردوے شاہجہاں آباد و منطق | و بدیع و بیان و عروض و قوافی بالتفصیل محاورات | و دیگر فوائد نظم و نثر زبان مذکور نصف اول آں تصنیف | میر انشاء اللہ خاں مرحوم و نصف ثانی مولفہ | مرزا محمد حسن قتیل مرحوم | کہ در تحقیقات ایں زبان از ابتدائے رواج | اردو تا حال ہیچ یک تالیف بدیں تفصیل و تنقیح نشد در بلدۂ مرشدآباد بمطبع | آفتاب عالمتاب مطبوع شد | در ماہ رجب المرجب ۱۲۶۶ ہجری التماس پانچ سطروں میں التماس ہے کہ کتاب حسب منشائے قانون بستم ۱۸۴۷ء "داخل بہی رجسٹری گورنمنٹ" ہو چکی ہے۔ بے اجازت کوئی صاحب قصد طبع نہ فرمائیں۔

تمہید نوشتہ احمد علی گوپاموی۔ ابتدا ہوالودود و تحمید سے ہوتی ہے اور سطر اول یہ ہے "بہترین فائدہ کہ فصحائے بدیع البیان محفل زبان آرائی و بلغائے۔

اس کے ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں: "از ابتدائے ترویج زبان ریختہ کہ بنام اردوئے معلیٰ موسوم و مشتہر شدہ تا حال کہ صدہا سال می گذرد و کتابے حاوی جمیع قواعد آں زبان ... مولف نشدہ بود، لہٰذا در مشہور سنہ ۱۲۲۲ میر انشاء اللہ خاں تا لیطفے بکار برد حسب وضع خود کہ مائل بمزاح و تمسخر بود، ضبط اصول و قواعد صرف و نحو اردو بقیاس قواعد مقررہ عربی و فارسی و ہم بایجاد طبیعت خود قرار واقعی نمودہ، و برائے نصف ثانی آں کہ

اما بعد فقیر اَحقر تراب اقدام فصحا، انشاء اللہ متخلص بہ انشا، ابن حکیم میر ماشاء اللہ جعفری نجفی گوید کہ چوں جناب عنایت قدر متعال ... بفیض مجالست ... اعظم الامراء اجل الوزراء امین الدولت ناظم الملک نواب سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ .... سرافتخار از طارم نیلگوں گذرانیدم ... بایں بندہ بے ریا ارشاد شد کہ زباندانان پیشین ... قواعد زبان عربی و فارسی برشتۂ تحریر کشیدہ اند ... اگر بخاطر می گذرد کہ قواعد زبان اُردو کہ بحکم کل جدید لذیذ زیادہ لذیذ زبان دیگر تازگی بخش جاں سامعان ست و تا امروز در کتابے طراز آستین کتابت نگردیدہ، اگر بہ سعی تو ... بشرح و بسط تمام گلگونۂ چہرۂ شاہد کاغذ گردد ہر آئینہ خالی از ضیافت طبع معاصران و طالبانے کہ بعد ازیں بوجود آیند نباشد بنا بر علی ہذا چنیں اصوب می نماید کہ دو سہ چند رُخ بہ تحریک قلم کشیدہ بتالیف نسخۂ مشتمل بر تحقیق لغت و محاورہ و صرف و نحو و منطق و عروض و قافیہ و بیان و بدیع ایں زبان پرداز ی، ہمیں کہ از زبان مبارک برآمدہ الستم کہ آں حضرت، الغرض از صرف توجہ بایں ارشاد نفع رسان فصیحان ہند و ابقائے نام ایں غلام مستہام ست۔ خلاصہ کلام ایں کہ امتثال امر عالی را ... ذخیرۂ خیر جاودانی دانستہ دست بدامن توفیق آویختم و ازیں سبب کہ در عالم استغراق بتحصیل لذات روحانی ابدی بمجلس ساقی بار یافتگان محفل عالی حضرت پیر و مرشد، و یاد کردن لطائف حضور اقدس کہ ہر روز بلافصل دو سہ چار از زبان معجز بیان ترشح می شود و می نماید و آں را خود بخود در کتاب لطائف السعادت کہ تا قیام قیامت بتمامی مرساد، می نوشتم و می نوشتم و خواہم نوشت ... ایں ہمہ فرصت بدست نیامد کہ نہار نگ چہرۂ ایں نقش بدیع کشم، میرزا محمد حسن قتیل را نیز کہ درکردۂ او بے تامل و کردۂ من پسندیدۂ او پسندیدۂ ایں کز مزبیان بود دوست، و از صغر سن میانۂ من و او در ہر چیز حصہ برادرانہ قرار پذیرفتہ، شریک ایں دولت ابدمدت ساختم و باہم چنیں مقرر شد کہ خطبہ کتاب لغت و محاورہ اردو و ہر چہ صحت و سقم آں باشد و مصطلحات شاہ جہاں آباد و علم صرف و نحو ایں زبان را راقم ... بنویسد و منطق و عروض و قافیہ و بیان و بدیع را او بتقصد قلم در آورد و چوں بندہ را بیشتر با نظم سروکار ماندہ و او را با نثر ہر وقت چند سطرے کہ می نویسیم نگاہ داشتن آں ہم نیز موقوف برپسند اوست۔ سوائے لفظ و محاورہ و اصطلاح اردو مخلش در عبارت ہمہ مقبول خاطر فقیر گشتہ !!

سید انشا یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں نے کتاب کا ایک نام ارشاد ناظمی اس رعایت سے رکھا کہ ناظم الملک بہادر کے حکم سے لکھی گئی ہے، اور دوسرا نام بحر سعادت قرار دیا۔ قتیل نے بھی دو نام رکھے۔ ایک دریائے لطافت اور دوسرا حقیقت اُردو۔ اس کے بعد مندرجات کتاب کی تشریح کی ہے۔ یہ اس فہرست کے مطابق ہے جو اس میں موجود ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جزیرہ سوم و جزیرہ چہارم و جزیرہ پنجم جو منطق، عروض و قوافی پر مشتمل ہیں، اس فہرست میں درج نہیں۔ خطبہ مصنف کے بعد پہلا ورود انہ شروع ہوتا ہے۔ اس کا عنوان "دربیان کیفیت زبان اردو" ہے۔ مصنف نے اولاحروف تہجی کے دو دو نام لیے ہیں جو سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت سے انھوں نے تجویز کیے ہیں اور یہی نام کتاب میں ہر جگہ برتے گئے ہیں۔

حروف تہجی کے نام یہ ہیں۔ اقبال، بخشش، پاکی طینت، ترحم، ثبات قدم، جوانمردی، چکمت، حکمت، خداترسی، چارہ سازی، دولت، ذکاوت فدویزی، ثروت، مجانچی، سطوت، شجاعت، صولت، ضبط، طرز بیان، ظہور برکات، علو نسب، غیرت، فتوت قدرت، کم دماغی، لشکر کشی، مروت، نفاست، وزارت، ہمت بلند، یاد حق۔

از "آرزو" جلیل

خاموش ڈراموں میں واقعات کا اظہار زیادہ تر خاموش عمل سے ہوتا ہے۔ "خاموش عمل" کرداروں کی نقل و حرکت پر منحصر ہے، اور اسی نقل و حرکت سے سامعین کل واقعات کو سمجھ جاتے ہیں۔ خاموش ڈرامے کو کامیاب بنانا مشکل کام ہے، کیونکہ خاموشی سامعین کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس لیے خاموش ڈرامے میں انتہائی کشمکش ہونی چاہیے ایسی کشمکش جس سے سامعین کے جذبات پر گہرا اثر ہو۔

بسا اوقات خاموشی گفتگو سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ شعرا کے نزدیک خاموشی ایک بحرِ بیکراں ہے جس میں ہزاروں معنی پوشیدہ ہیں۔ اس خیال کو ڈاکٹر اقبال نے اس طرح قلم بند کیا ہے ؎

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری + خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

خاموشی کی اس اثر انگیزی کا تجربہ ہمیں ڈرامے کے ذریعے بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے۔ روزمرے کی زندگی میں ہمیں اس قسم کے تجربے کا موقع مل سکتا ہے، لیکن زندگی کی تمثیل زندگی سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ جب ہم کوئی ڈراما دیکھتے ہیں تو ہماری توجہ صرف ڈرامے ہی کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ ڈرامے کے واقعات کا ہم غائر مطالعہ کرتے ہیں۔ ممثل کے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات پر ہم غور کرتے رہتے ہیں: ممثلین کی خاموشی ہمیں اُن کی گفتگو سے کم دلچسپ نہیں معلوم ہوتی۔

خاموش ڈراموں پر میں نے محض سرسری طور پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ کیونکہ میرا اصل مقصد میترلنک کے خاموش ڈراموں پر تبصرہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے میں نے اُس کے دو ڈراموں لزاویوگل (اندھے)[1] اور لال تیریر[2] کا انتخاب کیا ہے۔

"اندھے" ایک ایکٹ کا ڈراما ہے۔ اس کے افراد اندھے مرد اور اندھی عورتیں ہیں۔ یہ سب رات کے وقت ایک جنگل میں اپنے راہب کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ جنگل سمندر کے کنارے ہے۔ گہری خاموشی طاری ہے۔ کبھی کبھی خاموشی کا طلسم ٹوٹتا ہے اور سوکھی پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اندھے وقتاً فوقتاً بات چیت کرتے ہیں، پھر چپ ہو جاتے ہیں۔ وہ پریشان ہیں کہ راہب اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔

---

[1] اس ڈرامے کا ترجمہ جناب شاہد احمد دہلوی ساقی نے کیا ہے ملاحظہ ہو سالنامہ ساقی ۱۹۳۶ء

[2] اس کا ترجمہ "سکون" کے عنوان سے "معیار" کی اسی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے۔

گھنا جنگل، اندھے لوگ۔ آدھی رات کا وقت۔ ہوا کی سائیں سائیں۔ اور کبھی کبھی اندھوں کی آواز ........
اسی خاموش ماحول پر ڈرامے کی کشمکش منحصر ہے۔ یہ راہب کون ہے؟ بارہ بجے رات کو اندھے، اُس کا انتظار کیوں کر رہے ہیں؟ ........ سامعین کا اضطراب لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کتا آجاتا ہے اور اندھوں میں سے ایک شخص اُس کے اشارے پر چلتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک لاش سے ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ (خاموش عمل!)۔ اُسے تشویش ہوتی ہے کہ یہ کس کی لاش ہے۔ سب اندھوں کو وہ فرداً فرداً پکارتا ہے۔ اس طرح اندھوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن میں سے کوئی نہیں مرا۔ اور انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اُن کا مذہبی پیشوا مر گیا۔ اس کے بعد اندھوں کو قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے، اور بچہ جو اُن کے ساتھ ہے رونے لگتا ہے۔ قدموں کی آہٹ بہ تدریج قریب تر آتی ہے اور اندھوں کے درمیان آکر معدوم ہو جاتی ہے۔ "نوجوان اندھی عورت پوچھتی ہے" "تم کون ہو؟" تھوڑی دیر تک سناٹا چھایا رہتا ہے۔ پھر سب سے بوڑھی اندھی عورت کہتی ہے۔ "ہم پر رحم کر!" اس کے بعد خاموش وقفہ ہے۔ بچہ چلانے لگتا ہے اور پردہ گرتا ہے۔ خاموشی نے سامعین پر جادو کر لیا ہے، اُس کو میترلنک شور و غوغا سے درہم و برہم ہونے دینا نہیں چاہتا۔ اس لیے وہ ڈرامے کو عین اس وقت ختم کر دیتا ہے، جب بچے کی چیخ فضا میں گونجنے لگتی ہے۔

"لاں تیریر" کے مرکزی کردار ابتدا سے انتہا تک خاموش رہتے ہیں۔ افرادِ تمثیل حسب ذیل ہیں:۔

باغ میں: بوڑھا آدمی، اجنبی، میری و مارتھا (بوڑھے کی پوتیاں)

گھر میں: باپ، ماں، دو بہنیں، بچہ۔ (خاموش ہستیاں)

ڈرامے کے واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک لڑکی دریا میں ڈوب کر مر گئی ہے۔ اُس کی لاش لوگ اُس کے گھر کی طرف لا رہے ہیں۔ بوڑھا آدمی جو لڑکی کے والدین کا دوست ہے گھر کے باہر کھڑا ہے۔ وہ شش و پنج میں ہے کہ ان لوگوں کو کس طرح مطلع کرے کہ لڑکی ڈوب کر مر گئی۔ باہر سے مکان کا ایک کمرا نظر آ رہا ہے۔ جس میں گھر کے لوگ خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ گھریلو زندگی کا پُرامن منظر ہے۔ بوڑھا آدمی شش و پنج میں مبتلا رہتا ہے اور اسی عرصے میں کسانوں کا مجمع لاش لیے ہوئے مکان کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ بوڑھا آدمی مکان کے اندر جاتا ہے اور خبر بد سنا دیتا ہے۔

اس ڈرامے میں انتشار کا مقام یہ ہے کہ گھر والوں کو لڑکی کے ڈوب جانے کی خبر کس طرح سنائی جائے وہ مکان کے اندر آرام سے بیٹھے ہیں۔ لڑکیاں کپڑے سی رہی ہیں۔ ماں کی گود میں بچہ سویا ہوا ہے۔ سب کے سب خاموش اور بے فکر بیٹھے ہیں۔ انھیں کیا خبر کہ لڑکی دریا میں ڈوب گئی! ۔ یہ لڑکی دریا کے اُس پار اپنی دادی سے ملنے گئی تھی۔ گھر کے لوگ اُس کا انتظار بھی نہیں کر رہے تھے۔ غالباً اس وقت اُن کے دلوں میں لڑکی کے متعلق

کسی قسم کا خیال ہی نہ ہوگا۔ اس وقت بوڑھا آدمی ایک اجنبی کے ساتھ باغ میں داخل ہوتا ہے۔ دونوں مکان کے اندرونی منظر سے متاثر ہوتے ہیں اور لڑکی کے متعلقین کو اُس کی موت کی خبر سنانے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ وہ آپس میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں :-

اجنبی۔ اگر ہم باپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کریں اور اُس کو اشارہ کریں؟ اُس نے اپنا سر اس طرف پھیرا ہے میں کسی دریچے پر دستک دوں؟ ان میں سے کسی ایک کو دوسروں کے پہلے یہ خبر سننی ہی پڑے گی۔

بوڑھا آدمی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ میں کس کو انتخاب کروں .... انہیں بہت ہشیار رہنا چاہیے۔ باپ بوڑھا اور مریض ہے۔ ماں بھی علیل ہے۔ بہنیں بہت کمسن ہیں .... اور سب اُس سے ایسی محبت کرتے تھے جیسی محبت وہ پھر کبھی نہیں کرسکیں گے۔ میں نے کبھی اس سے زیادہ خوش و خرم گھرانا نہیں دیکھا ہے - - - - - - - - - -

اجنبی بوڑھے کو تنہا جانے کی ہدایت کرتا ہے۔ مگر بوڑھا اجنبی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ کیوں کہ اُس کا خیال ہے کہ "بدقسمتی" جس کا اعلان ایک ہی آواز کرتی ہے، بہت زیادہ نمایاں اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔" اُس کے خیال میں کسی بُری خبر کا اظہار اس طرح کرنا چاہیے کہ "غم کی یہی موج اپنی طاقت غیر ضروری الفاظ پر صرف کرے۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ بدنصیبوں کے گرد لوگوں کو اپنی خواہش کے مطابق جمع ہونے دیا جائے۔ بہت سے غیر متعلق لوگ بھی غم کے کچھ حصّے کو بغیر محسوس کیے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں"۔

اس عرصے میں مکان کے اندر کی فضا میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ گھر کے لوگ اس قدر مطمئن اور بے فکر نظر آتے ہیں کہ دوسروں کو اس بات کا احساس بھی تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سکون کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔

بوڑھے اور اجنبی میں گفتگو جاری ہی ہے کہ بوڑھے کی پوتی میری آتی ہے اور خبر دیتی ہے کہ لاش آرہی ہے ان کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ کس طرح مکان کے اندر جاکر موت کی خبر سنائیں۔ میری بوڑھے آدمی سے کہتی ہے :-

" اُن سے آج رات کو نہ کہیے دادا جان!"

تھوڑی دیر کے بعد بوڑھے کی دوسری پوتی بھی آتی ہے۔ وہ دادا سے خفا ہوتی ہے کہ اُس نے اب تک لڑکی کے والدین کو مطلع کیوں نہیں کیا۔ پھر کسانوں کا مجمع لاش لیے ہوئے قریب پہنچتا ہے۔ بوڑھا آدمی مکان کے اندر داخل ہوتا ہے۔ مجمع میں کانا پھوسی ہونے لگتی ہے۔ سامعین کا انتشار بڑھ جاتا ہے کہ بوڑھا "خبر بد" کس طرح سنائے گا اور لڑکی کے متعلقین پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ بوڑھا جب مکان کے اندر داخل ہوتا ہے تو "ماں" اُس کے استقبال کے لیے اُٹھتی ہے۔ ایک لڑکی اُس سے آرام کرسی پر بیٹھنے کی گزارش کرتی ہے، مگر وہ انکار کرتا ہے۔ بوڑھا باہر کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر گزارتا ہے۔ باپ بڑی بے تکلفی سے بات

چیت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بوڑھا آدمی کچھ بولتا ہے۔ گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ ماں چونک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور بے قراری میں بوڑھے سے سوالات کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بوڑھا کچھ کہتا ہے اور سر ہلاتا ہے۔ مجمع میں ہلچل ہوتی ہے۔ "اس نے ان سے کہہ دیا!" باپ، ماں اور دونوں لڑکیاں باہر کی طرف دوڑتی ہیں۔ مجمع مکان کے اسی جانب جاتا ہے جدھر سے یہ لوگ باہر نکل رہے ہیں۔ اجنبی تنہا رہ جاتا ہے۔ مکان کے اندر بچہ چین سے سویا ہوا نظر آتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اجنبی بھی چلا جاتا ہے۔

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ اس ڈرامے میں کشمکش کا موقع یہ ہے کہ لڑکی کے ڈوب جانے کی خبر اس کے متعلقین کو کیسے سنائی جائے۔ مکان کا اندرونی منظر اس قدر پرسکون ہے کہ بوڑھا آدمی خبر بد کا قاصد بننے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آخر کار تھوڑی دیر کے بعد وہ ہمت کر کے مکان کے اندر جاتا ہے۔ اگر اس موقع پر گھر کے لوگ اسٹیج پر بولتے پائے جاتے اور موت کی خبر سن کر بلند آواز سے اظہار غم کرتے تو ناظرین پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا ان کے خاموش عمل سے ہوا۔ بوڑھا آدمی ان کو موت کی خبر سناتا ہے۔ ان کے چہروں سے پریشانی کے آثار واضح ہیں۔ وہ مکان کے باہر نکلتے ہیں۔ سامعین کا اضطراب انتہائی درجہ تک بڑھا ہوا ہے۔ کیوں کہ مکان کے اندر کا منظر وہ صرف دریچوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ بوڑھے نے ان سے کیا کہا؟ انھوں نے اس سے کیا پوچھا؟ لڑکی کی موت کا اثر ان پر کیا ہوا؟ جب یہ "خاموش ہستیاں" مکان کے باہر نکلیں گی تو ہم انھیں دیکھ بھی سکیں گے؟ ان کی گفتگو بھی سن سکیں گے؟ ناظرین کے دلوں میں اسی قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اگر انھیں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملتا، کیونکہ عین اسی وقت پردہ گرتا ہے۔ اس وقت سامعین کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی؟ اس کا اندازہ ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

صوبۂ بہار

# گیارہویں صدی کی اُردو کا نمونہ

از قاضی عبد الودود

سید حارستہ دینیات کا ایک مختصر رسالہ ہے جو حضرت عماد الدین قلندر کی طرف منسوب ہے اور جس کا سال تصنیف ۱۰۔۔ یہ رسالہ بقول جناب تمنا انھیں کتب خانہ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب شہر پٹنہ سے ملا ہے۔ خلتے میں کاتب کا نام [illegible] لیکن جناب تمنا کا بیان ہے کہ یہ حضرت شاہ وجہ اللہ قلندر، خواہرزادہ حضرت شاہ نور الحق (بقول تذکرۃ الصالحین سال ولادت ۱۰۰۲ھ اور سال وفات ۱۱۰۲ھ) کا لکھا ہوا ہے کیونکہ ان کے خط سے ان کا خط ملتا ہے۔ یہ رسالہ از ابتدا تا انتہا خط نسخ میں لکھا ہے، اور بظاہر کم از کم تین سو اسی برس قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی نقل نور الحسن صاحب نے کی ہے اور اس کا مقابلہ اصل سے جناب خیال نے فرمایا ہے۔ ہم ان دونوں صاحبوں کے شکر گزار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس رسالے کا ایک نسخہ حضرت مصنف کا لکھا ہوا بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے، جناب تمنا اس کی تلاش میں ہیں۔ رسالے کی مندرجہ ذیل نقل بالکل اصل کے مطابق ہے۔ ابتدا میں سورۂ فاتحہ ہے، اس کے بعد اس طرح شروع ہوتا ہے۔

## سید حارستہ

امابعد پس جانو اے مسلمان بہین اور بہنی سب کہ اللہ تعالےٰ ایک ہیں۔ اون کے تیئں نظر، زبان، ہاتھ اور پانوں، انکھ کان پیٹ پیٹھ کوچھ نہیں ہے، وے طرح ہون مٹی سے بنین ہیں۔ وے مٹی پانی آگ ہوا سب کے تئیں تو آپی بناان ہیں۔ آسمان زمین پہاڑ ندی دریا سب اون ہی بنا ان ہیں۔ اُن کی تئیں صورت بھی نہیں ہے۔ صورت بدن کی ہو وے ہے۔ جب اون کے تئیں بدن نہیں تو صورت کیسے ہو سکی۔ اللہ تعالےٰ کے ایسا کوئی نہیں ہے، اور نہیں ہو سکے ہے۔ اللہ تعالےٰ کا کوئی شریک ساجھی سنگاتی نہیں ہے۔ اور نہیں ہو سکے ہے، نہیں اُن کے تئیں کوئی جنس ہے۔ اور نہیں اُون نے کسو کی تئیں جنی ہیں۔ اون کے تئیں جورو جاتا، بال بچہ نہیں، نہیں وے عورت ہیں، نہیں مرد، نہیں ہیجڑا، نہیں خنثی، نہیں وے لڑکا ہیں، نہیں بوڑھا، نہیں جوان، وے ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں اور آگے رہیں، جیسے تھے ویسے ہی ہیں، اور ویسی ہی رہیں، وے دیکھیں ہیں بنا آنکھ کے اور سنتے ہیں بنا کان کے، اور بولے ہیں بنا مونھ اور زبان کے وے سرد گرم، کڑا نرم سمجھیں ہیں بنا ٹوہ کے

غیب یعنی چھپی بات سب جن کی تیں کو نہیں جانیں، اللہ تعالےٰ ہی جانیں ہیں اُن کی سوائے کوئی نہیں جان سکے ہے،
وہی سب سیتی بڑی اور بزرگ ہیں، اُن سیتی بڑا اور بزرگ کوئی نہیں ہے، وو سب بات کے تیں اللہ ایستی جانیں ہیں
کوئی بات اُن سیتی چھپی نہیں ہے، کھانا پینا چلنا پھرنا اوٹھنا بیٹھنا سونا اونگھنا اور ان کے ایسی تمام سب بات سیتی
اُن کی ذات پاک ہے ◦

**فصل** اللہ تعالےٰ ہی کی تیں پوجنا چہیے، ماتھا، سیر دوسری کیسو کی آگے نیو رانا حرام اور شرک ہے،
**شرک** یو ہے کیسو کی تیں اللہ تعالےٰ کا ساتھی سنگھاتی بنانا اُن کے سوائے کیسو کی تیں پوجنا۔ کیسو کی تیں بیٹا بیٹی
حاجت و مراد دینہارا جاننا۔ کیسو بات میں اللہ تعالےٰ کی ایسا کیسو کی تیں جاننا کیسو کون ہر جاگہ کی بیچ حاضر ناظر
سمجھنا، ایک چھوڑ دوجا، دوسرا نہیں معبود جاننا، سورج، چاند، ستاروں کے تیں اچھا بُرا کرنے ہارا جاننا کیسو دیوتا
یا پیر یا پری یا کیسو پیر بزرگ سیتی حاجت مراد مانگنا، کیسو کی درگاہ یا مزار کے اوپر منت مراد مانگنا، کیسو کی قبر چومنا یا قبر کی
خاک سو غلہ جیو پر لگانا اور ملنا، قبر پر چادر، شیرنی چڑھانا، غازی میاں، بالے میاں، شیخ سدو میاں کوں ماننا۔ جن
بھوت و خبیث کے تیں دھیان رکھنی کوں ان چڑھاوا چڑھانا، امام صاحب کی منت ماننا، چبوترہ کی اوپر نیاز نذر کرنا اور
حاجت مراد مانگنا، سب شرک ہے اور حرام ہے جو بندا تو بہ کرے کدہی معاف نہیں ہو سکے گا، نہیں مرے پیچھے شرک کرنے والی
کے کوں اللہ تعالےٰ سیتی شفاعت کر سکے گا، نہیں دنیا کے بیچ شرک والی کی واسطے کیسو مسلمان کے واسطے بخشائش کی دعا مانگنا
جائز ہے، اللہ تعالےٰ ہر مسلمان کی تیں شرک سیتی بچا دیں، آمین ثم آمین ◦

**فصل** سب آدمی کے ہدایت کے واسطے اللہ تعالےٰ نے بہت سارے پیغمبر آدمی ہی میں سیتی بنائیں۔ سب سیتی
پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی تیں مٹی سے بنائیں اور سب فرشتوں کی تیں اُن کی اور مونھ کر کے سجدہ کرے کون کہیں
**ابلیس** شیطان کی تیں بھی حکم ہوا۔ سو اُس کمبخت نے سجدہ نہیں کیس سو ایسی واسطے راندا گیا اور مردود ہو گیا
دیکھو اللہ تعالےٰ کے حکم نہیں ماننے سیتی کیسا ہووے ہے، ابلیس جو کتنا بڑا بزرگ تھا سو ایک حکم کو نہیں ماننے سیتی راندا
گیا، تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کی پسولی چیر کر کے حضرت حوا کے تیں اللہ تعالےٰ نکالیں اور پھر ان دونوں کی بیچ میں
میاں بی بی کا رشتہ کھڑا کر کے نکاح باندھ کر کے ان دونوں سیتی اللہ تعالےٰ نے بہت سارے آدمی پیدا کیئیں جن کے
بیچ کچھ پیغمبر بھی ہوئیں۔ سب سے پہلے بڑے مشہور پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام ہوئیں، جن کے وقت میں بہت بڑا
طوفان آیا تھا جو ساری دنیا ڈوب گئی تھی ان کے بعد اور بھی بہت سے پیغمبر جن میں سیتی حضرت ابراہیم علیہ السلام
بہت بڑے پیغمبر ہوئیں، پھر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام
اور ان کے اگیارے بھائی سب، پھر حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت زکریا علیہ السلام
حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام، پیغمبر سب اُن ہی حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد سیتی ہوتیں گئیں۔ جو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو ئے بیٹے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں حضرت مریم کواری تھیں، اللہ تعالےٰ نیں اپنی
قدرت کا تماشا اپنے بندوں کے تئیں دکھلانے کو حضرت مریم کے تئیں بنا شوہر کے بیٹا عنایت کیا۔ جب حضرت عیسیٰ
علیہ السلام پیدا ہوئے تب حضرت مریم کے قوم نیں حضرت مریم کے اوپر بہتان لگانے اور طعنہ مارنے لگیں کہ بنا باپ کے یہ بیٹا
کہاں سیتی آگیا۔ تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو چھوٹے دین کے تھیں اُن کی گودی میں اللہ تعالےٰ کے حکم سیتی گواہی دیئیں کہ
ہم اللہ تعالےٰ کے ایک بندہ ہیں میرے کون اللہ تعالےٰ نیں کتاب دیئیں ہیں، اور میرے تئیں مبارک بنائے ہیں اور جیتے جی
تلک اپنے عبادت کا حکم کیئیں ہیں، اور میری ماں سیتی نیک کار ہیں اور اللہ تعالےٰ میرے تئیں ستھیارا بے سنگدل نہیں بنائے ہیں۔

**فصل** بڑے بڑے پیغمبروں کون اللہ تعالےٰ نے معجزہ بھی دیئیں تھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالےٰ کے حکم سیتی مُردہ
کون زندہ اور کوڑھی اندھلے کے تئیں دم بھر کے بیچ چنگا اور انکھیارا بنا دیتے تھیں حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ کے بیچ
لوہا موم بن جاتا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت ہوا کے اوپر اُڑتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تئیں ید بیضا
اور عصا ملا تھا یعنی جب کدھی وے اللہ تعالےٰ کے حکم سیتی اپنے جیب کے اندر ہاتھ ڈال کرکے نکالیں تھے تو اُن کی تل ہتھی
سورج کی طرح سیتی چمکنے لگی تھی۔

**فصل** حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل کی اولاد سیتی عرب کے ملک کے بیچ مکہ شہر میں
پیغمبری کے ختم کرنے والے آخری پیغمبر اور آخری رسول حضرت **محمد مصطفےٰ** صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے ان اگلے پیغمبروں
میں سیتی بعض بڑے بڑے پیغمبر جو تھے اُن کے اوپر اللہ تعالےٰ نے کتاب بھی اوتارن تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کے اوپر زبور
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اوپر توریت۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوپر انجیل اوتارن تھا۔ ہمارے آخری رسول حضرت
محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر قرآن شریف اوتارن، پہلے پیغمبروں کی اُمت نے اپنے اپنے پیغمبر کے کتاب کی بیچ بیچ میں اپنے جی
سیتی بہت کچھ ملا جلا اور کم و بیش کر دیئیں اس واسطے پہلے کتابوں کی اوپر کچھ بھروسا اعتبار نہیں رہا، اللہ تعالےٰ قرآن شریف
کی حفاظت کا وعدہ خود اپنے فرمائے ہیں، اس واسطے قرآن شریف کے بیچ میں کوئی بھی کچھ ملا جلا اور کم و بیش نہیں کر سکا اور قیامت
تلک نہیں کر سکے گا، جس طرح سیتی اوتارن تھا اُسی طرح سیتی آج تلک قرآن شریف ہے اور قیامت تلک رہیگا۔ قرآن شریف
اللہ تعالےٰ کا کلام ہے جس کون اللہ تعالےٰ نے اپنے فرشتہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہاتھ سیتی اپنے آخری رسول حضرت محمد
مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوپر **وحی** کرکے اوتارن اس واسطے اللہ تعالےٰ کے اوپر اور اُن کے سب رسولوں کے اوپر، اور
اُن کے سب فرشتوں کے اوپر جو اُن سب بھی اللہ تعالےٰ کے بندہ ہیں، اور نہیں وہ عورت ہیں، نہیں مرد، اور اُن سب کتابوں کے
اوپر جن کون اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبروں کے اوپر اوتارن سب کے اوپر ایمان لانا ہر مسلمان مرد و عورت کے واسطے فرض
اور ضروری ہے۔

**فصل**۔ دنیا کے بیچ میں جو کچھ جو آدمی کرے ہے سب کے واسطے ایک دین حساب کتاب کا ہے جس کون قیامت کا

دین کہن ہیں۔ اُسی دین سب کیسو کی بورے بھلے کام کا حساب ہووے گا۔ بہوت سارے مسلمان گنہگار بخشے جاویں گے
ہوئے نبی صاحب صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بہوت سارے گنہگار امتی کی شفاعت فرماویں گے۔ اُس دین جو جو اور ذرہ ذرہ کا
حساب ہوویگا۔ کافر او مشرک لوگ دوزخ کے بیچ اوندھے موں ڈھکیل دیے جاویں گے۔ نیک کام مسلمان اور جو گنہگار بخشا
گیا ہووے گا وے سب جنت کے اندر جاویں گے۔ دوزخ میں بہوت طرح کا عذاب ہووے گا۔ جنت کے اندر ہر طرح کا آرام ہوویگا
ان سب بات پر ایمان لانا ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے۔

**فصل**۔ ہر مسلمان کے اوپر **چوبیس گھڑی** کے بیچ میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے **فجر** کے وقت دو رکعت **ظہر** کے
وقت چار رکعت، **عصر** کے وقت چار رکعت، **مغرب** کے وقت تین رکعت، **عشا** کے وقت چار رکعت، جو نماز
کے تیں چھوڑ بیٹھا وہ کفر کرے ہے۔ اپنے دین کی عمارت کے تیں آپی ڈھاوے ہے، اور ہر سال بارہ مہینے کے بیچ سیتی
ایک مہینہ رمضان شریف کا بھر مہینہ روزہ رکھنا بھی فرض ہے۔ جو بیمار ہووے جب اچھا ہووے تب دوسرے مہینے میں قضا رکھے
اور جو مال والا ہووے اور نصاب والا تو سال پورا ہووے پیچھے سونا چاندی یا مال تجارت کے اوپر مال کا چالیسواں حصہ
زکوۃ نکالنا بھی اُس کے اوپر فرض ہے جس کے پٹے میں ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہووے یا ایک دوسرے
دوسرے کی کمی کے تیں پورا کردیوے تو وہ نصاب والا ہے اور جس کے تیں اللہ تعالیٰ اپنا دیون ہیں کہ وہ بال بچہ کی ضرورت
بھر گھر چھوڑ کے مکہ شریف تلک جا سکے اور رستہ بھی صاف ہووے بیچ میں ڈر خوف کی کوئی بات نہ ہووے تو عمر بھر میں ایک مرتبہ
خانہ کعبہ کا حج اُس کے اوپر فرض ہے۔

**فصل**۔ اپنے ماں باپ۔ شوہر کے فرماں برداری کا حق ادا کرنا۔ برادری والوں۔ پروس والوں سیتی اچھا سلوک کرنا۔ بال
بچوں کے تیں اچھی تعلیم دینا۔ اپنے بدن اور اپنے بدن کے کپڑوں کے تیں پاک رکھنا۔ یتیم۔ غریب۔ مسکین۔ محتاج پر رحم کرنا
بھی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور کیسو کی بے قصور جان مارنا۔ ظلم کرنا۔ مارنا۔ پیٹنا۔ مال چھین لینا۔ امانت کے بیچ خیانت کرنا۔ اپنی
جان کھونا۔ اور ڈاکا۔ چوری۔ زناکاری۔ دغا۔ حسد۔ کینہ۔ غرور۔ اپنے تیں دوسرے سیتی اچھا جاننا۔ دوسرے کے تیں اپنے
سیتی برا یا کمتی جاننا۔ تین دین سیتی زیادہ کیسو مسلمان سیتی دل میں غصہ یا عداوت یا بغض یا کینہ رکھنا۔ کیسو کے تیں کوسنا۔ کاٹنا
ہر وقت ناک بھوں چڑھائے رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سیتی نراس ہونا۔ کیسو کا احسان نہیں ماننا۔ کیسو کے اوپر اپنا
احسان جتلانا اور گداؤں کی تیں اپنے دست نگر اور احسان مند سمجھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اور ہر مسلمان کے اوپر بالکل حرام
ہے۔ ان سب بات سیتی بچنا ہر مسلمان کے واسطے فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان مرد۔ عورت کے تیں نیک کام کی
توفیق دیویں۔ اور ہر برے کام سیتی بچاویں۔ اور اس فقیر **عمادالدین** کے تیں جو شاہ برہان الدین کا بیٹا
ہے اور ان دونوں کے ماں باپ کے تیں اور سب مسلمان عورت مرد جیتے موئے کوں اپنی کرم سیتی بخشدیویں۔
اور سب کے گناہوں سیتی درگذر فرماویں۔ اور موئے پیچھے اپنے حبیب رسول کی شفاعت روزی فرماویں آمین ثم آمین۔

# رباعی

یارب نگہ عنایت ایدھر کردو — کانٹا ہے عماد تم گل تر کردو
بے رنگ گنہ سیتی رخ اس کا کالا — تم غازۂ عفو سیتی منور کردو

تمام ہوا یہ رسالہ صراط مستقیم معروف بہ سید عادستہ بتاریخ ۱۲ ربیع الاول شریف بیچ وقت ظہر کے سال ۱۰۸۱ھ ایک ہزار اکاسی ہجری میں۔ ۵ +

الحمد للہ کہ این رسالہ در مدت دو روز حسب فرمایش اہل خانہ خود در زبان مروجہ دیار خود نوشتہ شد و کہ مردان و زنان ناخواندہ را در زبان مادری ایشاں ذریعہ معلومات ضروریہ دینیہ گردد و برائے من ذخیرۂ آخرت شود۔
ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ +

حضرت مصنف کے حالات جو تذکرۃ الصالحین مصنفہ محمد حبیب اللہ صاحب عظیم آبادی میں مرقوم ہیں، مختصراً درج ذیل ہیں (ص ۱۱۱ تا ۱۱۳)، "آپ کے حالات تذکرۃ الکرام اور رسالۂ معارف پھلواری بابت شوال ۱۳۳۰ھ میں مندرج ہیں۔ سال ولادت ۱۰۶۵ھ ہے۔ تکمیل تعلیم کے لیے اٹھارہ، انیس برس کی عمر میں دہلی گئے، اور نبیرۂ شیخ عبدالحق دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی، اس زمانے میں حضرت سید محمد فاضل قلندر سادھوری سے فیض روحانی بھی پایا گیے، کچھ کتابیں باقی رہ گئی تھیں ان کی تکمیل کے لیے لاہور گئے، پچیس برس کی عمر میں اس سے فارغ ہوئے۔ اور دو سال وہاں کے مدرسے میں درس دیتے رہے، پھر سادھورے جاکر حضرت سید محمد فاضل قلندر سے بیعت کی، اور وہیں مقیم رہے۔ ۱۰۹۲ھ میں وطن تشریف لائے اور ۱۱۲۴ھ میں آپ نے انتقال فرمایا، اور دو صاحبزادے، ایک ہشت رسالہ دوسرے دو رسالہ یادگار چھوڑے"

اصل نسخے میں یائے مجہول بالعموم یائے معروف کی طرح لکھی گئی ہے، کاتب معیار نے کہیں تو اسے اسی طرح رہنے دیا ہے، کہیں اصلاح کردی ہے۔ وہ الفاظ جن کے املا میں کاتب کی غلطی کا امکان ہے، حسب ذیل ہیں:۔
اون، ان، اوس، اس، آوڑ، اور، ناگھ، ناگ، باتھ، ہاتھ، آپی، آپ ہی، میتی، مٹی، بہوت، بہت، دُسرے، دوسرے، دُنوں، دونوں، بورا، بُرا، دیکھلانا، دکھلانا، پھیر، پھر

# مطبوعات جدیدہ

۱۔ دیوان معروف۔ از قاضی عبدالودود۔ ۲۔ دریائے لطافت۔ از قاضی عبدالودود۔ ۳۔ سحر بنگال از ؟
۴۔ نیم بہار نمبر۔ از ؟ ۵۔ مادر ہند۔ از آرزو جلیلی۔ ۶۔ افکار عصریہ۔ از متعلم ۷۔ جبش اور اطالیہ از ؟
۸۔ محاکات الشعرا۔ از ق ع و

**۱ دیوان معروف**:- مصنفہ نواب الٰہی بخش خاں معروف دہلوی، مرتبہ شاہ عبد الحامد صاحب قادری بدایونی۔ تقطیع ۲۰×۲۶ ۱۶ ص ۱۴ + ۲۲۰ + ۲۶ = ۲۶۰ ملنے کا پتہ- عابد القادری مولوی محلہ بدایوں (قیمت عہ)

معروف نے یوں تو حاتم و مظہر دونوں کا زمانہ بھی پایا تھا، لیکن ان کی شاعری درحقیقت اس دور کی شاعری ہے جسے شاہ نصیر کے نام سے موسوم کرنا چاہیے۔ اس دور کے سب سے بڑے استاد نصیر تھے، ممنون، احسان وغیرہ بھی اس دور کے استادوں میں شمار ہوتے ہیں، لیکن شاہ نصیر نے دہلی ہی نہیں بلکہ اودھ اور دکن میں بھی اپنی اُستادی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ ذوق نے اپنی استادی کا سکہ اس دور کے ختم ہونے کے قبل ہی بٹھا دیا تھا، اور مومن و غالب نے اس کے ختم ہونے پر نام نکالا۔ دہلی کی شاعری کے لیے یہ انحطاط کا زمانہ تھا۔ شاعری کا مرکز منتقل لکھنؤ کو منتقل ہو گیا تھا، اور دہلی کے شعرا عموماً لکھنؤ کے صاحب طرز شعرا جرأت و ناسخ کی پیروی کرتے تھے، چنانچہ معروف کے دونوں دیوان میں تتبع جرأت و ناسخ کا اعتراف بکثرت موجود ہے۔ مرتب دیوان معروف کا خیال ہے کہ معروف درجۂ اول کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں، مصحفی سے لے کر نساخ تک جتنے تذکرہ نگار گزرے ہیں، ان میں سے ایک نے بھی ان الفاظ میں ان کا ذکر نہیں کیا جو درجۂ اول کے اساتذہ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کی رائے سے قطع نظر کر کے، اگر ان کے کلام کو دیکھا جائے تو وہ بھی انھیں اس مرتبے کا مستحق نہیں ٹھہراتا۔ ان درجۂ دوم کے اساتذہ میں، انھیں ممتاز حیثیت ضرور حاصل ہے۔ اور ان کا کلام خصوصاً وہ جو دیوان اول میں ہے لطف اور مزے سے خالی نہیں۔

کتاب کی ابتدا میں مرتب کا ۱۷ صفحوں کا مقدمہ ہے، جس میں معروف کے حالات بیان کیے گئے ہیں، اور کلام پر سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔ مرتب نے مصنف کے حالات زندگی معلوم کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، اور وہی باتیں لکھی ہیں جو متداول تذکروں میں ملتی ہیں۔ معروف کے اخلاف کے حالات البتہ مرتب نے زیادہ توجہ سے لکھے ہیں، حسب ذیل اقوال محل نظر ہیں:- ۱۔ وفات کے وقت عمر ۸۰ سے متجاوز تھی، اس سلسلے میں خود مرتب کا دوسرا بیان پڑھیے کہ معروف کے والد عہد احمد شاہ میں ہندوستان آئے اور اسی عہد میں ان کی شادی ہوئی۔ ۲۔ عارف جان نے دو لڑکے اپنی یادگار چھوڑے۔ آزاد نے چار لڑکوں کا نام لکھا ہے، اور آزاد کا قول صحیح ہے۔ ۳۔ میرزا علی بخش خاں معروف کے اکلوتے

بیٹے تھے۔ میرزا طالب کے بیان سے جو کتاب میں شامل ہے اس قول کی تردید ہوتی ہے۔ خود مرتب نے ایک ہی سطر کے بعد لکھا ہے کہ مرزا صاحب مرحوم نواب سرور الملک کے حقیقی چچا تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں بیانوں میں ایک ہی صحیح ہو سکتا ہے، لیکن طرہ یہ ہے کہ دونوں غلط ہیں۔ ہم۔ مرتب نے زمانہ تصنیف دیوان کی تعیین کی بھی کوئی کوشش نہیں کی، دیوان میں ۱۲۳۳ھ کی لکھی ہوئی ایک مثنوی اور تسبیح زمرد مصنفہ ۱۲۳۰ھ شامل ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کم از کم ۱۲۳۶ھ تک کا کلام اس دیوان میں ہو گا، لیکن اس بنا پر کہ اس کے بعد دیوان دوم کی تصنیف کے لیے صرف ۹ سال بچ جاتے ہیں، اور یہ دیوان ضخامت میں دیوان اول سے کچھ بہت کم نہیں، یہ نتیجہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مرتب نے اس قلمی نسخے کے متعلق جس پر دیوان مبنی ہے سوا اس کے کہ میرزا ظفر اللہ خاں نبیرۂ معروف سے حاصل ہوا ہے کچھ اور لکھنا غیر ضروری سمجھا ہے۔

دیوان مطبوعہ کے اشعار کی تعداد ۳۹۲۰ ہے، بدین تفصیل کہ غزلیات و مطلعات ۲۷۹۹، اشعار مثنوی ۲۶۲، قطعات و رباعیات ۶۲ (بعض اشعار ایسے بھی ۰۰ اس عنوان کے تحت میں درج ہو گئے ہیں، جو نہ قطعہ بند ہیں اور نہ ان پر رباعی کا اطلاق ہو سکتا ہے)، تسبیح زمرد ۱۰۱، مخمسات ۱۸۶، آشفتہ اور ذوق کے لکھے ہوئے دو قطعے بھی شامل دیوان ہیں،

مرتب دیوان نظری حیثیت سے مرتب کے فرائض میں کن باتوں کو داخل سمجھتے ہیں، اس کا ہمیں علم نہیں، لیکن عملی حیثیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان کا فرض قلمی نسخہ خواہ وہ مکمل ہو یا ناقص، صحیح ہو یا غلط، کاتب کے حوالے کر دینے پر ختم ہو جاتا ہے، اب کاتب جانے اور کتاب، سپردم بتو مایۂ خویش را، تو دانی حساب کم و بیش را، ایسی صورت میں اگر کتاب اغلاط سے مملو نہ ہوتی تو تعجب ہوتا۔ کچھ غلطیاں ایسی ہیں جن کا پڑھنے والے کو بآسانی پتا چل جاتا ہے، بہت سی ایسی ہیں، جن پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور کچھ ایسی ہیں کہ غور کرنے سے بھی ان کی تصحیح نہ ہو سکی۔ ہم نے ایسے اشعار کو جن میں غلطی کا احتمال ہے، اکٹھا کر دیا ہے، اور تبصرے کے آخر میں ہم انھیں درج کریں گے وہ الفاظ جو غلط یا مشکوک ہیں، ان کے نیچے نشان کھینچ دیا جائے گا، اور ان کی جگہ پر جو الفاظ ہم تجویز کرتے ہیں، قوسین کے اندر جگہ پائیں گے۔ بہت سے اشعار جن میں یائے مجہول و معروف اور اسی قبیل کی معمولی غلطیاں تھیں ہم نے طوالت کے خوف سے درج نہیں کیے، اس پر بھی رسالے کے بہت سے صفحات ان اغلاط نے لے لیے ہیں، جہاں تک ہمیں ان کے مقدمے سے پتا چلتا ہے مرتب کے پیش نظر صرف ایک قلمی نسخہ تھا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ غلطیاں بہت رہ گئیں، دوسرا یہ کہ متعدد غزلیں اور اشعار جو دیوان اول کے دوسرے نسخوں میں داخل ہیں، مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے۔ یہ اشعار ایسے

---

۱؎ تذکرہ گلشن بیخار شیفتہ مطبوعہ نول کشور طبع دوم۔ اشعار معروف منتخب از دیوان اول ص ۱۸۲ تا ۱۸۳۔ قس انتخاب دیوان معروف مرتبہ حسرت موہانی وغیرہ۔ غزل اس زمین میں دیوان میں ہے۔ غزل اس زمین میں دیوان میں نہیں ہے۔۔۔ تذکرہ مصحفی ص ۳۰۔ اگر کسی شعر کے قبل عدد ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ بشمول شعر مندرجہ اس قدر شعر ماخذ میں موجود ہیں۔ بقیہ اشعار کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

بھی نہیں جن کے متعلق احتمال ہو کہ مصنف نے نظر ثانی میں نکال دیے ہوں گے :-

کی وصیت یہ کچھ ارمان بھری آہ کہ رات — سلائے گھر کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا (ش +)

چشم تر سے گرچہ آ مژگاں پہ پانی پھر گیا — اس پہ بھی تو نوح کے طوفاں پہ پانی پھر گیا (ش -)

کہتا ہے جب وہ ہنس کر بے گریہ اختیاری — آتا ہے اور مجھ کو بے ساختہ رونا (ش -)

سو گئے جو اس کی ہم دیوار کے سائے تلے — ہم کو اس تقصیر پر اس نے جلایا دھوپ میں (ش +)

آپ جس قت رقیبوں کی قسم کھاتے ہیں — ہم رقیبوں کے نصیبوں کی قسم کھاتے ہیں (ش -)

دیکھ کر رفتار اس خوش قد کی کہتی ہے نسیم — جان یہ کس نے تن سرو سہی میں ڈال دی (ش +)

درد سر میں ہو گئے صندل لگانے کا دماغ — اس کا گھسنا اور لگانا درد سر یہ بھی تو ہے (ش +)

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل — کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جاتے ہے (ش -)

تم ایک مجھ سے کاش وفا کر کے بعد ازیں — مقدور کیا جو کوئی تجھے بے وفا کہے (ش -)

لاغر ہوں یہ کہ سب اسے باریک بیں کہیں — گر میرے دست و پا کو کوئی دست و پا کہے (ش -)

عمر آخر ہو چلی قاتل نہیں ملتا کوئی — کاٹ ڈالوں جی میں ہے اپنا گلا تلوار سے (س -)

واں زخم جگر پر بھی ترحم نہیں کرتے — کیا فائدہ پھاڑا جو گریباں کسی نے (ش -)

۲ صید شاہیں کی طرح ہوں میں اسیر الفت — ذبح کرتا ہے مجھے جو کہ چھڑاتا ہے مجھے (ش -)

ہائے اس شوخ کا یوں روٹھ کے جانا معروف — اور یہ کہنا کہ ہمیں اب نہ منائے کوئی (ش -)

۳ ہم تو جھوٹے ہیں محبت میں مگر — امتحاں بھی نہیں کرتا کوئی (ش -)

بعد مرنے کے ملی میری سیہ بختی کی داد — نعش کے ہمراہ تھا وہ موئے سر کھولے ہوئے (ش -)

دم بدم پاؤں سے تو ہم کو نہ ٹھکرا چل جا — خیر ہم دیکھ چکے فندق پا اچھی ہے (ش -)

کس کی چشم شرمگیں نے بے اجل مارا مجھے — سر پہ میرے جو قضا آئی تو شرمائی ہوئی (ش -)

معروف اب تو دیکھتے ہو تم ہمیں غریب — ٹک منہ لگائے یار تو پھر ہم کو دیکھیے (ش - ح)

دور جو بزم میں وہ ان کے بیٹھے ہم سے — کیا ہی پچھتائے کہ اٹھ آئے ہیں کیوں نہ ہوئے (ش -)

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے ٹلے — تڑپے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے (ش -)

ناتواں مجھ سے کو کس طرح کرے قاتل دو — ہوں میں وہ جزو کہ جو لا تجزی ہو جائے (ش +)

کیا چشمی اس کی تمامی کی وہ انگیا ہاتھ سے — ہاتھ ملتا ہوں گئی سونے کی چڑیا ہاتھ سے (م -)

خون فرہاد نے بیرنگ نہ چھوڑے پتھر — لعل و یاقوت کیے کوہ کے روڑے پتھر (ح +)

قبر مجنوں کے بھی اب کوئی نہ چھوڑے پتھر — تیرے دیوانے کو مارے نہیں چھوٹے پتھر (ح +)

ہر اک سوختہ دل پڑا دیکھے ہے گلشن میں — لگی دیتی ہے تیری بو صبا ہر برگ کو آتش (ح -)

کہوں کیا کچھ نہ پوچھو اس بت بے پیر کا عالم — کہ بوٹا سا ہے قد اور شکل ہے تصویر کا عالم (ح +)

۵ اول تو میں رکتا نہیں اور جس سے رکوں میں — تا حشر یہ ممکن نہیں پھر اس سے پھروں میں (ح -)

۲ ان کے گھر ہم ڈر سے جا سو کے جا سکتے نہیں — جی تو جلتا ہے بہت پر دل جلا سکتے نہیں (ح -)

۸ چپکے چپکے ایک تو ہنس آپ جمائی اور دی — تس پہ الٹی ہم کو تہمت آگے لگانی اور دی (ح -)

کس برق وش کی تیغ نگہ نے کیا شہید — ہم سرد ہو گئے دل اونگاہ گرم ہے (ح +)

کاہک ہوئی تھی جیسے کہ یوسف کی پر زاں — یوں آج یوسف اس کا خریدار گرم ہے (ح +)

۴ یوں نگہ دل پہ پڑی داغ جگر کے ہوتے — کھائی تلوار صد افسوس سپر کے ہوتے (ح -)

ہم نے دیکھا نہ کچھ مگر دھوکا — سو بھی تیرے سوا دیا کس نے (ح +)

۵ مژگاں کی چشم یار کے ہے بات میں چھری — لے دل کہیں نہ مارے اشارات میں چھری (ح -)

ہے دل میں زلف یار کے عالم کو دیکھیے — پھنستے ہیں آپ دام میں ہم ہم کو دیکھیے (ح -)

میں ہی نہیں ہوں شیفتہ حسن گندمی — آگے سے ہوتی آئی ہے آدم کو دیکھیے (ح -)

۳ خوبرو لاکھ جہاں میں کوئی ہشیار چنے — پر تجھے دیکھے تو نکلے سر بازار چنے (ح -)

نہیں میری جبیں پہ خاک شفا — درد سر کی دوا لگا دی ہے (ح +)

محو یاں تک ہوں تصور میں ترے از ذوق — ہاتھ ہر دم ترے داماں کی طرف جاتا ہے (ح +)

جوش طغیانی باراں ہے فضا اچھی ہے — مے پرستی کے لیے آب و ہوا اچھی ہے (ح -)

خاتمۂ دیوان کے بعد نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کی ایک تقریظ ہے جس میں معروف کے حالات درج ہیں اور آزاد کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ معروف ذوق سے اصلاح لیا کرتے تھے[1]۔ اس کے بعد جناب احسن مارہروی کا تبصرہ، ایک اور تقریظ اور چند قطعات تاریخ ہیں۔

مرتب نے اس کی امید دلائی ہے کہ حالات مساعد ہونے پر دوسرا دیوان بھی شائع ہوگا۔ ہم انھیں مشورہ دینے کی جرأت کرتے ہیں کہ اول تو وہ جتنے قلمی نسخے ممکن ہو سکے فراہم کریں، دوسرے یہ کہ کاپیوں کی تصحیح ایسے لوگوں سے کرائیں جو شعر فہم ہوں، ورنہ جس طرح انھوں نے دیوان اول شائع کیا ہے، اس سے تو دیوان کا پردۂ گمنامی ہی میں پڑا رہنا بہتر ہے۔

[1] طالب مرحوم کی تقریظ کے بعض مقامات مرتب نے حذف کر دیے ہیں۔ ہم ان کی تقریظ کے خارج شدہ حصے آیندہ شائع کریں گے۔

ص ۱ ـ یہ روشن ہے چراغ اس کفر دیں کا (کفر و دیں) ص ۱ ـ کماں جوں شمع فانوسی چھپے ہو (جوں) جوں کی جگہ چوں کاتب نے کی جگہ لکھا ہے۔

ص ۲ ـ نے نہیں سکتا ہے یک کروٹ بھی اے معروف آہ ۔ ہاتھ سے افتادگی کی ہے یہ حال نقش پا دا یک (کے) اس قسم کی غلطیاں بکثرت ہیں۔

ص ۳ ـ دونوں جہاں میں نما ہے یاد اس پاشت کا (پشت) ص ۳ ـ تیر خال لب اے جان دو عالم نقطہ کون ہے (ترا)

ص ۳ ـ تیری دوری میں لے دریائے خوں دل یہ مضطرب (تری)

ص ۴ ـ محتسب مستوں سے الجھا یہ بھی کچھ ہیجا نہ تھا (بیجا)

ص ۴ ـ ایسے ہفتہ دوست کی غلطی یہ مت جا اے رقیب ۔ چار دن کی بات ہے یاروں سے بھی یارانہ تھا لوگے غلطے

ص ۴ ـ کیونکر ہوا اس سرو قد سے مہ جائے دل حصول (کیونکہ)

ص ۴ ـ پہنے اے معروف صورت کا تماشا دیکھیے ۔ پھر وہاں سے کیجیے قبلہ قصد بیت اللہ کا (سورت)

ص ۵ ـ اور تو باتیں بری چھٹ گئیں سب جیتے جی ۔ آنکھ منہ سے پر نہ چھٹا ایک نگہ دیکھنا (پر چھٹا)

ص ۶ ـ شب وصل ہے لے سحر گہ تو سمی دوں (کہ) ص ۷ ـ سحرگہ خواب سے اٹھتا تو تھا دوران سر مجھ کو (اٹھا)

ص ۸ ـ روغ تاب و طاقت بھی اگر جاتا ہے تو کیا ۔ عدم کو کوچ ٹھہرا ہے ترے بیمار ہجراں کا (ہے)

ص ۹ ـ اسنتے تھے ہم روز قیامت ۔ روز وہ شب قیامت ہے برا نکلا جو دیکھا روز ہجراں کا (سے ؟)

ص ۱۱ ـ پھرا ہیں بزم میں گھسیں تو تیرا بیز کرو (تیراونیز) یہ ترکیب کلام معروف میں کئی جگہ پائی جاتی ہے۔

ص ۱۱ ـ اٹھانے ؛ ہاتھ گر اب تیرے گھر کے آنے والے پر ۔ تو میری قبر پر بھی ہاتھ اٹھانے تو یہ ٹھہرا آتا (نہ پھر آتا ؟)

ص ۱۲ ـ دل دیوانہ تیرا اس خیال چشم آہو کو ۔ پھرا جو دشت میں تو گھرے گھرے تو کیا آیا۔ (گھیرے گھیرے)

ص ۱۲ ـ کوبے انجم یک یہ مرغ دل بن خال مہ رویاں (گرے) ص ۱۳ ـ تو نے مجھے معروف ہم وہ جانیں سخنور ہو گیا۔ (وہ زاید ہے)

ص ۱۳ ـ بعد ایک عمر کے ہاتھ آیا (یک) ص ۱۴ ـ کیا کرتے تھے باہم قہقہے جوں قلقل مینا (جوں)

ص ۱۶ ـ لطف کیا جانے کورکر میرا (کور و کر) ص ۱۸ ـ بناوٹ کی لگاوٹ ہے سمجھتے ہیں نہ ہم چھپنا (یہ)

ص ۱۹ ـ پیالی مجھ کو بھر کر جام پر تے جا اے ساقی (پیالیے) ص ۲۲ ـ تجھ سا کبھی اے چشم جہاں نہ دیکھا (پہ)

ص ۲۲ ـ کی ہم نے رسوائی اب تنگ کرنے ۔ جہاں میں کوئی ہم سا رسوا نہ دیکھا (ننگ)

ص ۲۲ ـ فسردہ دل ان سے جہانی جہاں میں ۔ کہیں عشق بازی کا چرچا نہ دیکھا (ایسی)

ص ۱۰۱ سے پروا نہیں ہے کچھ مجھے نام ونشان کی + پرگندہ دل جہاں میں ہوں نقش نگیں سے میں ۔ (پرگندہ)
ص ۱۰۱ سے معروف ہوں گدا میں درشاہ مرتضیٰ (گدا ے)
ص ۱۰۳ سے سمجھ کر مانگو کبابی کی یاں دکاں نہیں (کے ، یاں)
ص ۱۰۵ سے دم بدم ڈھلتی رہے جیسے منارو‌ں کی چھاؤں ۔ (میناروں)
ص ۱۰۶ سے بشرہ بشر کا دیکھ کے کہتے ہیں بند کو (پند)
ص ۱۰۶ سے معروف درس عشق میں جاتے ہی ایک بار + ہم نے خرد کے طاق پہ رکھا کتاب کو (کی)
ص ۱۰۷ سے کیونکر تلاش در بدر کو بکو نہ ہو (در بدر و کو بکو)
ص ۱۰۸ سے سن کے کہا کہ کہہ بجو ان سے میں نے مزا بس بھر پایا (کہ ذاید)
ص ۱۰۹ سے اضطراب دل سے تیشہ اپنے سر پہ مار کر + ہم سے جنگ عاشقاں چاہے ہے اب کیا داد تو (ننگ)
ص ۱۱۳ سے ستم کشوں کو ہے تیرے نفس شماری آج + بس اب تو ہاتھ کہیں جور بے حیات سے دھو (بے حساب)
ص ۱۱۷ سے پھرتے ہیں یاں تلک اس کے خریدار ساتھ ساتھ + گویا لیے پھرے ہے وہ بازار ساتھ ساتھ (ہے ؟)
ص ۱۲۳ سے غنچہ سا منہ کو بھی ڈالا نہ گریباں میں کبھی ۔ (ساں)
ص ۱۲۴ سے آنکھ جھپکی ہو اگر ایک پل شب ہجراں میں کبھی (گر اک)
ص ۱۲۶ سے بے تامل تاج تخت خسرواں سے دوں ابھی ۔ (تاج و تخت)
ص ۱۲۹ سے لب پہ فغاں بغل میں دل آزار گرم ہے (زار)
ص ۱۳۰ سے روز پکا لگا دیا تونے (زور) ص ۱۳۰ سے خیر و شر کو ہم اسی پے دھر چلے (پر)
ص ۱۳۹ سے جو رسم مہر الفت یک بار بھول جائے ۔ (مہرو الفت)
ص ۱۳۷ سے رہنما ہے یہی اور یہی تیرا ادی ہے ۔ (یہ ہی ترا)
ص ۱۳۷ سے ایسے ظالم کو لکھوں خاک کتابت معروف + قاصد و وہم بھی جائے تو وہ گھائل آ ئے ۔ (قاصد و ہم)
ص ۱۳۹ سے شرمندہ بحر ہے نہیں قطرے کی جو حباب (کے) ص ۱۴۰ سے جو تیرے پاس ہولے خانا خراب تو دے (خانماں)
ص ۱۴۰ سے کیوں نہ ہو ممنوں سیل اشک میرا چشم زار + اس کے کوچے کی طرف تنکا سا بہتا جائے ہے ۔ (جسم)
ص ۱۴۲ سے کر ہم کو یاد مژگاں میں کسی کے طلا تا ہے ۔ (تملاتا)
ص ۱۴۵ سے کہ حرف صلح ہیں گر خط میں لکھا تو تھا بگڑ تا ہے ۔ (تھا زاید)
ص ۱۴۰ سے دیا نقش جو اس نے کھینچ کر ہمزاد اسی کو تو رنگ رکے آئینہ وہ ہیولا یوں نہیں یوں ہے ۔ (اسی کا)
ص ۱۴۹ سے کھینچتا ہے یار کی کلک تصور سے شبیہ (یار)

ص ۱۵۰ س ۵ واقعی معروف دو بے کر گئے ہیں زندگی۔ (دو ہی)

ص ۱۵۰ س ۱۵ کہا گر آپ اب اس کا اثر خدا جانے (کہاں) ص ۱۵۴ س ۱۱ کہ ثانی آج ہے جیرا قلم سحر آفریں (مانی)

ص ۱۵۵ س ۱۵ سنا گئی ہیں جو معروف کی فغاں شب و روز ؛ ازیں سبب مرغ حافظ جو بیدلان شب و روز۔ (گئے ہیں)

ص ۱۵۵ س ۱۵ مار پہلو میں مرے دشتہ و خنجر لاکھوں (دشنہ) ص ۱۵۶ س ۱۰ نہ ربط ہے مجھ کو قد دلجوے کسی کے ؛ کچھ واسطہ
ہم کو نہیں گردوے کسی کے ؛ واقف نہیں چشم و لب و ابروے کسی کے۔ (رنگ گل، دو؟)

ص ۱۵۸ س ۵ ہم عشق بتاں ترک ہی کر بیٹھے تھے کب کے ؛ لگ چلتے نہ تھے اور کھنچے رہتے تھے سب سے۔ (سے)

ص ۱۵۸ س ۲ آپ میں ہے معروف بیشہ و ساماں۔ (بے علیے سرو ساماں)

ص ۱۵۹ س ۲ راضی ہے تیری خو سے خفا اور خفا سے ہم۔ (جفا)

ص ۱۶۰ س ۲ وائے دل سوز محبت خوب ہی جیرا کا نمک۔ (دل وا)

ص ۱۶۱ س ۵ کچھ تو کہہ لے بت اغیار کہوں یا نہ کہوں۔ (عیار)

ص ۱۶۳ س ۲ اے دل چشم تو گر حقیقت بیں ہے ؛ چشمے بکشا ببیں حقیقت بین ہست (این ہست)

ص ۱۶۴ س ۱ جس شخص کو چاہتا ہے اپنا دل ؛ وہ چاہ کا مطلقاً نہیں ہے مائل۔ (مصرع اول ناموزوں ہے "دل" کے بعد یوں کا اضافہ ہونا چاہیے۔)

ص ۱۶۵ س ۱ خاموش ایک ہی رباعی کہکر ؛ ناچار بجھا کے چار پائی سورہ۔ (خاموش ہوا ایک)

ص ۱۶۵ س ۵ ہر گل میں بو ہے بو میں ہے گل ؛ دیکھ لے بہار کیا گل میں جز ہے جز میں ہے گل دیکھ سے بہار ؛
(کل، جزو جزو کل)

ص ۱۶۵ س ۔ ہے صبر پہ جور کہ گریاں مجھ کو ذبح کرتے ہیں ؛ مناسب تھا اگر اس پاؤں میں موزا چڑھا لیتے۔ (پاؤں)

ص ۱۶۵ س ۵ سو اب چلو ادھر ہے آخر برنگ شبنم (ہی) ص ۱۶۶ س ۔ ہم تو مرجاتے کبھو کے زیست کی ہے یہ وجہ (وجہ یہ)

ص ۱۶۶ س ۔ ان کو نرگس نے جو گلشن میں اشارے سے کہا ؛ سحر ہے اے بت بے باک تری آنکھوں میں۔
۔ گھور کر بولے یہ قدرت تری سیقل باندھے ؛ ہم کو تو کتی ہے خاک تری آنکھوں میں۔ (شفق باندی)

ص ۱۶۷ س ۔ معلوم ہو گیا ہمیں احوال آپ کا ؛ تا قل ہے جو کوئی اسے مکتہ کتاب ہے (عاقل نقطہ)

ص ۱۶۹ س ۔ ناصحا کر پیرہن کے واسطے ہو عیب چاک ؛ باوجود حسن گل کا ہے کو، کھے جیب چاک (اگر، حسن بنیر اضافت)

ص ۱۷۱ س ۔ عزیزو شب جو یاں مستی میں اکثر دیس آتا ہے، (آکر دیس لگاتا ہے)

ص ۱۷۲ س ۔ مجنوں کو جیتے جی زلف سیاہ مرغوب ہوتی ہے (سیہ)

ص ۱۷۴ س ۔ عشق کے نام جو ہیں یہ حرف ؛ (عشق کے نام میں جو تین ہیں حرف)

ص ۱۷۵ سے ننگ و ناموں کو مت کر تہ خاک ہ (ناموس)
ص ۱۷۵ سے لاکھ اپنے پر کروں میں جبر (ناموزوں ہے) اب یا اس قسم کا کوئی لفظ
ص ۱۷۶ سے اس نے پڑھنا کوئی سیکھا تھا عمل (پڑھنا) ص ۱۷۹ سے گاہ ہاتھوں سے بجھائی آتش۔ گاہ بستر میں لگائی آتش
(بجھائی، لگائی)
ص ۱۷۷ سے کہ نہ کچھ سنتے ہو نہ کچھ بولتے ہو (کچھ نہ سنتے ہو نہ کچھ بولتے ہو۔ یار کہ نہ کچھ سنتے نہ کچھ بولتے ہو)
ص ۱۸۰ سے وحشتِ شوق کے تکیں کی قسم (تمکیں) ص ۱۸۱ سے کہ بجھا تھا اس کا مشکل کام (بجھنا)
ص ۱۸۲ سے صائب و شوکتِ ظہیر و کلیم (صائب و شوکت و ظہیر و کلیم) ص ۱۸۳ سے بس گزرتا ہے حق و باطل ہم (دامنگے)
ص ۱۸۴ سے کہتے ہیں کچھ نہیں واں اور یہاں۔ (یاں) اس قسم کی غلطیاں اور بھی ہیں۔
ص ۱۸۴ یعنی کھولی کے بھی محل کو چھوڑ، (محل کو بھی)
ص ۱۸۵ سے آپ ہی دل میں رہو اپنے خجل (رہوں) ص ۱۸۹ سے جس کو صدا فکر مضامین رہے۔ (سدا)
ص ۱۸۶ سے جا ئیو اجمیری ہی دروازہ سے روک تو ہے واں بھی پہ اندازے (جا ئیو دروازے۔ اندازہ)
ص ۱۸۶ سے یوڑی والی کی دوکاں پہ الگ (دکان پر) ص ۱۸۷ سے جس سے کہ شرمندہ قصرِ بہشت (شرمندہ ہو قصرِ بہشت)
ص ۱۸۷ سے روکنے پائے نہ اس لیے چوبدار۔ (نہ لے چوبدار)
ص ۱۸۸ سے آپ سے مت سمجھو کچھ دور ہوں (سمجھو کہ یا سمجھیو) ص ۱۸۸ سے ان سخن یکے معروف اب (سخن کو مرے)
ص ۱۹۰ سے تا نیتری زندگانی مشکل ہے (تیری) ص ۱۹۰ سے اور ہے تقریر فرمانے لگے (ہی)
ص ۱۹۲ سے ہوگئی اس سرو قد پہ فاختہ (پر) ص ۱۹۶ سے سب اطبا ایک قلم حیران کار (یک)
ص ۱۹۷ سے گاہ ہشیار آئے گاہ دیوانہ آئے (گہ) ص ۱۹۸ سے الغرض ہنگامہ آزاری پہ تھی، وہ قضائی کار فرمائی نہیں تھی (آرائی)
ص ۱۹۹ سے پھر لگی کہنے کہ اے حیران کار، خلق کو کب ہے خدا پر اعتماد (اعتبار)
ص ۱۹۹ سے آپ ہی انصاف کر لو اے حزیں (کر یو؟) ص ۲۰۳ سے دیکھ کر اس طرح کرے التجا۔ (گرم)
ص ۲۰۵ سے اہلِ ماتم کا زبس غوغہ ہوا (غوغا) ص ۲۰۷ سے گاہ وہ بہاتے چشم سے دریائے اشک (گہ)
ص ۲۰۷ سے نفی اور اثبات کو وہ شاہِ دیں پہ گرہ کھاتے تھے واں عین الیقیں۔ (نہی)
ص ۲۰۸ سے جس سے دل بستا تھا سب کا دمبدم۔ (لبستا تھا)
ص ۲۰۹ سے چاک دامن تک گریباں چاک تھا، دل گداز وہ یہ وہ حیران تھا۔ (حیرتناک)
ص ۲۰۹ سے تھی وہ عرق بحر پہ ساحل پہ تھا (غرق) ص ۲۰۹ سے قبر میں ناچار اس کو گاڑ کر (گاڑ)
ص ۲۰۹ سے گور کھتی تھی اسے در گور تو۔ (کہتی)

ص ۲۱۴ سے کیا کہوں اڑ گئی طوطی سی مرے ہاتھ سے، رات (گئے طوطے سے)
ص ۲۱۵ سے ہے چشم سبزہ رنگ نشے میں مدام سُرخ + یا شرغے سی ہے پر زمرد کا جام سُرخ، (سے ہے یہ)
ص ۲۱۶ سے ہے صدا اس آئینے میں جلوہ گر طوطی کا عکس۔ (سدا)
ص ۲۱۷ سے ساقی نہیں ہے سبزہ مینا سے کیا غرض۔ (ہمیں)
ص ۲۱۷ سے مہدی کا اب تلک نہ سُنا تھا مزاج گرم۔ (مہندی)
ص ۲۱۸ سے اس سبزہ رنگ سے جب کھوینگے راز کچھ ہم (کھوینگے)
ص ۲۱۸ سے کھوے ہے ہر سبزہ رنگ اس سے ہری جگ ہیں۔ (چگ)
ص ۲۱۸ سے جیسے سبزہ رنگ بہشت ستر کی تحتی ہیں۔ (دیشب)
ص ۲۱۸ سے یارب اس دلبر کی گردے نیب جتنی عمر ہو + بلکہ سبزہ رنگ ہے وہ اس کی خضری عمر ہو (کرما دے نیب)
ص ۲۱۹ سے سبزہ رنگ اس تیرے خط رکھنے سے نادانی کھلے (کھلی)
ص ۲۱۹ سے ہمدم کب آئے نیندہ بن اس سبزہ رنگ کے۔ (نیند)
ص ۲۲ سے سیاہ کاری معروف نے سیاہ دروں + جو ہو سیاہ دروں اس بشر کا منھ کالا (سیاہ کار ہے)
ص ۴۸ سے منزل عشق میں یوں دل کو ہے بن آہ کے شوخ + بے عصا کور کرے جوں دم رفتار لحاظ (سوچ)
ص ۱۹ سے اسیر دام الفت ہو گئے یک بار جان و دل + کلی میں تیرے نیمہ جب سے دیکھا ہے دو دامی کا (کھلے)
ص ۷۰ سے صحبت کا یہ اثر ہے کہ معروف اپنے رنگ + کر دی ہے دیکھ تو نیہ زر گر میں زر کو آگ (دے، بوتہ)
ص ۹۱ سے سنوں ہے عشق میں کیونکر نہ وصیائے باتیں + گمان کی ہیں نرالی جہان سے باتیں (کمال!)
ص ۱۰۳ سے راحت خواب عدم دیکھ کے سب نے یک دست + نقش پائے کف برخالی میں در بند کیا (خاک)
ص ۳۰ سے یہاں تو داغ خوں دامن سے دھویا تو نے اے قاتل + وہاں اک دن کھلے گا گل ہماری بے گناہی کا (کھلے)
ص ۱۰ سے تمام منزل مقصد کو ہم رفیق + میں ناتواں چلتے ہی دو گام رہ گیا۔ (ہم رہاں؟)
ص ۱۵ سے اہل دل کے بغیر اب میرے دود سمجھے ہر اک بشر میرا (اب کی جگہ تو کب معلوم ہوتا ہے لیکن
لفظ میرے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی جگہ میرا ہو تو یہ خرابی ہے کہ ردیف بھی یہی ہے)
ص ۱۶ سے بلبل روح تازہ اپنے معروف + گر سنے ایک شعر تر میرا (ہو)
ص ۱۲۰ سے معروف کے جو دل میں الفت نہ ہو حیا کی (حیا) ۴۲ سے بکے اس کے ہزار ڈھونڈیں لوگ (کمرہ کی)
ص ۶۱ سے عنان شعلہ نے مضطرب پسرا اب تو + بھڑکتی ہے مرے دل میں تری آہنگ سے آتش (لے)
ص ۱۴ سے بلا ساحر ہے اس کی چشم کے سرے کا دنبالہ + کرے ہے نیزہ باز شاہ ترکستان بہ جادو۔ (نیزہ باز؟)

## دریائے لطافت

مصنفہ سید انشا و مرتبہ عبدالحق صاحب و مترجمہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ، ص ۸ + ۲۴ + ۳۹۶ = ۴۲۸ قیمت مجلد عہ غیر مجلد ع ، سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو نمبر ۶۲ ۔

دریائے لطافت ، د کے اس وقت تین مطبوعہ نسخے ہیں ، نسخہ مرشد آباد ۔ م ، جو مکمل اور سب صحیح ہے ، نسخہ انجمن ترقی اردو ۱۹۱۶ء جو بعض تصرفات کے ساتھ شایع ہوا تھا ۔ ن نسخہ ۱۹۳۵ء مزید تصرفات کے ساتھ اصل کا اردو ترجمہ ہے ۔ ت ، عبدالحق صاحب نے اپنے مقدمے میں غلط نہیں لکھا کہ اس سے پہلے کسی نے اردو صرف و نحو اور تحقیق زبان پر اس اصول و ترتیب کے ساتھ کوئی کتاب نہیں لکھی تھی ، زمانۂ حال میں بھی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ انشا کی تحقیق کو نہیں پہنچتیں ، اور بعض چیزیں تو وہ ایسی لکھ گئے ہیں کہ اگر وہ نہ لکھتے تو ہمیں ان کا کبھی علم نہ ہوتا ، کتاب کا مطالعہ کرنے سے واقعہ یہ ہے کہ بقول مرتب " سید انشا کی ذہانت ، باریک نظری ، زبان دانی ، اور زبان فہمی کا قائل ہونا پڑتا ہے " لیکن کتاب کو جیسی چاہیے ویسی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی ۔

ابتدا کی بے اعتنائیوں سے قطع نظر بھی کیا جائے تو اس کا کیا جواب ہے کہ ن کے ہزار نسخے اٹھارہ انیس سال میں بکے ، اب اس خیال سے کہ شاید اس کی مقبولیت کی راہ میں اس کی زبان حائل ہو ، انجمن نے اس کا اردو ترجمہ شایع کرایا ہے ۔ فاضل مرتب کا ارادہ اس کتاب کے ان مقامات کے متعلق جن میں گفتگو ، بحث اور تشریح کی گنجایش ہے ، تفصیل لکھنے کا تھا ، اس موضوع پر ان کی تحریر واقعی قابل دید ہوتی ، لیکن افسوس ہے کہ کثرت مشاغل سے انھیں اس کا موقع نہ مل سکا ۔ کیفی صاحب کا ترجمہ بھی سلیس ، بامحاورہ اور شگفتہ ہے ، کتاب کے مضامین کی تقسیم بھی اب اس طور پر کی گئی ہے کہ ن اور م کے مقابلے میں اس سے فائدہ اٹھانا بہت آسان ہو گیا ہے ، اور اب بھی اگر یہ کتاب مقبول عام نہ ہوئی تو ہمیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ یہ اہل اردو کی بد مذاقی کی بڑی دلیل ہوگی ۔

ت کی خوبیوں کے متعلق اس وقت جو کچھ لکھا گیا ہے ، اس میں صرف عام ناظرین کے نقطۂ نظر اور ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے ، اور ہم اپنے تبصرے کا یہیں خاتمہ کر دیتے لیکن اس ڈر سے کہ کیفی صاحب جو عموماً اہل نظر سے داد طلب ہوا کرتے ہیں اور عوام کی پسندیدگی کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے ، اس قسم کے سرسری تبصرے کو بے توجہی پر محمول نہ فرمائیں ، ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے ہم ان کے ترجمے کو جانچتے ہیں ۔ اگر ہم کیفی صاحب کی انصاف پسندی کے قائل نہ ہوتے ، اور انھیں اہل نظر میں نہ شمار کرتے تو نہ ان کے ترجمے کو دیدہ ریزی سے پڑھتے ، اور نہ چند سطروں سے زیادہ اس کے متعلق لکھنے کی ضرورت سمجھتے ۔

۱ ۔ ن میں کتابت کی جتنی غلطیاں تھیں ، وہ سب کی سب باستثناے بعض ت میں موجود ہیں ۔

۲ ۔ بہت سے الفاظ اور عبارتیں ن سے فحش و مبتذل ہونے کی بنا پر خارج کر دی گئی تھیں ، وہ اب بھی خارج ہیں ، یہ امر قابل اعتراض نہیں ، لیکن ن میں کہیں کہیں اس عمل کے ساتھ کاتب کی غلطی شامل ہو گئی ہے

جس سے بعض محاوروں اور روزمروں کے غلط معانی درج ہو گئے تھے، کیفی صاحب کو ان کی تصحیح کرنی چاہیے تھی،

۳۔ کیفی صاحب اپنے دیباچے میں عنوانوں کے نام بدل دینے کے علاوہ کسی اور قسم کے تصرف کرنے سے منکر ہیں لیکن انھوں نے جا بجا تصرفات کیے ہیں الفاظ اور عبارات بے سبب حذف کر دی ہیں، ضروری مثالیں ترک کر دی ہیں، مصنف نے بعض الفاظ کی جو تشریح کی تھی وہ خارج کر دی ہے۔

۴۔ ترجمہ بہت آزادی بلکہ ناجائز آزادی کے ساتھ کیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ م اور ن کے مطالعے سے جو ضمنی معلومات حاصل ہوتی تھیں، ت کے دیکھنے سے اس حد تک حاصل نہیں ہو سکتیں،

۵۔ یہ سن کر لوگوں کو تعجب ہو گا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بعض مقامات پر ترجمہ مصنف کے منشا کے بالکل خلاف کر دیا گیا ہے۔

۶۔ مصنفین کے حالات سے جناب کیفی بڑی حد تک ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔

۷۔ مترجم کی زبان پر بعض ایسے الفاظ اور تراکیب بھی ہیں جو نہ ہونی چاہئیں

اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ مترجم کی کل غلطیاں چن چن کر دکھائی جائیں، محض چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(۱) عبارت ذیل م سے ماخوذ ہے، ن اور م کا فرق بھی دکھا دیا گیا ہے، کیفی صاحب کا ترجمہ بھی اس کے بعد درج ہے۔

"سعادت یار خاں، رنگین تخلص پسر اوسط طہماسپ خاں کہ در شیوۂ آشنا پرستی وصفت شجاعت و سواری اسپ و دیگر مراتب عمل سپاہی عدیم البدل است از بس کہ (مدتے رخش ہمتش در وادی امتحان قوت باہ دویدہ) و بیشتر با زنان پردہ نشیں سروکار داشتہ، نبذے از مصطلحات شاں در فصلے از کتاب تالیف نمودہ خود نوشتہ بلکہ دیوانے در آں گفتگو بہ نظم در آوردہ، بہ دیوان ریختی کہ ایجاد او ست موسوم ساختہ، الحق کہ بادی شعر ہندی دریں زبان خان مذکور است۔ راقم آثم ایں مصطلحات را با سرہا دریں جا نقل می کند، زیرا کہ از دوستان بے ریا و باصفا است، و راقم را باوصف ہیچ مدانی مسلم الثبوت بہتر از شعرائے حال و ماضی زبان ریختہ می داند۔"

ن میں عدیم کی جگہ نم اور قوسین کے الفاظ خارج ہیں۔ "سعادت یار خاں رنگین خلف طہماسپ خاں جو دوستداری کے شعار اور سپاہگری و شجاعت وغیرہ مردانہ اشغال میں اعلیٰ درجہ رکھتا ہے، اس کو پردہ نشین مخدرات سے واسطہ رہا ہے۔ ایک جزو اس نے اپنی تالیف کی ہوئی کتاب میں ان کی زبان میں لکھا ہے، بلکہ اسی زبان میں ایک دیوان بھی کہا ہے، وہ ریختی کا موجد ہے اور اس دیوان کا نام بھی ریختی رکھا ہے، یہ سچ ہے کہ اس زبان (ریختی) ایسی ہندی شعر کا موجد خان مذکور ہے۔ راقم آثم، یہ اصطلاحیں وہیں سے نقل کرتا ہے، کیونکہ موصوف بے ریا اور مخلص دوستوں میں ہے، اور راقم کو باوجود ہیچ مدانی کے مسلم الثبوت اور گزشتہ اور حال کے شعرا سے بہتر سمجھتا ہے

(۱) عدیم البدل است، کا ترجمہ "اعلیٰ درجہ رکھتا ہے" کیا گیا ہے۔ ب زنانِ پردہ نشیں سے مصنف کی مراد شریف عورتیں نہ تھیں بلکہ بہ تقابل زنانِ بازار، خانگی عورتیں تھیں، اس کا ترجمہ پردہ نشیں مخدرات بالکل مدعاے مصنف کے خلاف ہے۔ ج رنگیں کے پسر اوسط ہونے، عیاشی کی طرف بہ شدت مائل ہونے اور ان کی سواری اسپ میں ماہر ہونے کا ذکر مترجم نے کیوں غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا، ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ د مصنف نے یہ نہیں لکھا کہ دیوان کا نام ریختی رکھا بلکہ دیوان کا نام دیوانِ ریختی رکھا، ہ "باسرہا" کا ترجمہ مترجم نے نہیں کیا۔ و مصنف نے صرف اتنا لکھا تھا کہ رنگیں مجھے ماضی و حال کے شعراے ریختہ میں سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ مترجم نے لفظ ریختہ کو اڑا دیا، اور اب دنیا مترجم کی ذرا سی بے پروائی کی وجہ سے یہ سمجھے گی کہ رنگین کی رائے میں انشا دنیا کے تمام شعراے بڑھ کر تھے۔

(۲) "چوں … در وقت والد مرحوم تحصیل کتب درسیہ منطق و حکمت بہ عمل آوردہ بودم و از مدتے …… آنچہ خواندہ بودم بہ سہو انداختہ بود"۔ "سواے اختلاط شعر و سخن اظہار مقدمات علمی در حضرت ایشاں حمل بر تنگ ظرفی خود کردم" "چونکہ … والد مرحوم کے وقت میں منطق اور فلسفے کی درسی کتابیں پڑھی تھیں اور مدت سے …. ان موضوعوں پر جو کچھ پڑھا تھا بھول گیا تھا، موصوف کی خدمت میں علمی مسئلوں سے متعلق گفتگو کے بدلے شعر و سخن سے صحبت گرم کرنا میں نے تنگ ظرفی خیال کیا،" ت ص ۸، ۹۔ مصنف کا مدعا اس کے بالکل برعکس ہے، مولوی حیدر علی انشا جن سے ملنے کے لیے گئے تھے جید عالم تھے، چاہیے تھا کہ انشا ان سے عالموں کے مذاق کی باتیں کرتے، لیکن چونکہ انشا کو اب علوم میں حسب دلخواہ دستگاہ نہ رہی تھی اپنے علمیت کے جتانے کو اس قسم کی گفتگو کرنا انشا نے تنگ ظرفی پر محمول کیا۔ اور شعر و سخن سے متعلق بات چیت کو ترجیح دی۔ تنگ ظرفی علوم سے متعلق گفتگو کرنے میں تھی نہ کہ شعر و سخن سے متعلق گفتگو کرنے میں۔ کیفی صاحب کا مصنف کے مدعا کو نہ سمجھنا حیرت انگیز ہے۔

(۳) مصنف نے دہری مذہب والے سید صاحب کا ایک لطیفہ لکھا ہے، جس میں سید صاحب کا جواب فارسی میں ہے، ت ص ۱۰۴ و ۱۰۵، سید صاحب کا جواب "قبلہ خیر ست" سے شروع ہو کر "مباحثہ می کند" پر ختم ہو جاتا ہے، مترجم نے اس کے بعد کی متعدد سطروں کا ترجمہ نہیں کیا، فارسی ہی رہنے دیا ہے اس گمان پر کہ یہ بھی سید صاحب کی تقریر کا جزو ہے، حالانکہ مباحثہ می کند کے بعد کی عبارت کو سید صاحب سے کوئی تعلق نہیں، اور ان کا ترجمہ کرنا چاہیے تھا۔

(۴) "دو ملا میں مرغی مردار۔ ت ۱۳۹، اگر مترجم نے م کے مطالعے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ انشا کی زبان پر دو ملا میں مرغی حرام ہی تھا، دو ملا میں مرغی مردار، کاتب ت کی ایجاد ہے،

(۵) پانی پت کے رہنے والے ہیں، اس کی تشریح یوں کی ہے کہ نرم اور میٹھے ہیں۔ ص ۱۶۰ ت حالانکہ م میں اس طرح ہے

بانی پت تک ۔ بسنے والے ہیں اور نرم ہیں اور ہیچے ہیں یعنی مفعول ہستند ۔ ان محاورات کو خارج کرنے کی وجہ ہو سکتی ہے، لیکن غلط معنی بتلانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ۔

۶ ۔ الایچی، دوگانہ، زناخی وغیرہ کی تشریح میں انشا نے صاف لکھا ہے کہ "این ہمہ القاب زنانے باشد کہ با ہم شغل ساحقت دارند" ص ۹۹ ن عبد الحق صاحب نے اس تشریح کو خارج نہیں کیا تھا ۔ لیکن کیفی صاحب کی ثقاہت اسے برداشت نہ کر سکی ص ۱۷۳ ت ۔ انھوں نے اصلی الفاظ تو رہنے دیے، لیکن ان کی تشریح عبارت بالا کو حذف کر کے ناقص کر دی اور اب اگر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ الفاظ انشا کے زمانے میں پاکباز شریف خواتین ایک دوسرے کے لیے استعمال کرتی تھیں، تو اس کی ذمہ داری کیفی صاحب کی ثقاہت کے سر ہوگی ۔

(۷) فن بیان کے متعلق جو قتیل کا مصنفہ باب ہے وہ مترجم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بجنسہ رہنے دیا گیا ہے، لیکن اس میں مترجم نے بہت کچھ قطع و برید سے کام لیا ہے ۔ کم از کم ناظرین کو انھیں اس سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا مثالوں میں جن کی اہمیت کا انھیں اعتراف ہے، بہت سی انھوں نے ترک کر دی ہیں میر حسن کا شعر ذیل جو ص ۲۱۲ ن میں موجود ہے، انھیں متروکات میں سے ہے، حالانکہ میر حسن کے مراثی (شعر مرثیے کا ہے) نہایت کمیاب ہیں، اور دیوان حسن کے قلمی نسخوں میں بھی نہیں پائے جاتے، ؎

تم تو سر دینے رن میں سدھارے فاطمہ کے پیارے حسینا ،،
آج آفت ہے گھر پہ تمہارے فاطمہ کے پیارے حسینا ،،

(۸) قتیل کا نام مترجم نے میرزا محمد احسن لکھا ہے اور ان کا وطن فرید آباد بتایا ہے، ت ص ۲۵۹ ۔ قتیل کا نام محمد حسن ہے اگر سند کی ضرورت ہوئی تو بکثرت سندیں پیش کی جا سکتی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ قتیل کے فرید آبادی ہونے کی سند کیفی صاحب پیش کریں مگر معاصرین کا قول ہونا چاہیے،

(۹) مترجم نے، انشا کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جو دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے تھے، حاشیہ ص ۲ ت ۔ لیکن، انشا دہلی کے رہنے والے تھے اور نہ یقینی طور پر معلوم ہے کہ ان کا قیام کب سے کب تک دہلی میں رہا ۔ انشا مرشد آباد سے شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد گئے تھے، اور ان کی وفات کے بعد فیض آباد سے رخصت ہو گئے تھے، ان کے کلام سے مختلف السنہ ہند سے واقفیت کا پتا چلتا ہے، اور تعجب نہیں کہ کسی ایک جگہ جم کر رہنے کے بجائے یہ مختلف اقطاع ہند کی سیر کرتے رہے ہوں، دہلی میں ان کا غیر معلوم مدت تک قیام مسلم، لیکن محض اس بنا پر ان کا شمار مہاجرین دہلی میں کیونکر ہو سکتا ہے،

(۱۰) اہل ہنود چنگا وڈ صفت اور ازادی کے سے الفاظ اور تراکیب مترجم کی زبان پر ہیں،

## سحرِ بنگال

از طاہرہ دیوی شیرازی، ص ۱۲۷، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶، قیمت عمہ ملنے کا پتا ساقی بک ڈپو دہلی

عورتوں کا مردانہ نام اختیار کرکے کتابیں لکھنا کوئی نئی بات نہیں، جورج ایلیٹ اور ژرژ ساں کے اصلی نام سے لوگ عام طور پر واقف نہ ہوں، لیکن مغربی ادب سے سرسری شناسائی رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ یہ عورتیں تھیں جو مردانہ نام سے اپنی کتابیں شائع کیا کرتی تھیں، زمانے کا انتقام بھی عجیب ہوا کرتا ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے یہ دونوں اب بھی مشہور ہیں، ان کی کتابیں اب بھی پڑھی جاتی ہیں، لیکن ان کے اصلی نام ادبیات کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والوں کو چھوڑ کر شاید ہی کسی کو معلوم ہوں، عورتوں کا اپنی تصانیف کے لیے مردانہ نام اختیار کرنا بے سبب نہ تھا۔ ایک تو یہ کہ عورتوں کی ذہنی صلاحیتوں کی طرف سے عام بدگمانی تھی، وہ عورتیں جو ادبی شہرت حاصل کرنے کی آرزومند تھیں ڈرتی تھیں کہ اگر کتاب ان کے اصلی نام سے شائع ہوئی تو نقاد اس سے منصفانہ برتاؤ نہ کریں گے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے عورتیں بہت سی باتیں آزادی کے ساتھ کہتے ہوئے جھجکتی تھیں، اور سلامتی انھیں اسی میں نظر آتی تھی کہ جو کچھ کہیں بظاہر وہ مردوں کی طرف سے ہو۔ تیسرا سبب نفسی ہے، اور اسے بھی اس تبدیل نام میں بڑا دخل معلوم ہوتا ہے۔ عورتیں مردوں کے مقابلے میں اپنی پستی (انفی ریوریٹی) کا شدید احساس رکھتی ہیں، یہاں تک کہ بعض میں تبدیل جنس، کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے، نام بدل لینے سے وہ عورت سے مرد تو نہیں ہو جاتیں، لیکن وہ یہ سمجھنے لگتی ہیں کہ اس ظلم کی جو فطرت نے ان کے ساتھ روا رکھا ہے، فی الجملہ تلافی ہو گئی۔

اس کی مثال بہت کم ملتی ہے کہ کسی مرد نے زنانہ نام اختیار کرکے کتاب شائع کی ہو، اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہندوستان کے ریختی گو شاعروں نے زنانہ تخلص رکھے، لیکن اپنا کلام خود ہی پڑھتے رہے۔ تاریخ ادبیات میں پیرلوئی شاید پہلا شخص ہے، جس نے اپنے نتائج فکر ایک عورت کی طرف منسوب کر دیئے۔ پیرلوئی نے اپنی نظموں کا مجموعہ نغماتِ بلیتیس، کے نام سے شائع کیا تو اپنی حیثیت صرف مترجم کی بیان کی، اور اصلی مصنف ایک قدیم یونانی شاعرہ کو قرار دیا۔ پیرلوئی کا بیان اپنی جگہ پر اتنا مضبوط تھا کہ عامۃ الناس کا کیا ذکر ہے، علمائے یونانیات بھی دھوکا کھا گئے۔ اس کتاب کے ۴۰ سال بعد اردو میں سحرِ بنگال شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر مصنف کی حیثیت سے طاہرہ دیوی شیرازی کا نام ثبت ہے، دیباچے میں ان کی داستان حیات بیان کی گئی ہے، اور اہل شک کی طمانیت قلب کے لیے مصنف کی تصویر بھی کتاب میں شامل ہے۔ لیکن ان اہتمامات کے باوجود طاہرہ دیوی شیرازی کو عالم آب و گل کی ہستی سمجھنا ضرورت سے زیادہ سادہ لوحی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ کتاب کسی عورت کی بساط سے باہر ہے یا کسی بیرونی کو اردو پر یہ قدرت نہیں ہو سکتی۔ دور کیوں جائیے، ہمارے زمانے میں، اور خود بنگالے ہی میں سروجنی نائیڈو موجود ہیں، جن کو ایک بیرونی زبان انگریزی پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ بہت سے انگریزوں کے لیے باعث رشک ہو سکتی ہے۔ طاہرہ دیوی شیرازی کے وجود خارجی کو تسلیم نہ کرنے کی اصلی وجہ ہمیں یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولف خود بھی

اس کے زیادہ خواہش مند نہیں کہ طاہرہ دیوی شیرازی، ان کی مخلوق ذہنی سے زیادہ سمجھی جائیں، اور وہ خود سحر بنگال کی تصنیف کے شرف سے محروم کردیے جائیں۔ ان کے لیے بہ آسانی ممکن تھا کہ طاہرہ دیوی کی داستان حیات میں ایسی باتیں درج کرنے سے جو بعید الاحتمال ہوں گریز کرتے، لیکن ایک ایسی بنگالی نژاد ہندو عورت، جو شانتی نکتن کی تعلیم یافتہ، بنگلہ، ہندی، اردو، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ ان زبانوں میں مضمون نگاری کی بھی قدرت رکھتی ہو، سب سے بڑھ کر یہ ایک ایسے مسلمان کی بی بی ہو جو ۱۹۳۱ء میں عہدۂ سفارت پر فائز ہوکر ایران گیا ہو، اور جواب افسانہ نگاری سے بیوگی کا غم غلط کررہی ہو، افسانوں کے صفحات میں مل سکتی ہے، لیکن مادی دنیا میں اس کے وجود سے انکار کرنے کے لیے بہت زیادہ متشکک ہونے کی ضرورت نہیں۔

مولف نے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ "پیش نظر مجموعے میں چند افسانے طبعزاد ہیں، اور باقی ماخوذ یا ترجمہ" لیکن جہاں تک ترجموں کا تعلق ہے، صرف ایک ہی افسانے کے مصنف کا نام بیان کیا ہے، باقی افسانوں کے متعلق مولف کی طرف سے ناظرین کو حق حاصل ہے کہ انھیں طبعزاد سمجھیں یا ترجمہ۔ مولف کو شاید اس کا احساس نہیں ہوا کہ ان کی اس فروگزاشت کی وجہ سے اس کتاب کے متعلق ناقدانہ حیثیت سے کچھ لکھنا کس قدر دشوار ہوگیا ہے۔ ہم کسی افسانے کی تعریف بھی کرنا چاہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولف کو اچھا افسانہ لکھنے کی داد دیں یا اچھا ترجمہ کرنے کی۔ ادبیات میں مصنف اور مترجم کا مرتبہ ایک نہیں ہوسکتا، اور وقت آگیا ہے کہ ہمارے اہل قلم ان دونوں میں جو فرق ہے اسے محسوس کرنے کی کوشش کریں۔ مولف نے یہ بھی اقرار کیا ہے کہ انھوں نے اصل افسانوں کو اردو کے قالب میں ڈھالتے ہوئے بہت کچھ بدل دیا ہے۔ مولف کے حق میں ہم اس سے بہتر دعا نہیں کرسکتے کہ انھیں بھی اپنے طبعزاد افسانوں کے لیے ویسے ہی مترجم ملیں۔

دوسری بات جو اس کتاب میں کھٹکتی ہے وہ 'دختر کفش دوز' کی عریاں نگاری ہے۔ اگر مولف نے اپنے نام سے یہ کتاب شائع کی ہوتی تو یہ بات چنداں قابل گرفت نہ ہوتی، لیکن ایک عورت کی زبان سے (خواہ وہ مولف کے تخیل کی موج ہی کیوں نہ ہو) اس "خفیف اختلاف" کا بیان جو صنف نازک کو صنف کرخت سے جدا کرتا ہے، عضویات کی بحث میں موزوں ہو تو ہو ادبیات میں قطعی بے محل ہے۔ شائد مولف کی نگاہ اس پہلو پر بالکل نہیں پڑی کہ یہ وہی بات ہے جسے سبزی فروش اپنی زبان میں "پھڑک کر بیچنا"[1] کہتے ہیں۔ ذوق سلیم جمالی نقطۂ نظر سے اسے پسند نہیں کرسکتا، اور کچھ تعجب نہیں کہ مسز چودھری[2] نے اپنی تقریر میں اس افسانے کو خاص طور پر قابل اعتراض قرار دیا تھا۔

---

[1] انشا کا شعر ہے ۔ دل کو رکھ کر دامن مژگاں تر پر بیچیے + یعنی اپنا مال ہے اس کو پھڑک کر بیچیے۔

[2] اردو کی حمایت میں کلکتے کی عورتوں نے ابھی حال میں ایک جلسہ کیا تھا۔ صدر مجلس استقبالیہ مسز چودھری تھیں۔

سحر بنگال میں ایک افسانہ " بنگالی ادب اور ایک گمنام شاعرہ " کے نام سے بھی ہے۔ مولف کو اس کے افسانہ ہونے سے انکار ہے، اور اس انکار کے جواز کی انھیں بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک بار اس انکار کے بعد ان سے بجا توقع تھی کہ وہ آخر تک اس پر قائم رہیں گے، اور کوئی لفظ ان کی زبان سے ایسا نہیں نکلے گا جس سے سربالا دیوی کے وجود میں شک پیدا ہو جائے، لیکن مولف نے یہ لکھ کر کہ سربالا دیوی کے والد کو کلکتہ یونیورسٹی نے ڈی او ایل کی اعزازی ڈگری دی تھی، اپنی بنائی ہوئی عمارت خود مسمار کر دی ہے۔ ڈی او ایل کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے ملتی ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے نہیں ہے تو ذرا سی غلطی، لیکن اس کا اثر بڑا ہے۔

سحر بنگال کے دیباچے میں دو رائیں بھی نقل کی گئی ہیں، ' خواب رنگیں ' کے متعلق ایک ذمہ دار رسالے کے مرتب جو خود بھی ترجمے کا کافی تجربہ رکھتے ہیں' فرماتے ہیں " اگر آج موپاسان زندہ ہوتا تو یہ فیصلہ نہ کر سکتا کہ ترجمہ کون سا ہے اور اصل کون سا " موپاسان تو آج زندہ نہیں، لیکن اس کے افسانے زندہ ہیں، پیرا ے ژاں ' کا دیباچہ بھی موجود ہے، جس میں زبان اور اسلوب بیان کے متعلق موپاسان نے اپنے خاص مسلک کی توضیح کی ہے۔ ' خواب رنگین ' کی رنگیں بیانی کی ایک خاص نقطۂ نظر سے تعریف کی جا سکتی ہے، لیکن ہمیں بہت شبہ ہے کہ اگر موپاساں اردو سے واقف ہوتا تو اسے اپنے نام سے منسوب کرنے کی اجازت دیتا۔ ' ہم جلیس ' کی ترکیب موپاساں کی زبان پر نہیں ہو سکتی، اور روزمرہ اردو کے خلاف موپاساں ' سفینے ' کو کشتی پر ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔ ہم اس سے بے خبر نہیں کہ میرزا غالب نے سفینے کو کشتی کے معنی میں استعمال کیا ہے، لیکن سوال موپاساں کی زبان کا ہے' میرزا غالب کی زبان کا نہیں۔

دوسری رائے ' سکون کی جستجو ' کے متعلق ایک بزرگ کی ہے' جو اردو کے مشہور انشا پرداز اور ایک رسالے کے " رئیس التحریر " ہیں، آپ کا خیال ہے کہ اس افسانے میں " جس اعلیٰ پیرایے میں تجزیۂ نفسی ( سائیکو اینلی سس ) کیا ہے' ادب اردو میں اس کی مثال ملنی محال ہے " ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ افسانہ اچھا ہے' اور اگر طبعزاد ہے تو اس کی تصنیف سے مولف کے بہت سے ادبی گناہوں کا کفارہ ہو گیا ہے، لیکن اس افسانے کو قابل تعریف سمجھنا اور بات ہے اور اس کو تجزیۂ نفسی ( سائیکو اینلسز ) کے نمونے کے طور پر پیش کرنا اور بات ہے۔ اگر سائیکو اینلی سز یہی ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تحصیل کے لیے ویانا اور زوریچ جانا بے سود ہے' اور پھر لکھنؤ ہے بھی کس قدر قریب۔ سائیکو اینلی سز کے متعلق فرواُئڈ' ایڈلر اور ینگ نے جو کچھ سکھایا ہے اسے حرف غلط کی طرح صفحۂ خاطر سے محو کیجیے اور اس ہمہ داں بزرگ کے آگے زانوئے ادب تہ کیجیے، جس کے دماغ کی ہمہ گیری کے سامنے عمرو عیار کی زنبیل بھی بے حقیقت ہے۔

**ندیم گیا** بہار نمبر ۳۵ء مرتبہ جناب انجم، تقطیع ۲۰×۳۰/۸، ص ۳۳۲ تصاویر ۲۲ قیمت ؏

کہتے ہیں کہ بہار کی آب و ہوا اُردو کے رسالوں کے لیے ساز گار نہیں، ندیم سے اُردو کی کوئی اور خدمت بن پڑتی ہو تی جب بھی اس کے لیے یہ فخر کچھ کم نہ تھا کہ اس کے کارکنوں کے حوصلے اور استقلال نے اس ہمت شکن قول کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ یہ معلوم کر کے بھی ہمیں بڑی مسرت ہوئی ہے کہ یہ رسالہ صرف اہل قلم کی ایک جماعت کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے اپنی مالی بنیاد بھی مضبوط کر لی ہے۔ اس صوبے کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم جناب انجم کو مبارک باد دیتے ہیں۔

ندیم چند سال سے، سال بھر میں غیر معمولی ضخامت کا ایک پرچہ بہار نمبر کے نام سے نکالا کرتا ہے، اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کل مضامین بہار ہی اہل قلم کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں، یہ قید بقول جناب "انجم" صرف اس غرض سے لگائی گئی کہ اپنے صوبے کے اہل قلم حضرات کو کسی طرح عمل میدان میں کھینچ کر لایا جائے اور اُردو ادب کی خدمت پر آمادہ کیا جائے صوبجاتی تعصب کو اس میں کچھ دخل نہیں" ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جناب انجم کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

زیر نظر نمبر میں جائے امتیاز سید سلیمان صاحب ندوی کے مضمون "نوجوانان بہار اور خدمت ادب" کو دی گئی ہے۔ سید صاحب کو اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے مخاطب اس مضمون سے بُرا نہ مان جائیں، برخلاف اس کے، ہماری رائے ہے کہ سید صاحب کی ہر دل عزیزی میں اس مضمون کی اشاعت سے معتد بہ اضافہ ہو جانے کی توقع ہے۔

سید ریاست علی صاحب کا مضمون "سید غلام حسین مصنف سیر المتاخرین" اور سید ابو ظفر صاحب ندوی کا مضمون "شتاب رائے" قدر کے قابل ہیں۔ یہ دونوں مضمون زیادہ تر سیر المتاخرین سے ماخوذ ہیں، لیکن "سیر" ایک ضخیم کتاب ہے، اور ان دونوں کے حالات اس کتاب میں کسی ایک مقام پر نہیں ملتے بلکہ منتشر ہیں، ان کو تلاش کر کے نکلنا، اُردو میں ترجمہ کر کے ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کرنا بھی محنت کا کام تھا۔

پہلے مضمون میں تین نقص ہیں، ایک تو یہ کہ تکمیل سیر کے بعد مصنف پر کیا گزری، اور کب تک وہ زندہ رہا، اس کے متعلق مضمون نگار نے کچھ نہیں لکھا، اس کے لیے ہم انھیں الزام نہیں دے سکتے، کیونکہ ایک آدھ مورخ یا تذکرہ نگار کے سوا کسی نے اس کا حال نہیں لکھا، دوسرے یہ کہ اخلاف غلام حسین کا حال بہت ہی تشنہ ہے اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس پر بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے، تیسرے یہ کہ غلام حسین کی ادبی زندگی کا بیان بالکل ناکافی ہے۔ غلام حسین کا تخلص وفا تھا اور اس کا دیوان فارسی اور مثنوی اب تک موجود ہیں، اور راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

دوسرے مضمون کے متعلق ہمارے اعتراضات زیادہ سنگین ہیں، ایک تو یہ شتاب رائے کے متعلق کچھ لکھنا اور مہاراجہ کلیان سنگھ کی کتاب خلاصۃ التواریخ کی طرف رجوع نہ کرنا ویسا ہی ہے جیسے غلام حسین کے حالات لکھنا اور سیر سے منھ موڑنا۔

دوسرے یہ کہ اگر ادبیات اردو کی تاریخ کے مطالعے کا انھیں موقع نہیں ملا تھا، تو جب شتاب رائے کی ادبی تاریخ کی طرف توجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی ان کا مختصر سا بیان اغلاط سے بھرا ہوا ہے۔

۱۔ شتاب رائے کا ادبی ذوق بہت بلند تھا ... اور خود بھی شاعر تھا۔ ۲۔ حزیں ... نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ۳۔ عظیم آباد میں ... شعر و سخن کا خوب چرچا تھا۔ اور یہ تمام ذوق ادب راجہ رام نرائن اور مہاراجہ شتاب رائے کا پیدا کردہ تھا۔ ۴۔ راجہ شتاب رائے بھی علم و ادب کا شیفتہ تھا، دہلی اور دوسرے مقامات سے شعرا اور ادبا آتے تھے اور گوہر مراد لے کر مالامال واپس جاتے۔ اور اس طرح اکناف ہند میں پٹنے کا نام روز روشن کی طرح مشہور ہو گیا۔" ۵۔ فغاں احمد شاہ کے سوتیلے بھائی تھے۔ ۶۔ راجہ شتاب رائے کے صاحبزادے راجہ بہادر، راجہ تخلص کرتے تھے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے۔ شتاب رائے کے شاعر اور ادب نواز ہونے کا ذکر کسی تذکرے اور تاریخ میں نہیں، اور نہ محض شاعر کی حیثیت سے کسی شخص کے انعام پانے لوگوں کا ان کی قدردانیوں کا حال سنکر پٹنے کی طرف کھچنے کا کہیں ذکر ہے۔ لے دے کر ایک فغاں ان کے یہاں ملازم تھے، اور وہ بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ مصاحب کی حیثیت سے ورنہ دربار دہلی سے شتاب رائے انھیں ظریف الملک مصاحب الدولہ کے خطاب نہ دلواتے۔ (تیسرا خطاب بھی اسی قسم کا ہے، اس وقت یاد نہیں آتا) فغاں احمد شاہ کے سوتیلے بھائی بھی نہیں بلکہ کوکہ تھے۔ سعادت جنگ نامی کوئی رئیس پٹنے میں نہ تھا، اور نہ حزیں اس نام کے کسی رئیس کے ملازم تھے۔ حزیں کو صولت جنگ سے تعلق تھا اور وہ کسی طرح بھی عظیم آباد کے رئیس نہیں کہے جا سکتے۔ حزیں کا انتقال بھی شتاب رائے کے بہار آنے سے پہلے ہی ہو چکا تھا، راجہ رام نرائن کے یہاں اگر کوئی اردو گو شاعر ملازم تھا تو اس کا نام رائج الوقت تذکروں میں نہیں ملتا۔ اس کے تین شعر البتہ اردو کے تذکروں میں ملتے ہیں، اس بنیاد پر جتنی بڑی عمارت بھی چاہے کھڑی کر لیجیے۔ شتاب رائے کے تین بیٹے شاعر تھے ایک کا تخلص عاشق، دوسرے کا مجبور، اور تیسرے کا گریاں۔ راجہ کسی کا تخلص نہ تھا۔

رسالے کی جان سید وصی احمد بلگرامی صاحب کا مضمون "حسن کشش" ہے جو رسالے کے ۲۰ صفحات پر آیا ہے۔ اس سے قبل ہمیں بلگرامی صاحب کے کسی مضمون کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن ہم ان کے ایک ہی مضمون کو دیکھ کر، اپنی ذمہ داری کے کامل احساس کے ساتھ، یہ کہہ سکتے ہیں، کہ وہ صرف نثر نگار نہیں بلکہ انشا پرداز بھی ہیں۔ لیکن ان کی انشا میں تشبیہ، استعارات اور دوسرے صنائع کا بہت خرچ ہے، اور یہ طرز تحریر ایسا ہے کہ اگر کافی احتیاط نہ کی جائے تو حقیقت سے انحراف بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ضرورت سے زیادہ لفاظی ممکن ہے کہ ابوالفضل کے عہد میں پسند کی جاتی ہو، آج کل تو وولٹیر کے اس قول پر عمل ہے کہ اپنی تحریر کو زوائد سے بری کرو۔ طرز تحریر سے قطع نظر کرکے اس مضمون پر یہ اعتراض بھی وارد ہو سکتا ہے کہ مضمون میں بہت سی بیکار اور خارج از بحث باتیں درج کر دی ہیں۔ داستان [illegible] کے سلسلے میں حضرت شفق کے قطعے کی کیا ضرورت تھی، اور اس مضمون میں جو سلطان شاہ صغیر کے متعلق ہے حضرت [illegible] کے

انکسار کے ثبوت میں ان کا خط نقل کرنے کا کون سا محل تھا؟ تاہم یہ ان کی انشا پردازی کا کمال ہے کہ باوجود ان غیر ضروری باتوں کے داخل کر دینے کے، ان کے مضمون کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جو دلچسپی سے نہ پڑھا جا سکے۔ وہ بھولی بسری داستان کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اشخاص افسانہ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ رہا ان کا دعویٰ کہ شاد مرحوم نے صفیر مرحوم سے اصلاح لی تھی، اس میں اگر پہلے کچھ بولنے کی گنجایش بھی رہی ہو تو شاد مرحوم کے اس اعتراف کے بعد کہ صفیر اُستاد من بود کچھ کہنا مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہے۔ دسمبر کے ندیم میں حق گو نے اس اعتراف کی اہمیت کو یہ کہہ کر کم کرنا چاہا ہے کہ یہ اعتراف اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ بظاہر حق گو صاحب کے اخلاقی معیار سے ہمارا معیار جدا گانہ ہے، ورنہ ایک ہی فعل انھیں اخلاقی کمزوری کا نتیجہ اور ہمیں اخلاقی جرأت کا نتیجہ نہ نظر آتا۔ جناب نہال کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاد کے خط کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں لفظ اُستادی الحاقی ہے، لیکن ان کا یہ دعویٰ کہ سلطان مرحوم مرقع فیض کے مصنف ہونے سے منکر تھے ثبوت کا محتاج ہے۔

ظریفانہ مضامین میں آپ ٹو ڈیٹ شاعری، لطف سے خالی نہیں، لیکن مان پوری صاحب نے دیہات کی جیتی بعض مناظر ایسے بھی دکھا دیے ہیں، جن پر پردہ ہی ڈالنا بہتر تھا۔

## مثنوی مادر ہند

مصنفہ خاں بہادر میر علی محمد صاحب شاد مرحوم، و مرتبہ ظہیر احمد صاحب مجروح عظیم آبادی ص ۵۷ + ۱۴۷ = ۲۰۰، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتا، شاد بک ڈپو، چوگھرا، پٹنہ سیٹی

شاد عظیم آباد کے مایۂ ناز شاعر تھے، ان کی وفات کے بعد ان کی تصانیف کی اشاعت کی غرض سے ایک مجلس قائم ہوئی تھی، جس میں بڑے ذی اثر اور با اقتدار اصحاب شریک تھے، لیکن اس مجلس کا عدم وجود برابر ثابت ہوا اور چند تجویزیں منظور کرنے کے سوا اس نے کچھ نہ کیا۔ اب ان کے تلامذہ ان کی تصانیف کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں، چنانچہ مثنوی مادر ہند جناب حمید عظیم آبادی کی تمہید، جناب رشید احمد صدیقی صاحب اور سیماب صاحب اکبر آبادی کے مقدموں کے ساتھ ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، یہ مثنوی ملکۂ وکٹوریا کی پہلی جوبلی کے موقع پر لکھی گئی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان کا زمانۂ حال میں مقبول ہونا ذرا مشکل ہے۔

صدیقی صاحب اور سیماب صاحب کے بعض بیانات محل نظر ہیں، مثنویوں کی اتنی طویل فہرست کی چنداں ضرورت نہ تھی، اور اگر اس کی ضرورت سمجھی گئی تھی، تو اس کو صحیح اور مکمل بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ دکنی زبان کی بیسوں اہم مثنویوں کا سیماب صاحب نے ذکر ہی نہیں کیا۔ مصحفی نے بیس کے قریب مثنویاں لکھی ہیں، سیماب صاحب کو صرف ایک کا علم ہے۔ حسن کی مثنوی کا نام گل ارم نہیں، گلزار ارم ہے۔ دریائے لطافت مصنفہ انشا کو مثنوی سمجھنا حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ سیماب صاحب نے قطب شاہ کو اردو کی پہلی مثنوی کا مصنف اور غواصی کو دوسری مثنوی کا مصنف قرار

دیا ہے۔ قطب شاہی خاندان میں اس لقب کے بہت سے پادشاہ ہوے ہیں، سلطان قلی قطب شاہ، ابراہیم قلی قطب شاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ وغیرہ۔ محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۹۸۸ھ سے سنہ ۱۰۲۰ھ تک حکومت کی اور اسی کے نام سے بعض حضرات نے اُردو کی پہلی مثنوی کو منسوب کیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا تخلص دکنی زبان میں معانی تھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سنہ ۱۰۱۸ھ تک صرف قلی قطب شاہ کی مثنوی ہی تھی۔ اسی سال وجہی نے مثنوی قطب مشتری لکھی۔ اس کے بعد متعدد شعرا نے بیسیوں مثنویاں لکھیں۔ غواصی کی مثنوی سیف الملک و بدیع الجمال سنہ ۱۰۳۵ھ میں لکھی گئی۔ غواصی کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" کا سن تصنیف سنہ ۱۰۴۹ھ ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ "یورپ میں دکنی مخطوطات": مرتبہ نصیر الدین ہاشمی)۔ صدیقی صاحب "خاور نامہ" کو اُردو کی دوسری مثنوی قرار دیتے ہیں حالانکہ سنہ ۱۰۵۹ھ کے پہلے کی متعدد مثنویاں موجود ہیں۔

مثنوی مادر ہند کا مختصر قصہ یہ ہے کہ مادر ہند کے دو بیٹے رام اور رحیم تھے، ان میں اتفاقاً پھوٹ ہو گئی ہندوستان میں غیر ممالک کے بعض تجار آئے اور مادر ہند کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ رام اور رحیم کے پردے میں ہندو اور مسلمانوں کی نااتفاقی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ غیر ملکی تجار انگریز ہیں، جنھوں نے آخرکار ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ اور اسے بڑی ترقی دی۔ ذیل میں مثنوی سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:-

ساقی نامہ:-

ساقی قدح شراب لاجلد — اک آگ لگی ہے مے پلا جلد
جلتا ہے جگر جو اس بیاں پر — شعلہ ہے سخن مری زباں پر
اُٹھتا ہے دُھواں جو اپنے سر سے — اوجھل ہے جہاں مری نظر سے

مادر ہند کا بیٹوں کو سمجھانا

وہ چارہ گر شکستہ حالاں — وہ بانوئے دل فگار و نالاں
سوچی کہ رہوں خموش اگر میں — کھو بیٹھوں گی آپ اپنا گھر میں
دونوں بیٹوں کو تب بلایا — شفقت سے گلے لگایا
الفت سے ہر ایک پر نظر کی — کس جوش سے لیں بلائیں سر کی
پھر گرم سخن ہوی وہ اس طرح — ہے ہے مجھے نیند آئے کس طرح
سنتی ہوں کہ بھائیوں میں ہے سو — پھیلی ہوئی یہ خبر ہے ہر سو
کمبخت نفاق رنگ لایا — آخر کو یہ دن تمھیں دکھایا
اس پر بھی نہ تم کو ہوش آیا — آپس میں لڑے یہ جوش آیا

خطاب بہ ساقی

ساقی ہے فلک کو انقلاب اب — چکر میں ہے عقل دے شراب اب
اک جام میں مجھ کو بے خبر کر — نے ڈھال کے قصہ مختصر کر

بے دُردِ زلال ہے یہی مے ۔۔۔ ہر مشرب میں حلال ہے یہی مے
پھر ہوش نہ آئے اب جو بہکوں ۔۔۔ بلبل کی طرح سے خوب چہکوں

مثنوی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔

## افکار عصریہ

مصنفہ چارلس آر گبسن۔ مترجمہ محمد نصیر احمد عثمانی۔ سلسلۂ دارالمصنفین اعظم گڈھ نمبر ۳۴ ص ۲۵۰، تقطیع ۲۶×۲۰، قیمت درج نہیں ہے۔

اس کتاب میں جدید سائنس کے بعض انکشافات کو عام فہم پیرایے میں بیان کیا ہے۔ ابتدا میں جوہروں کی تعمیر، اور برق اور مقناطیسیت کی حقیقت سے بحث ہے۔ پھر نور کی ماہیت اور اس کے مختلف نظریوں کا بیان ہے۔ تیرھویں باب میں رنگ کی اصلیت سے بحث ہے۔ اس کے بعد طیف (اسپکٹرم)، ستاروں کی پیدایش، زمین کی عمر، ریڈیم، تجاذب (گراویٹیشن) اور مثبت شعاعوں (پوزیٹو ریز) کے متعلق مختصر مقالے ہیں۔ مصنف نے مندرجہ بالا موضوعات پر محض عام فہم پیرایے میں اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب کا علمی پایہ بلند نہیں ہے۔ سائنس کی جدید ترین انکشافات سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ نظریۂ اضافیت۔ نظریۂ دقائق (کوانٹم تھیوری)، ویو میکانکس۔ نور کے متعلق سر سی ۔ وی ۔ رامن کی دریافت، لاسلکی مراسلت، اور ٹیلی ویژن کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف خود کوئی بلند پایہ مفکر یا سائنس کا ماہر نہیں ہے۔ اس کتاب کو لکھے ہوئے بھی عرصہ گزرا۔ سائنس کی ترقی اتنی سرعت سے ہورہی ہے کہ سائنس کی ترقیوں کے متعلق اگر کوئی کتاب آج لکھی جائے تو وہ کل پرانی ہوجائے۔

اس کتاب کا ترجمہ اردو جاننے والوں کے لیے بہرحال مفید ہوگا۔ کیونکہ سائنس کے مشکل مسائل کو سمجھنے کے قبل بنیادی مسائل کی واقفیت ضروری ہے۔ عامۃ الناس کے لیے بلند پایہ علمی کتابوں کی نہیں بلکہ عام فہم کتابوں کی ضرورت ہے۔ "افکار عصریہ" میں ان کے لیے معلومات کا کافی ذخیرہ ہے۔ ترجمہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔ بعض اصطلاحات بہت اچھی ہیں شلاً "زیمین ایفکٹ" کے لیے "زیمینی منظر"، "میڈیم" کے لیے "واسطہ"، "ایٹم" کے لیے "جوہر"۔ لیکن بعض اصطلاحات سے غلط معنی پیدا ہوتے ہیں۔ "اورا" کا ترجمہ شفق نہیں ہو سکتا۔ بیٹری کو "مورچہ" کہنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ "فیلڈ" کا ترجمہ "میدان" مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء کے ادبی دنیا میں جناب آرزو جلیلی کا ایک مضمون بعنوان "مصطلحات علمیہ" شائع ہوا تھا۔ صاحب مضمون نے فیلڈ کا ترجمہ "فضا" کیا تھا۔ "الیکٹرک فیلڈ" کے لیے "برقی فضا" زیادہ مناسب اصطلاح ہوگی۔ اس کی توجیہ مضمون نگار نے اس طرح کی تھی کہ "الیکٹرک فیلڈ" اس حلقے کو کہتے ہیں جہاں تک برقی طاقت کا اثر محسوس ہو۔ بیٹری کا ترجمہ انھوں نے "بطیری" ہی کیا ہے۔ کیونکہ

ایلکٹرک بیٹری کو مورچہ نہیں کہتے۔ لڑائی کا مورچہ جس کو انگریزی کی فوجی اصطلاح میں بیٹری کہتے ہیں، برقی بیٹری سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ اگرچہ سائنس کی اصطلاحات وضع کرنا مشکل کام ہے اور غلطیوں کا ہونا لازمی ہے، لیکن مترجم کو ایسی فاش غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ "بیٹری" کو مورچہ اور "فیلڈ" کو میدان کہنا فاحش غلطیاں ہیں۔ مجھے ایک اصطلاح بہت پسند آئی۔ صفحہ ۱۸۱ کی تیسری سطر میں مترجم نے "ایلکٹرو میگنیٹک فیلڈ" کا ترجمہ "برقاطیسی میدان" کیا ہے۔ برقاطیسی، "برقی مقناطیسی" کی مخفف شکل ہے۔ یہ نہایت ہی موزوں اور آسان لفظ ہے۔ صرف لفظ "میدان" قابل اعتراض ہے۔ "برقاطیسی فضا" بہتر اصطلاح ہوگی۔

## حبش اور اطالیہ

:- مرتبہ اختر حسین صاحب، اپوری سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو۔ ص ۱۹۲ قیمت عہ

ماضی سے بے تعلقی اگر سطحیت کی دلیل ہے تو حال سے بے پروائی مردہ دلی کی علامت ہے۔ انجمن ترقی اردو کا ایک رُخ اگر ماضی کی طرف ہے تو دوسرا مستقبل کی طرف، اور یہی وجہ ہے کہ قدیم تذکروں اور دواوین کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ اور حالات حاضرہ سے متعلق کتابیں بھی وہ شائع کیا کرتی ہے۔ اردو کے تبصرہ نگار کا قول ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان میں حبش کے متعلق ایسی پر از معلومات کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ اور زبانوں کا حال تو ہمیں معلوم نہیں لیکن ہندوستانی زبان میں حبش و اطالیہ کی اشاعت سے قبل، اصغر صاحب کے ایک مختصر سے رسالے کے سوا جو انھوں نے کئی سال ہوئے بچوں کے لیے لکھا تھا، کچھ موجود نہ تھا۔ اس کتاب کے مرتب "اردو" کے ہونہار مضمون نگار اختر حسین صاحب ہیں، لیکن اس کے مختلف ابواب مختلف اشخاص سے لکھوائے گئے ہیں۔ "جشن اور عرب" ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے، اس باب میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ انگریزی کتابوں میں بھی نہیں مل سکتیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ خیال کہ ابرہہ کا ہاتھی محمود نامی در اصل میتھ تھا اور محمود میتھ کی خرابی ہے، مزید تحقیق کا محتاج ہے۔ بقیہ ابواب کے عنوانات درج ذیل ہیں، اس فہرست سے کتاب کی جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، جغرافیہ، تاریخ، معاشرت، حبش کا دور حاضر، حبش اور اطالیہ، لیگ، استعمار اور حبش، مستقبل۔ ضمیمے میں واردات جنگ اور مجلس اقوام کے میثاق کی چند دفعات درج ہیں کتاب میں متعدد تصاویر اور حبش کا نقشہ شامل ہے۔ نقشے میں بہت کم مقامات کے نام ہیں۔ طبع ثانی کی نوبت آئے تو اس کی طرف توجہ مناسب ہے۔ اختر حسین صاحب کی تحریر میں کہیں کہیں مبلغانہ رنگ آگیا ہے، کیا انھیں اپنے ناظرین کی سمجھ پر اتنا بھروسا نہیں کہ صرف واقعات کے پیش کرنے پر قناعت کر سکیں؟

**نکات الشعرا** :- مصنفہ میر تقی میرؔ، مرتبہ عبدالحق صاحب سلسلہ انجمن ترقی اردو، طبع ثانی
ص ۱۲ + ۱۹۰ قیمت مجلد ۱۲؍ غیر مجلد ۱۰؍

میر کا دعویٰ ہے کہ نکات الشعراء سے قبل شعرائے اردو کے حالات میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا۔ لیکن یہی دعویٰ قائم کا بھی اپنے تذکرے کے متعلق ہے، اور گلشن گفتار تو مسلم ہے کہ زمانۂ تصنیف کے لحاظ سے نکات الشعراء سے مؤخر نہیں۔ پھر دعوائے اولیت سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو یہ قبول کرنے میں ذرا تامل نہیں ہونا چاہیے کہ نکات الشعرا شعرائے اردو کے قدیم ترین اور اہم ترین تذکروں میں ہے ......... قدیم تذکرہ نگاروں میں سے اکثر نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا چنانچہ قائم، گردیزی، شفیق، حسن، خلیل، عشقی، کمال کے تذکروں سے میر سے استفادے کا پتا چلتا ہے۔ قائم نے بھی میر کا حوالہ دیا ہے لیکن نکات الشعرا کے معلوم نسخوں میں وہ الفاظ نہیں ملتے جو قائم نے میر کی طرف منسوب کیے ہیں اس لیے یہ امر مشکوک ہے کہ نکات اس کی نظر سے گزرا بھی تھا یا نہیں۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ قائم نے وہ نسخہ دیکھا ہو جو میر نے ابتداءً لکھا ہو، بعد کے نسخوں میں ان الفاظ کے نہ پائے جانے کی وجہ یہ ہو کہ میر نے اپنے معاصرین کے اعتراضات سے تنگ آ کر انھیں نکال دیا ہو۔ بہر حال اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میر حسن کا اس تذکرے سے استفادہ مسلم ہے۔ تذکرے سے اس کا بہ کثرت ثبوت ملتا ہے لیکن یقین کے ترجمے میں میر صاحب کے حوالے سے حسن نے جو کچھ لکھا ہے وہ نکات کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملتا۔ حسن نے سہواً تاقب کی جگہ سودا و سوز لکھ دیا ہے، یا کسی نسخے میں جو حسن کے پیش نظر تھا اسی طرح لکھا تھا۔ یہ ایک معما ہے جس کا حل موجودہ مواد کی مدد سے نہیں ہو سکتا۔ نکات الشعرا قدما میں جس قدر مقبول رہا اسی قدر متوسطین و متاخرین نے اس سے بے اعتنائی کی چنانچہ اب سے بیس پچیس سال قبل تک شعرائے اردو کے جو مطبوعہ تذکرے عام طور پر دستیاب ہوتے تھے، ان کے مصنفین[1] بہ استثنائے صفیر (صفیر کا تذکرہ زیادہ مقبول نہیں ہوا) نکات سے براہِ راست واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ آزاد نے اس کا حوالہ دیا ہے لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اس کے مطالعے کا انھیں اتفاق نہیں ہوا تھا۔ شبلی اپنے زمانۂ نظامت انجمن ترقی اردو میں اس کی اہمیت کا اندازہ کر کے اسے شائع کرنا چاہتے تھے لیکن اسے کنج گمنامی سے منظر عام پر لانے کی سعادت عبدالحق صاحب کی قسمت میں تھی۔ ابتداءً یہ تذکرہ پہلی بار انجمن ترقی اردو کی طرف سے آج سے کم و بیش ۲۰ برس قبل شائع ہوا لیکن شاید اس وجہ سے کہ متن کی درستی کے لیے ایک سے زیادہ نسخہ ہاتھ نہ آیا، اور کاپیوں کی تصحیح کارکنان مطبع کے سپرد کر دی گئی، مطبوعہ نسخے میں اتنی غلطیاں رہ گئیں کہ بجائے انجمن کے نول کشور یا پنجابی کا چھپوایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اب انجمن نے اسے دوسری بار شائع کیا ہے، اور متن کی تصحیح ایک ایسے نسخے سے کی ہے جو میر کے معاصر اور شناسا عبدالولی عزلت نے تکمیل کتاب کے کچھ ہی بعد ۱۱۶۵ھ میں اپنے لیے لکھوایا تھا۔ طبع اول اور طبع ثانی میں جو فرق ہے اس کا مفصل ذکر کرنے سے قبل مجملاً ہم اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ طبع ثانی سے انجمن نے اپنی سابق سہل انکاری کی بہت اچھی طرح تلافی کر دی ہے، اور یہ نسخہ ان لوگوں کے پاس بھی رہنا چاہیے جن کے پاس طبع اول موجود ہے۔

[1] ممکن ہے کہ محسن نکات سے واقف ہوں۔

(۱) طبع ثانی سے وہ مقدمہ جو مرتب سابق نے لکھا تھا' نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ عبدالحق صاحب کے مقدمے نے لے لی ہے یہ بہت مختصر ہے' لیکن کل ضروری باتیں اس میں آگئی ہیں' اور بڑی بات یہ ہے کہ رومانیت سے قطعی معرا ہے جو اس عہد کے مقدمہ نگاروں پر بلا کی طرح مسلط ہے۔ تاہم کچھ باتیں ایسی درج ہو گئی ہیں جن میں اختلاف کی گنجایش ہے۔ سید امام الدین خاں کے تذکرۂ شعرا کا نام جس کتاب میں سب سے پہلے پایا جاتا ہے وہ تذکرۂ حسن ہے' بعد کے مصنفوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حسن ہی سے ماخوذ ہے' گو اس کا قول ہو یا نہ ہو حسن کی عبارت یہ ہے "سید امام الدین خاں ولد سید معین الدین خاں سرجوکی والاشاہی بود در وقت محمد شاہ ........ او ہم تذکرۂ معاصرین خود نوشتہ ہست احوالش معلوم نیست" ص ۱۰۲، ۱۰۳۔ اول تو یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ محمد شاہی عہد میں سرجوکی والاشاہی' امام الدین تھے یا معین الدین' (ہماری رائے میں حسن کی مراد معین الدین سے ہے) دوسرے یہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ امام الدین عہد محمد شاہ میں اس عہدے پر فائز تھے تو اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکل سکتا ہے کہ تذکرہ بھی عہد محمد شاہی میں لکھا گیا' اور اس بنا پر نکات الشعرا سے متقدم ہے؟ فاضل مرتب نے میر صاحب کی سیرت کے متعلق بھی جو کچھ کہا ہے' اس سے اتفاق مشکل ہے' میر صاحب کی رائے پر ذاتی تعلقات کا بہت اثر پڑتا تھا' اور وہ تمام شعرا جو ان پر اعتراض کرتے تھے' یا ان کے اتنے مداح نہ تھے جتنا وہ چاہتے تھے' ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ میر صاحب کے لیے ناممکن تھا۔ ان کے اعتراضات بے باکانہ ہوں' لیکن ہم انہیں بغیر دوسروں کے ساتھ ناانصافی کیے ہوئے منصفانہ نہیں کہہ سکتے۔ ان کی نکتہ چینیاں جائز حدود سے عموماً تجاوز کر جاتی ہیں' اور نکات الشعرا کے سے تذکرے میں قطعی بے محل ہیں' مفصل بحث کا یہ موقع نہیں' اس لیے ہم صرف فاضل مرتب کی توجہ تراجم حشمت' و قائم و حاتم و قدرت و خاکسار و یقین کی طرف مبذول کرانے پر قناعت کریں گے۔ میر صاحب کی بے باکی بھی مصلحت اندیشی سے خالی نہیں ہوتی۔ میر صاحب کی تحقیقی رائے آرزو کے متعلق ذکر میر سے ظاہر ہوتی ہے' میر صاحب آرزو سے اس قدر خفا ہیں کہ ان کی موت کا ذکر بھی کامل اطمینان بلکہ فی الجملہ اظہار مسرت[۱] کے ساتھ کرتے ہیں' تذکرے میں صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کے تمام شعرائے معاصر سے انہیں افضل قرار دیتے ہیں' بلکہ اس زمانے کے ایرانی شعرا پر بھی ترجیح دینے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں' یہاں تک بھی مضائقہ نہیں' میر صاحب ممکن ہے کہ آرزو کے کمالات کے اسی حد تک معترف ہوں' لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ فطرت کے ترجمے میں جہاں ضمناً آرزو کا نام آجاتا ہے' اور جہاں اظہار عقیدت کی چنداں ضرورت نہیں' انہیں استاد و پیر و مرشد بندہ لکھتے ہیں۔ یہ حیا کی بنیں کچھ اور چیز ہے' لیکن ادب یہ بتانے سے مانع ہے کہ کیا ہے۔

(۲) طبع ثانی میں کسی ایسے شاعر کا ترجمہ نہیں ملتا جو طبع اول میں نہ ہو' لیکن مضمون' حاتم' یکرنگ' سجاد' کلیم' عزلت' کے زاید اشعار ملتے ہیں' ان شعرا کے دواوین یا ناپید ہیں یا کمیاب اس لیے' طبع ثانی کی یہ خصوصیت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

(۳) طبع اول میں جا بجا سے الفاظ چھوٹ گئے تھے' اور غلطیاں بھی بہت رہ گئی تھیں۔ طبع ثانی میں' یہ نقائص بڑی حد تک دور کر دیے گئے ہیں' گو بعض مقامات اب بھی مشکوک ہیں' اور بعض غلطیاں اب بھی موجود ہیں۔ ص ۳ "خیز" کی جگہ "خیزد" ص ۱۰ "دوانا" چھپا

[۱] ذکر میر ص ۵،

ہیں گھر میں آباد یوں اب چھوڑ کر صحرا - دوا نہیں کریں الخ ۲۲ د شیشۂ خالی کو کیا عزت ہے - دیواروں کے بیچ' طبع اول میں کوئی جگہ کی ہے'
(بی بہتر) معلوم ہوتا ہے - مگر از کم طبع ثانی میں اس اختلاف کو ذکر کر دیا تھا - ص ۱۵۱ - دریں ولا ایں خانۂ دیوان روزوہ نوشتہ می شود'
حاشیے میں ہے کہ غالباً ، روزوہ کی بجائے معتقدہ ہوگا جو انتخابی اشعار کی تعداد کو بتاتا ہے" میر صاحب نے ، انتخابی اشعار کی تعداد نہیں
بتائی ۔ (سوائے ان مقامات کے جہاں ایک دو شعر نقل کیے ہیں) ہماری رائے میں روزوہ کی جگہ از دوست داد' اسی قبیل کی کوئی عبارت ہوگی
۲۲۔ کہتا ہے دو نین کہو تو نغز گرے ۔ نذر ہونا چاہیے - ۲۲ - شعر ہزل خود می واند = می خواند ۔ ۱۶ تیری آنکھوں کے دو پلکے ہیں (غیر موزوں)
۴۶ کیا جانے وصال ترا ہو کسے نصیب' طبع اول میں دوسری طرح ہے' اختلاف نہیں دکھایا گیا ۔ ۴۹ عطا کا شعر صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔ ۷۱
زبان طاقت بیانش = زبان طاقت بیانش ۔ ۷۴ جہت اس راہ کو گئے ہیں ماپ = ناپ ۔ ۹۷ کیا جانتے تھے ہم سے مل کر کے اس سے
کل = کِل ۔ ۹۹ نویں سطر صحیح نہیں معلوم ہوتی ۔ ۱۰۰ ابسیار رنگیں می گفت = رنگین یا رنگینی ؟ ۱۰۰ امکن = کمن ۔ ۱۰۸ از دیدن رنگ
آتش = رنگ و آتش ؟ ۲۷۵ آخر اس الفت اس پر نہ کری بجا تھی = آفت ۔ اس کے علاوہ ممکن ہے اور بھی اغلاط ہوں لیکن کتاب کا
لفظ لفظ ہمیں پڑھنے کا وقت نہیں ملا ۔ ان اغلاط کی طرف اس نیت سے توجہ دلائی گئی ہے کہ طبع سوم میں ان کی تصحیح ہو سکے ۔ طبع ثانی
کی منقصت مقصود نہیں ۔ موجودہ حالت میں بھی یہ شاید اس وقت تک جتنے تذکرے چھپے ہیں ان میں سب سے صحیح چھپا ہے ۔

(۴) کتاب کے حسن ظاہر کے متعلق صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ میر کے شایان شان ہے ۔ کاش انجمن کلیات میر کا کوئی ناقدانہ نسخہ بھی
اہتمام سے طبع کراتی تو شیدائیان کلام میر پر جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے بڑا احسان ہوتا ۔

---

## رسید کتب :-

| کتاب | ناشر |
| --- | --- |
| (۱) خطبات گارساں دتاسی | انجمن ترقی اردو' اورنگ آباد |
| (۲) دیوان تاباں | |
| (۳) داستان عجم | شاد بک ڈپو |
| (۴) اشعار میر | رام نرائن لعل |
| (۵) اشعار مومن | |

---

# اقتباسات

(۱) غزل میرزا غالب ماخوذ از دیوان معروف مطبع نظامی بداؤں
(۲) میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس ماخوذ از اردو اکتوبر ۱۹۳۵ء

## غزل میرزا غالب

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں
شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں
اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریٔ دل جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں
دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں
میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز گوش ہے در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

## میرزا غالب کے متعلق ایک قدیم اخبار کا اقتباس

احسن الاخبار بمبئی سے ۹ نومبر ۱۸۴۲ء کو نکلا۔۔ یہ فارسی کا اخبار تھا۔۔ اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع محدود ہونے کے باوجود بیشتر دہلی و تعلقہ دہلی کی خبریں صحت کے ساتھ شائع کرتا تھا۔ دہلی میں اس کے نامہ نگار موجود تھے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس اخبار سے اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

جلد ۴ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۷ جون ۱۸۴۷ء میرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کردیا جائے کہ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے، عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت میں بیرو ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

جلد ۴ نمبر ۲۷ مطابق ۲ ماہ جولائی ۱۸۴۷ء۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر ہوا

اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ میرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں، سوا پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قید مصیبت و مشقت کا برداشت کرنا میرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظرثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، ایسے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔

# استفسارات

۱۳۔ ذیل کے متعلق ناظرین معیار کو اگر کچھ معلوم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ نہایت ممنون ہونگا۔ عبدالودود

۱ وزیر علی عبرتی کا لکھا ہوا ایک تذکرہ کلکتے میں ہے، اس میں وجیہہ الدین عشقی عظیم آبادی کا بھی ترجمہ ہے۔ وفات کا جہاں پر ذکر آیا ہے سن کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے، کیا دوسرے نسخوں میں سال وفات درج ہے؟

۲ دیوان اشرف علی خاں فغاں کے قلمی نسخے نسخہ دستہ ولاہور (مملوکہ پروفیسر محمد شفیع) کے علاوہ کہاں کہاں ہیں؟

۳ مصحفی نے اردو میں مندرجہ ذیل مثنویاں لکھی ہیں کیا اس کے علاوہ بھی ان کی مثنویاں ہیں؟ کیا آخری مثنوی کا قلمی نسخہ کسی صاحب کی نظر سے گذرا ہے؟ ذیل میں مثنویوں کے نام یا ابتدائی مصرعے لکھے جاتے ہیں۔ ۱۔ بحر المحبت مطبوعہ ۲۔ گلزار شہادت مطبوعہ (رسالہ اردو) ۳۔ شعلۂ عشق مطبوعہ۔ ۴۔ زبس آئینہ رو ہے طفل حجام۔ ۵۔ یہ جو ہم پاس چارپائی ہے۔ ۶۔ کھٹملوں کی زبس کہ ہے افراط۔ ۷۔ کیا کروں وصف تیری اجوائن۔ ۸۔ اپنے رہنے کو جو ملا ہے مکاں۔ ۹۔ یہ جو موری خانہ ہے سرکار کا۔ ۱۰۔ اب کے سردی کا جو ہوا ہے وفور۔ ۱۱۔ کیا کہوں سوزش ہوائے تموز۔ ۱۲۔ شور آتش ہے کس قدر اس سال۔ ۱۳۔ یہ جو بکری کی پٹھ ہے اپنے پاس۔ ۱۴۔ یہ جو اترا ہے چرخ سے مینڈھا۔ ۱۵۔ عشق ہے جو ہر محیط جہاں۔ ۱۶۔ یہ جو توم شیخ ہے اے دوستاں۔ ۱۷۔ توتا ہے جو یہ زمردیں بال۔ ۱۸۔ توتا بولن نے جو کہ پالا تھا۔ ۱۹۔ دل میں تھا مدت سے یہ مذکور ہو۔ ۲۰۔ ہے سزاوار ستایش دو الہ +

# سنہ ۳۶ء کے ادبی مضامین :-

**اُردو** اورنگ آباد مرتبہ عبدالحق صاحب جنوری ۱۹۳۶ء: "سر سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی" از مرتب ص ۳ تا ۳۵ (برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی وساطت سے سید احمد خاں نے ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ ورنیکلر سے مراد اردو تھی اس کے متعلق جو مراسلات ہوئے وہ اس مضمون میں درج ہیں معیار)

"بادہ کہن، گلدستہ رنگین" از مرتب ص ۳۶ تا ۴۳ (۱۳۰ اشعر کی مثنوی سعادت یار خاں رنگین کی تصنیف ہے صنعت تجنیس میں ہے۔ شعر ابتدائی "حمد اسے کہہ جو کہ ہے جان آفریں ٭ آگہیں سب تجھ کو اے جان آفریں" شعر آخر "مثنوی گلدستۂ رنگین ہے یہ ٭ نظم رنگا رنگ سے رنگین ہے یہ" ۲۰۔۲۵ سال قبل اردوئے معلیٰ علی گڑھ میں شائع ہوئی تھی۔ معیار) "ایک ہندی شعر اور دو شعر پر مولانا حالی کا محاکمہ" از مرتب ص ۵۲ تا ۹۵ (حالی کا خط بھی منقول ہے۔ معیار)

"کلام خوشتر عظیم آبادی" از قاضی عبدالودود صاحب ص ۹۶ تا ۹۹ (مختصر حالات اور منتخب کلام مرتب تو برائے شغل تو سیر مجاز ہی کی جگہ "تب تک الغرض اور" "دیوانے سے کیا کم ہے جو ایسے دل کو دل جانے" کی جگہ "دو دیوانے سے" اخذ ہونا چاہیے۔ معیار)

**نیرنگ خیال** لاہور مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب سالنامہ ۳۶ء "غدر سے پہلے کی اُردو شاعری پر ہندوستانی تمدن کے زوال کا اثر" از جناب عزیز احمد صاحب بی اے ص ۷۰ تا ۸۰۔ (۱) دکنی شاعری بھی تقلیدی تھی، لیکن اس میں زندگی اور حقیقت صاف نمایاں ہے، تصنع کے باوجود جذبات میں سچائی اور گہرائی تھی، زبان وہی تھی جو عوام الناس بولتے تھے۔ ولی کی غزلیں فارسی کی نقل معلوم ہوتی ہیں اور اس کا شمار دور انحطاط کے شعرا میں ہے۔ اس کی ابتدا تقلید سے ہے اور اس کی بنیاد غلط رکھی گئی ہے۔ متقدمین شعرائے اردو کے کلام میں زندگی کا صحیح عکس کہیں نظر نہیں آتا، جذبات مصنوعی ہیں اور انفرادی جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی (۲) فارسی کی تقلید میں اردو شاعری اور آزاد اور ذاتی اسالیب بیان سے محروم ہو گئی، طرح طرح کی قیود سے جذبات کی لطیف کیفیات شاعری سے محو ہو گئیں، اور ان کی جگہ خیال آرائی نے لے لی، ہندوستانی الفاظ زبان سے خارج ہوتے رہے اور فارسی الفاظ ان کی جگہ داخل ہوتے گئے۔ (اگر متقدمین سے مراد آبرو، مضمون وغیرہ ہیں، تو کم از کم زبان سے ہندوستانی الفاظ کے اخراج کے متعلق مضمون نگار کا قول صحیح نہیں۔ معیار) صنائع لفظی و معنوی کو غیر ضروری اہمیت دی گئی۔ شاعری میں ان وجوہ سے جمود پیدا ہو گیا، اور بعض کے یہاں جمود و متانت کے درجے سے گر کر ابتذال کی حد تک پہنچ گیا۔ (۳) میر و سودا کے دور میں تین رجحانات بہت نمایاں ہیں "یاسیت" "تصوف" ایہام اور جدت طرازی کے بجائے سادگی اور ابتذال اور تصنع میں خرچ ہونے لگا۔ یہی رجحان سودا کی شاعری پر چھایا ہوا ہے، زوال و انحطاط کی فضا نے ان رجحانات کو سینچا ہے۔ (۴) مغلوں کی تہذیب نے لکھنؤ آ کر سنبھالا لیا تھا، لیکن مرض اس قدر شدید تھا کہ مریض نے مایوس ہو کر ہی کھول کر بدپرہیزی شروع کر دی۔ زندگی کی تمام تر عملی صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں، عیش و عشرت اور رنگینی خیال کی ایک جھوٹی زندگی فروغ پانے لگی۔ مرغ بازی وغیرہ کی ایجاد کے ساتھ شاعری کے کھیل کو بھی فروغ ہوا۔ شرفا اور خواندہ اصحاب کے لیے ذہنی عیاشی کا اس سے بڑھ کر کیا سامان ہو سکتا تھا

لکھنؤ کی مخصوص معاشرت کا اثر شاعری پر کئی حیثیت سے پڑا۔ شاعری زندگی، جذبات اور تخیل سے معرا ہو گئی ساری توجہ انداز بیان اور لطف زبان پر صرف ہوئی' روح تو پہلے ہی سے تقریباً مفقود تھی اب وہ ایک بے جان سرد لاش ہو گئی' تکلف اور تصنع کا زور ہوا' زندگی میں باوجود نفاستوں کے انتہائی درجے کا جو ابتذال شامل تھا وہ شاعری میں داخل ہو گیا۔ میر و سودا بھی لکھنؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے' لیکن لکھنؤ کی اصل شاعری انشا و جرأت سے شروع ہوتی ہے (صاحب مضمون نے انشا' مصحفی' رنگین' ریختی کی ایجاد کے متعلق اپنی رائے دی ہے معیار) ناسخ نے ان الفاظ کو جو عوام الناس کی زبان پر تھے' خارج کر کے زبان کا دائرہ بہت محدود کر دیا' آتش کو قدرت نے غلطی سے لکھنؤ میں پیدا کیا تھا۔ ان کا کلام کہیں کہیں لطیف بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ان دونوں کے جانشینوں میں متقدمین کے عیوب منتقل ہوئے' لیکن خوبیاں منتقل ہوئیں اور لکھنؤ کی شاعری پست سے پست تر ہوتی گئی۔ (۴۰) (مضمون نگار نے اسباب سے بحث کر کے دہلی کی شاعری ان عیوب سے مبرا کیوں کر محفوظ رہی' مومن و غالب و شیفتہ کی تعریف کی ہے معیار) "مومن کی شاعری میں سچے احساسات اور خالص شخصی اور ذاتی جذبات پہلی مرتبہ بڑی حد تک نظر آتے ہیں" (۵) نظیر اکبر آبادی کی شاعری جنگل کا ایک خودرو پھول تھی' اس کے اگانے میں انسان کی آبیاری کا بہت کم دخل تھا۔ (مضمون نگار نظیر کی شاعری کے معترف ہیں معیار) (۶) (ایک فصل لکھنؤ کی شاعری کے آخری دور کے متعلق ناسخ و آتش کی شاعری ہے معیار) "مراثی کا غمناک موضوع اس دور کی تنزلی ذہنیت کے لیے موزوں تھا" انیس کو طبعاً لکھنؤ کے رنگ سے مناسبت نہ تھی' مگر وہ مجبور تھے' لکھنؤ میں رہنا اور اہل لکھنؤ سے داد لینا' دبیر کے یہاں لکھنؤ کی ذہنیت کے مضر اثر زیادہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

(مضمون دو حصوں میں ہے' یہ حصہ اول کا خلاصہ تھا' دوسرے کا عنوان "اردو شاعری کے موضوع اور ان پر انحطاط کا اثر" ہے۔ ذیلی عنوانات یہ ہیں' عشق اور لوازمات عشق' معشوق' عاشق' رقیب' فراق و وصل' امرد پرستی' معیار)

**شاہکار** لاہور' مرتبہ جناب تاجور "**خواجہ آتش**" از مرزا یاس یگانہ چنگیزی ص ۱۶ تا ۱۱ (ایک مختصر سی تمہید کے بعد آتش کے و شعروں کی تشریح کی ہے' معیار)

**ادبی دنیا** لاہور' مرتبہ منصور احمد صاحب' سالنامہ ۱۹۳۶ء "تاریخ اردو کا مطالعہ" از جناب کیفی ص ۲۵ تا ۳۰ (۱) صاحب مضمون کا خیال ہے کہ دو باتوں کی اب تک کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ کہ "اردو محض ایک بولی کی صورت میں اور ادبی زبان کی صورت میں کب اور کس سے ظہور پذیر ہوئی" دوسرے یہ کہ "جس مقام اور خطے میں اردو کی ابتدا ہوئی وہاں کی دیسی زبان اردو سے پیشتر اور اس کی پیدائش کے قریب کیا تھی"۔ (۲) صاحب مضمون نے محمود غزنوی کی ہندی فوج "جس کی چھاؤنی غزنین میں تھی" اور اس کے ہندو سردار ونایا سوئیندرا' اور تلک کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ "ان واقعات کی بنا پر اگر کوئی یہ کہے کہ اردو کی ابتدا غالباً غزنین میں ہوئی تو اسے ناقابل غور کیوں قرار دیا جائے؟" صاحب مضمون نے راجا نندا کے اشعار کا بھی ذکر کیا ہے جو محمود کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے' اور تحقیق اللسان مصنفہ قمر اللہ لاہوری کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے بہت قبل بھی ہندو راجاؤں کے دربار میں ایک دو فارسی داں ہوا کرتے تھے' جو بادشاہوں کو فارسی میں خطوط لکھا کرتے تھے۔ صاحب مضمون نے رائے پتھورا کے درباری شاعر "ملک الشعرا چند" کے کلام میں عربی الفاظ پائے جانے کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ (چند کے متعلق جو جدید تحقیقات ہوئی ہے' اس سے صاحب مضمون بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں' معیار)

(۳) صاحب مضمون کی رائے ہے کہ دکن میں اردو کا رواج دہلی والوں کی بدولت ہوا جنہیں محمد تغلق نے دہلی چھوڑ کر دکن جانے پر مجبور کیا تھا ثبوت میں یہ بات بھی پیش کی ہے کہ "اگر آج کوئی حیدرآباد، اورنگ آباد، دولت آباد اور گلبرگہ وغیرہ شہروں اور قصبوں میں جا کر گفتگو کرے تو وہ الفاظ محاورے اور کہاوتیں سننے میں آئیں گی جو ہم دہلی کے عوام الناس اور کم خواندہ لوگوں سے دہلی میں سنتے تھے' بلکہ کچھ نہ کچھ اب بھی سنتے ہیں" صاحب مضمون نے اورنگ آباد کے بہت سے محاورے اور روزمرے نقل کیے ہیں جو انہوں نے دہلی میں بھی اپنے بچپن میں ایک مغلانی سے سنے تھے۔ اٹھاؤ چولھا (خانہ بدوش) پیارے بیٹی (کوسنا) رسا (کم سیٹھا) تے دانی، کجلوٹی، ستیاناس، خاک چاٹ کر رہتی ہوں، منہ تو ما، بُربولا، کھوراز، سفیل (فصیل) برو برا (برابر) بیا، بیاؤ (حوصلہ) منہ کا سواد بگڑ گیا، وغیرہ۔ اردو زبان دہلی سے دکن پہنچی اور وہ دکنی الفاظ جو بعد کی دہلی کی زبان میں کھٹکتے ہیں انہیں اہل دہلی کے ذریعہ شمالی ہند میں آئے جو اردو کو اپنے ساتھ جنوب میں لے گئے تھے" "اردو یا ہندوستانی اس خطے میں پیدا ہوئی جہاں برج بھاشا کا رواج تھا، یہ مقام دکن ہرگز نہیں ہو سکتا" (۴) صاحب مضمون کی رائے میں قطب شاہ سوراشٹری سے ضرور واقف تھا، لیکن کب اور کہاں اس نے اس زبان کو سیکھا، اس کے متعلق انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ صاحب مضمون کی رائے میں قطب شاہ اردو کا پہلا شاعر نہیں لیکن اس کا دیوان "اردو یا کسی قسم کی اردو کا پہلا دیوان قرار دیا جا سکتا ہے" صاحب مضمون نے قطب شاہ کا یہ شعر "کمہ نور پر دسے یوں بچ خط عنبریں ند ۔ جوں سوار پرے باول ریحاں سوں گلستاں" نقل کر کے دعویٰ کیا کہ لفظ "دسے" سوراشٹری زبان کا ہے' اور سوراشٹری کی ایک پرانی کتاب پانچ دو باز کلام راتم سہاشنی میں جو چند سال ہوئے شائع ہوئی ہے یہ مصدر دسنا مختلف زمانوں اور فعل کے صیغوں میں کئی بار استعمال ہوا ہے۔ کتاب کا زمانۂ تصنیف کم از کم ۱۰۰۰ء قرار دیا گیا ہے۔ (۵) اردوئے قدیم کے حوالے سے امیر خسرو کے دو شعر نقل کر کے صاحب مضمون یہ فیصلہ فرماتے ہیں کہ "اردو کی نظم سے متعلق ایجاد و اختراع اور اولیت کا سہرا حضرت امیر خسرو ہی کے سر رہتا ہے" (۶) اردو نثر کی قدیم ترین کتاب جو اس وقت تک دستیاب ہے معراج العاشقین ہے۔ "ہندوستانی مشاعرے: از جناب احسن مارہروی ص ۳۲ تا ۴۰۔ یہ مضمون تلاش سے نہیں لکھا گیا ہے' حکایات و واقعات اکثر آب حیات سے ماخوذ ہیں' مشاعروں کے سنین جو قائم کیے ہیں وہ بھی زیادہ تر غلط ہیں' کرم الدولہ کا زمانہ ۱۱۷۳ سے کم از کم ۲۰ برس بعد ہے' میر درد کے مشاعروں کا ذکر میر نے کیا ہے۔ نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۵ ہے' درد کے مشاعروں کا زمانہ ۱۱۶۵ کے قبل ہونا چاہیے' نہ کہ بعد' یہی حال میر تقی اور سجاد کے مشاعروں کا ہے جن کا زمانہ علی الترتیب ۱۱۶۹ اور ۱۱۰۰ قرار دیا ہے۔ ۱۱۹۱ھ میں رئیس لکھنوی کوئی صاحب ایسے نہ تھے جن کے مشاعروں میں میر و سودا و معاصرین میر مصحفی، انشا، جرأت شامل ہوتے ہیں۔ مصحفی تو ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ آئے ہیں' اور میر، سودا اور سوز میں کبھی ایک زمانے میں نہ تھے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ مصحفی سلطان شکوہ کے استاد تھے' اور نہ وہ اشعار جو اس سلسلے میں آزاد اور ان کے تتبع میں جناب احسن نے نقل کیے ہیں سلیمان شکوہ سے متعلق ہیں۔ (معیار)۔ اردو ادبیات پر غالب کا اثر ص ۹۰ تا ۹۹۔ از ن۔م۔راشد۔ (۱) غالب کی ذات اور اس کی شاعری ہر چند حالی اور آزاد کی طرح شعوری نہیں' لیکن بے شبہ غزل میں ایک بالکل نئی تحریک تھی' جس کا احساس آج تک نہیں کیا گیا۔۔۔ غالب کی ذات۔۔۔ رسمی شاعری کے خلاف ایک بہت بڑی بغاوت تھی جس نے حالی کی نئی تحریک کے لیے راستہ صاف کیا تھا۔ اس لحاظ سے مومن خاں کو ایک حد تک غالب کا بھی پیشرو کہا جا سکتا ہے' لیکن یہ وثوق کے ساتھ

نہیں کہا جاسکتا ہے کہ مومن نے اس قدیم شاعری کے پاؤں پر آخری ضرب لگائی کیونکہ اوائل میں وہ شاہ نصیر کا شاگرد تھا ...... کچھ عرصے بعد وہ جرأت کی طرز معاملہ بندی کا شکار ہوگیا چنانچہ آخر عمر تک وہ ان ابتدائی اثرات سے پورے طور پر نجات حاصل نہ کرسکا .... لیکن غالب جو اوائل ہی سے تخیل کی شاعری کے رستے پر چل کھڑا ہوا تھا اپنی واقعیت نگاری اور یگانگت خیال کی بنا پر اس بات کا حقدار ہے کہ اسے زبان کی شاعری کا خاتم کہا جائے ۔ (۲) ذوق کی اپنے زمانے میں اگر کوئی عزت تھی تو وہ اس اثر و اقتدار کی بنا پر تھی جو اسے خلیفہ دربار میں حاصل تھا اور یہی سبب تھا کہ وہ اپنے زمانے کے مذاق پر حکومت کرتا تھا" "غالب کا فلسفیانہ تصور اور اس کا بے نظیر جمالیاتی احساس" اس کے معاصرین کے "فہم کی گرفت سے باہر تھا" ...... وہ لوگ غالب کی بلند تر زبان اور پیچیدہ اسلوب کا اپنے نیم فلسفیانہ اور عامیانہ عشقیہ خیالات سے کوئی تعلق متعین نہیں کرسکتے تھے' غالب کو صحیح طور پر نہ سمجھنے والوں میں ذوق کا درجہ سب سے بلند ہے" .. صاحب مضمون کی رائے میں ذوق نے غالب کے ساتھ شوق مسابقت میں اپنے شعروں میں بیجا فارسیت بھر نی شروع کردی غالب کی مشکل پسندی جہاں ابتذال سے بچنے کے لیے تھی ذوق کی مشکل پسندی محض مصنوعی تھی ۔" غالب طبعاً ایک فلسفیانہ رجحان کا مالک تھا اور اس کا اسلوب بیان نہ صرف ان مضامین کے لیے موزوں تھا بلکہ ناگزیر ... اس کی روح قدرتاً ایسی تھی جو اس کی مخصوص مبہم و مغلق زبان کے علاوہ کسی طرح صحیح طور پر واضح نہیں ہو سکتی' غالب کے معاصرین نے غلطی سے اسی کو اس کی کائنات سمجھ لیا تھا' حالانکہ اس کے لیے یہ چیز محض ثانوی حیثیت رکھتی تھی" ذوق کی شاعری صاحب مضمون کی رائے میں ناسخ سے قریب تر تھی ۔ اس کی کائنات محاورہ اور روزمرہ اور ادنیٰ قسم کے اخلاقی مسائل تھے ۔ اس کی تقلیدی فارسیت ناکام اور فلسفیانہ مسائل کے لیے اس کے دل و دماغ ناموزوں تھے ۔ (۳) مومن کے اشعار میں فلسفیت اور جو بیانی خلا پایا جاتا ہے وہ یقیناً غالب کا اثر ہے نصیر ناسخ اور جرأت سے متاثر ہونے کے باوجود" غالب کی موجودگی نے اسے وہ رستہ دکھایا جس کے لیے وہ موزوں تھا" آخر عمر میں غالب کے طریق اظہار میں جو تغیر ہوا تھا اس کا ایک سبب کلام مومن بھی تھا کہ "حکیمانہ نکات اور بلند پایہ پاکیزہ عشق کا اظہار کسی حد تک سنگین اور مغلق الفاظ سے دور رہ کر بھی کیا جاسکتا ہے' لیکن مومن بہت زیادہ غالب سے متاثر ہیں' ان کی "جدت نگاری' حکیمہ بلند نظری' اشکال زبان' اور متانت اظہار ... بہت حد تک غالب کی مرہون منت ہے" (۴) غالب کا بہترین معترف اور بہترین نقاد شیفتہ تھا' اسے مغلق اور مبہم زبان سے نفرت تھی' لیکن عاشقانہ مضامین کے عامیانہ پہلو سے پرہیز' انداز بیان میں حکیمانہ متانت اور ترکیبوں کی جدت اس نے غالب سے سیکھی تھی ۔ بعد وفات مومن' شاگردی غالب اختیار کی' لیکن حکیمانہ متانت کے باوجود طرز خیال عشق آمیز تھا ۔ (۵) مومن و ذوق کے شاگرد ان دونوں کی موت کے بعد یا تو غالب کے شاگرد ہو گئے یا معتقد' غالب کے تلامذہ خاص میں سالک' مجروح' ذکی' حالی قابل ذکر ہیں۔ ذکی نے سب سے زیادہ کامیاب تقلید کی' مجروح کی "جمالیاتی حس" گہری نہ تھی' لیکن غالب سے شدید طور پر متاثر ہیں ۔ (۶) غالب کی حقیقی عظمت کا احساس حالی اور آزاد کی نئی تحریک کے آغاز سے شروع ہوا ۔ معاصرین غالب اس کی زبان اور اس کے خیالات کی ہم آہنگی کو نہ سمجھ سکے' اس کے شاگردوں نے اس کے اسلوب بیان کی تقلید کی' لیکن کوئی بھی اس کی روح کی گہرائیوں میں نہ اتر سکا ان کے لیے طبعاً ایسی شاعری نامانوس تھی جو بیک وقت دل و دماغ سے تعلق رکھتی ہو اور جس میں خیال کی انتہائی یگانگت (کذا) پائی

حالی ہو اور جس کا مقصد محض جمالیاتی ہو۔" (۷) (حالی پر غالب کے متعلق ایک صفحہ لکھا ہے۔ معیار) (۸) غالب کی "خط و کتابت کا ذرا لا
طریقہ اس کی باغیانہ ادبی روح کا مظہر ہے" (۹) داغ و امیر و تسلیم بھی غالب سے متاثر ہیں۔ تسلیم کی مثنویوں سے خاص طور پر اس کا
ثبوت ملتا ہے (۱۰) اقبال و غالب میں فرق بھی ہے اور مشابہت بھی۔ "اگر حالی کو اقبال میں سے تفریق کر دیا جائے تو حاصل تفریق غالب
کے سوا کچھ نہ ہوگا لیکن ایسا غالب جو بیسویں صدی کے مجمع سے بھی یکساں طور پر آشنا ہو" (۱۱) مضمون کا خاتمہ عہد حاضر کے متغزلین پر
غالب کے اثر" اور شارحین و ناقدین غالب کے ذکر پر ہوتا ہے۔ معیار) ۔ شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر: از وقار عظیم صاحب ص ۱۱
تا ۱۳ ۔ (۱) صاحب مضمون کی رائے میں معترضین نے اس اعتراض میں کہ اردو شاعری مقامی اثرات سے بے تعلق ہے اصولی غلطی سے کام
لیا ہے۔ کوئی شاعری ایسی نہیں جس پر مقامی اثرات نہ پڑیں اس لیے اردو شاعری بھی اس اصول سے الگ نہیں ہو سکتی (۲) تین کالموں میں
مقامی اثر کے معنی اور مقصد کی تعیین کی ہے۔ " شاعر مقامی رنگ سے متاثر ہو کر جو شاعری کرے گا وہ فطرت سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوگی
جب انسان پر مقامی رنگ نے اتنا گہرا اثر کر رکھا ہے کہ وہ خود اس کی فطرت کا ایک جزو طبیعت بن گیا ہے تو ظاہر ہے کہ جو چیز اس کے فطری جذبات
سے متاثر ہو کر نکلے گی وہ زیادہ قدرتی ہوگی" (۳) دوسرے عنوانات "مقامی ادب اور زبان کا اثر" "مذہب اور اس کی روایات" "تیوہار
اور خوشیاں" اور "عقائد" ہیں۔ مثالیں قطب شاہ سے لے کر واجد علی شاہ تک شعرا کی دی ہیں۔ عہد حاضر کے شعرا کا ذکر کہیں کہیں حواشی میں
کیا ہے۔ معیار) ۔ عالمگیر لاہور مرتبہ حافظ محمد عالم، سالنامہ ۱۹۳۶ء ۔ حضرت مضطر علیہ الرحمۃ از سید شاہ عطاء الحق شاغل فریدی بہاری
(۱) خیر آباد کی ادبی تاریخ میں پہلا دور فارسی گو شعرا مخدوم شیخ سعد، حافظ شاہ مشتاق، معشوق علی شاہ کا ہے، دوسرا دور اردو گویوں کا، منشی
قدرت حسین قدرت، مظفر حسین شوقی، محمد جعفر زمری، بہاری لال خاوری، موہن لال گرامی، الٰہی بخش نازش، بی بی سعید النساء حرمان تخلص
خواہر مولانا فضل حق و مادر حضرت مضطر۔ تیسرا دور بسمل و مضطر کوثر و تسنیم و ریاض کا دور ہے۔ (صاحب مضمون نے رسالہ الناظر جون ۱۹۲۵ء
کے ایک مضمون "ریاض سخن اور خیر آباد" کا حوالہ دیا ہے۔ معیار) (۲) مضطر کا نام سید محمد افتخار حسین تھا۔ افتخار سے سال ولادت ۱۲۸۲ھ
نکلتا ہے۔ ان کے خطابات اعتبار الملک، افتخار الشعرا، اقتدار جنگ تھے۔ (یہ خطابات کہاں سے ملے اس کی تصریح نہیں کی گئی۔ معیار) ان کے
والد کا نام مولوی تفضل حسین تھا۔ نجیب الطرفین سید تھے، مذہب حنفی، مشرب صوفی۔ (۳) احتشام الدین احمد حقی دہلوی کا ایک
مضمون ۱۹۲۰ء کے بہارستان میں شائع ہوا تھا، اس کے حوالے سے صاحب مضمون کہتے ہیں کہ مضطر نے ایک ناول "قتیل جفا" نامی بھی لکھا
تھا جو بہت کامیاب ہوا تھا۔ دیوان حمیدیہ یعنی "نذر خدا" چھپ چکا ہے، "نعتیہ دیوان" "میلاد مصطفےٰ" مضطر کی زندگی ہی میں چھپنے کے لیے کسی
مطبع کو دیا گیا تھا لیکن مطبع کی بدعنوانیوں سے اب تک "معرض التوا میں ہے"۔ عاشقانہ دیوان مرتب نہ ہو سکا۔ "لیکن سخن صاحب کے
پاس کچھ مطبوعہ کتابیں ہیں (کذا) کوئی صاحب دیوان مرتب فرمانا چاہیں تو منگوا لیں" (۴) مضمون نگار اور سخن صاحب کے اشعار
پر مضطر کی اصلاح کے نمونے (۵) مضطر کے ۸ خطوط جن میں سوا ایک کے سب مضمون نگار کے نام ہیں، ایک سخن اور مضمون نگار دونوں کے
نام ہے۔ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ (الف) مضطر کی رائے میں وعظ دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مذکر ہے مونث نہیں، اور بعض دوسرے
شعرا نے مونث باندھا ہے۔ معیار) اور اپیل کو وہ مذکر سمجھتے تھے (ب) جون ۱۳ ۱۹ء میں تبدیل ہو کر صدر لشکر گوالیار کی ڈسٹرکٹ ججی

پڑ گئے تھے' ج' اودینا کے معنی سیتے' سنبھالنے کے ہیں۔ بیڑنا کے معنی بچھاڑنے کے ہیں' د' اگست ۱۹۱۵ء سے قبل انھوں نے ایک سال کی رخصت لی تھی۔ وکالت پیچ درجہ اول کی سند حاصل کر لی تھی اور ملازمت سے علٰحدہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہ آٹھ نو لگانا کوئی محاورہ نہیں ح ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ گوالیار سے رشیائرڈ ہو کر دس ماہ بھوپال میں رہا' اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں اندور آ کر دربار کا مصاحب ہو گیا اب اندور میں ہوں' ط تین زادے ۱۹۲۵ء میں تین لڑکوں کا ذکر کیا ہے جن کے تخلص برتر' نشتر اور اختر ہیں' ی ۲۵ تا ۱۹۲۷ء میں بستر بیمار رہے' (۱۶) ۱۹ رمضان ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء تاریخ وفات ہے (۲) مضطر کے شاگردوں کی فہرست جس میں نواب ٹونک ہزہائنس حافظ محمد ابراہیم علی خاں صاحب بہ القابہ کا بھی نام ہے۔

**رفتار اردو** ص ۱۲۴ تا ۱۴۰ از حامد حسن قادری (۱) شعرائے متقدمین کے تین دور قائم کیے ہیں (۱) شعرائے دکن ۱۵۵ تا ۱۷۰۰۔ (۲) شعرائے دکن ۱۷۰۰ تا ۱۷۵۵ء۔ اس دور میں بحری' ولی' آگاہ' سراج' عزلت' عاجز وغیرہ شامل ہیں (اصحاب مضمون ولی کے متعلق جدید تحقیقات سے واقف نہیں ورنہ ان کا نام شمس الدین ولی نہ لکھتے' اور انہیں اس سے قبل کے دور میں داخل کرتے۔ معیار) (۳) تیسرے دور کا زمانہ بھی یہی ہے' فرق صرف دہلی اور دکن کا ہے۔ اس دور میں آبرو' مضمون' ناجی' یکرنگ' کلیم' حاتم' فغاں' مظہر' سجاد' بہاری ہیں (کلیم اور فغاں کو اس دور میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نہیں یہ دونوں میر و مرزا کے معاصر ہیں۔ معیار) (۲) شعرائے متوسطین کا پہلا دور ۱۷۲۰ سے ۱۸۰۰ تک ہے۔ میر و مرزا' درد وغیرہ اس دور کے شاعر ہیں (یہ بیان صحیح نہیں کہ سودا نے قصائد کی ابتدا کی' شعرائے دکن تجلی' احسان اس دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ معیار) متوسطین کا دوسرا دور ۱۸۰۰ سے ۱۸۲۰ تک' خاص شعرا مصحفی' جرأت' انشا' حسن وغیرہ اس دور میں لکھنؤ کا طرۂ امتیاز فن مرثیہ گوئی کی ترقی ہے جس کے پیشرو خلیق و ضمیر ہیں۔ (خلیق و ضمیر مصحفی کے شاگرد ضرور تھے' لیکن یہ دونوں ناسخ کے دور میں داخل ہیں۔ معیار) دور سوم ۱۸۰۰ سے ۱۸۵۰ تک ناسخ' آتش' نصیر' ممنون' نسیم' نظیر اکبر آبادی' شہید دہلوی (شہید تخلص کا کوئی ممتاز شاعر اس عہد کا نہیں' نظیر اکبر آبادی مصحفی و انشا کے دور سے تعلق رکھتے ہیں' ذوق و غالب' وزیر و صبا کو اس دور میں نہیں رکھا تو نسیم لکھنوی کو اس دور میں شامل کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ معیار) (۳) شعرائے متاخرین کے بھی تین دور قائم کیے ہیں۔ ۱۔ دور اول ۱۸۲۵ تا ۱۸۷۵' ذوق' غالب' مومن' اسیر' وزیر' رند' صبا' انیس وغیرہ۔ ۲۔ دور دوم ضمیمۂ دور اول ۱۸۵۰ تا ۱۸۷۵' داغ' امیر و تسلیم وغیرہ۔ ۳۔ دور سوم ۱۸۹۰ء سے ۱۹۲۵ء تک تلامذۂ داغ و امیر' شاد عظیم آبادی' نظم طباطبائی' صفی' عزیز' آرزو وغیرہ (۴) شعرائے عصر حاضر ۱۹۰۱ء تا ۱۹۳۵ء حسرت' عزیز' ثاقب' فانی' جگر' اصغر' یگانہ وغیرہ (تحقیق کے اعتبار سے مضمون میں بہ کثرت غلطیاں ہیں' تنقیدی حیثیت سے بھی ناقابل اعتنا ہے۔ معیار)

**نگار لکھنؤ** جنوری ۱۹۳۶ء مرتبہ جناب انجم: "**غالب و اقبال**" از سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب ایم اے۔ ص ۱ تا ۳۰ (۱) غالب و اقبال کی مشترک خصوصیات' فارسی سے شغف اور فارسی تراکیب کی کثرت' فلسفہ' تعالی و حکمت طرازی' نازک خیالی' بلند پروازی' مبتذل اور عامیانہ خیالات سے احتراز' زبان و انداز بیان مشکل۔ غالب اور اقبال میں فرق یہ ہے کہ "اقبال اسلامی شاعر ہیں' ان کے پیغام کا مقصد اپنی خفتہ قوم کو بیدار کرنا ہے" "غالب وسیع المشرب اور آزاد خیال شاعر ہے" اس کے خیالات و افکار عالمگیر ہیں

(۲) غالب کے یہاں تشائم خیالات اور ان کے اسباب: ضمناً مضمون نگار نے لکھا ہے کہ باقر علی خاں اور حسین علی خاں غالب کی زندگی ہی میں داغ دے گئے تھے۔ یہ صحیح نہیں، دونوں کا استقال غالب کے بعد ہوا ہے۔ معیار)۔ اقبال کی شاعری میں بھی ناکامی و افسردگی کا عنصر موجود ہے۔ (۳) غالب بھی اقبال کی طرح شک سے یقین کی طرف گئے ہیں۔ (۴) خودشناسی تجدید آرزو، جوش عمل، محنت کوشی و خشن پسندی کی تعلیم اقبال کی طرح غالب کے یہاں بھی ہے۔ ولی عظیم آبادی از حکیم سید احمد اللہ ندوی ص ۴۱ تا ۴۴۔ (۱) (ولی کے والد کا نام جسونت ناگر بتایا ہے جو صحیح نہیں، یہ غلطی دراصل اول مصنفی سے ہوئی اور اس کی ایک خاص وجہ تھی، معیار) (۲) غالباً یہ نو مسلم تھے" (یہ بھی صحیح نہیں، معیار) (۳) "آج ان کی تصنیف عنقا صفت ہے، ان کی تصنیف سے عروض الہندی اب تک موجود ہے۔ معیار) (۴) ۱۱۸۰ — ۱۱۹۲ میں ولی کی عمر ۳۰ بتائی ہے (عروض الہندی کا سال تصنیف ۱۱۶۷ھ ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ پچیس تیس سال سے کم کی عمر میں یہ رسالہ نہ لکھا گیا ہوگا۔ معیار) (حیرت کی بات ہے کہ مضمون نگار نے کریم الدین کو گلزار ابراہیم کا مترجم لکھا ہے۔ معیار)

**ادب لطیف** لاہور، سالنامہ ۱۹۳۶ء مرتبہ چودھری برکت علی و مرزا ادیب۔ **غالب کے اردو کلام کی چند نمایاں خصوصیات**۔ ص ۲ تا ۳، از صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (۱) "غالب شاعری کی صحیح روح سے باخبر ہے اس لیے اس کا تخیل ہر گوشۂ کائنات اور حیات انسانی کے تمام مناظر و واقعات پر پرواز کرتا ہوا نظر آتا ہے" (۲) "اردو شاعری بالخصوص غزل کے اندر حسن و عشق کے معاملات تک محدود تھی، جن لوگوں نے ان حدود سے تجاوز کیا وہ یا تو رمی تخیلات میں ڈوب گئے۔ یا سطحیات ہی پر رہ گئے" غالب کے تخیل میں صرف وسعت ہی نہیں تعمق بھی ہے۔..... اس عمیق تخیل کے باوجود اشعار کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسی پر غالب کی شاعرانہ عظمت کا دار و مدار ہے"..... "غالب کے مشاہدات محض نہیں، وہ ہر شے کی تہ میں ایک اور ہی منظر دیکھتا ہے۔ اس مادی جہان کے اندر وہ ایک جہان معنوی تیار کرتا ہے اور پھر اس کو نیا نظام بخشتا ہے"۔ اس نظام میں موزونیت، حسن اور جاذبیت ہوتی ہے اگر یہ جاذبیت نہ ہو تو اس کے تخیلات خشک فلسفیانہ مسائل بن کر رہ جائیں۔ (۳) غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے علو تخیل کو جذبات کے ساتھ پیوست کیا ہے"...... غالب کا فنی کمال یہ ہے کہ وہ ٹھوس سے ٹھوس خیال کو کیف حسن میں ملبوس کر کے ہمارے سامنے لاتا ہے، اس لباس حسن میں الفاظ کی آرائش چار چاند لگا دیتی ہے" (۴) "اس کی شاعری فطرتاً پستی خیال سے مبرا ہے، غالب کی عظمت کی بڑی دلیل یہی ہے کہ اس نے ایک ایسے وقت میں یہ غیر فانی نغمہ بلند کیا جب کہ ہندوستانی تمدن کی پستی کے ساتھ ساتھ معیار زندگی ہر چیز زوال پذیر ہو چکی تھی"۔ "غالب اپنے عہد کے معیار ذہنی سے بہت بلند تھا" (۵) "غزل میں تسلسل جذبات کا امکان بہت کم ہے" لیکن غالب کی غزلیات میں بہت سی ایسی ہیں کہ اگرچہ اشعار کی انفرادی حیثیت جداگانہ ہے تاہم ساری غزل میں ایک ہی جذبہ کارفرما ہے (۶) اس کا تغزل شدید جذبات کا حامل ہے" "غالب حسن و عشق کے میدان میں جب آتے ہیں تو اس کے شعر تیر و نشتر بن جاتے ہیں" (۷) غالب کے تغزل کی دوسری خصوصیت اس کی کیفیات کا عمق ہے۔ یہ عمق نفسیاتی ہے"۔ "اس کے عشقیہ اشعار کے مطالعے سے انسان کبھی نہیں اکتاتا بلکہ جتنا غور کیا جائے کیف آور ہوتے جاتے ہیں"....... "یہ غور لفظی مشکلات کے متعلق نہیں ہوتا" "بلکہ نفسیاتی وسعت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ جذبات و کیفیات کا سیلاب کہیں تھمتا نظر نہیں آتا"..... "ایک شعر مضمون کی بلاغت اور اثر کی شدت کے اعتبار سے مستقل نظم کا مترادف سمجھا جا سکتا ہے"

(۸) حسن و عشق کے متعلق غالب کے خاص نظریے ہیں: "حسن راحت ابدی ہے جس کے لیے ظاہری آرائش کی ضرورت نہیں۔ فطرت خود حسن کی مشاطہ گری کرتی ہے۔ عشق اپنے گرد و پیش کی اشیاء کو بھی حسین بنا دیتا ہے۔ عشق ایک غیر فانی جذبہ ہے، غیر معین غیر محدود، انسانی قلب فانی اور محدود، یہ دریا اس ظرف تنگ میں کیونکر سما سکتا ہے۔ انسان کی بیتابی پیہم بکی زبردست دلیل ہے ہجر و فراق و وصال اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ غالب کی عاشقانہ قنوطیت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے (۹) غالب کی شخصیت اس کے اشعار میں نمایاں ہے۔" وہ کائنات کی عمیق گہرائیوں تک پہنچتا ہے، لیکن اپنی ہستی کھو نہیں بیٹھتا" (۱۰) عہد حاضر کی جدید نگاری حالی و آزاد کی ممنون احسان ہے، لیکن غیر شعوری طور پر اس جدت کا احساس غالب کی مجتہدانہ روش سے ہوا۔ مصحفی کا قیام دہلی ص ۱۰۸ تا ۱۱۱ از جناب افسر (۱) مصحفی ۱۱۶۱ اور ۱۱۶۴ کے درمیان پیدا ہوئے (۲) تعلیم و تربیت امروہے میں ہوئی، دہلی ۲۰ سے زیادہ کی عمر تھی جب پہنچے (نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۳ مضمون نگار نے بتایا ہے، حالانکہ اس کا سال تکمیل ۱۱۶۵ ہے۔ معیار)۔ (۳) مصحفی ۱۱۸۶ میں دہلی گئے اور ۱۱۹۰ میں لکھنو۔

---

## محکمہ:-

غزل آصف الدولہ و جواب شمس النسا بیگم: آصف الدولہ کا دیوان ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانے میں ہے اس میں ایک غزل چار شعروں کی۔ "ہم دیکھتے ہیں، تم دیکھتے ہیں" والی زمین میں پائی جاتی ہے۔ غزل یہ ہے:-

| | |
|---|---|
| تجھے غیر سے جب بہ و دیکھتے ہیں | نہ دیکھے کوئی جو کہ ہم دیکھتے ہیں |
| جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال دل کا | تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں |
| تو جلد آ کے آ ور نہ میرے مسیحا | کوئی دن کو راہ عدم دیکھتے ہیں |
| گلی میں بتوں کی شب و روز آصف | تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں |

شعر اول و سوم و چہارم تذکرۂ ہندی مصنفہ مصحفی ص ۵ و ۶ میں بھی موجود ہیں۔ شعر سوم میں "کوئی دن" کی جگہ "کوئی دم" ہے۔ شعر چہارم میں "گلی میں بتوں کی" کی جگہ "بتوں کی گلی میں" ہے۔

دیوان جہاں کا ایک قلمی نسخہ بھی اس کتب خانے میں ہے، بیگم کی غزل میں ایک شعر زاید ہے:

| | |
|---|---|
| بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے | بھلا اب کے تیری قسم دیکھتے ہیں |

ق۔ع۔و

# عالم ادب

**شاہ جارج پنجم کی وفات:** ملک معظم کی وفات کا غم عالمگیر ہے اور ہر طبقے اور ہر عقیدے کے لوگ خاندان شاہی کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ معیار بھی اس غم میں شریک ہے اور عالم ادب کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی پیش کرتا ہے۔ ملک معظم کو دستوری سلطنت کا قابل مثال بادشاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اپنے مشوروں سے اپنے وزرا کی اعانت کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن امور انتظامی میں کبھی انہوں نے ایسی مداخلت نہ کی جو دستور کے خلاف ہو۔ خاص خاص مواقع پر بادشاہ کا حق ہے کہ اپنے اختیارات تمیزی سے کام لے ایسے مواقع بہت کم پیش آتے ہیں لیکن جب کبھی ایسا موقع آیا وہ اس طرح عمل پیرا ہوئے کہ دوست دشمن سب نے اعتراف کیا اور دستور انگلستان کا مسلمہ کلیہ کہ بادشاہ غلطی نہیں کرسکتا ایک نئے مفہوم میں صحیح ثابت ہوگیا۔ ان کی فرض شناسی ضرب المثل تھی اور ان کی صداقت کے لوگ بہت اہل فکر و مانتے تھے۔ ذاتی قربانی سے انہوں نے کبھی دریغ نہ کیا۔ اور وہ قوم کے دکھ سکھ کو ہمیشہ اپنا دکھ سکھ سمجھتے رہے۔ اگر وہ اپنی قوم میں ہر دل عزیز نہ ہوتے تو تعجب ہوتا۔ ان کے عہد میں جو ذہنی سیاسی اور معاشی انقلاب ہوئے وہ تاریخ عالم میں یادگار رہیں گے۔ ان کے عہد کا ادب بھی صحیح معنی میں انقلابی ادب ہے اور یہ کہنا بالکل مبالغے سے خالی ہے کہ انسان کی مکمل تصویر کھینچنے کی اگر کوشش کی گئی ہے تو صرف اسی عہد میں۔ عہد وکٹوریہ کے مصنفین نے مشاہدات و محسوسات کے ایک چھوٹے سے جزیے پر قناعت کرلی تھی۔ اور دنیا کا بڑا حصہ ان کی نظروں سے پنہاں تھا۔ عہد ایڈورڈ ہفتم کے مصنفین انیسویں صدی کی علمی ترقی کے مادی نتائج کو دیکھ کر اس قدر حیران ہوئے کہ خود انسان کو بھول ہی گئے۔ ادبیات کے حدود کی یہ غیر معمولی توسیع قواعد فن میں غیر معمولی تبدل کی خواہاں ہے اور اس عہد کے مصنفین قواعد فن میں قدما کی پیروی سے بے نیاز ہوگئے ہیں۔ اس عہد کے اصلی نمائندے جوائس، لارنس، فورسٹر، ہکسلے، ورجینیا وولف، ایلیٹ، لٹن اسٹریچی وغیرہ ہیں اور اس عہد کی خصوصیات کی تلاش انہیں کی تصانیف میں کرنی چاہیے۔ ولز اور شا اب بھی زندہ ہیں اور ان کے تخیل کا سرچشمہ اب تک خشک نہیں ہوا۔ بنٹ اور گالزوردی کی بھی بہت سی تصانیف اس عہد میں لکھی گئیں لیکن ان سبھوں کی تصانیف اس عہد کے میلانات کے صحیح مظہر نہیں۔

**رڈیرڈ کپلنگ کی وفات:** انگریزی زبان کے اس نامور شاعر اور افسانہ نگار نے ۱۸ جنوری کو انتقال کیا اور ویسٹ منسٹر ایبے میں دفن ہوا۔ اس کی وفات فرد واحد کی موت نہیں بلکہ ایک دور کے خاتمے کا اعلان ہے۔ کپلنگ انگلستان کے مقبول ترین مصنفین میں سے ہے اور ایک زمانہ تھا کہ نوجوان اس کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اب بھی اس کے ماننے والوں کی تعداد کم نہیں۔ لیکن نوجوان اس کے نقش قدم کو دلیل راہ نہیں سمجھتے اور ذہنی حیثیت سے اس کی وقعت گذشتہ سال کی جنتری سے زیادہ نہیں۔ تاہم اس کے متعلق جون میسفیلڈ، ملک الشعراء انگلستان کے اس قول سے اختلاف مشکل ہے کہ عہد وکٹوریہ کے شاندار کارناموں کی قصیدہ خوانی اس سے بڑھ کر کسی شاعر نے نہیں کی اور برطانی خلافت ارضی کا ترانہ اتنے بلند سروں میں کسی نے نہیں گایا۔ اہل ہند کو اس سے بجا شکایت ہے کہ اس نے ہندوستان کی ذہنی نسل کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور ان کی آرزوؤں کی ہمیشہ تضحیک کرتا رہا۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تحقیر کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور ان کے مفروضہ نقائص کا ذکر مزے لے لے کر کرتا ہے۔ دی ہیڈ آف دی ڈسٹرکٹ کا مطالعہ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوگا کہ کپلنگ میں غیر جانبداری

نہیں پائی جاتی جو اعلیٰ درجے کی صنعت کاروں کے لیے ضروری ہے اور اسی وجہ سے ہم پول موران کے اس قول کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں کہ کپلنگ اپنے زمانے کا سب سے بڑا کہانی لکھنے والا ہے۔ کپلنگ کے والدین انگریز تھے، لیکن اس کی پیدائش ۱۸۶۵ء میں بمقام بمبئی ہوئی۔ بچپن کا زمانہ ہندوستان میں گزار کر تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا گیا۔ اس کی عمر ابھی ۱۵ ہی برس کی تھی کہ اس نے اپنی پہلی کتاب لکھی جسے اس کے والدین نے اپنے خرچ سے چھپوایا۔ ہندوستان واپس آکر یہ لاہور کے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے اسٹاف میں لے لیا گیا، لیکن اس نے تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ابھی کم سن ہی تھا کہ اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ "پہاڑیوں کی کہانیاں" ہندوستان میں شائع ہوا۔ ابتدا میں یہ چنداں مقبول نہیں ہوا، لیکن سیٹرڈے ریویو کے تبصرے نے اسے مقبول عام بنا دیا۔ اس کے بعد کپلنگ انگلستان چلا گیا اور وہیں مستقل طور پر مقیم ہو گیا۔ ۱۸۹۰ء میں کپلنگ نے انگلستان میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی اور ۱۹۰۰ء میں وہ عالمگیر شہرت کا مالک تھا۔ ۱۹۰۷ء میں اسے انعام نوبل ملا۔ اس کی تصانیف میں سب سے مقبول "دی جنگل بک" ہوئی۔ اس کے ۴ لاکھ سے زیادہ نسخے اب تک بک چکے ہیں۔ جسٹ سو اسٹوریز، کم، سکنڈ جنگل بک، اسٹوکی اینڈ کو، پک اوف پوکس ہل دوسری مقبول کتابیں ہیں۔ ان کے ۱۲ لاکھ سے زیادہ نسخے فروخت ہوئے ہیں۔ فرانسیسی اور المانی میں اس کی اکثر تصانیف کا ترجمہ ہوا ہے۔ رہی اردو، اس میں دی جنگل بک کے سوا جہاں تک ہمیں علم ہے کسی کا ترجمہ نہیں ہوا۔ ہم اس کی بعض کہانیوں کا ترجمہ اور اس کے متعلق ایک ناقدانہ مضمون جلد شائع کریں گے۔

**راموں ایسریا دل وال انکلاں کی وفات:** وال انکلان کا انتقال جنوری کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ رو ائٹر نے یہ خبر ہندوستان نہیں بھیجی۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ باوجود اس کے کہ وال انکلان عہد حاضر کے ہسپانوی مصنفوں میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ ہسپانوی زبان بولنے والے ممالک کے باہر وہ چنداں مشہور نہ تھا۔ اس کا سال ولادت ۱۸۶۹ء ہے اور اس کا مولد و منشا گلیشیا ہے جس کی شعریت و نفاست جزیرہ ہسپانیہ میں اپنی آپ نظیر ہے۔ وال انکلان مصنفین کی اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جو ۹۸ء کی نسل کہی جاتی ہے، اور جس کا موجودہ ہسپانیہ کی معنوی تعمیر میں بہت بڑا حصہ ہے۔ یونامانو، پیو بروخا، آزورین اسی گروہ کے لوگ ہیں، گو خیالات میں ایک دوسرے سے بہت اختلاف رکھتے ہیں۔ وال انکلان ادیب، شاعر، افسانہ نویس اور تمثیل نگار تھا۔ بعض ناقدین کی رائے میں اس زمانے کا کوئی نثر نگار اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ فلسفیانہ دقت آفرینیوں سے اسے کوئی سروکار نہ رہا، اور باوجود جمہوریت کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے گھبراتا تھا۔ اس کی شخصیت بڑی دل آویز تھی اور اس کو ہر دل عزیز بنانے میں اس کا بھی کچھ حصہ کم نہ تھا۔ پرانی وضع کے شرفا کا لباس، لمبی داڑھی ہوا میں اڑتے ہوئے بال فوراً لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ اس کی جنگ جوئی اور جسمانی تکالیف سے حد درجہ بے پروائی اس پر طرہ، سچے واقعات کو چھوڑ کر، اور ان کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی، لوگوں نے ہزاروں قصے گڑھ لیے تھے۔ اور وال انکلان کو ان کا ہیرو بنا دیا تھا۔ اسے بارہا ڈوئیل سے لڑنے کا اتفاق ہوا۔ اور ایک بازو اسی کی نذر ہوا۔ جس وقت ڈاکٹر اس پر عمل جراحی کر رہا تھا، وہ بے پروائی کے ساتھ سگرٹ پی رہا تھا۔ ہندوستان سے بھی اسے ایک قسم کا تعلق تھا۔ مہاراجہ کپورتھلہ کی شادی ایک غیر معروف ہسپانوی رقاصہ سے اسی نے کرائی تھی۔ اس کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور "طوروی سیند اڈے" ہے۔ ہمیں علم نہیں کہ انگریزی میں اس کی کتابوں کا ترجمہ ہوا یا نہیں لیکن فرانسیسی میں متعدد تصانیف کے تراجم موجود ہیں۔ اس کی تصانیف اس کی شخصیت سے علیحدہ نہیں۔ اور ہر کتاب میں خود بھی اپنی تخیل کا

گستاخیوں پر حیرانی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی کتابیں باوجود اس کے کہ مصنف کی شخصیت ہمیشہ ان میں مداخلت کرتی رہتی ہے، شروع سے آخر تک دلچسپی سے پڑھی جا سکتی ہیں۔ ناقدین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ بڑا صنعت کار تھا۔

**عبدالراشد الخیری مرحوم:** ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ سنا کہ دہلی کے مقبول افسانہ نگار راشد الخیری نے ۳ فروری کو اس دنیا سے رحلت کی۔ مرحوم کا سال پیدائش ۱۸۶۸ء ہے۔ ان کے والد حافظ عبدالواجد مرحوم ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس میں کئی مشہور عالم گزرے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں مرحوم کی پہلی تصنیف حیات صالحہ شائع ہوئی لیکن یہ چنداں مقبول نہ ہوئی۔ ان کی شہرت کا سنگ بنیاد رسالہ مخزن کے مضامین اور منازل السائرہ کی اشاعت نے رکھا۔ ۱۹۰۰ء میں مرحوم نے سرکاری ملازمت ترک کی۔ عورتوں کے لیے رسالہ عصمت نکالا جو کامیابی کے ساتھ اب بھی جاری ہے اور اپنی قسم کے بہترین پرچوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۱ء میں مرحوم اور محمد اکرام صاحب کی ادارت میں رسالہ تمدن نکالا لیکن یہ چند سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ ترک ملازمت کے بعد مرحوم نے اپنی زندگی خدمت ادب اور حمایت نسواں کے لیے وقف کر دی تھی چنانچہ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ۵۰ سے زیادہ ہے۔ کم سن بچیوں کے لیے مرحوم نے پندرہ سولہ سال قبل ایک مدرسہ بھی قائم کیا اور ان کی سرپرستی میں عورتوں کے لیے عصمت کے علاوہ دو پرچے اور نکلے۔ مدرسہ اور یہ رسالے اب تک قائم ہیں۔ عورتوں کی حمایت مرحوم کی زندگی کا مقصد عظیم تھا لیکن ابتدا میں آزادی نسواں کے متعلق ان کے خیالات انتہائی درجے کی قدامت پرستی پر مبنی تھے۔ زمانہ ایک ایسا معلم ہے جو بہ قدر استعداد سب کو سبق دیتا ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مرحوم کے خیالات میں بھی کچھ اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی تصانیف میں صبح زندگی کے سلسلے کی کتابیں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان کی وفات سے ایک خاص طرز انشا پردازی کا خاتمہ ہو گیا اور حقوق نسواں کا ایک زبردست حامی اٹھ گیا۔ ہمیں بیگم راشد الخیری اور ان کے لائق فرزند رازق الخیری اور مرحوم کے دوسرے اعزہ سے دلی ہمدردی ہے۔

**آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میسور:** آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا آٹھواں اجلاس بمقام میسور دسمبر کے آخری ہفتے میں زیر صدارت راجا سیوا کا راؤ بہادر ڈاکٹر اس۔ کرشنا سوامی آئینگر منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ای۔ پی۔ مٹکاف وائس چانسلر میسور یونیورسٹی صدر مجلس استقبالیہ کی تقریر کے بعد ہز ہائی نس یووراج میسور کی تقریر ہوئی اور آپ نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ صدر کی تقریر سے ان کی قدامت پرستانہ تنگ نظری ابھی پڑتی ہے۔ ہندو سوسائٹی کے نقائص کو دور کرنے کے لئے جو تحریکیں ملک میں زور پکڑ رہی ہیں، صدر صاحب کو ان سے بالکل ہمدردی نہیں۔ خطیبانہ انداز میں وہ اپنے سامعین سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر ان نقائص کے باوجود قدیم زمانہ کے ہندو ہندوؤں کی تہذیب کا سکہ ان ممالک میں بٹھا سکے جہاں یہ نقائص نہ تھے تو پھر آج کیوں ہندوستان کی ترقی کے لیے ان کا دور کرنا لازمی شرط سمجھی جائے۔ خطبہ صدارت میں کافی جگہ ہندوؤں کے مذہب کے مستقبل پر غور کرنے کے لیے نکالی گئی ہے لیکن ہندوستانی، فارسی عربی سے متعلق ایک لفظ بھی اس میں تلاش کرنے پر بھی نہ ملا۔ ہمارا خیال ہے کہ صدر صاحب نے اپنے عہدے کے فرائض کو اچھی طرح سمجھا نہیں یا اس دھوکے میں پڑ گئے کہ کانفرنس کو ہندوؤں کی تہذیب اور ہندوؤں کے مذہب کے علاوہ کسی اور چیز سے تعلق ہی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جدت بھی اچھی پسندیدہ نہیں کہ عربی فارسی کے شعبے کا نام بدل کر شعبۂ اسلامیات رکھ دیا گیا ہے۔ ہندوستانی اور ہندی کے شعبے اس سال سے بند کر دیے

اور ہندوستانی زبان سے متعلق جتنے مقالات تھے وہ شعبۂ اسلامیات میں پڑھے گئے۔ کانفرنس کا یہ رویہ صد درجہ قابل اعتراض ہے اور حامیان زبان ہندوستانی کو بلا قید مذہب و ملت اس پر اعتراض کرنا چاہیے تاکہ آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو۔ ذیل میں ہم ان مقالات کی فہرست دیتے ہیں جو کانفرنس میں پڑھے گئے۔ یا مقالہ نگاروں کا ارادہ تھا کہ انہیں پڑھیں لیکن کسی وجہ سے اس کا موقع نہ مل سکا۔ فہرست میں صرف وہی مقالات درج ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ ناظرین معیار کو ان سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔

شعبۂ ایرانیات" صدر پرنسپل بی ٹی انکلیسریا: (۱) "عمر خیام بحیثیت صاحب فکر و فلسفی" از جے ای سکلتوالا بمبئی۔ خیام میں رہبانیت کے بجائے نفرت کی وہ محبت تھی جو اہل تصوف میں ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے خیام اور تومس ڈاہرن کے فلسفۂ زندگی کا مقابلہ کیا ہے ان کی رائے میں اگر استعارات سے قطع نظر کر کے اصل معنی پر غور کیا جائے تو خیام حب الٰہی کے نشے میں سرشار نظر آتا ہے۔ براؤننگ اور خیام کے نظریہ ہائے محبت کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے!

شعبۂ اسلامیات صدر ڈاکٹر ابو النصر محمد نظام الدین پی۔ ایچ۔ ڈی (کینٹب) (۱) "دکن میں اردو شاعری کا احیا بعہد آصف جاہ ثانی از عبد القادر سروری ایم اے۔ دکن میں مغلوں کا عروج" دکنی زبان کا زوال" ابتدائے دور آصف جاہی میں شاعری کی حالت نظام علی خاں کے دربار میں دکنی شعرا کا شمالی عناصر سے میل جول اور اس کا اثر" شعرا کے تین گروہ جن کی سلطنت نے سرپرستی کی خالص دکنی خالص شمالی جو دہلی کے روز مرے کو برتتے تھے" اور وہ دکنی شعرا جو مخلوط زبان استعمال کرتے تھے)

(۲) نظام الملک طوسی کی زندگی اور سیاسی کارنامے کا تاریخی مطالعہ" از ابو نصر خالدی بی اے (عثمانیہ)

(۳ و ۴) شمس تبریز" اور حافظ کی عربی شاعری" از قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی (کسی مصنف نے شمس تبریز کے والد کا نام علاء الدین یا جلال الدین لکھ دیا ہے۔ یہ دونوں الموت کے اسماعیلی حکمراں تھے" اس بنا پر بعض لوگوں نے شمس تبریز کو اسماعیلی سمجھ لیا ہے۔ شمس کے والد کا نام جیسا کہ قدیم ذرائع سے معلوم ہوتا ہے محمد بن علی بن ملک داد یا ملک داؤد تھا" اور شمس اسماعیلی نہ تھا۔ دولت شاہ نے نام علاؤ الدین لکھا ہے" اس کی تردید)

(۵) "مشرق و مغرب کے مشرقی کتب خانے" از ڈاکٹر محمد حمید اللہ (عثمانیہ و بون و پیرس)

(۶) "اردو شاعری کا لکھنوی اسکول" از ڈاکٹر غلام محی الدین قادری (عثمانیہ و لندن)

(۷) "احیائے ادب در ایران در حکومت پہلوی" از صدر شعبہ (فارسی ادب کے پانچ دور" ایک نئے دور کا آغاز" شاہ پہلوی کی لطیفہ فنون و ادبیات" ادب کے جدید میلانات" عہد حاضر کے فارسی ادبیات کا مختصر جائزہ" فارسی کا مستقبل)

(۸) "شیر محمد خان ایمان" دکنی معاصر میر و سودا" از سید محمد ایم اے۔

شعبۂ کلاسیکل سنسکرت" صدر ڈاکٹر ایس کے اے اوڈی لٹ) (۱) "کیا غم انجام تمثیلوں کا نہ ہونا سنسکرت ادب کا نقص ہے؟ ابورو بھنگا" بھاسا کا ناٹک غم انجام ہے۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں غم و الم کے واقعات موجود ہیں۔ سنسکرت کے شاعروں کے نزدیک ادب کا جو مقصد ہے وہ ان کو غم انجام ناٹکوں کے لکھنے سے مانع آتا ہے)۔

(۲) "کالی داس اندھرا دیس کا باشندہ تھا" از گوبند چاریا سوامی مہاراجہ سنسکرت کالج وتزا نگرام

(۳) "رس کا ایک نیا تصور" از سی۔ آر۔ نارا سمہا شاستری مہاراجہ کالج میسور

(۴) "کالی داس کا پیام" از نارا سمہا شاستری دیو دو ایم۔ اے بنگلور (کالی داس کی خصوصیت یہ ہے نظریہ ہے۔ اس میں فن کے ادبی محاسن کے ساتھ مہابھارت کے عمیق مذہبی خیالات بھی ہیں۔ اس کی شاعری امید پرستوں کی شاعری ہے۔ شکست کو وہ نہیں جانتا لیکن کامیابی سے دیوانہ بھی نہیں ہو جاتا۔ وہ خوش دلی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں ہے۔ حصول کے ستھان کے نزدیک یہ ہیں کہ وہ چیزیں جو سدراہ ہیں دور کی جائیں۔ دنیا کی مسرتوں میں وہ حصہ لیتا ہے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ کوئی چیز ہے جو اس سے بلند تر ہے اس لیے اس کی نگاہ میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ انسان اگر مناسب ذرائع اختیار کرے تو ہر بات میں کامیاب ہوگا)

(۵) "سنسکرت میں غم انجام ناٹک" از ام چند راؤ ایم اے شعبہ سنسکرت میسور یونیورسٹی (چند ناٹک "اُرو بھنگا" "ہبھارا" وینی سمہارا" "چنڈا کوسی" کا مغربی معیار سے جانچنے کے بعد غم انجام ٹھہرتے ہیں۔ دوسرے ناٹک کا غم انجام کہنے کی وجہ یا وجوہ اس کے ہیرو اس میں مرتا نہیں۔ پہلے "اُنکہیں ہیرو کی موت" جو تھے ہیں موت کو ایک خاص پیرایہ میں ظاہر کرنا تیسرے میں ہیرو کی موت۔ اس ناٹک کا ہیرو دریودھن کو سمجھنے کی وجہ۔ ہیرو خاص قسم کے کردار کے لوگ "امور اور عالی مرتبہ اشخاص ہوتے ہیں (تیسرے یہ تھے "ناٹک شیکسپیر کے انداز کے ہیں" پہلے دوسرے یونانی انداز کے "ان ناٹکوں اور یونانی تمثیلوں کی مشترک خصوصیات)

(۶) "ہندوستانی شعریات میں قوت تخیل" از ٹی این سری کنٹیا ایم اے مہاراجہ کالج میسور۔

شعبہ پراکرت، صدر ڈاکٹر پی۔ ایل ویدیا ڈی لٹ (۱) "جین رامائن" از نارا سمہا چار راؤ ایم اے میسور۔

شعبہ تاریخ، صدر ڈاکٹر تارا چند معتمد پی ایچ ڈی بی آر ایس (۱) جہاں آرا بیگم از علم الدین سالک ایم اے لاہور۔

(۲) "نواب علی وردی کی سیرت اور اس کی حکومت" از کالی کنکر دت ایم اے لکچرر پٹنہ کالج پٹنہ۔ (ماخذ: سیرالمتاخرین، وقائع فتح بنگالہ محمد وفا، احوال علی وردی خاں یوسف علی، تاریخ بنگالہ سلیم اللہ، ریاض السلاطین غلام حسین سلامی (؟)، خلاصۃ التواریخ کلیان سنگھ، چند شائع شدہ و غیر شائع فرانسیسی انگریزی کاغذات)

(۳) "پیشواؤں کی زندگی" از رگھو ندر راؤ ایم اے میسور (۳) گوبند پنت بندیلہ دیالی مت از ایضاً۔

(۴) "ٹیپو سلطان" از و نکٹا سبا شاستری پی ایچ ڈی مہاراجہ کالج میسور (حال کے مصنف تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ٹیپو رعایا کا بہی خواہ تھا اور رعایا میں نامقبول نہ تھا۔ دونوں گھاٹوں کے درمیان جو ہندو رہتے ہیں ان کے ساتھ اس کا سلوک روا داری کا نہ تھا صرف ویلزلی ہی اسے بیوقوف بنا سکا لیکن جدید شہادتوں کا لحاظ کرکے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معمولی زمانے میں ٹیپو بھی معمولی قسم کا حکمراں تھا، لوگوں کے مذہب کا تبدیل کرانا سیاسی اغراض سے تھا۔ وہ اپنے ہندوستانی اور یورپی معاصرین سے زیادہ احمق نہ تھا)

شعبہ اثریات، صدر کے این دکشت ایم اے (۱) "تاریخ و عمارات اورنگ آباد" از بی احمد خاں اورنگ آباد۔

"پاٹلی پترا" میں کھدائی میں کون سی چیزیں نکلیں" از منورنجن گھوش پٹنہ میوزیم پٹنہ۔

شعبۂ فنونِ لطیفہ وغیرہ - صدر پروفیسر شاہد سہروردی بی اے - (۱) "قدیم ہندوؤں کی تماشا گاہیں" ہندوؤں میں غنائیت ہے اور قدیم ترین ویدوں میں ڈراما کے عناصر پائے جاتے ہیں - موہنجوداڑو ہڑپا اور دوسرے مقامات کی کھدائیوں سے شہادت ملتی ہے کہ ویدوں کے وجود میں آنے قبل بھی باقاعدہ تھیٹر موجود تھے -

شعبۂ السنۂ دراوڑی، صدر آر - راماسوامی ایم اے (۱) "تمل کی جدید تحریک اس کا آغاز اور نشو و نما" از ڈاکٹر سی نرائین - وی ایچ ڈی -

شعبۂ السنۂ جدیدۂ ہند - صدر ڈاکٹر ایس کے چیٹرجی ایم اے ڈی لٹ ہندی فورٹ ولیم کالج میں از برج رتن بیس ایم اے -

ہندوستانی اکیڈمی: ہندوستانی اکیڈمی کی چوتھی کانفرنس جنوری کے دوسرے ہفتے میں بمقام الہ آباد منعقد ہوئی - کانفرنس کا افتتاح صدر اکیڈمی رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کی تقریر سے ہوا - اس کے بعد مسٹر سچدانند سنہا سابق رکن ایگزیکٹو کونسل بہار و اڑیسہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا - یہ خطبہ اخبارات میں مکمل شائع ہو چکا ہے اس لیے اس کا صرف خلاصہ معیار میں درج کیا جاتا ہے (۱) الہ آباد کی ہندوستانی اکیڈمی کے قیام کے بعد بہار و اڑیسہ کی مجلس قانون سازی میں یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس صوبے میں ایک اکیڈمی قائم کی جائے حکومت نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی زیر صدارت سر علی امام بہادر جس کی سفارش اکیڈمی قائم کرنے کے حق میں ہوئی لیکن اس کے بعد حکومت کو چند ایسی مالی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا کہ اس سفارش پر عمل درآمد نہ ہو سکا - (۲) اکیڈمی نے اس وقت تک ۲۰ کتابیں ہندی میں ۱۹ اردو میں شائع کی ہیں مشاہیر اہل علم سے لکچر دلوانے کا انتظام بھی اکیڈمی نے کیا تھا اور یہ سلسلہ ۱۹۳۲ء تک جاری رہا ۔۔۔ ہزار روپے اکیڈمی نے ...... اس وقت بطور انعام ہندی اردو کے مصنفین کو دئے ہیں - طلبہ کی ہمت افزائی کے لیے ۔۔۔ روپے دئے گئے وہ اس کے علاوہ ہیں - اکیڈمی اردو ہندی کے سہ ماہی رسالے الگ الگ نکالتی ہے (۳) شمالی ہند کے ان اضلاع میں جہاں اردو ہندی بولی جاتی ہیں ان دونوں کی علیحدگی کی وجہ سے بڑی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں - بنگالے میں بنگلا اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہو سکتی ہے لیکن صوبجات متحدہ میں اردو و ہندی کے جھگڑے کی وجہ سے کسی دیسی زبان کا ذریعۂ تعلیم ہونا ناممکن ہے - ان صوبوں میں کچھ عرصے سے ابتدائی مدارس کے لیے یہ تجربہ ہو گیا ہے کہ ایسی زبان میں تعلیم دی جائے جو ہندو مسلمان دونوں سمجھتے ہوں یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا - صوبہ بہار میں بھی اس کی تقلید کی گئی ہے (۴) اردو ہندی دونوں نام فساد کی جڑ ہیں ان کو ترک کر کے ایک نام ہندوستانی رکھنا چاہیے - ہندی والے یہ سمجھتے ہیں کہ بہترین ہندی وہ ہے جس میں بدیسی زبان کے الفاظ کیا خود روزمرہ کے ہندوستانی الفاظ نہ آنے پائیں اردو والے اسے بہتر جانتے ہیں کہ ہندی الاصل الفاظ جہاں تک کم ممکن ہو استعمال کریں اور عربی فارسی الفاظ جہاں تک ہو سکے بھر دیں - سر تیج بہادر سپرو فرماتے ہیں کہ اس طرف اردو میں نئے نئے عربی فارسی الفاظ داخل ہو رہے ہیں جو پہلے کبھی سننے میں بھی نہ آتے تھے رہی ہندی اس کا یہ حال ہے کہ کبیر، عبدالرحیم، تلسی داس، بہاری لال، ملک محمد جائسی کا کلام بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے لیکن آج کل کے لکھنے والوں کی کتابیں سمجھنے کے لیے قدم قدم پر لغت کی ضرورت ہوتی ہے - یہ مقام مسرت ہے کہ اس رجحان کی مخالفت بھی ہو رہی ہے چنانچہ ہندی کے ایک نامک سیتا کے سپوت میں ایسے لوگوں کی خوب ہنسی اڑائی گئی ہے جو خواہ مخواہ بڑے بڑے

الفاظ زبان میں ٹھونستے ہیں، اُردو و ہندی قدیم نام نہیں اور نہ ان کے ترک کرنے سے یہ ڈر ہے کہ لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ میر علی محمد شاد مرحوم، شیدا علی بلگرامی مرحوم اور سید سلیمان صاحب ندوی کی رائے ہے کہ اُردو کی جگہ ہندوستانی نام زیادہ موزوں ہے۔ شاد مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو قدیم نام زبان کا نہیں ہے بلکہ تیرہویں صدی کے وسط میں یہ نام وجود میں آگیا۔ امیر نے "زبان اردوئے معلی شاہجہان آباد" لکھا ہے۔ مصحفی کے اشعار میں جو تیرہویں صدی کی ابتدا کے لکھے ہوئے ہیں، "اردو زبان" آیا ہے اور دریائے لطافت جب تصنیف ہوئی ہے تو لفظ اردو زبان کے لیے عام طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شاد کا قول صحیح نہیں۔ معیار۔ (۴) عوام کی زبان پر ہزاروں الفاظ ہیں جو خالص ہندوستانی ہیں لیکن شرفا کی زبان سے خارج ہیں۔ اکیڈمی کو ایسے الفاظ کا لغت تیار کرانا چاہیے۔ (۵) ہندی اردو کے مستند مصنفین کی کتابوں کے ارزاں نسخوں کا ایک سلسلہ شروع ہونا چاہیے جن کی قیمت ایک روپیہ فی جلد سے زیادہ نہ ہو۔ (۶) ایک مستقل سلسلہ ایسی کتابوں کا شائع ہونا چاہیے جو نہ مغلق ہندی میں ہو نہ مشکل اردو میں بلکہ ایسی زبان میں جس کو اردو والے بھی سمجھ سکیں اور ہندی والے بھی۔ انشا کی کہانی، پنڈت شری دھر پاٹھک اور پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیا کی کہانیاں، نظیر اکبر آبادی اور آرزو کا منتخب کلام اس سلسلے میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ کچھ روپے جو انعامات میں دیے جاتے ہیں ایسے مضمونوں کے لیے مخصوص کر لینے چاہییں جو اردو ہندی کے فرق کو بڑھاتے نہیں بلکہ کم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ خطبۂ صدارت کے بعد اکیڈمی کی کارگزاری کی رپورٹ پڑھی گئی اور اس کے بعد پنڈت گنگا ناتھ جھا صدر شعبۂ ہندی اور عبدالحق صاحب صدر شعبۂ اردو نے اپنے اپنے خطبے پڑھے۔ عبدالحق صاحب کا خطبۂ صدارت رسالہ اردو جنوری میں چھپا ہے۔ انھوں نے ابتدا میں گذشتہ صدی کی چار منظم تحریکوں کا ذکر کیا جن سے اردو زبان و ادب کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اور اورینٹل کالج لاہور۔ پھر اس کی شکایت کی کہ ادبی اداروں میں باہمی اتحاد اور ارتباط نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت سا وقت، محنت اور روپیہ رائگاں جاتا ہے۔ اگر سال میں ایک بار اردو کی خدمت کرنے والوں میں سے وہ لوگ جو اہل نظر اور صاحب رائے ہیں ایک جگہ جمع ہو کر کام کی نوعیت، کام کی تقسیم، اس کی ترقی و اشاعت اور جدید ضروریات کے متعلق غور کر کے کچھ امور طے کر لیں، ان کے عمل میں لانے کی تدابیر سوچیں اور ان کے انجام دہی کے وقت کا بھی تعین کریں تو یقین ہے کہ وقت، محنت اور روپے کی بڑی بچت ہوگی۔ صاحب موصوف نے ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ اکیڈمی ایسی کتابیں لکھوائے جو ایسی زبان میں ہوں جو بجنسہ دونوں رسم الخط میں چھپوائی جا سکیں۔

قابل ذکر مضامین جو جلسے میں پڑھے گئے حسب ذیل ہیں:— ڈاکٹر زبیر احمد "اردو و قواعد"، ڈاکٹر سید محی الدین قادری "دکن کی اردو شاعری عہد آصفیہ میں"، مولوی نعیم الرحمن صاحب "اردو کے اعراب"، عبدالماجد صاحب "اردو کا واعظ شاعر"، ریاض الحسن صاحب "آرٹ اور حقیقت"، آفاق حسین صاحب "قدیم اردو ادب"، سیماب صاحب "ہندوستان کی تربیت جدید میں اردو شاعری کا حصہ"، ڈاکٹر سید حسن برنی صاحب "شاہ دولہ"، ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ "دور سلطانی کے امرا"، محمد اکمل خاں صاحب "لاطینی رسم الخط کے ذریعے سے ہندی اور اردو کا ملاپ"، پنڈت کشن پرشاد کول "اردو اور ہندی زبانیں"، عبدالسلام صاحب ندوی "اردو شاعری کے جدید انتخابات کی ضرورت"، مہیش پرشاد صاحب "غالب کے خطوط"، خان صاحب سید افضل حسین "نفیس لکھنوی"۔

انجمن ترقی اردو۔ انجمن ترقی اردو کی طرف سے کتب ذیل بہت جلد شائع ہونے والی ہیں۔ "تذکرۂ گل عجائب" (۱۱۹۴-۱۱۹۲) مصنفہ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی "ملا نصرتی" از عبدالحق صاحب تقریباً ۲۵۰ صفحے "سودا" تحقیقی مقالہ از شیخ محمد چاند صاحب ۵۲۰ صفحات۔

دیوان جوشش: عظیم آباد کے اس نامور شاعر کا دیوان دستیاب ہو گیا ہے اور اس کی ترتیب و تہذیب کا انتظام ہو رہا ہے۔ مثنویات مصحفی: مصحفی کی اردو مثنویاں تعداد میں سات کے قریب ہیں۔ عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو کی فرمائش سے قاضی عبدالودود صاحب انہیں مرتب کر رہے ہیں۔ قرینہ ہے کہ اس سال ان کا مجموعہ مرتب ہو کر شائع ہو جائے۔ تذکرہ میر حسن: یہ تذکرہ ایک بار چھپ چکا ہے، لیکن کتابت کی غلطیاں بہت رہ گئی تھیں اور زیادہ قلمی نسخوں کے مقابلے کا بھی انتظام نہ ہو سکا تھا۔ اب قاضی عبدالودود صاحب اسے کئی قلمی نسخوں کی مدد سے از سر نو مرتب کر رہے ہیں۔ اس کی طباعت انجمن ترقی اردو کی طرف سے بہت جلد شروع ہونے والی ہے۔ ثلاثۂ غسالہ: اس نام کی ایک کتاب کشف الفنون کی طرز پر حکیم حبیب الرحمن صاحب ڈھاکہ لکھ رہے ہیں اور اب قریب تکمیل ہو۔ قرینہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے اس سال یا سال آئندہ شائع ہو جائے۔ اس کتاب کو حکیم صاحب کی ادبی زندگی کا حاصل قرار دی جائے تو غلط نہ ہوگا، اس لیے کہ تکمیل میں ان کی زندگی کے بیس پچیس سال صرف ہوئے ہیں۔ ثلاثۂ غسالہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اول تو کتاب بنگالے کے متعلق ہے، دوسرے اس کو تین زاویوں سے مرتب کیا ہے۔ ثلاثہ غسالہ میں تین کی رعایت تو ظاہر ہے یہ بھی ناظرین کو معلوم ہوگا کہ یہ ترکیب حافظ کے ایک شعر سے ماخوذ ہے اور جس غزل کا یہ شعر ہے وہ حافظ نے بطور ارمغان بنگالے بھیجی تھی "شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند ؛ زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود"۔ اس کتاب میں ان تمام کتابوں کا ذکر ہوگا جو جنوبی زبانوں میں بنگالی مصنفین نے لکھی ہیں۔ بیرونی اشخاص نے بھی جو کتابیں زمانہ قیام بنگالہ میں لکھی ہیں وہ اس میں شامل ہیں۔

دنیا کے بہترین افسانے: منظور احمد صاحب (مدیر ادبی دنیا) کی یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اب متعدد افسانوں اور مقدمے کے اضافے کے ساتھ دوسری بار چھپ رہی ہے۔ اپریل تک شائع ہو جانے کی توقع ہے۔

رسول کریم: منظور احمد صاحب کے قلم سے امیر علی مرحوم کی روح اسلام کے پہلے حصے کا ترجمہ اپریل تک شائع ہو جائے گا۔

تمدن عرب: سید علی بلگرامی مرحوم نے گستاو لیبون کی اس کتاب کا ترجمہ اصل فرانسیسی سے کیا تھا اور ۱۸۹۸ء میں اس کا پہلا نسخہ شائع کیا تھا۔ کتاب عرصے سے کمیاب تھی۔ سید عبدالقادر صاحب، مالک اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدر آباد دکن اسے طبع کرا رہے ہیں۔ قیمت طبع اول کے مقابلے میں کم رکھی گئی ہے۔

کتاب الہند بیرونی: سید حسن برنی صاحب بی اے ایل ایل بی (علیگ) بیرونی کی مشہور عالم کتاب کا بظاہر اصل عربی سے ترجمہ کر رہے ہیں اور بفضلہ تعالیٰ کے انہوں نے یہ کام انجام بھی کر لیا ہے۔ دوسرے باب کا ترجمہ انہوں نے سالنامہ عالمگیر ۱۹۳۶ء میں چھپوایا ہے اور اہل نظر سے مستدعی ہیں کہ اس ترجمے کے حسن و قبح سے انہیں آگاہ کریں۔

ہوں براہ کرم تعارف کو غور سے پڑھیں۔ (۲) یہاں پر صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں مترجم اپنی خواہش کے مطابق رد و بدل کر دیتا ہے نہ شائع ہوں گے۔ ہر ترجمے کے ساتھ مصنف اور اصل افسانہ نگار یا مضمون کا نام ضرور درج ہونا چاہیے۔ (۳) جو صاحب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں مضمون کے ساتھ اس کی تصریح فرما دیں۔ (۴) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں کہ ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کر دیے جائیں۔

**معاصرین سے۔** جن معاصرین کو تبادلہ منظور ہو وہ (یہ صرف ادبی رسائل کے لیے ہے) براہ کرم سال رواں کے کل پرچے روانہ فرمائیں تاکہ معیار میں ہم ان کے ادبی مضامین کے خلاصے درج کر سکیں۔ اس عنایت نوازش کے لیے ہم نہایت ممنون ہوں گے۔

**مشتہرین سے۔** مشتہرین میں رسالے کو مقبول بنانے کے لیے اجرت بہت کم رکھی گئی ہے۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی اشتہار شائع ہو سکتے ہیں۔ نرخ نامہ طلب کرنے پر بھیجا جائے گا۔

**نمونہ۔** خاص خاص اصحاب کی خدمت میں معیار کا پہلا پرچہ نمونتہً حاضر ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ وہ اس کے مطالعے کے لیے وقت نکال کر ہمیں شکرگزاری کا موقع دیں گے۔ اس کے حسن و قبح سے ہمیں آگاہ فرمائیں گے اور پسندیدگی کی صورت میں ہمیں اجازت دیں گے کہ ان کا نام خریداروں کی فہرست میں درج کر لیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ دوسرا پرچہ بے لیاقتی تضییع اوقات کا باعث بنے گا۔

## مندرجات معیار ماہ مئی

مئی کے معیار میں اس کی مخصوص عنوانات کے علاوہ حسب ذیل مضامین ہوں گے۔

۱۔ اشعار غیر مطبوعہ مرزا غالب۔ ۲۔ دیوان دوم معروف از قاضی عبدالودود مدیر معیار۔ ۳۔ پنج حرف از نئے ہی دادا ؟ ۴۔ قدیم فارسی شاعری از ڈاکٹر نظام الدین استاذ فارسی جامعہ عثمانیہ۔ ۵۔ امانت کی اندر سبھا کے متعلق غلط فہمیاں از آرزو جلیلی۔ ۶۔ حسن ذکاں۔ از گی دمو پاسان۔ مترجمہ آرزو جلیلی۔

امیر مینائی اور ان کے خاندان کے بعض افراد کی ایک مجموعی تصویر ہمیں مل گئی ہے۔ ہم اس نایاب تصویر کو مئی کے معیار میں شائع کریں گے۔ یہ تصویر ہمیں جناب ریاض حسن خاں خیال کی عنایت سے مل گئی ہے۔

مقام اشاعت۔ مراد پور بانکی پور (پٹنہ)

"منتظم"

# دیوان جوشش

جوشش عظیم آباد کا نامور شاعر ہے ۔ اور اس کی نغز گوئی کے کل تذکرے معترف ہیں ۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ دنیا میں موجود ہے جو بڑی کوشش سے دستیاب ہوا ہے ۔ انجمن ترقی اردو اس کا نہایت اہتمام سے اشاعت کی غرض سے مرتب کرا رہی ہے ۔ اس کو صحیح اور جامع بنانے کی انتہائی کوشش کی جا رہی ہے ۔ چنانچہ کل تذکروں سے انتخاب کر کے متعدد ورق میں مبسوط تذکرہ صرف کر کے جوشش کے حالات اور ان کے اشعار کی نقلیں منگوائی گئی ہیں مقدمے میں جوشش کے علاوہ ان کے بھائی محمد عابد دل کے حالات بھی ہوں گے اور ان کے عہد کی زبان سے بھی مفصل بحث کی جائے گی ۔ دل کا کلام جوشش کے کلام میں کیا گیا ہے ۔ ان کے اشعار بڑی کوشش سے حاصل کیے گئے ہیں اور جو مجموعہ دیوان جوشش شائع ہو گئے ہیں تو یہ دیوان ہندوستان بھر کے ارباب ذوق کی قدر شناسی کا مستحق ہے لیکن اہل بہار سے خاص طور پر توقع ہے کہ وہ اس کی خریداری فرمائیں گے ۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بہار کے قدیم باکمالوں میں شاد کے سوا کسی کا کلام اب تک طبع نہیں ہوا ۔ اکثر کا کلام ضائع ہو چکا اور دیوان جوشش بھی اسی حالت میں ہو کر اگر انجمن اس کی اشاعت کی طرف متوجہ نہ ہوتی تو بہت جلد کیڑوں کی نذر ہو جاتا ۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ تذکرہ عشقی تذکرہ شورش جو ان دونوں کے مصنف عظیم آبادی ہیں اور بعض دوسرے دواوین بھی شائع کیے جائیں لیکن اس ارادہ کا قوت سے فعل میں آنا اس صورت میں ممکن ہے کہ دیوان جوشش کے خریداروں کی تعداد میں ہم پہنچیں دیوان مع مقدمہ نفیس لکھائی چھپائی کے ساتھ ۳۰۰ صفحات سے زائد پر طبع ہو گا ۔ ماہ اپریل کے آخر تک جن صاحبوں کی درخواستیں وصول ہوں گی ان سے قیمت ۲۵ فی صدی کم یعنی اصل قیمت دو روپے کے قریب ہو گی ۔

درخواستیں بنام منتظم معیار بانکی پور (پٹنہ)

# اصلاحیہ بک ڈپو

## مہندرو پٹنہ

مغل اور اردو ۔ داستان اردو کا ایک دلچسپ باب ۔ از جناب ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیال ۔ قیمت صرف عمر

داستان عجم ۔ قیمت صرف ایک روپیہ عہ

فکر بلیغ ۔ از حضرت شاد عظیم آبادی قیمت ۱۲

ظہور رحمت " " " ۸

نادر ہند " " ۱۲

تاریخ شعرائے بہار جلد اول مؤلفہ عظیم آبادی ۔ اردو شاعری کی تاریخ بیان کرنے کے بعد صوبہ بہار کے تین سو شعرائے متقدمین اور متوسطین کا تذکرہ اور ان کے ادبی کارناموں کی فہرست مع نمونہ کلام تین مجلدوں میں بتفصیل مذکور ہے قیمت عمر

تذکرہ بہار اور اڑیسہ ۔ مرتبہ محمودہ خاتون مرحومہ سٹرس گرلس اسکول پٹنہ ۔ بہار کے جغرافی تاریخی ادبی علمی حالات درج ہیں ۔ قیمت صرف دس آنہ ۔ ۱۰

اس کے علاوہ بھی کتابیں اردو ادب کی رہتی ہیں ۔

خرچ ڈاک و پیکنگ وغیرہ ذمہ خریدار ۔

ملنے کا پتہ

**منیجر اصلاحیہ بک ڈپو**

مہندرو (پٹنہ)

نور الحسن پرنٹر و پبلشر نے برقی مشین پریس مراد پور بانکی پور سے چھپوا کر دفتر معیار مراد پور بانکی پور سے شائع کیا۔

انجمن ترقی اردو (شاخ پٹنہ) کا ادبی رسالہ

مرتب:- قاضی عبدالودود　　معاون:- آرزو جلیلی

اپریل　　بانکی پور (پٹنہ)　　۱۹۳۶ء

# معیارؔ

سالانہ چندہ ۔ للعہ
ممالک غیر سے ۔ معہ

فی پرچہ ۔ ۱۲ر
انجمن ایڈیشن (ولایتی کاغذ) فی پرچہ ۔ ۳ر
ضمیمہ (۴۰ صفحات) فی پرچہ ۲ر

بانکی پور۔ (پٹنہ)

(جنوری ۔ مارچ ۔ مئی ۔ جولائی ۔ ستمبر اور نومبر میں ۱۱۲ صفحات ۔ باقی مہینوں میں ۴۰ صفحات)

مرتب:۔ قاضی عبدالودود
معاون:۔ آرزو جلیلی

جلد ۱ — اپریل سنہ ۱۹۳۶ء — نمبر ۲




## تعارف

میر حسن کے اشعار کلیات حسن کے اسی نسخے سے ماخوذ ہیں، جس کا ذکر گزشتہ اشاعت میں کیا جا چکا ہے۔ سراج دکنی، وحشیؔ کی غزلیں تذکرۂ عیار الشعرا، مصنفہ خوب چند ذکا سے نقل کی گئی ہیں۔ اس کا صرف ایک نسخہ دنیا میں ہے، اور وہ دفتر وزارت ہند لندن میں محفوظ ہے۔ دل عظیم آبادی کے اشعار تذکرۂ عشقی سے لیے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ بھی بہت کمیاب ہے، اور اس کے صرف دو نسخوں کا اس وقت تک پتا چلا ہے۔ صولت مرحوم کے اشعار ان کے مطبوعہ دیوان سے انتخاب کیے گئے ہیں۔ سید محبوب خیر صولت مرحوم اور ان کے استاد حسن بلگرامی کا ذکر وصی احمد بلگرامی صاحب نے اپنے مشہور مضمون "س ش ص" میں کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ حسن اپنی لکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھا کر اپنے شاگردوں کو چھ مہینے دو مہینے میں شاعر بنا دیتے تھے۔ صولت کا کلام مشاہیر اساتذۂ فارسی کے مقابلے میں

نہیں پیش کیا جاسکتا۔ لیکن جو قدرت انہیں شعر گوئی پر ہے اگر وہ حسن کی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ ہے تو حسن کی کرامت میں کوئی شبہ نہیں۔ مولف کے حالات بھی ہم کسی موقع پر لکھیں گے۔

**مراسلت** :۔ یہ باب اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ ادب یا زبان کے متعلق وہ مسائل جو وقتی اہمیت رکھتے ہیں ان پر بحث کی جاسکے۔

# تصحیح

مارچ کے پرچے میں کتابت اور طباعت کی غلطیاں اس قدر تھیں کہ ان کی مکمل تصحیح غلط نامے میں نہیں ہو سکی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ناظرین کو دوبارہ زحمت دینی پڑی۔ ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ پرچے صحیح چھپیں۔ اگر کسی پرچے میں غلطیاں رہ جائیں گی تو ان کی تصحیح دوسرے ماہ کے پرچے میں کی جائے گی۔

ص الف س ۳ ، چھپائے = چھپوائے۔ ص ا دستدرجات بابت ماہ ماریچ = مارچ (نمبر شمار = شمار)۔ اقتباسات کے بعد فہرست میں ایک عنوان "استفسارات" چھوٹ گیا ہے۔ اس کا شمار ۲۷ ہوگا، اور اس کے بعد ۲۷ کی جگہ ۲۸، ۲۸ کی جگہ ۲۹ اور ۲۹ کی جگہ ۳۰۔

ص ۳/س ۲۱ پسند = پسند نہیں۔ ۴/۱ ساتو = سے۔ ۵/۱۲ زبان = کس زبان ۵/۲۲۔ بعض = انہوں نے بعض۔ ۶/۴ ص ۲۴ = ص ۳۰۔ ۷/۲۰ سکے گی = سکی۔ ۷/۱۴ ضروری = ضروری ہے۔ ۸/۱۲ سے باہر = باہر۔ ۷/۱۲ طے = منضبط۔ ۷/۲۲ پر = پر بھی۔ ۸/۲ بھی ہم = بھی۔ ۸/۱۱ الیے = اپنے۔ ۱۲/۱۲ ممین = ممکن۔ ۲۶/۴ بالاخانہ = بالا خانے۔ ۲۶/۱۲ زمانہ = زمانے۔ ۳۰/۸ ہوئی = ہوئے۔ ۳۶/۲۲ جس کی منزل = جس کے چونے منزل۔ ۳۹/۲۴ کا پیارہ = کو پیارہ۔ ۳۹/۲۴ مزہ = منہ ۴۱/۱ دایاں = دہنا۔ ۴۲/۲۲ الا = الا۔ ۴۸/۴ سکینہ = سکینہ۔ ۴۸/۱۱ رضا = رضا۔ ۵۰/۱۲ سے نکلے ہیں = ۹ء ۱۱ نکلتا ہے۔ ۵۰/۱۲ بھی حال = حال بھی۔ ۵۱/۱۱ مزاے = مزہ۔ ۵۲/۲۵ جلوہ = جلوہ۔ ۵۴/۲۲ این است = این ست۔ ۵۵/۱۴ بودہ است = بود و است۔ ۹۲/۱۱ لڑکی = لڑکی کی۔ ۹۳/۱۰ لکھا ہے = ہے۔ ۹۴/۹ ومطلعات = اور مطلعے۔ ۹۶/۱۴ پھروں = لوں۔ ۹۹/۱۰ کیا = کی۔ ۹۹/۲ لیکن = ۔ ۹۹/۲ اشتاب = شتاب۔ ۹۹/۲۲ یہ کر۔ ۹۹/۴ منقدہ = منعقدہ۔ ۹۹/۱۲ لینا = لیناتھی۔ ۱۰۵/۱۱ وکٹوریہ = وکٹوریا۔ ۱۰۵/۱۵ (لارنس = لارنس) (ورجینا = ورجینیا) (اشروجی = اشرواجی) ۱۰۵/۲۲ ارض = ارضی۔ ۱۰۶/۱۴ جزیرہ = جزیرہ نمائے۔ ۱۰۶/۲۲ رابہ = راجا۔ ۱۰۸/۴ مقالا = مقالہ۔ ۱۱۱/۲ روپیہ = روپیا۔ ۱۱۱/۸ ہو = ہوں۔ ۱۱۱/۲۰ زبیر = زبید۔ ۱۱۱/۲۲ (شاہ = شاہ) (میکنگیسن)۔ ۱۱۳/۴ اس کتاب کو ...... دی جائے = یہ کتاب ...... دی جائے۔ (اس کی جو تصحیح سابق میں ہوئی تھی وہ غلط ہے)۔ ۱۱۳/۱۴ امتحان = ارمغان۔

ص ۱۰۸/۱۹ حمایت = اعانت

# آثار ادبیہ

(۱) مثلثات میر حسن (۲) ترکیب تضمین ایجاد میر حسن (۳) غزلیات سراج اورنگ آبادی و ممنون دہلوی و قطب الدین مشیر دہلوی۔

## مثلثات میر حسن

| | | | |
|---|---|---|---|
| گزر ہر دل میں ہے از بس کہ تیرا | "ز خود ہرگز نیازارم دلے را | کہ می ترسم دروجائے تو باشد" | نظیری |
| سوا اس کے نہیں درکار کچھ شے | "جہانے مختصر خواہم کہ در وے | ہمیں جائے من وجائے تو باشد" | لاعلم |
| کسی کے درد کو سمجھے گا تو خاک | "ترا ہرگز گریبانے نشد چاک | چہ دانی لذت دیوانگی را" | حیاتی |
| نکالا اب کہاں کا اس نے یہ بیر | "چناں آمیزشے کردہ است با غیر | کہ بے او در خیال ما نسیاید" | لاعلم |
| مجھے ٹھہرا گیا نہ آخر کار | "نرفتم از خویش وقت رفتن یار | او چناں رفت و من چنیں رفتم" | " |
| سب طرف سے ہاتھ اٹھا کے اک دم | "سر بر قدمت نہادہ بودم | افسوس کہ روزگار نگزاشت" | " |
| کیا حال رہا ہے اس میں اب خاک | "از بس کہ رفو زدیم و شد چاک | این سینہ ہمہ بہ دوختن رفت" | لاعلم |
| ٹک دیکھ کے راہ چل ستم گر | "از نقش قدم بسے فزوں تر | در راہ تو چشم انتظار است" | حزیں |
| دفا کیسی کہاں کی بے وفائی | "شکایت را بود شرط آشنائی | چہ باید گفت آں نا آشنا را" | پیام اکبر آبادی |
| اس بت کی ادا نے مجھ کو مارا | "گفتم کہ نگاہ کن خدا را | گفتا کہ خدا نگاہ دارد" | نسبتی |
| گر سفر پہ کرے ہے تو نے کسی | "بہ غریبان شہر او چو رسی | نسبتی را سلام ما برساں" | " |
| دیدہ وا دیدہ ہو گئی کل واں | "دی چشم با چشم شد پیام رساں | از میان منت زباں برخاست" | " |
| یہ کج فہمی ہے تیری میں کہوں سچ | "ظہوری شکوہ ات از یار بیجاست | تو بے طالع فتادی جرم او چیست" | ظہوری |
| ایک دل ہو کدھر کدھر لے گل | "یک طرف زلف و یک طرف کاکل | جان من در کشاکش افتاد است" | " |
| بے شرکت غیر آہ یک چند | "بودیم بہ دوستیش خورسند | آن نیز نصیب دشمناں شد" | امید |

## ترکیب تضمین ایجاد میر حسن

(۱)

بلندی پر کوئی گو اپنے ٹکرائے — پہ تیری سی یہ چھب تختی کہاں ہے

اگر سر وے بہ بالائے تو باشد — نہ چوں قد دل آرائے تو باشد

| | | |
|---|---|---|
| حسن کسی کو بھئے سودا یا نہ سودا | "خوش است اندر دل دیوانہ سودا | بہ شرطے آں کہ سودائے تو باشد" |
| شاد خوبہ نظر آیا ترے جلوے کا جب رنگ | "دو عالم را بیک بار از دل تنگ | بروں کردیم تا جائے تو باشد |
| ابھی نکلو تو کچھ نکلے مرا کام | "یک امروز است مارا نقد ایام | مرا کے صبر فردائے تو باشد |

خوشی کے واسطے کوئی کسی کے پاس جاتا ہے (۲) وہ مجھ کو دیکھ کر آگے ہی اپنا منھ بناتا ہے
"روم ہر گہ بہ بزم یار تا خوشنود بنشیند ز بس برخیزم | نہ گوید با من بیدل سخن تا زود برخیزم"
جو کوئی بو الہوس ہو وہ ڈرے لے سر و بیں تن | "زبیدادِ تو گر خواہم جدائی برگزیدم من
کہ از بزمت بہ یک حرفِ عتاب آلود برخیزم"

اشارے سے مجھے کہہ دے کہ میں کہتا ہوں اپنا غم | "پے ترتیب بزم خاص مجلس می زنی برہم
اگر من ہم درین مجلس نہ خواہم بود برخیزم"

خدا جانے کہ کیا عالم ہو اور کیسی پڑے پھر ان | "ز رشک غیر می ترسم چہ دانم سر زند از من
ز بزم او ہمیں بہتر کہ امشب زود برخیزم"

## غزلیات سراج وممنون ومشیر

چمن میں گل بدن جب قامت رعنا سے آتے ہیں (۱) بہشتی چھوڑ جنت سایۂ طوبیٰ سے آتے ہیں
مراد خاص اشک واہ طوف کعبۂ دل ہے | کوئی دریا سے آتے ہیں کوئی صحرا سے آتے ہیں
ہجوم داغ کے طرحے بنائے غم کے مالی نے | عجب پھولوں کے دونے گلشن سودا سے آتے ہیں
نہ پوچھو خود بخود کرتا ہوں تعریف اس کے قامت کی | یہی مضمون مجھ کو عالم بالا سے آتے ہیں
کہو کیوں کر رہے فوج خودی کا مورچہ قائم | کہ یہ قلقل کے گولے قلعۂ مینا سے آتے ہیں
سراج اس ہستی موہوم کا احوال سمجھے کو | عدم کے صاف تحفے کشور عنقا سے آتے ہیں

کوئی ہمدرد نہ ہمدم نہ یگانہ اپنا (۲) روبرو کس کے کہیں ہم یہ فسانہ اپنا
نہ کسی جیب کے پھول اور نہ دامن کے خار | کس لیے تھا چمن دہر میں آنا اپنا
فائدہ کیا جو ہوئے شیخ حرم راہب دیر | نہ ہوا دل میں کسی کے جو ٹھکانا اپنا
ہیں رواں نالے کے دنبال ہزاروں بیتاب | دیکھیو پردہ محمل نہ اٹھانا اپنا

بادِ خزاں سے کیا ورق گل الٹ گیا (۳) جس کے الٹتے ہی دم بلبل الٹ گیا
مارا جو قہقہہ کبھی اس مست ناز نے | مینائے کا دم درم قلقل الٹ گیا
شاید کسی کی روح پیاسی تھی لے صبا | جو خود بخود صبوح خم مل الٹ گیا
اٹھا تھا قیس ناقۂ لیلےٰ تری طرف | زنجیر پا کا سنتے ہی وہ غل الٹ گیا
شکل کبوتران گرہ باز اے مشیر | یاں اشک جو ترہ سے گیا ڈھل الٹ گیا

# صوبۂ بہار :- (۱) کلام شیخ محمد عابد دل عظیم آبادی - (۲) کلام سید محبوب بشیر صولت عظیم آبادی

## کلام دل

گر یار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا — اب تک دل مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا
ہے تیغ نگہ کا ترے گھائل نہ جیے گا — میں سوچ چکا ہوں دل بسمل نہ جیے گا

اضطراب ہجر میرے دل پہ زور اور پڑا — صبر تیری اس توانائی پہ کیا پتھر پڑا
دھوکے میں ہم کنار وہ طناز ہوگیا — یہ بھی اک اتفاق خدا ساز ہوگیا

کہہ نہ یوسف کو تو اس ماہ لقا سے بہتر — کوئی بندے کو بھی کہتا ہے خدا سے بہتر
ان لبوں سے کہیں کہ کام نہیں — اتنے بھی تو نمک حرام نہیں

دل مضطر کو مارے درد و غم ناحق جدائی میں — یہی انصاف ہے کیا اے خدا تیری خدائی میں
اے ابر ہم تو وہ ہیں اگر چشم نم کریں — طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو ہم کریں

نہ دیکھ اس طرف وہ ظالم مبادا دیکھتا ہی ہو — دل اپنی جان کا دشمن تو مت خواہی نخواہی ہو
پہنچنے پائے نہ عارض تلک اس یار کے ہاتھ — زلف نے باندھ لیے جیسے گنہگار کے ہاتھ

## کلام صولت عظیم آبادی

از سر نام گذشتن ہمہ نام ست ایں جا — دست از کام کشیدن ہمہ کام ست ایں جا
بادہ خم خم بکش و نغمہ وشکرانہ بسنج — کہ ہمہ عشرت کونین تمام ست ایں جا
زہے زخار رہت گل بہ جیب آبلہ ہا — ہجیر خلد بہ کوئے تو گرد قافلہ ہا
نقاب حسن فزایہ رخ فرنگ ترا — کند دو آتشہ مینا شراب رنگ ترا
دے قرار نہ گیرد بہ کنج سینۂ من — اگر چہ از رم آہو بود خدنگ ترا
بود خمانۂ تو خوشتر ز لطفہائے دوکون — بہ صلح گل نفروشم ادائے جنگ ترا
خدنگ تو نہ ہمیں می کشد دلم بہ خودش — دلم مدام بہ خود می کشد خدنگ ترا
چکید از جلوۂ ہر عشوہ تے سر غیل آفتہا — بلاہا فتنہ ہا کافر ادا ئیہا شرارتہا
بہ خواب اندر زبس حسرت انگیزم امشب — بود تار شعاعی تار و پود بسترم امشب
بیرس از روئیدا و بزم ماد و راز لب لعلت — فغاں خیزد بجائے موج مے از ساغرم امشب

گل آب و رنگ یافتہ موج خون ماست
صبح بہار ضمیمۂ داغ جنون ماست

تسخیر عالمے بہ قناعت نمودہ ایم
آواز پاشکستگی افسون ماست

بے لبت جام مے از دیدۂ پرنم کم نیست
در صہباکدہ از حلقۂ ماتم کم نیست

بس کہ از عارض رنگین تو ترگشت بہار
گل بہ صحن چمن از قطرۂ شبنم کم نیست

دلم ز ذوق طرب دیدہ از ضیا خالیست
بیا کہ جائے تو اے شوخ جا بجا خالیست

کدام ما ز چہ مطلب چہ مدعا چہ پیام
بہ عالمے کہ منم کوہ از صدا خالیست

گذشتہ اند ازیں دشت با سر پرشور
زمین وادی الفت ز نقش پا خالیست

جہان ز جلوۂ آن آفتاب لبریز است
نشان دہید کہ یک ذرہ از کجا خالیست

خیال نمودہ مرا از خمیدن مژگان
کہ جائے اہل تواضع بہ دیدہ ہا خالیست

بہ رنگ نکہت گل صولت از سبک روگی
بہ ہر مکاں کہ در آیم جائے ما خالیست

سرخ پوشے نگہے بت رعنائے ہست
بر سر بام بہ بینید تماشائے ہست

ما بہ تسلیم و زندگی ما تپیدن است
تسلیم جان نمودن ما آرمیدن است

من و سوزے کہ ز دل تا بہ تفتیدہ رماند
نفس تار شتہ جاں موئے آتش دیدہ را ماند

شب کہ بے صہبائے لعلت خاطرم دلگیر بود
قلقل مینا بہ گوشم نالۂ شبگیر بود

اگر ز خویش خودت را جدا توانی کرد
چہ گویمت کہ ازیں پس چہا توانی کرد

بے دل ز ہجوم غم جانان گلہ دارد
ایں خانہ ز انبوہی مہمان گلہ دارد

ساز یاسے کہ روان در تن امید دمد
گریۂ گیر کز و خندۂ جاوید دمد

از در شہر [illegible] ز راہ بیابان رفتم
از رہ چاک جگر تا در جانان رفتم

ذوق نظارہ نگر تا بہ چہ عنوان رفتم
دل خود گشتم و خون گشتہ بہ مژگان رفتم

ہیچ دانی کہ دراں کو بہ چہ عنوان رفتم
پائے کوباں بہ دم خنجر براں رفتم

نمی گردد جدا فکر سخن از طبع ناشادم
ثمر گردند از خاک زمین شعر بنیادم

چہ گویم کز خود جلوۂ کیستم من
دریں پردہ گر اونیم چیستم من

بہ ہر محفل کہ ریزد جلوہ شمع روئے جانانہ
خط ساغر شود تار نگاہ چشم پروانہ

از حسن چہ کم گردد اے کافر ترسائی
یک جلوہ گرم در بر از ناز بفرمائی

ہر دم بہ تمنایت وقت است کہ باز آئی
اے آمدنت جان اعجاز مسیحائی

# مطبوعاتِ جدیدہ

۱۔ اشعارِ میر از ڈوزہ جلیل ۲۔ اشعارِ مومن از ڈاکٹر حسین ۳۔ زمانہ حالی نمبر از ؟ ۴۔ ساقی جاپان نمبر از ؟ ۵۔ ہمایوں سالگرہ نمبر از ؟ ۶۔ نیرنگِ خیال۔ سالنامہ ۱۹۳۶ء از ؟ ۷۔ ادبی دنیا سالنامہ ۱۹۳۶ء از تعلم۔ ۸۔ ادبِ لطیف سالنامہ ۱۹۳۶ء ۔ از نبیہ حسن

**اشعارِ میر** ۔ مرتبہ پروفیسر عبدالمنان بیدل ایم اے پٹنہ کالج۔ ناشر رام نرائن لال الہ آباد۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ص ۔ ۳۱ + ۱۱۸ قیمت ۸ر

جناب بیدل نے میر کے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ میر کے مختصر حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے یہ کتاب پٹنہ یونیورسٹی میں آئی اے کے نصاب میں داخل ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد نے ۱۶ صفحات کا تعارف لکھا ہے۔ اس تعارف میں انھوں نے مختلف موضوعات پر میر کے اشعار کا انتخاب کیا ہے اور تقابل کے لیے دوسرے شعرا کا کلام بھی درج کیا ہے پیش لفظ کے عنوان سے بیدل صاحب نے کتاب کی وجہِ تالیف بیان کی ہے۔ اس کے بعد ۲۹ صفحات میں میر کے حالات لکھے ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ میر کی تصانیف ان کے معاصرین اور شاگردوں کی فہرست دی ہے' اور میر کے عہد کی معاشرت اور شاعری کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔

انتخاب طلبہ کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ کلام پر تبصرہ بھی اسی انداز سے کیا ہے کہ طلبہ کے لیے مفید ہو بعض بیانات محلِ نظر ہیں:۔

(۱) صفحہ ۱۶ جناب بیدل نے آزاد کا قول نقل کیا ہے کہ "اردو میں واسوخت کے موجد میر ہی ہوئے" آزاد کا یہ قول صحیح نہیں۔ کیونکہ اس سے قبل کا آبرو کا واسوخت موجود ہے۔ (۲) "میر کی مثنویوں میں جہاں تک میر کا حافظہ کام کرتا ہے کوئی مافوق الفطرت عنصر کارفرما نہیں" یہ خیال بھی صحیح نہیں۔ میر کی مثنویوں میں مافوق الفطرت عنصر پایا جاتا ہے۔ مثنوی شعلۂ شوق ملاحظہ ہو ۔۔ جو کلیاتِ میر کے مطبوعہ نسخے میں موجود ہے۔
جناب مرتب سے گزارش ہے کہ "اشعارِ میر" کی دوسری اشاعت میں میر کی مثنویوں کے حوالے سے اپنے اس قول کی تصحیح کریں۔ (۳) صفحہ ۲۲ راسخ عظیم آبادی کے سن وفات کے متعلق مرتب نے صرف گارساں دتاسی کا قول نقل کیا ہے' جو نہایت بے پروا تذکرہ نگار ہے۔ دتاسی نے سال وفات ۱۲۴۰ھ لکھا ہے۔ لیکن صحیح سال وفات ۱۲۳۸ھ ہے جو "سخن شعرا" مرتبہ نساخ میں درج ہے۔ یا اس آردو کے دیوان میں ہدایہ کی

وفات کا قطعہ تاریخ ہے جس سے سنہ ۱۲۳۳ھ نکلتا ہے۔ (۴) انعام اللہ خاں یقین کے متعلق مرتب نے صرف مصحفی کے تذکرے کا حوالہ دیا ہے۔ کہ یقین ۲۵ برس کے سن میں مرے۔ دوسرے تذکروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین نے ۲۵ برس سے زیادہ کی عمر پائی تھی۔ (۵) صفحہ ۳۹ مرتب نے ہدایت دہلوی کا سال وفات سنہ ۱۲۱۵ھ درج کیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ سنہ ۱۲۱۵ھ کریم الدین نے لکھا ہے جو قاسمی کے تذکرے سے ماخوذ ہے۔ بعض تذکروں میں سنہ ۱۲۱۳ھ یا سنہ ۱۲۱۹ھ لکھا ہے۔ صحیح سال وفات کی تعیین مشکل ہے۔ قدرت اللہ قاسم اپنے تذکرے میں ان کو مرحوم و مغفور لکھتے ہیں۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں لکھا گیا۔ اس لیے صرف یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہدایت سنہ ۱۲۲۱ھ کے قبل مر چکے تھے۔ (۶) صفحہ ۴۱ میر الم کا سن وفات سنہ ۱۲۱۵ھ لکھا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا۔ حقیقت میں الم کا سن وفات سنہ ۱۲۲۱ھ کے بعد ہے۔ مجموعہ نغز کی تصنیف کے زمانے میں یہ زندہ تھے۔ (۷) میر سوز کی ولادت کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ سنہ ۱۱۳۳ھ میں ہوئی درست نہیں۔ یہ صحیح سن ولادت اب تک تیقن کے ساتھ معلوم نہیں۔ (۸) صفحہ ۳۹ "میر محمد بیدار"۔ ان کا نام میر محمد بیدار نہیں بلکہ میر محمدی بیدار ہے۔ اصل نام میر محمد علی ہے۔ (۹) صفحہ ۴۴ "مرزا محمد علی فدوی دہلوی سنہ ۱۱۹۰ھ میں عظیم آباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔" یہ صحیح نہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ فدوی کا قیام کبھی فیض آباد کبھی مرشد آباد کبھی عظیم آباد میں رہتا ہے۔ میر حسن کے تذکرے کی تصنیف سنہ ۱۱۸۸ھ کے قریب شروع اور سنہ ۱۱۹۲ھ کے قریب ختم ہوئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سنہ ۱۱۹۰ھ کے قبل ہی سے فدوی عظیم آباد سے تعلقات قائم کر چکے تھے۔ (۱۰) تصانیف کی فہرست نامکمل ہے۔ خصوصاً "ذکرِ میر" (میر کی خود نوشتہ سوانح عمری) جیسی اہم تصنیف کا ذکر نہیں جو چھپ بھی چکی ہے۔

مرتب نے خصوصیات کلام میر کی جو تشریح کی ہے اس سے مجھے چنداں اختلاف نہیں لیکن عیوب کلام جو مرتب نے لکھے ہیں وہ میر کے مخصوص عیوب نہیں۔ یہ عیوب ہر غزل گو شاعر کے کلام میں بہ کثرت موجود ہیں۔ مثلاً تعلی صرف میر ہی کا شیوہ نہ تھا بلکہ ہر ... کا۔ میر پر مرتب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ ایک شعر اعلیٰ ہوتا ہے تو دوسرا بالکل پست۔ یہ کمزوری تو صنف غزل ہی کی ہے۔ ضرورت شعری اور قافیے کی پابندی کی وجہ سے غزل میں اس قسم کا ابتذال پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔

مرتب نے میر کے لکھنؤ آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا اور نہ طلبہ کے نقطۂ نظر سے اس کی کوئی خاص ضرورت تھی لیکن میں اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میر اور سودا سے لکھنؤ میں ملاقات نہیں ہوئی۔ بعض بے پروا حضرت یہ لکھ دیا کرتے ہیں کہ میر اور سودا کا لکھنؤ میں یکجا ہونا تحقیق طلب ہے۔ جناب نیاز فتحپوری نے جنوری سنہ ۳۵ء کے نگار میں لکھا ہے کہ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ میر اور سودا سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی یا نہیں۔ جناب نیاز کا یہ خیال ان کے سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ تاریخ ادب سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ میر سنہ ۱۱۹۶ھ اور سنہ ۱۱۹۷ھ کے

درمیان لکھنؤ آئے۔ سودا کا سن وفات ۱۱۹۵ھ ہے جس میں شک کی مطلقاً گنجایش نہیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ سودا اور میر لکھنؤ میں یکجا ہوے ہوں؟

**اشعار مومن** ۔ مرتبہ پروفیسر عبد المنان بیدل۔ ناشر رام نرائن لال الہ آباد۔
تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ص ۲۰۶۔ قیمت ۱۲

جناب بیدل نے پٹنہ یونیورسٹی کے آئی اے کے طلبہ کے لیے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ یہ کتاب بھی اشعار میر کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ مومن کے حالات اور اس کے کلام پر تنقید ۲۵ صفحات میں ہے۔ انتخاب ۱۴۴ صفحات میں ہے۔ انتخاب میں رباعیات غزلیں اور قصیدے ہیں۔ مومن کے متعلق مرتب لکھتے ہیں (صفحہ ۲) "مومن نے شاعری میں کسی کی تقلید نہ کی۔ بلکہ عام روش سے بالکل الگ اپنا راستہ بنایا جو عام طبائع کو نامرغوب تھا۔ شاعری کی پرانی شاہراہ سے الگ چلنے والا دلیر اور جدت پسند مومن جابجا ٹھوکریں بھی کھا جاتا ہے مگر وہ پھر بھی اپنی طبیعت سے نکالے ہوے نئے رستے کو نہیں چھوڑتا ........." اس کے بعد لکھتے ہیں (صفحہ ۲۱) "ناسخ کے تتبع کی وجہ سے کلام میں جابجا خشکی سی آگئی ہے"۔ مجھے حیرت ہے کہ مرتب نے اپنے پہلے قول کی تردید چند سطروں کے بعد ہی کس طرح کر دی!۔ شاعری میں کسی کا تتبع نہ کرنے والا "دلیر اور جدت پسند" مومن ناسخ کا تتبع کس طرح کر سکتا تھا۔ یا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ناسخ کا تتبع کرتا تھا، تو وہ دلیر اور جدت پسند کس طرح ہو سکتا تھا؟

**نیرنگ خیال**، سالنامہ ۱۹۳۶ء مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب حجازی تقطیع ص ۲۴۴ علاوہ تصاویر قیمت عہ نیرنگ خیال مدعی ہے کہ اردو میں سالناموں کی ابتدا اسی نے کی ہے، اور اس دعوے کو قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ رہا یہ سوال کہ بدعت حسنہ ہے یا بدعت سیئہ اس کے جواب میں اختلاف کی گنجایش ہے لیکن اس وقت ہم یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے۔ ۱۹۳۶ء کے سالنامے کو ملا کر ۹ سالنامے نیرنگ خیال نے نکالے ہیں، اور زیر نظر سالنامہ اپنے پیشرووں سے کسی طرح کم نہیں۔ خود نیرنگ خیال کی رائے میں یہ ایک محیر العقول کارنامہ ہے دوسرے رسائل تو کسی شمار میں نہیں، نیرنگ خیال کے سابق سالناموں سے بھی بازی لے گیا ہے۔ نو زائیدہ بچے کہا گیا، اگر ان سے زیادہ ہو ہو یروان چڑھ چکے ہیں تو تعجب کی کوئی بات نہیں بہ قول حسن یہ بھی "رفتہ رفتہ اپنے قرینے پر آ رہے گا"

دونوں کے چاؤ چوز حسن کے بھی ہو چکے ۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پہ آ رہے

زیر نظر سالنامے کو دلچسپ اور مفید بنانے میں شاعر، افسانہ نگار، انشا پرداز، اہل تحقیق سب کا حصہ ہے۔ شاعروں میں حفیظ، ساغر، افسر، آشفتہ، فانی، ذوقی، جوش، اثر کے اشعار موجود ہیں۔ جوش کا دماغ تشبیہ سازی کا ایک کارخانہ معلوم ہوتا ہے جہاں ہر رنگ اور ہر وضع کی تشبیہیں ڈھلتی رہتی ہیں۔ ایک غزل جناب راجا صاحب محمود آبادی کی بھی

کلام الملوک ملوک الکلام کے عنوان سے چھپی ہے۔ ممکن ہے کہ کلام اس تعریف کا مستحق ہو' لیکن یہ ہمیں اب تک علم نہ تھا کہ
والیٔ محمود آباد کو حکومت برطانیہ نے امیر افغانستان اور مہاراجہ نیپال کی طرح بادشاہ تسلیم کر لیا ہے۔ اگر یہ خطاب حکومت
برطانیہ نہیں بلکہ نیرنگِ خیال کے دربار سے عطا ہوا ہے۔ تو حکیم صاحب کو تاج بخش تسلیم کرنے میں اب عذر نہ ہونا چاہیے۔ افسانوں
میں بیجا امتیاز حجاب امتیاز علی صاحبہ کے 'تحفے' کو دی گئی ہے۔ موصوفہ کے اکثر افسانوں میں انہیں لڑکیوں اور ناتجربہ کار
لڑکوں کا عشق دکھایا جاتا ہے۔ اشخاصِ افسانہ عالمِ محسوس سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس خیالی دنیا کے باشندے ہوتے ہیں
جس کی سیر کرنے کی موصوفہ خوگر ہیں' اور تو اور ان کے مخلوقاتِ ذہنی کے نام بھی ساری دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ اجنبی محاورات
کے تراجم اس پر مستزاد! موصوفہ کی تصانیف میں جو دماغی اجنبیت اکثر و بیشتر نظر آتی ہے وہ پیر لوتی کی یاد دلاتی
ہے لیکن پیر لوتی کبھی جاپان کبھی ترکی کبھی حبش کی سیر کراتا ہے۔ موصوفہ نے صرف ایک 'ملک' پر اور وہ بھی ایسا جو
دنیا کے موجودہ نقشوں میں نہیں مل سکتا، قناعت کی ہے۔ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ پیر لوتی الفاظ سے مصوری کرتا ہے
موصوفہ کو نہ تو وہ قدرتِ زبان پر حاصل ہے اور نہ انہوں نے اتنی حسن شناس نظر پائی ہے۔ ٹھنڈی بجلی میں جو کچھ جدت
ہے وہ اس کے نام میں ہے' 'کنول' نام کی جدت کا بھی مدعی نہیں ہو سکتا' 'ایک بیوہ دن کا عروج' اور 'گناہ بے گناہی' اپنی
قسم کے بڑے افسانے نہیں۔ 'اپیل' مجھے باز خاص و دودیل ہے' اور نور الٰہی مرحوم کی موت کی وجہ سے ناتمام رہ گیا ہے
تحقیقی مضامین میں سب سے بہتر 'خضر خاں اور دول دیوی' سے متعلق سید حسن برنی صاحب کا مضمون ہے۔ 'اسلام اور عورت'
ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری نے لکھا ہے۔ صاحبِ مضمون فرماتے ہیں کہ اسلام نے نسوانی مسئلے کا "مکمل ترین حل دنیا کے
سامنے پیش کر دیا ...... اور اسلام کے دیگر حقوق کی طرح اس مسئلے کا حل بھی مساوات کی بنیاد پر قائم ہے" اس رائے
کے پہلے حصے سے اگر اتفاق بھی کیا جائے تو دوسرے سے اتفاق بالکل ناممکن ہے۔ اور مساوات کو ثابت کرنے میں فاضل
مضمون نگار نے تاویل بیجا سے کام لیا ہے اور ان کا استدلال بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اگر طلاق کے معاملے میں مرد و
عورت کے حقوق اسلام نے یکساں مقرر کیے ہیں تو پھر جہاں مرد کے حقوق کی تصریح کی گئی ہے عورتوں کے حقوق کی
تصریح کیوں نہیں کی گئی؟ مرد کو پورا حق ہے کہ کوئی وجہ بتائے بغیر عورت کو طلاق دے دے' یہ فعل بہت برا سہی'
لیکن مرد کے قانونی حق سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ یہ صحیح کہ عہد رسالت میں ناموافقت زوجین کی بنا پر عورت
کی درخواست پر نکاح فسخ کر دیا گیا' لیکن کوئی حکم عام اس بارے میں نہیں دیا گیا کہ فسخ نکاح کے متعلق ہر عورت کی درخواست
عام اس سے کہ کسی بنا پر ہو' منظور ہی کر لی جائے گی۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ عہد رسالت میں جو فیصلے ہوئے
وہ آئندہ کے لیے بطور نظیر پیش کیے جا سکتے ہیں' اور قاضی کا فرض ہے کہ نکاح فسخ کر دے۔ جب بھی مساوات نہیں قائم ہوتی
مرد بغیر عدالت میں گئے ہوئے خود فیصلہ کر سکتا ہے اور عورت کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے۔ مرد کو تعدد ازدواج
کی جو اجازت ہے اس کے متعلق محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ عورت پابند نہیں کہ شادی شدہ شخص سے نکاح کرے۔ مساوات

جب ہوتی کہ عورتوں کو بھی اس کی اجازت ہوتی کہ ایک سے زیادہ شوہر کریں۔ ترکے کے متعلق بھی صاحب مضمون نے فیصلہ کر دیا ہے کہ "باپ کی جائیداد میں بیٹی کا حصہ جو کم رکھا اس کی تلافی شوہر کی جائیداد سے حصہ دلا کر دی" اور یوں بھی شوہر کو تمام اخراج کا کفیل بنا کر باپ کی جائیداد میں سے حصے کی کمی کی تلافی ہو جاتی تھی" اس دلیل کا آخری ٹکڑا اگر صحیح ہے تو شادی شدہ عورتوں کو سرے سے باپ کا ترکہ ملنے کی ضرورت ہی نہیں۔ فاضل مضمون نگار نے کافی غور نہیں کیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ آزاد عورت کے لیے شوہر کا کفیل ہو جانا کافی نہیں۔ ہم شکل ذیل پر انہیں غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں باپ کی سالانہ آمدنی تیس ہزار ہے۔ لڑکے کا حصہ ۲۰ ہزار اور لڑکی کا ۱۰ ہزار ہوتا ہے۔ لڑکی کی شادی ایک غریب شوہر سے ہوتی ہے۔ کیا مالی حیثیت سے لڑکا اور لڑکی دونوں برابر ٹھہر سکتے ہیں؟ دلیل کا پہلا ٹکڑا بھی اسی قدر کمزور ہے جتنا کہ دوسرا۔ شوہر کی جائیداد میں اگر بی بی کا حصہ ہے تو کیا بی بی کی جائیداد میں شوہر کا حصہ نہیں ہوتا؟ پھر مزید برآں یہ کہ عورت ۴ ۱ کی حقدار ہے شوہر ۲ ۱ کا۔ اور اگر شوہر ۴ بیبیاں رکھتا ہے تو کسی بی بی کو آدھ آنے سے زیادہ نہیں مل سکتا۔ اگر مساوات یہی ہے تو اس لفظ کا مفہوم ہمارے اور فاضل مضمون نگار کے ذہن میں الگ الگ ہے۔ فاضل مضمون نگار کو شکایت ہے کہ "ہماری سرشت میں دوسرے مذاہب کے تمدن کا بہت گہرا اثر ہو گیا ہے" اس آئینے میں تو ہمیں انہیں کی تصویر نظر آتی ہے۔ عورت مرد کی مساوات کا تصور تہذیب نو کا پیدا کردہ ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ کھینچ تان کر اسلام کے احکام عہد حاضر کے مزعومات کے مطابق ثابت کیے جائیں۔ عزیز احمد صاحب کا طویل مضمون غدر سے پہلے کی اردو شاعری پر جتنا طویل ہے اتنا بصیرت افروز نہیں۔ پرویز صاحب نے خالد کی شاعری کا تعارف مناسب طریقے سے کرایا ہے۔ جاپانی شاعری پر ایک مضمون لطیف الدین احمد صاحب کے قلم سے نکلا ہے۔ یہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ اختر صاحب شیرانی اور اختر حسین صاحب کے تراجم بھی اچھے ہیں۔ رشید احمد صدیقی صاحب کا مضمون اصغر کی شاعری پر سنجیدگی اور ظرافت کے امتزاج کا کامیاب نمونہ نہیں کہا جا سکتا۔ صدیقی صاحب اگر "مرشد" کی ہدایت کے بغیر مضمون لکھا کریں تو شاید زیادہ کامیاب ہوں۔

زمانہ کانپور حالی نمبر، مرتبہ دیا نرائن نگم صاحب ص ۸۰ و علاوہ تصاویر۔ قیمت ۱۲/۔ رسالہ زمانہ کی بڑی وقعت ہماری نظر میں ہے، اور ہم اس کا مقابلہ بازاری رسائل سے نہیں کر سکتے۔ اپنی زاید از سی سال زندگی میں اس نے متعدد خاص نمبر کامیابی کے ساتھ نکالے ہیں، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حالی نمبر نہ حالی کے شایان شان ہے، اور نہ اس معیار کے مطابق ہے جو خود اس رسالے نے قائم کیا ہے۔ مضامین زیادہ تر سرسری طور پر لکھے ہوئے ہیں ان کا معتدبہ حصہ پہلے بھی کہیں نہ کہیں شایع ہو چکا ہے، اور حالی کی ادبی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے بحث ہی نہیں کی گئی ہے۔ نگم صاحب کی یہ رائے کہ حالی کی شہرت کا دارومدار بہ نسبت نظم کے نثر پر ہے، شاید ہی اہل نظر میں قبول کی جا سکے۔ ایک مضمون زمانہ کی کسی گذشتہ اشاعت سے نقل ہوا ہے۔ مضمون نگار کا نام منشی عبد الرحمن

سیوہاروی درج ہے۔ ہمارے نزدیک مناسب ہے کہ یہ مرحوم عبدالرحمٰن بجنوری ہیں۔ حالی کی تحریر کا عکس اور تین غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل رسالہ ہیں۔ اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو ان خطوط کی وجہ سے قدر شناسانِ حالی کو حالی نمبر کی خریداری کرنی چاہیے۔

ساقی دہلی جاپان نمبر، مرتبہ شاہد احمد صاحب و نور الحسن برلاس صاحب، ص ۲۴۰ علاوہ تصاویر قیمت ۱۲؍ جاپان گذشتہ صدی میں ایک غیر معروف ملک تھا جس کا نام صرف کتابوں میں ملتا تھا، اب اس کا نام بچے بچے کی زبان پر ہے۔ پہلے ایک ناقابلِ اعتنا دورافتادہ جزیرہ تھا، اب دنیا کی بڑی طاقتوں میں اس کا شمار ہے، اور اس کی ہمسایہ اقوام اس کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف زدہ ہیں۔ اس صدی کے اوائل میں جب جاپان نے روس کو شکست دی ہے تو وہ ایشیا میں مشرق کا نجات دہندہ سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس ملک سے جو عقیدت پیدا ہو گئی تھی، اس کی ادبی یادگار ظفر علی خاں کی تمثیل جنگ روس و جاپان ہے۔ اس کے بعد مشرقی اقوام کے ساتھ جاپان کا جو سلوک رہا، وہ ایسا نہ تھا کہ اس عقیدت کو قائم رکھنے میں مدد دیتا، چنانچہ عہدِ حاضر کے مشہور شاعر حسرت موہانی نے اپنی مایوسی اور بدگمانی کا اظہار اس طرح کیا:

بے چین و کوریا کے مٹانے پہ مستعد — جاپان بھی ہوا ہے مگر مبتلائے حرص

اس بدگمانی اور مایوسی کے باوجود جاپان سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، وہ روبہ تنزل نہیں، بلکہ روبہ ترقی ہے۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے رسالوں کو چھوڑ کر تین مستقل کتابیں گذشتہ سال میں صرف اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی غالب ہے کہ اس معاملے میں اردو سے پیچھے نہ ہوں گی۔ ہم ساقی کے جاپان نمبر کا خیر مقدم کرتے ہیں، اور اس کی کامیابی پر اس کی جدت پسند مدیر کو مبارکباد دیتے ہیں۔ بعض رسائل میں یہ اعتراض ہماری نظر سے گزرا کہ چند مضامین سرسری طور پر لکھے ہوئے ہیں، ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن ہمارا خیال ہے کہ اردو کے رسائل جس دور سے گزر رہے ہیں، اس میں کسی علمی معیار کا از اول تا آخر قائم رکھنا قریب قریب ناممکن ہے، اور قلیل قیمت میں ادارۂ ساقی نے خاص [illegible] علمی حیثیت سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ صد درجہ قابلِ داد ہے۔

ہمایوں لاہور، سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۳۶ء، مرتبہ بشیر احمد صاحب و حامد علی خاں صاحب، ص ۱۴۴، علاوہ تصاویر پنجاب کے رسائل میں ہمایوں امتیاز خاص رکھتا ہے، اس کا سالگرہ نمبر ضخامت اور تعداد تصاویر میں دوسرے رسائل کے سالناموں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن معنوی حیثیت سے کسی سے گھٹیا نہیں۔ اس کے مضمون نگاروں میں دو ہمیں خاص طور پر پسند ہیں، ایک تو فلک پیما، دوسرے فیاض محمود۔ فلک پیما کا تخیل فلک پیما ہو یا نہ ہو دور کی کوڑی ضرور لاتا ہے، اور اس کا انوکھا پن ممکن ہے عام پسند نہ ہو لیکن اہلِ نظر کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ فیاض محمود کی ادبی زندگی کی عمر چند سال سے زائد نہیں، لیکن ان کے ناقدانہ مضامین سے ان کی نکتہ رسی اور افسانوں سے اصولِ فن سے باخبری کا پتا چلتا ہے۔ اگر وہ زبان میں صفائی پیدا کریں تو ادبِ اردو میں اپنے لیے مستقل جگہ نکال سکتے ہیں۔ شام کی بزم آرائیاں جوش ملیح آبادی

کی نظم ہے۔ موصوف کا ایک خط بھی ہمایوں میں چھپا ہے جس کے آخر میں کاتب کا نام جوش مرحوم لکھا ہے۔ اگر تخلص کے انتخاب سے شعرا کی افتادِ طبیعت کا حال کھل سکتا ہے اور جوش صاحب کو اس پر بہت اصرار ہے' تو جوش کے بعد لفظ مرحوم' کے اضافے کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ نظم کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ڈھلنے میں وہی اگلے برس کی تیلیاں ہیں جنہیں جوش صاحب سوختنی قرار دے چکے ہیں۔ تصاویر میں ایک قابل غور ہے۔ چار پانچ آدمی مغربی لباس پہنے ہوئے تھقہہ زنی کی مشق کر رہے ہیں' اور بشیر احمد صاحب بہ نفس نفیس اس مجمع کی صدارت فرما رہے ہیں۔ ایک تو ہنسا دوسرے دکھا کر ہنسانا' ستم بالائے ستم! ایسی باتوں سے لوگوں میں حسد کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بشیر احمد صاحب کو اس کا خود بھی کچھ احساس ہوا ہے' اور جس طرح نظر بد سے بچانے کے لیے بچوں کی پیشانی پر کالا ٹیکا لگا دیتے ہیں' انہوں نے اس تصویر کے ساتھ ایک بھدی سی نظم بھی شامل کر دی ہے۔ کئی تراجم قابل داد ہیں' لیکن ایک ایسے رسالے میں جس کے مرتب بشیر احمد صاحب ہیں یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ مصنف بیچارے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے' اور ان کی دماغ سوزی کی اس طرح داد دی جاتی ہے کہ بعض تراجم کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا۔

**ادبی دنیا لاہور'** سالنامہ ۱۹۳۶ء۔ مرتب جناب منصور احمد صاحب تقطیع ۲۲ × ۲۹ ص ۲۰۹ تصاویر ۶ قیمت ۱؎

(م - م)

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ اس سال کے بہترین سالناموں میں سے ہے' اس میں ادبی مضامین کا اچھا ذخیرہ ہے۔ مضامین کے انتخاب سے ایڈیٹر کے سنجیدہ مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ سالنامے کے ممتاز مضامین یہ ہیں۔

(۱) شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر۔ از جناب وقار عظیم۔ (۲) تاریخ اردو کا مطالعہ۔ از پنڈت کیفی۔ (۳) اردو ادبیات پر غالب کا اثر۔ از جناب راشد وحیدی۔ جناب وقار عظیم نے اپنے مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ جو لوگ اردو شاعری کو مقامی خصوصیات سے مبرا سمجھتے ہیں انہوں نے نادانی سے کام لیا ہے۔ پھر صاحب مضمون نے مقامی رنگ کا مطلب بیان کیا ہے اور مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ اردو شاعری میں مقامی رنگ کی کمی نہیں۔

جناب احسن مارہروی کے مضمون "ہندوستانی مشاعرے" میں متعدد تاریخی اغلاط ہیں' اس مضمون کا بیشتر حصہ "آب حیات" پر مبنی ہے۔ مضمون نگار نے اس مضمون کے متعلق مزید مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ "سوسائٹی کے اجارہ دار" کامیاب تمثیل ہے' لیکن اس کی زبان میں سلاست اور روانی نہیں۔ زبان کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ "مصنف کی بی بی" ایک فرانسیسی ڈرامے کا ترجمہ ہے جس کے مصنف کا نام مترجم نے نہیں ظاہر کیا۔ اس ڈرامے کا مصنف تر ورشر کورتلین ہے۔ مترجم نے ڈرامے کی سرخی کے نیچے لکھا ہے "ایک فرانسیسی ڈراما ہندوستانی فضا میں"۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ محض کرداروں کے ناموں کو ہندوستانی بنا دینے سے ڈرامے کی فضا ہندوستانی کیوں کر ہو گئی؟ اگر مترجم کا اصول صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم کرداروں کے نام جاپانی نہیں بنا دیں اور

اس ڈرامے کو "ایک فرانسیسی ڈراما جاپانی فضامیں" نہ کہیں۔ ترجمہ بھی اچھا نہیں مثلاً مترجم نے ایک جگہ لارڈ بائرن کا ترجمہ "ہندوستانی شیکسپیر" کیا ہے۔ کیا شیکسپیر ہندوستانی نام ہے کہ بائرن کا ترجمہ شیکسپیر کردینے سے ڈرامے کی فضا ہندوستانی ہوگئی؟۔

## ادب لطیف لاہور سالنامہ ۳۶ء :- مرتبہ چودھری برکت علی و میرزا ادیب

تقطیع ۲۰×۳۰/۸ ص ۲۰۰ مع متعدد تصاویر - قیمت ۱ر - ملنے کا پتا: نشٹ لوئر مال لاہور

ادب لطیف ایک نیا رسالہ ہے، اس لحاظ سے اس کا سالنامہ بہت کامیاب ہے، ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے مجھے اس سالنامے کو ۳۶ء کے بہترین سالناموں میں شمار کرنے میں تامل نہیں۔ "میترلنک" "کلام غالب کی نمایاں خصوصیات" ۔ "اور مصحفی کا قیام دہلی" قابل ذکر مضامین ہیں۔ "میترلنک" کے مطالعے سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ میترلنک کے تخلیق کردہ کرداروں کے نام بھی اس کی مثالیت کے آئینہ دار ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ جو لوگ میترلنک کے ڈراموں کے ترجمے میں کرداروں کے نام ہندوستانی بنالیتے ہیں وہ میترلنک کے تخیل کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جناب تبسم کی تنقید کا ماحصل یہ ہے کہ غالب کے کلام کو مہمل یا اس کے مغلق اشعار کو ہی شعریت کا مرقع کہنے والے دونوں گروہ نے کلام غالب کی حقیقی خصوصیات کو نہیں سمجھا۔ غالب کے وہ اشعار بھی جنہیں لوگ مہمل سمجھتے ہیں، پڑھنے والے کے دل پر خاص اثر ڈالتے ہیں۔ یہ اثر غالب کے ہمعصر شعرا یا ان کے متقدمین کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ غالب کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی تخیل ہے۔ دوسری خصوصیت تعمق اور تیسری علو تخیل ہے۔ غالب اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے علو تخیل کے ساتھ جذبات کو پیوست کیا ہے۔ مضمون نگار نے غالب کے تصورات شعری اور نظریہ حسن و عشق پر بھی بحث کی ہے۔ اخیر میں غالب کی چند فارسی ترکیبیں نقل کی ہیں جو ہر اندیشہ، بگلی تنگ تسلی، خمیازہ ساحل، موج نگاہ ......... جناب افسر نے مصحفی کے قیام دہلی کے متعلق نئے رائے قائم کی ہے۔ تاریخی مضامین میں کوئی محققانہ مقالہ نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ادارے نے نذر ادبیں میں جناب تبسم اور جناب افسر کے مضامین کا تذکرہ نہیں کیا ہے اور بعض معمولی ترجموں کی تعریف کی ہے۔ "شالامار" اپنے طرز کی ایک دلکش نظم ہے۔ جناب علی اختر کی نظم "غنچۂ پژمردہ" بھی قابل ذکر ہے۔

ادب لطیف کا یہ سالنامہ اس قابل ہے کہ شائقین ادب اس کو اپنے کتب خانے میں جگہ دیں۔

---

# سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

تنویر کراچی "شعروسخن نمبر" (۳۶ء) مرتبہ عبدالمجید "جیسلیری"۔ "جلیس ماضی" از خواجہ عشرت لکھنوی ص ۹ تا ۱۴۔ (۱) محمد حنیف علی رعب، متوطن شاہ آباد ضلع کرنال، فارغ التحصیل، داخلہ تکمیل الطب لکھنؤ ۱۹۰۵ء سند تکمیل، ملازمت شفا خانہ مدرسہ تقرر بعہدہ طبابت در کلکتہ و میں۔ واپسی لکھنؤ پر سائیکل سے گرے، پاؤں کی ہڈی ٹوٹی، پھر کلکتے ملازم ہو گئے، بیمار ہو کر لکھنؤ واپس آئے۔ وفات بعمر ۴۲ سال در وطن سنہ ۱۹۱۹ء (۳ شعر) شاعر اردو و فارسی، ش جلال (۲) میر ذاکر حسین "یاس" لکھنوی، ش مونس در مرثیہ، بعدہ ش جلال، واقف عروض، پہلا تخلص ذاکر، پھر توقیر، گندمی رنگ، پستہ قد، دو گوشیا ٹوپی پہنتے تھے، خلیق، با وضع، آغا ابو صاحب کے یہاں سلسلہ ملازمت تھا، صاحب دیوان مطبوعہ، شاگرد بھی تھے (۴ شعر) (۳) نواب مرزا مہدی حسن خاں "رفعت"، صاحب دیوان مطبوعہ، گلزار محمدی، لکھنؤ، گورے، دبلے، میانہ قد، ثقل سماعت تھا، مشاعرے کیا کرتے تھے، ش جلال (۱ شعر) (۴) محمد قاسم "قاسم" متوطن کڑہ مانک پور، ہمشیر زادہ امان علی سحر، بقول خود لکھنؤ آکر فارسی پڑھانے کی نوکری کر لی تھی، امرا کے یہاں قصیدے لکھ کر لے جاتے، مشاہرے اور جائزے پر معاش تھی۔ زمین کی بھی قلیل آمدنی تھی، جب عشرت سے ملاقات ہوئی ہے تو ۷۰ سال کے تھے، بی بی بچے سب مر چکے تھے، صرف ایک نیم مجنون لڑکا باقی تھا۔ لکھنؤ یا وطن میں انتقال کیا، تخمیناً ۳۰ برس قبل، زمانہ ملاقات تخمیناً ۴۰ سال (۲ شعر) (۵) خیراتی لال "شگفتہ"، ساکن اشرف آباد لکھنؤ، ش نسیم دہلوی، پستہ قامت، سیاہ فام، لاغر گرد، فارسی میں قتیل سے تلمذ، قادر الکلام، شاعری زیادہ فارسی آمیز، صاحب دیوان مختصر مطبوعہ، تلامذہ بکثرت، از آں جملہ جسم کا لیتھو کاپی لکھنے والا اور نواب کسریٰ جاہ، سنا گیا ہے کہ شاگردوں کو غزل بھی کہہ کر دے دیا کرتے تھے۔ وفات ۳۰-۳۲ سال قبل۔ (۴ شعر) طالع میں نامرادی و حسرت ازل سے ہے ÷ اک بیوفا سے مجھ کو محبت ازل سے ہے ÷ زندگی ہے تو میسر مجھے رخصت ہوگی ÷ اے مصیبت تجھے اک روز مصیبت ہوگی (۶) نواب کاظم حسین خاں "کاظم" تخلص، ساکن سرائے معالی خاں، لاغر، متوسط قد، سانولے، نیک رو، وضعدار، ۳۰-۴۰ روپے کا وظیفہ اور مصوری کی بھی آمدنی تھی، سنگلاخ زمینوں کا بہت شوق تھا، آسان زمینوں میں شعر نہ کہتے، نازک مزاج تھے اور حفظ مراتب کا بہت خیال تھا، انتقال تخمیناً ۱۰ سال قبل بعمر تخمیناً ۷۰ سال (۱) (۷) حکیم خیر علی خاں "رسا" تخلص ساکن بھوائی ٹولہ لکھنؤ، گورے، بھرے بھرے، دراز قد، کتابی چہرہ، کرنجی آنکھیں، خوش پوشاک، پہلے شوکت تخلص تھا۔ (۸) غلام محمد خاں "تپش" تخلص، ساکن دہلی، دراز قد، فربہ، گول چہرہ، لکھنؤ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو کر آئے۔ ان کے بعد نیا اخبار شیر "تیر" جاری کیا، تین بیٹے، مطبع کا کام کیا کرتے۔ عشرت کے یہاں اکثر جایا کرتے، خرچ زیادہ، آمدنی کم، دو بیبیاں تھیں

خلیق، مزاج پسند، بے نظر، حامی زبانِ دہلی، اعتراضات بر امیر اللغات، آخر میں شیر تقیر بند ہو گیا، طبع پر معاش تھی، پابندِ صوم و صلوٰۃ، لڑکیاں بھی کئی تھیں، بڑے لڑکے کا نام عزیز احمد خاں تھا، شعر کم کہتے تھے، وفات سنہ ۱۹۱۱ء (۱۰ شعر) (۲) شیخ احمد علی کامل تخلص، بخاری، مقیم لکھنؤ، ش فائز، چند ناول انگریزی زبان سے ترجمہ کیے۔ اس کے بعد اودھ اخبار میں مترجم انگریزی رہے، کالے دبلے، میانہ قد، قیام اولاً کشمیری محلہ، بعدہٗ گولا گنج، نیک مزاج، مہذب، وفات تخمیناً ۸ برس قبل عمر ۴۵ تخمیناً (۱۲ شعر) (۳) سید محبت احمد خاں، یہ تخلص، نبیرہ ماشاء اللہ خاں، کتابی چہرہ، سانولا رنگ، میانہ قد، دوگوشیا ٹوپی اور چکن کا رومال، مہذب، وضعدار، تقریر شستہ، ماہر علم نجوم، فارسی میں استعداد کامل، انشاء اُن کے پرنانا تھے (یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا معیار) انتقال تخمیناً ۲۰ سال قبل (۴ شعر) آسیا کی طرح دست و پائے حاجت قطع کر + دیکھ کیونکر رزق بے وہم و گماں ملتا نہیں۔

(۴) شمس العلماء سید علی محمد شاد، ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا (یہ خطاب شاد کو نہیں ملا، عمر بھی صحیح نہیں معیار) عشرت نے ابتدائے شباب میں پٹنے جانے والے نواب تبسم ش قلق کے اصرار سے مشاعرے میں شریک ہونے کا ذکر کیا ہے۔ بانی مشاعرہ نجف تخلص، وکالت پیشہ، میانہ قد، گندمی رنگ، چیچک رو، نہایت خلیق، وضعدار، بذلہ سنج، شہرت بھی شریک مشاعرہ تھے، شاد کی عمر اس وقت تخمیناً ۷۰ سال کی ہوگی، سب سے آخر میں شاد نے اپنا کلام پڑھا (۴ شعر)

تنویر مارچ "قصیدہ عیدیہ" از مصحفی ص ۹ تا ۱۳ (۱) سال تصنیف سنہ ۱۲۰۸ھ (یہ صحیح نہیں، ۱۲۰۷ اور ۱۲۰۹ کے درمیان یہ قصیدہ لکھا گیا ہے معیار) مطلع اول و شعر آخر: خطائے خصم نہیں کچھ یہ بخت کا ہے قصور + کہ مجھ سے ہو کے سخن سنج نہیں مزاج حضور + جو ہیں غلام انھوں کو ہو عید قربانی + جو خیرہ سر ہیں کلاہ[1] ان کا ہو تہ ساطور (اس قصیدے کے ابتدائی اشعار مجموعہ نغز اور شعر الہند میں چھپ چکے ہیں، کتابت کی غلطیاں بکثرت ہیں معیار)

ادب لطیف جنوری سنہ ۱۹۳۶ء "لاہور قدیم کا علمی و ادبی طبقہ" از جناب نیاز ترمذی ص ۳ تا ۱۵ (مضمون کا مقصد یہ ہے پنجاب میں اردو کے نمونے۔ فدوی کے متعلق یہ قول صحیح نہیں ہے کہ وہ احمد شاہ کے زمانے میں دہلی گیا تھا، اس کے لکھنؤ جانے کا بھی کہیں ثبوت نہیں ملتا معیار) شاگردانِ غالب از جناب افسر ص ۲۳ تا ۳۲ (بسلسلہ ادب لطیف اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء) (۱) عبدالسمیع بیدل سہارن پوری صاحب دیوان نعت (۲ شعر) (۲) حکیم مراد علی بیکانیری (۳) سید علی تپش سبزواری خلف نجف علی اکبرآبادی، ش اسیر اکبرآبادی و غالب، مصنف خزینۃ القواعد و فاتح الاذہان، شریک مشاعرہ مہاراجہ بلوان سنگھ (۷ شعر) یادگار ضیغم میں غلام محمد تپش کو ش غالب لکھا ہے۔ (یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا معیار) نواب اکبر علی خاں کے زمانے میں پاٹودی میں تھے پھر لکھنؤ گئے (۵ شعر) (۴) حافظ قاضی عبدالرحمٰن پانی پتی م ۱۲۹۹ھ (فارسی شعر ۳) (۵) آشفتہ صاحب دو دیوان ۱۳۰۲ھ و ۱۳۰۸ھ (۶ فارسی شعر) (۷) محمد حسین تمنا مرادآبادی اردو میں رنگ مرادآبادی فارسی میں غالب کے ش تھے (فارسی شعر ۴) (۸) محمد حسین مرزاپوری ش زخمی مرزاپوری و غالب، مضطر مرزاپوری ان کے ش تھے۔ بیس پچیس سال قبل مرے۔

---

[1] کلاہ غلط، کلہ صحیح

**کلیم دہلی** (دہلی مرتبہ جناب جوش ملیح آبادی) **حالی کی مصلحانہ شاعری** ، از خواجہ غلام السیدین صاحب ص ۱۵۹ تا ۱۶۲ ،

(۱) "جو شاعر .. تڑپ اور احساس سے محروم ہے، جس کا دل اپنے زمانے کی خرابیوں پر اور نا انصافیوں پر نہیں کڑھتا جو صداقت اور شرافت کی طرف سعی نہیں کرتا، جس کا خون حق و باطل کی جنگ کو دیکھ کر تیز تیز حرکت نہیں کرنے لگتا، ممکن ہے ایسا شاعر اپنے کلام میں محاورے اور روزمرے کا کمال دکھائے، لیکن نگاہ حقیقت بیں میں اس کی وقعت بازی گر کے کرتبوں سے زیادہ نہیں" (۲) "حالی کو حساس اور درد آشنا دل ملا تھا، اور حق پسندی اور حق گوئی کا جوہر عطا ہوا تھا۔ طبیعت ہمدردی کی طرف مائل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کا دل پر گہرا اثر ہوا۔" "حالی کی شاعری ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے، مگر کس کے دل کی؟ وہ ایک فرد واحد .. کا دل نہیں، بلکہ ایک قوم و ملت کا، ایک تہذیب و تمدن کا دل ہے جو اپنی وسعت میں ایک جہان درد و آرزو لیے ہوئے ہے۔" "حالی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض ذاتی جذبات و واردات کا آئینہ نہیں۔" "بلکہ ایک پوری قوم کی داستان عروج و زوال ہے" (۳) دوسری خصوصیت حالی کی نظر کی رسائی اور رائے کی اصابت ہے۔" حالی نے صرف مرض کی تشخیص ہی نہیں کی بلکہ دوا بھی تجویز کی۔ انھوں نے اسلام کے بھولے ہوئے اصول یاد دلائے" اور مغرب کی ان خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جو اس کی ترقی کا باعث ہوئی ہیں (۴) زوال مسلمانان ہند، اور ان کی قومی سیرت کا مسخ ہو جانا، سید احمد خاں کی تحریک اصلاح، حالی کا مسدس سید احمد خاں کی فرمائش سے، ہر طبقے اور ہر گروہ پر صحیح نکتہ چینی۔ قصیدہ نعتیہ (عرض حال) میں اسلام کا صحیح تصور۔ (۵) حالی تمدن اور معاشرت کے "مختلف فیہ مسائل میں ادھر جاتے ہیں، جو عدل و انسانیت اور انصاف کا راستہ ہے"۔ اقبال کے اس شعر کا جو شیکسپیر کی شان میں ہے بدرجۂ کمال حالی پر اطلاق ہوتا ہے:- "حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن۔ دل انساں کو ترا حسن کلام آئینہ"۔ "حالی کی شاعری میں قوم کے بلند ترین جذبات اور اعلیٰ ترین مقاصد کی ترجمانی موجود ہے" (۶) "حالی کی کامیابی اور اثر آفرینی کی .. بڑی وجہ ان کا خلوص ہے، ان کی شاعری میں بھی وہی خالص سونا دمکتا ہے جس سے ان کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا۔" "تکلف اور تصنع کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا قول صحیح ہے کہ حالی "یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط انسان اور صوفیہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے"۔ اس کی تائید جسٹس سید محمود کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو (بروایت سر سید راس مسعود) ان کی زبان سے سر سید کے سامنے نکلا تھا "ابا جان، اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے، ان میں سے کوئی ایسا ہے جس کی پرستش کے لیے تو تیار ہے، تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے"۔

**نیرنگ خیال** (لاہور مرتبہ حکیم یوسف حسن صاحب فروری) **عہد شاہجہانی کا علمی و ادبی طبقہ** ص ۹ تا ۱۶، از سید نیاز احمد ترمذی صاحب (۱) چندر بھان برہمن اکبر آبادی

وفات ۱۲۶۲ھ، مطلع غزل اردو سے خدا نے کس شہر کے اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے، نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے"
(یہ غزل اور لوگوں نے بھی برہمن سے منسوب کی ہے، لیکن یہ علم نہیں کہ کس سند سے معیار) (۲) ولی رام ولی، عربی، فارسی
ہندی کہتا تھا، دارا شکوہ کا مشیر خاص، مثنوی ملقب بہ شش وزن مطبع دار العلوم میں چھپ چکی ہے، کلام سے

چہ دل داری دریں دنیا کہ دنیا سے چلا جانا ہے | چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے
چو ہنگام اجل آید بہ کارت کہ نہ آید | بچھائی کاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے

(اور لوگوں نے بھی اس شاعر کی طرف ان شعروں کو نسبت دی ہے، لیکن سند کا پتا نہیں چلتا، معیار)

**معارف** اعظم گڈھ مرتبہ سید سلیمان صاحب ندوی فروری: **"کتبخانہ دفتر دیوانی حیدر آباد میں کرناٹک کی تاریخ کے مخطوطات"** از جناب محمد غوث صاحب ص ۱۱۷ تا ۱۲۲ مضمون میں ۳۶ کتابوں کا ذکر ہے جس میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

(۱) نواب سعادت اللہ خاں ۱۱۶۵ تک کے حالات (۲) انور نامہ میر محمد اسمٰعیل ابجدی انور الدین خاں اور والاجاہ کے زمانے کی منظوم تاریخ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۲۰۰ ۔ ۱۱۷۰ تک (۳) قصر والاجاہی ۱۲۵۶ تک (۴) فوز عظیم مصنف نامعلوم منظوم، ۱۲۱۰ تک کے حالات (۵) نشان والاجاہی ۱۲۵۵ تک۔ (۶) سرگزشت زمانہ نیابت مصنفہ نواب عظیم جاہ۔ ۱۲۵۱ تک (۷) تذکرۃ الانساب مصنفہ خوشدل (۸) گلستان النسب مصنفہ غلام عبد القادر، قادر عظیم خاں ناظر (۹) وقائع امیر الامراء (۱۰) تشریح النوم مصنفہ امیر الامراء، ذاتی واقعات، اور مشائخ طریقت کے حالات (۱۱) شرف نامہ مصنفہ حفیظ اللہ خاں، خود نوشت حالات (۱۲) دستور الالقاب (۱۳) مجموعہ مکاتیب شاہان انگلستان و ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۱۶۴ تا ۱۱۹۴ (۱۴) مجموعہ فرامین شاہ عالم ثانی ۱۱۷۴ تا ۱۲۲۱ھ (۱۵) گلدستۂ کرناٹک مصنفہ حکیم باقر حسین، کرناٹک کے شعرائے فارسی کا تذکرہ، (۱۶) جغرافیۂ علاقۂ مدراس، مرتبہ سید شاہ ابو الحسن ۱۲۰۰ھ بزبان اردو، خطوط کے مجموعے بھی متعدد ہیں۔

**ندیم گیا** مرتبہ جناب انجم گیاوی فروری: **"میر کمال علی شاہ، المتخلص بہ کمال اور ان کی مثنوی اردو"** از حافظ سید عبد الرؤف صاحب ص ۱۵ تا ۲۱، (۱) پسر شاہ فیض علی، دلپسر زادہ، پوتا، شاہ سلیم اللہ گیاوی، دختر زادہ شاہ غلام علی، دیورے کے مشہور بزرگ حضرت شاہ برہان الدین سے ننھیالی قرابت تھی، مولد و منشا ننھیال موضع دیورہ ضلع گیا (۲) مدیر ندیم نے حاشیے میں لکھا ہے کہ شاہ سلیم اللہ کا مزار محلہ نادرگنج میں ہے کمال کو بعض نے مان پوری اس وجہ سے لکھا ہے کہ شاہ سلیم اللہ کے نانا شاہ آدم مان پوری تھے، بعض کے عظیم آبادی لکھنے کا سبب یہ ہے کہ کمال کے بھائی شاہ ذو الفقار علی اور دو بہنیں پٹنے میں رہیں، مولوی نصیر الدین پھلواروی ان کے ساڑھو تھے، (۳) فارسی کی درسی کتابیں، عربی کی مختصرات، خاندان اور شہر کے ارباب فضل سے پڑھ کر پٹنہ میتن گھاٹ کے مدرسے میں پہنچے" وہاں مولوی زاہد میر بختی سے تعلیم پائی، پھر لکھنؤ جا کر مولانا بحر العلوم کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے

(مضمون نگار نے لکھا ہے کہ نشو و نما دیورے میں پائی، اور اس کے بعد ہی تعلیم کا حال شروع کر دیا ہے۔ یہ صاف نہیں کھلتا کہ
فارسی کی درسیات اور عربی کی مختصرات کہاں پڑھیں اگر دیورے میں تو شہر کے ارباب فضل سے کیا مراد ہے؟ معیار)
(۴) ان کا انتخاب خانقاہ برہانیہ کی سجادہ نشینی کے لیے ہوا تھا، لیکن اپنے ماموں شاہ غلام ولی کے نواسے شاہ
خادم علی کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ (۵) لکھنؤ میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ فارسی کا ضخیم دیوان خانقاہ کمالیہ
دیورہ میں موجود ہے۔ اردو کی ایک مثنوی ہے' تعداد اشعار ۲۲۰۰ (سال کتابت مضمون نگار نے غیاثا ۱۲۱۳ بتایا ہے،
لیکن جیساکہ مدیر ندیم نے لکھا ہے یہ صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ کاتب نے مصنف کے نام کے بعد مغفور لکھا ہے۔ معیار)
(۶) کمال الحکمت (فلسفے میں) اور چہار در، وو آپ کی دوسری تصانیف ہیں (۷) سید شاہ ولایت حسین صاحب دیوروی
کی زبانی روایت ہے کہ حزیں اسی مکان میں پہنچ کر ٹھہرا تھا جہاں کمال مقیم تھے، مذاکرے سے مباحثے اور مناظرے
کی نوبت آئی، حزیں بھی لوہا مان گئے۔ فارسی دیوان کمال میں اس کی طرف اشارے ہیں (جب تک کوئی قدیم سند ہو
یہ قابل قبول نہیں، شاد نے حیات فریاد میں بزمانۂ طلب علم حزیں کی خدمت میں ان کی حاضری کا ذکر کیا ہے۔ یہ روایت
بھی مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ معیار) (۸) کم و بیش ۵۰ برس کی عمر میں بماہ جمادی الثانی سنہ ۱۲۱۵ھ وفات پائی۔ صحیح سال
ولادت معلوم نہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ بارہویں صدی کے ربع اول کے بعد پیدا ہوئے۔ اوائل جمادی الثانی میں آپکا
عرس ہر سال ہوا کرتا ہے، دریغا سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ سید محفوظ الحق صاحب سے سال وفات، تاریخ وفات
تالیفات اور دیورے کا وطن ہونا معلوم ہوا، اور وہ تذکرہ شورش کا حوالہ دیتے ہیں (بحر العلوم کے شاگرد کا سال ولادت
۱۱۲۵ کے لگ بھگ خلاف قیاس ہے اس لیے کہ خود ان کی پیدائش سنہ ۱۱۴۴ھ یا اس کے بعد کی ہے۔ اگر شاعری کا شوق لکھنؤ میں
ہوا تو یہ شباب کا زمانہ ہوگا اور لکھنؤ میں ۱۱۷۵ سے قبل شعر گوئی کا بالکل چرچا نہ تھا۔ شاد نے بھی جو کچھ لکھا ہے اس سے ۱۱۲۵
کے بہت بعد پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ تذکرۂ شورش کے حوالے سے کمال کا سال وفات ہرگز معلوم نہیں ہو سکتا اس لیے
کہ ۱۲۱۵ سے ۲۰ برس قبل شورش کا انتقال ہو چکا تھا۔ معیار) (۹) مثنوی فلسفہ آمیز تصوف میں ہے، مختلف سرخیاں
مثل حمد و نعت وحدت الوجود، توکل، رضا، تسلیم، قضا و قدر وغیرہ قائم کر کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سلسلۂ کلام
میں پنڈوے کا بھی ذکر آیا ہے، وہاں کے شاہ صفی اور ان کے ساتھ سعدی و حمدی کا نام بہت ادب سے لیا ہے۔ شعر اول
ع الہی حمد تیری کب بیاں ہو ٭ اگرچہ مو بمو تن پر زباں ہو (خاتمہ جس شعر پر ہوتا ہے وہ صاحب مضمون نے درج نہیں کیا، مثنوی
خلاف قاعدہ ایک بحر میں نہیں، بلکہ دو بحروں میں ہے۔ صاحب مضمون کی نگاہ اس پر نہیں پڑی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔
یہ سرخی ہے تعریف بنگالہ میں کہ خورشید واں داغ ہے لالہ میں طلب ہے اگر تجھ کو واں چل جا کہ رہتے ہیں ہر دو در میں اولیا۔
شاد مرحوم نے کمال کے حالات کچھ اس طرح سے لکھے ہیں کہ شبہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے کسی دوسرے کمال کا حال لکھا ہو،
شاہ سلیم اللہ کا نام شاہ سلام اللہ لکھا ہے اور انھیں کمال کا چچا نہیں بلکہ برادر جد بتایا ہے، سال وفات بھی ۱۲۱۵ کے بہت بعد

ان کے حساب سے قرار پاتا ہے۔ مضمون نگار سے ہماری گزارش ہے کہ دیوان فارسی اور حیات فرہاد کے مطالعے کے بعد کمال کے حالات پھر لکھیں، اور ان کے اخلاف کا بھی ذکر کریں۔ معیار)

**کنول** اکبرآباد

خاص نمبر جنوری ۱۹۳۶ء مرتبہ جناب منظر صدیقی۔ **سحر معنی** از جناب سیماب ص ۵ تا ۸۲۔
(۱) مولوی غلام امام ابن ولی اللہ ابن محمد علی نبیرۂ شیخ خیرالدین ابن خیر اللہ العمری، گوپاموی، اسی خاندان سے ہیں جس کے رکن ارتضا علی خاں گوپاموی، اور مجتبیٰ علی خاں خوشدل تھے۔ مفتی انعام اللہ سے قرابت قریبہ تھی۔ آخر عمر میں شجاع الدولہ کے دربار میں منسلک ہو گئے تھے۔ ۱۱۹۴ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور وطن میں دفن ہوئے۔ (۲) انتظام اللہ صدیقی صاحب کے پاس ان کی تصنیف سے ایک مثنوی سحر معنی ہے، جو آصف الدولہ کی بنوائی ہوئی کسی کوٹھی کے افتتاح پر لکھی گئی تھی، نسخہ مصنف کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے مصرع اول و شعر آخر ہے ابھی پردہ صورت اٹھا دے + نہ کچھ قصہ ہے اس میں نہ کہانی۔ مگر یہ مثنوی ہے سحر معنی۔ (کاتب کا لکھا ہوا خاتمہ جو منقول ہے اس میں ان کی سکونت بسوہ لکھی ہے۔ معیار)

**یوپی میں اُردو**

(سلسل) از انتظام اللہ صدیقی صاحب ص ۱۹ تا ۲۶۔ یہ کتاب، سالے میں کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ (۱) سعید تخلص مفتی ابو سعید گوپاموی، بحوالہ تذکرۃ الانساب مصطفیٰ علی خاں و تاریخ خاندان مفتیان گوپامو و قلمی بیاض، ہندی اور فارسی کے شاعر (۲) مولوی عبدالرب اکبرآبادی عہد محمد شاہ میں دہلی گئے۔ بین کی کتاب سیاحت کا انگریزی سے اُردو میں و لنگا کسر (کذا) مہتم رصدخانہ کی اعانت سے ترجمہ کیا۔ یہ نسخہ اب تک موجود ہے (نمونہ عبارت بھی دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب محمد علی شاہ کے وقت میں لکھی گئی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ مصنف کو اتنا بھی علم نہیں کہ اس نام کا ایک بادشاہ اودھ میں گزرا ہے اور اس عہد میں علمی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے ہوا تھا۔ کہاں بین اور کہاں عہد محمد شاہ!) (۳) مولوی غلام امام پیدائش ۱۱۰۵ کے لگ بھگ مفتی محمد ولی، شیخ غلام محمد وغیرہ سے علم حاصل کیا، شاعری میں فیض احمد سے مشورہ تھا۔ سال وفات ۱۱۹۵ بحوالہ واقعیت الفواتح مرتبہ مجتبیٰ علی خاں خوشدل متوفی ۱۲۳۴ھ۔ سال وفات مصطفیٰ علی خاں ۱۱۹۸۔ (۴) حکیم محمد شریف خاں ابن حکیم محمد اکمل خاں۔ خاندانی حالات، ولادت ۱۱۲۰ کے قریب، خطاب اشرف الحکما، جاگیر ۲۵ ہزار از بادشاہ، ترجمہ مشکوٰۃ بزبان فارسی بنام کاشف المشکوٰۃ، ۱۱۹۳، حاشیہ نفیسی حاشیہ شرح اسباب، آثار نبوت، شرح حمد اللہ، ترجمہ فارسی قرآن مجید وغیرہ۔ اُردو میں بھی قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے جو مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا حکیم محمد احمد خاں صاحب دہلوی کے پاس موجود ہے۔ سال وفات ۱۲۲۲۔ نمونہ "جو تعریف کہ اول سے آخر تک موجود ہے، لائق ہے واسطے اللہ کے کہ پالنے والا تمام عالموں کا۔ بخشنے والا وجود کا آخرت میں بھی" یہ ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمے سے تقریباً ۲۰ سال قبل کا ہے۔ (۴) (تتمہ دور اول کے عنوان سے ۱۱۰۰ اور ۱۲۰۰ھ

کی کتابوں کی فہرست دی ہے، لیکن اس فہرست میں اس سے بہت قبل کی کتابیں بھی موجود ہیں، اور بکثرت اغلاط ہیں
ازاں جملہ، ناصر افضل کا زمانہ ۱۰۵۰ھ نہیں، آبرو کا دیوان غدر سے قبل طبع نہیں ہوا، شاہ حکیم اللہ نہیں، نام شاہ کلیم اللہ
ہے، عشرۂ کاملہ اردو میں نہیں، حسب ذیل کتابوں کے نام قابل ذکر ہیں) مرأۃ المستفیدین، ابن میر مہدی خاں،
روضہ کریم منشی عبد الغنی، چراغ ابدی تفسیر شاہ عزیز اللہ، ہر سہ کتبخانۂ آصفیہ، جنگ الملائکہ، سید محمد چشتی آزاد
۱۱۵۴ کتبخانہ شیب محمدیہ آگرہ، روضۃ الاطہار مصنفہ نوازش علی شیدا، معرفت السلوک محمد ولی اللہ قادری ۱۱۹۷ھ،
فقہ محفوظ خانی، قدر عالم بن بدر عالم ۱۱۹۹ ہر سہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد، رسالہ تصوف نادر علی شاہ قادری
۱۱۹۰ کتبخانہ انجمن محمدیہ بمبئی ترجمہ منظوم، مثنوی مولانا روم از عبد اللہ دہلوی، رسالہ نجیبی از محمد نجیب امیٹھوی (۵)
تفسیر قرآن موسومہ حقانی از سید شاہ حقانی نبیرہ شاہ برکت اللہ مارہروی، تحریر ۱۲۰۶ھ نمونہ "رنج میں نہ ڈالیگا
اللہ، خدائے تعالیٰ کسی کو مگر موافق طاقت اس کی کے اس کو ہی جو عمل کیا، اور اوپر اس کے جو گناہ کیا" ،
(۶) حکیم غلام امام اکبر آبادی، طبیب شاہی رہے۔ اردو ترجمہ چہل حدیث ۱۲۰۶ھ منتخب النجوم علم ہیئت میں ۱۲۰۴ھ
(۷) مرزا قتیل فرید آباد، نہیں بلکہ مضافات لاہور کے رہنے والے تھے، کایستھ نہ تھے، کھتری تھے، ان کے شاگرد کا نام
امداد الدین تھا، ان کا سال وفات ۱۲۴۰ھ سے کئی سال قبل ہے، اور بھی اغلاط ہیں۔ معیار) (۸) انشا کے حالات
میں یہ صحیح نہیں کہ ان کے اجداد سمرقندی تھے۔ سودا کے حالات میں بھی غلطیاں ہیں

**ادبی دنیا** لاہور، جنوری "غالب کا تصور حسن و عشق" از صوفی تبسم صاحب ص ۳۰، تا ۳۴،
غالب کی شاعری تصوف کی شاعری نہیں، اگرچہ ان کے نزدیک کائنات حسن حقیقی کا
مظہر ہے۔ حسن روحانی شے ہے، ازلی اور ابدی، اس کی فطرت میں خود نمائی کا جذبہ ہے اور یہی کائنات کے عالم
ظہور میں آنے کا باعث ہوا۔ انسان اس حسن کا بہترین مظہر ہے، اور حسن کی کشش سے متاثر ہونے کا نام عشق ہے
یہ ایک جذبۂ بے قرار، اضطراب پیہم ہے، مجازی جب جنسیت کی حدود میں مقید ہو اور حقیقی جب ایک ہستی دوسری
میں گم جانے کو ہمیشہ بیتاب ہو، غالب حقیقت کا مشاہدہ مادی عالم میں کرنا چاہتے ہیں، وہ اس پر تصرف
حاصل کرنا چاہتے ہیں، اپنے ذاتی تشخص کو کھو دینا نہیں چاہتے۔ باوجود اس کے ان کا تصور حسن کبھی مادیت محض
سے ملوث نہیں ہونے پاتا۔ ان کی مخاطبت دراصل روح حسن سے ہوتی ہے، اس لیے وہ معشوق کے مختلف اعضا کی تعریف
نہیں کرتے، اور نہ حسن کے لیے خارجی سامان آرائش ضروری سمجھتے ہیں۔ حسن ابدی راحت ہے "مرزو خوبی بے علتی، لالانی بہ ابدی جنت قرین
ازلی، زمانی" کیٹس کے مشہور مقولہ "اے تھنگ آف بیوٹی از اے جوائے فار ایور" کے مقابلے میں غالب حسن کی مسرت میں زیادہ وسعت پیدا کرتا
غالب کی روح حسن کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہے لیکن نہیں کر سکتی، ایک شدید خواہش ایک تشنگی ہے جو نہیں بجھتی

**شاہکار** لاہور، فروری "تاریخ اردو زبان" ص ۶۰ تا ۷۰، از جناب جوہر، یہ غالباً ایک کتاب کا جزو ہے، جو ابھی شاید حیدر آباد تک بھی نہیں پہنچے (معیار)

**محکمہ** ۔ (۱) دیوان معروف از ق ۔ ع ۔ د ۔ (۲) ندیم ، بہار نمبر ۔ از نثر ۔

**دیوان معروف** :۔ مارچ کی اشاعت میں ایسے اشعار نقل کیے گئے تھے یا ان کا حوالہ دیا گیا تھا جو مطبوعہ دیوان معروف میں موجود نہیں لیکن دوسری جگہ ملتے ہیں ۔ تذکرہ قاسم ۔ ق ، تذکرہ گلستان بے خزاں ۔ گ کے مطلب سے اور اشعار اس طرح کئے ہیں + ۔ سے مطلب یہ ہے کہ اس میں غزل مطبوعہ دیوان میں ہے یا نہیں ہے ۔

ہے شغل اہل ماتم اپنا اشعار رونا ۔ دل کے بیان کرنے اور زار زار رونا ۔ گ ۔

اک طرف بخشش اُس کی لے معروف ۔ میرے سارے گناہ ایک طرف ۔ گ ،

چشم ترسے گو کر آ مژگاں پہ پانی پھر گیا ۔ اس پہ بھی تو نوح کے طوفاں پہ پانی پھر گیا ۔ گ

کیا کریں گے جب سوا نیزے پہ ہوگا آفتاب ۔ ہم تو اے معروف یاں جلتے ہیں گھر او دھوپ میں ۔ گ +

جو بھیجتا مرے خط کا وہ دل فریب جواب ۔ تو کاہے کو مجھے دیتا بھلا طبیب جواب ۔ ق ۔

جو اٹھاتے قتل کو تھے عاشق بیدل کے ہات ۔ رنگ ہے تجھ کو حنا! نہ ہے سوا اس قاتل کے ہات (کدام) ق ۔

جس کو تکیہ ہے خدا کا اُن کو (کذا) کیا تکیے سے کام ۔ سو رہے جب نیند آئی رکھ کے نیچے سر کے ہاتھ ۔ گ +

مرے منھ سے جو اُس کا آ لگا منھ ۔ تو ان نے پیٹ پیٹ اپنا لیا منھ ۔ ق +

ساقیا دیکھے ہے کیا تار رگ ابر سیہ ۔ ہر مژہ کرتی ہے یاں کار رگ ابر سیہ ۔ ق ۔

دیکھ آئینہ مت وہ دیدۂ تر ہی تو ہے آخر ۔ ڈر ہے نہ کرے کام نظر ہی تو ہے آخر ۔ ق +

قد قیامت گات اچھی بات کیا اُس شوخ کی ۔ خط دھواں چہرہ پری ابرو ستم تصویر زلف ۔ گ ۔

جس کے مرقد پر کوئی روتی ہے تو آپ زار زار ۔ صورتیں کیا کیا ملی ہیں دیکھیو اس گل میں شمع ۔ گ ۔

نالہ وہی ہے کہ ساتھ اس کے کلیجا پھٹ جائے ۔ خو سی اک پڑ گئی ہے مرغ گرفتار کو تو ۔ گ +

دو تفتہ دل ہوں گرے اشک گرم گر میرا ۔ کباب جل کے ہوں دریا میں مچھلیاں ساری ۔ گ +

جان کر شیشہ دل پُر درد پر رکھا ہاتھ ۔ یہ اثر دیکھو کہ دست شیشہ گر میں درد ہے ۔ ق +

رہ گئی دن سے ہمیں اب رات کا سونا حرام ۔ جھوکے جھکوں کے گوش سیم بر میں درد ہے ۔ ق +

دور ہی سے دیکھ کر کہتا ہے بھائی اب تو جا ۔ تو نہ لائیگا ، مجھے آگے ہی سر میں درد ہے ۔ ق +

جام بھر بھر کے جو ساقی تو پلاتا ہے مجھے ۔ گردش چشم بتاں یاد دلاتا ہے مجھے ۔ ق +

کیا ہوا چھوٹے قفس سے بھی اگر ہم ناتواں ۔ رہ گئے بیٹھے کے بیٹھے یونہیں پر کھولے ہوئے ۔ گ ۔

شکل آئینہ صفا اے دل اگر پیدا کرے ۔ عکس روئے یار تیرے دل میں گھر پیدا کرے ۔ گ ۔

| | |
|---|---|
| ایک دن معروف برہم ہوگی یہ محفل تمام | حیف گل افسوس بلبل وائے قمری ہائے سرو |
| یوں ہے دل زلف میں اس ستم ایجاد کے ہاتھ | صید جوں دام میں ہو دام ہو صیاد کے ہاتھ |

دیوان معروف میں ابھی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ازاں جملہ: ۳ دی ہے تحت مصرعہ = دے ہے تحت معرکہ ۵ وحش حال وہ کوئی جو وہ ناکام رہ گیا = ہے جو ۔ ۸ تنور رجنج میں ہو سرخ ترمیں جو زیرِ آب کیونکر = نہ ۱۰ گل عارض کے تیری تازگی = کی تیرے تازگی ۱۴ بے معروف نام اور یار ہرجائی کا بھرنے دے = پھرنے ۳۰ عشق کی راہ میں نقش قدم و سوز خروش = شور و خروش؟ ۳۸ قتل کرکے مجھ کو قاتل کیا سو جدا بن گئے = بن گیا ۔ ۴۱ گو نہ جھاڑ اور سر سرکا معروف نے = درد سر ۴۴ گنہ جرم و تقصیر و موجب سبب = (واو دونوں جگہ فاضل؟) ۵۹ تیرے دیوانے کے اس ہوش کا دیوانہ ہوں = کے ۶۳ جرم و تقصیر گنہ واسطہ پھر کیا باعث = واو فاضل ۷۲ ایک دم ہوتی نہیں پھر دل لگی پیے ہو گر = بے ۸۴ آخر اک روز تیگئے ہم ۹۰ مرشد پیر مرشد و پیر ۹۰ سگ دربان = سگ و دربان ۹۵ تمکین دل پہ تیرا = ترا ۱۰۰ احوال میرا = مرا ۱۰۶ ہے یہاں صفت جوہر اکسیر عنا ہوں = سنا ۱۰۹ خلد میں بھی دو جنم = یہ ۱۱۰ پرگندہ دل جہاں کے ہوں نقش نگیں سے میں = پرکندہ ۱۱۱ جو کو کن = جوں ۱۱۲ ادیچ تاب = پیچ و تاب ۱۱۳ جو شخص خوش الحان پر جادو = جوں ۱۱۴ بیان کو .... عمران پر جادو ۱۱۵ گو نہ کیونکر لوں میں ہر اک سے چھپا منہ = کیونکہ ۱۱۶ ارو زیر میں نہ مخمس اس پری پیکر کے ہاتھ = در ۱۲۳ نگہ جھپکی ہو اگر ایک بھی شب ہجراں میں کبھی = گر اک ۱۲۷ سوزیدۂ ازل ہوں ڈھب سے مجھے سید آگی = شوریدہ، صدا ۱۲۸ اکس کا وصف دہن کیا تھا تنج سخن میں خوشبو گلاب کی سی ہے = کہ تج ۱۳۰ اخیر وشر کو ہم اسی پہ دھر چلے = پر ۱۴۴ عاشق بتیات = بیتاب ۱۴۹ ارودِ حکمت یاد ہے = زور ۱۵۰ ہزار حسرت و صد حیف صید ہزار و دریغ = وصد ۱۵۱ ہنسا زیر لب اک بھر کے یارے دم سرد = ناز ۱۶۰ احیا کا گر چہ معجزہ آرائی ہے مسیح = آرائے ۱۶۲ دل میں باتیں ہوں بھری جب کے زیادہ از حد = کر ۱۶۳ حق سے صحبت کا طلبگار نہا میں = صحت ۲۲ رہے ہے ثمرآہ جوں سرو معروف = جوں ۲۰۳ جو واں گیا سو مرا ہی ہمدرد ہو گیا = تیرا؟

ندیم بہار نمبر: "مولانا سید سلیمان ندوی نے دیباچۂ کلام شاد میں لکھا ہے کہ شتاب رائے شاعر تھا اور شتاب تخلص کرتا تھا۔ اس کے بیٹے کا تخلص راجا تھا" اس کی سند مجموعۂ نغز میں ملاحظہ ہو۔ عبدالحفیظ ثمر۔

"جب تک یہ علم نہ ہو کہ سید صاحب نے کس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور نہ اپنی رائے بدلنے کی کوئی ضرورت سمجھتے ہیں۔ مجموعۂ نغز ہماری نظر سے گزرا ہے لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش عشقی عبرتی نے کلیان سنگھ کا تخلص صرف عاشق لکھا ہے راجا کا ذکر نہیں کیا اور ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ کلیان سنگھ کا راجا تخلص نہ تھا۔ اور قاسم نے غلطی سے ایسا لکھا ہے"۔ ؟

# مراسلت

## تعلیم

جناب مدیر معیار

میں آپ کے رسالے کے ذریعے محکمۂ تعلیم صوبہ بہار کی توجہ اسکولوں کی درسی کتابوں کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ اکثر درسی کتابیں غلط زبان اور غلط معلومات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں "رہنمائے اردو" حصہ اوّل مؤلفہ لطیف اللہ خستہ کے بعض اغلاط بتانا چاہتا ہوں، یہ کتاب اسکولوں کے درجہ ہشتم اور نہم کے لیے منظور شدہ ہے۔ اس کی بعض غلطیاں نہایت مضحکہ خیز ہیں:-

(۱) صفحہ ۵۳ "کولمبس دنیا کا زبردست تاریخ داں محقق و عالم فاضل گزرا ہے۔" (۲) صفحہ ۵۳ "ہومر دنیا کا زبردست تاریخ داں، محقق و عالم فاضل گزرا ہے۔" (۳) صفحہ ۵۳ "بن جانسن زبردست تاریخ داں اور صاحب قلم تھا۔" مؤلف کی نادانی کا یہ حال ہے کہ سیاح، شاعر، اور تمثیل نگار سبھی کو "زبردست تاریخ داں، عالم و فاضل، اور صاحب قلم" سمجھتے ہیں!- ایک حدیث کی کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ کئی ہزار جلدوں میں ہے۔ "رہنمائے اردو" اسی قسم کی فاحش غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ٹکسٹ بک کمیٹی کے اراکین اس کی وجہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کتاب اسکولوں کے نصاب میں کیوں داخل کی گئی؟-

عبدالحفیظ ثمر

# عالم ادب

**پیلیاس اور میلیساند:-** میترلنک کے اس ڈرامے کا جناب تمنائی نے ترجمہ کیا ہے اور آرزو جلیلی نے مقدمہ لکھا ہے، جو ادب لطیف [illegible] رسالے میں چھپ چکا ہے۔ کتاب پنجاب بک ڈپو لاہور کی طرف سے زیر طبع ہے۔

**مذہب اور باطنی تعلیم:-** مرزا احمد سعید دہلوی سابق آئی سی ایس کی یہ تصنیف جس کے اکثر اجزا رسالہ شاہکار لاہور میں چھپ چکے ہیں۔ کتابی شکل میں عنقریب تاجور صاحب کی طرف سے شائع ہوگی۔

**کلیات سودا:-** شیخ محمد چاند صاحب ایم اے کلیات سودا کا نقادانہ نسخہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے اشاعت کے لیے مرتب کر رہے ہیں۔ انجمن نے ۳۰ قلمی نسخے کلیات کے فراہم کر لیے ہیں اور سودا کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی حاصل کیا ہے۔

**رامپور اور غالب:-** مرزا غالب نے نوابان رامپور اور متوسلین ریاست کو جو خطوط لکھے تھے، وہ محفوظ ہیں اور ریاست کی جانب سے ان کا مجموعہ جلد شائع ہونے والا ہے۔ امتیاز علی صاحب عرشی منتظم کتب خانہ ریاست خطوط کے جمع و ترتیب کا کام انجام دے رہے ہیں۔

REGD. NO. P. 394.                                                رجسٹرڈ نمبر پی ۳۹۴

انجمن ترقی اردو "شاخ پٹنہ" کا ادبی رسالہ

# معیار

## قواعد

(۱) معیار ماہوار رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال میں سردست صرف چھ پرچے نکلا کریں گے، یہ پرچے جنوری، مارچ، مے، جولائی، ستمبر، نومبر میں کم از کم ۱۱۲ صفحوں پر شائع ہوا کریں گے۔ بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہوں گے۔ ۴۸ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، دسمبر میں شائع ہوا کریں گے۔ سال بھر میں معیار تصاویر و سرورق کے علاوہ کم از کم ۹۱۶ صفحات پیش کیا کرے گا۔

(۲) سالانہ قیمت للعہ فی پرچہ ۱۲؍ - نمونے کا پرچہ ۱۳؍ کے ٹکٹ آنے پر بھیجا جائے گا۔ کچھ پرچے معمولی کاغذ پر نمونۃً بھیجنے کے لیے چھاپے گئے ہیں، قیمت فی پرچہ ۸؍ - اگر دفتر سے منگانا ہو تو ۸؍ کے ٹکٹ بھیجیے۔ جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ بھیجنے چاہئیں۔

(۳) معیار خالص ادبی رسالہ ہے، جو اصحاب اس کی قلمی اعانت کا ارادہ رکھتے ہوں براہ کرم اس کے مخصوص عنوانات کو مدنظر رکھیں۔ یہاں پر صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں مترجم اپنی خواہش کے مطابق رد و بدل کر دیتا ہے، نہ شائع ہوں گے۔ ہر ترجمے کے ساتھ "مصنف" اور اصل افسانہ، ناٹک یا مضمون کا نام ضرور درج ہونا چاہیے۔

(۴) جو صاحب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں "مضمون" کے ساتھ اس کی تصریح فرما دیں۔ (۵) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں، کہ ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کر دیے جائیں۔

---

جن حضرات کی خدمت میں معیار نمونۃً بھیجا گیا ہے وہ مطلع کر دیں کہ انہیں معیار کی سرپرستی منظور ہے یا نہیں۔

---

**دیوان جوش** دیوان جوش عنقریب انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوگا۔ اس کے ساتھ ایک مبسوط مقدمہ بھی ہوگا۔ قیمت دو روپے کے قریب ہوگی، خریداری کی درخواست جلد بھیجیے۔

ناظم انجمن پرنٹر و پبلشر نے برقی مشین پریس مراد پور۔ بانکی پور سے چھپوا کر دفتر معیار مراد پور بانکی پور سے شائع کیا۔

معیار

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کا ادبی رسالہ

# معیار

سالانہ چندہ للعہ — مالک غیر سے معہ
[جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر اور نومبر میں ۱۱۲ صفحات باقی مہینوں میں ۴۴ صفحات]
فی پرچہ ۱۲ر — ایجنسی ایڈیشن ۸ر — نمونہ ۲ر

## قواعد

(۱) معیار ماہوار رسالہ ہے لیکن پوری ضخامت اور کل مستقل عنوانوں کے ساتھ اس کے سال میں صرف چھ پرچے نکلا کریں گے، یہ پرچے جنوری، مارچ، مئی، جولائی، ستمبر، نومبر میں کم از کم ۱۱۲ صفحوں پر شائع ہوا کرینگے۔ بقیہ پرچے جن میں صرف چند ہی عنوانات ہونگے۔ ۴۴ صفحوں پر فروری، اپریل، جون، اگست، اکتوبر اور دسمبر میں شائع ہوا کرینگے۔ سال بھر میں معیار مقتضا وبرو سرورق کے علاوہ کم از کم ۹۱۰ صفحات پیش کیا کریگا۔ رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوگا۔

(۲) سالانہ قیمت للعہ فی پرچہ ۱۲ر، معیار کا ایک معمولی ایڈیشن بھی ہوتا ہے جس کی قیمت فی پرچہ ۸ر ہے نمونے کا پرچہ ٹکٹ آنے پر بھیجا جائیگا۔ یہ رسالہ سالانہ خریداروں کو نہیں دیا جاتا۔ جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ بھیجے چاہییں۔

(۳) معیار خالص ادبی رسالہ ہے جو اصحاب اس کی قلمی اعانت کا ارادہ رکھتے ہوں براہ کرم اس کے مخصوص عنوانات کو مدنظر رکھیں۔ یہاں پر صرف اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ غزلیں اور ایسے تراجم جن میں مترجم اپنی خواہش کے مطابق ردوبدل کر دیتا ہے، نہ شائع ہونگے۔ ہر ترجمے کے ساتھ "مصنف" اور "اصل افسانہ"، "ناٹک"، یا "مضمون" کا نام ضرور ہونا چاہیے۔

(۴) جو صاحب مضمون کے معاوضے کے خواستگار ہوں، مضمون کے ساتھ اس کی تصریح فرمائیں۔

(۵) مضامین کے ساتھ ٹکٹ بھی بھیجے جائیں، کہ ناپسندیدگی کی صورت میں واپس کر دیے جائیں۔

انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار کا ادبی رسالہ

# معیار

(بانکی پور پٹنہ)

مرتب: قاضی عبدالودود

معاون: آرزو جلیلی

تصویر:- امیر مینائی اور اُن کے اعزہ

جلد ۱ | مئی سنہ ۱۹۳۶ء | شمار ۳



محمد علیم الدین پرنٹر و پبلشر نے برقی پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر معیار واقع انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ سے شائع کیا

# معروضات

(از ق ع د)

عبدالحق صاحب اور دوسرے محبان وطن جو متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھتے ہیں' لاکھ چاہیں کہ زبان کے مسئلے کو سیاسیات سے دور رکھیں لیکن یہ مسئلہ اب سیاست کا تختۂ مشق ہو کر رہیگا ، اردو ہندوؤں مسلمانوں کے ہزار سالہ میل جول کی یادگار ہے، لیکن ایک جماعت تنگ نظری سے اسے مسلمانوں کے گذشتہ سیاسی اقتدار کی نشانی سمجھ کر اسکے مٹانے پر تلی ہوئی ہے' یہ ہندوستان کی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس جماعت نے گاندھی جی کی سرپرستی حاصل کر لی ہے، گاندھی جی کی شرکت نے اس جماعت کے حوصلے بڑھادیے ہیں' اور یہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اردو پر بہت جلد حملہ کرنے والی ہے ، ناگ پور میں گاندھی جی کا یہ بیان کہ "ملک کی زبان ہندی یا ہندوستانی ہے (یہی ہندی جس کا نمونہ ہنس کے صفحات پر نظر آتا ہے) اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے جو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے' یہ زبان مسلمان بادشاہوں کی بنائی اور پھیلائی ہوئی ہے اور اس کا رکھنا اور پھیلانا خاص مسلمانوں کا کام ہے" . اردو کے خلاف اعلان جنگ ہے . گاندھی جی کے بیان سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ اگر ہندوستان پر ان کا یا ان کے ہم خیال لوگوں کا قبضہ ہوا تو اردو کا کیا حشر ہوگا . گاندھی جی کے راج میں اردو بولنے والوں کے لیے مزید سہولتوں کا حاصل ہونا درکنار، اس کی وہ حیثیت بھی باقی نہ رہیگی، جو آج ہے ، ہندی کو ملک کی زبان قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو دفتروں اور عدالتوں سے خارج کی جائیگی' اور ہندی کے ذریعہ تعلیم ہونے کے بعد ان لوگوں کو بھی جن کی مادری زبان اردو ہے مجبوراً ہندی سیکھنی پڑیگی ، اردو بولنے والوں کو اپنے خاص مدرسے قائم کرنے ہونگے ، بشرطیکہ حکومت ایسے مدارس کو فرقہ وارانہ مدارس قرار دے جن کا اجرا غالباً ممنوع ہوگا ، حامیان اردو میں سے بعض کا رجحان اس امر کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی سے اس مسئلے کے متعلق مزید گفت و شنید کی جائے' ہم اسے لاحاصل سمجھتے ہیں، تاریخ اور لسانیات کی مدد سے اردو کی ابتدا اور اس کی ترویج کے متعلق آپ گاندھی جی کے نظریے کو باطل ٹھہرا سکتے ہیں' آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ گاندھی جی کا یہ جدید اعلان انڈین نیشنل کانگریس کی منظور کردہ قرارداد کے مطابق نہیں ، زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ خود گاندھی جی کی سابق تحریریں ان کے موجودہ رویے کے خلاف پیش کر سکتے ہیں ، لیکن کیا آپ ایسے شخص کو قائل کر سکتے ہیں' جو عالم بالا سے براہ راست تعلقات رکھتا ہے اور جس کا ہر قول و فعل دیوتاؤں کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے ؟ ہمیں یقین کامل ہے کہ گاندھی جی اپنے موجودہ طرز عمل اور پرانی روش میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتے ، جنگ عظیم میں انگریزوں کے لیے رنگروٹ بھرتی کرانے کے بعد بھی اگر وہ اپنے کو عدم تشدد کا حامی تصور کرتے رہے' تو ہندوستانی اور ہندی . ہندوستانی کو ایک سمجھنا ان کے لیے کونسی بڑی بات ہے .

حامیان اردو کو اس موقع پر کیا کرنا چاہیے ، اس سے ہم آئندہ بحث کرینگے .

# تعارف

(۱) از قاضی عبد الودود (۲) از جناب اعجاز حسن خاں صاحب۔

(۱)

از قاضی عبد الودود

مرزا غالب کے اشعار تذکرۂ عظم الدولہ سرور سے ماخوذ ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ ہندوستان میں بھی ہے لیکن جو نسخہ ہماری نظر سے گذرا ہے وہ دفتر ہند لندن میں ہے۔ اس تذکرے میں میرزا کے اور اشعار بھی ہیں لیکن ہم نے وہی نقل کیے ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

مثنوی میر حسن کا ایک مصرع صریحاً غلط ہو جناب خیال کی قیاسی تصحیح حاشیۂ مثنوی میں درج ہے لیکن وہ بھی اس سے مطلق علیں۔ اگر کسی صاحب نے یہ مثنوی کہیں اور دیکھی ہو تو اس مصرعے کی طرف توجہ فرمائیں۔

حسن رانگاں لابوتے ان یوتیل کا ترجمہ ہے، دواتی چوبیتری کا انگریزی نام لے کنٹری کو یج ہے۔ بدگمانی لاز الوزی کا ترجمہ ہے ایک جگہ مترجم کو اصل میں ترمیم کرنی پڑی ہے جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔

آقا احمد بن محمد علی بن محمد باقر الاصفہانی المشہور بہ بہبہانی کا مولد و منشا ایران تھا۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے ربع اول میں ہندوستان آئے۔ ان کے سفرنامے کا نام مراۃ الاحوال جہاں نما ہے۔ اس کے تین قلمی نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں، دو پٹنے میں اور ایک کلکتے میں۔ آقا بہبہانی تین بار عظیم آباد آئے۔ اس شہر کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ معیار میں بہ اقساط شائع ہوگا۔

معین الدین دردائی صاحب کے مضمون میں بہت سے اشعار غلط معلوم ہوتے ہیں؛ ان کا بیان ہے کہ اصل نسخوں میں یہ اشعار اسی طرح درج ہیں۔ امیر خسرو کی ہندی شاعری ڈاکٹر وحید مرزا کی انگریزی کتاب لائف اینڈ ورکس اوف امیر خسرو کے ایک باب کا خلاصہ ہے ہم ڈاکٹر عندلیب شادانی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے زبان کے لحاظ سے معیار کو جانچا، اور اس کی اغلاط سے ہمیں واقف کیا۔ ان کے مفصل خط کا ایک حصہ اس بار شائع ہو رہا ہے، باقی آیندہ شائع ہوگا۔ صاحب موصوف کے اکثر اعتراضات صحیح ہیں لیکن بعض غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ ہم آیندہ مہینے اس خط کے متعلق اپنی رائے بھی ظاہر کریںگے۔

سالنامۂ سہیل کا حسن ترتیب اور اس کی تصاویر اسے دوسرے سالناموں سے ممتاز کرتی ہیں؛ معیار کا تبصرہ ان خصوصیات کو اچھی طرح نمایاں نہ کر سکا۔ ہمیں اس فروگزاشت کا افسوس ہے۔

## تصحیح

اپریل۔ صفحہ ۱۱۴ سطر ۱ مطالعہ۔ مطالعے، ص ۱۱۵ ازمیانِ منت ذباں برخواست = ازمیاں منت ذباں برخاست ص ۱۱۵ چھپ تختی۔ چھپ تختی ص ۱۱۷ طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو کم کریں۔ طوفان نوح سے نہ ہوا ہو سو ہم کریں۔
مارچ ص ۲۶ ٹھنڈھی ٹھنڈی کا ص ۱۰۵ صیابت = اصابت۔

## (۲)

### از جناب اعجاز حسن خاں صاحب

منشی امیر احمد امیر مینائی (۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ تا ۱۹ جمادی الآخرہ ۱۳۱۸ھ) کے محاسن واوصاف اپنی شہرت کے باعث کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ عنفوان شباب ہی کے زمانے سے آپ کو اساتذۂ عصر قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ میرزا غالب مرحوم اپنے عزیز شاگرد منشی شیو نرائن، رئیس آگرہ کو (جو رسالہ معیار الشعرا شائع کرتے تھے) ایک خط میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔ یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا ....... اس کو اپنے معیار الشعرا میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چہار ورقہ ان کے پاس بھیج دو اور سرنامے پر یہ لکھو کر در رام پور بدر دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد۔ اور مجھ کو اس کی اطلاع دو۔ مرسلہ یکشنبہ ۱۲ جون ۱۸۶۶ء۔"

اردوئے معلیٰ مطبوعہ دہلی ص ۱۳۱۔

جس وقت میرزا صاحب نے یہ خط لکھا ہے، امیر مینائی کی عمر اکتیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ غدر سے پیشتر لکھنؤ میں شاہ اودھ کے دربار میں مصاحبت کا اختصاص حاصل تھا۔ بادشاہی مشاعروں میں بھی شرکت فرماتے تھے۔

مولوی عبد الواحد سیماب مرحوم نے فارسی کی درسی کتابیں منشی طالب حسن مرحوم (امیر مینائی کے برادر بزرگ) سے پڑھی تھیں اور شاعری میں سیماب کے شاگرد تھے۔ وہ مجھ سے بیان فرماتے تھے کہ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں بادشاہ نے ان کو گلے سے لگا لیا اور چند بار ایسا ہوا کہ شال جو خود اوڑھے ہوئے تھے اس کا ایک سرا منشی صاحب کے شانے پر رکھ دیا۔ یہ نوازش خوشنودی خاص کے اظہار کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ جب اودھ کی سلطنت کو زوال آیا غدر کے زمانے میں آپ کا گھر تک کھدگیا یہ رباعی فرمائی ؎

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے
روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر
یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

گھر کے ساتھ گھر کا سامان اور پہلا دیوان بھی ضائع ہو گیا۔

غدر کے بعد آپ کو فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں ناظم تخلص فرمانروائے رامپور نے رامپور بلا لیا اور حاکم عدالت بنایا۔ کبھی کبھی مشورۂ سخن بھی آپ سے فرماتے تھے۔

فن سخن میں ان کی اُستادی اور قادر الکلامی مسلم الثبوت ہے۔ دورِ آخر میں غزل گوئی کے سوا (کہ اس صنف خاص میں میرزا داغ کو فضیلت تھی) جملہ اصناف سخن میں اپنے کل معاصرین سے افضل تھے۔

قطع نظر شاعری کے اخلاق حسنہ، صفات برگزیدہ، علم و عمل، زہد و ورع اور عبادات میں زبان اردو کا کوئی شاعر باستثنائے حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ آپ کے ایسا نہیں ہوا۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں حضرت سید محمد امیر شاہ سے بیعت تھی، پیر و مرشد سے خلافت بھی مل گئی تھی۔ شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مرحوم مجھ سے فرماتے تھے کہ "شاعری کے سوا بھی ان میں ایسے اوصاف تھے کہ صرف اُن اوصاف کے لحاظ سے اُن کے سوانح لکھے جائیں"۔ افسوس ہے کہ منشی صاحب کے حالات میں اب تک کوئی مفصل کتاب شائع ہوئی۔ مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے آپ کے مکتوبات چھاپے ہیں اُس کے ساتھ کچھ حال بھی لکھا ہے اور نواب فصاحت یار جنگ جلیل مانکپوری نے بھی ایک کتاب آپ کے متعلق تصنیف فرمائی ہے مگر اُس میں بھی حالات کا حصہ بہت کم ہے۔

منشی صاحب کے تصنیفات نظم کے علاوہ نثر میں بھی متعدد ہیں۔ اردو کے سوا فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے، عربی اشعار بھی کبھی کبھی فرماتے تھے۔ مگر باستثنائے معدودے چند آپ کے اور تصانیف ابتک چھپ کر شائع نہیں ہوئے۔

راقم الحروف کے خاندان سے تعلقات کا آغاز میرے والد ماجد حکیم محمد ہادی حسن خاں نایاب مرحوم و مغفور کے زمانے سے ہوا۔ والد مرحوم شعر و سخن میں حضرت اسیر سے (جو جناب امیر مینائی کے اُستاد تھے) اصلاح لیتے تھے۔ سنہ ۱۲۹۹ھ میں جب حضرت اسیر کا انتقال ہو گیا تو والد مرحوم نے حضرت امیر مینائی کی طرف رجوع کیا مگر اس کے بعد بہت تھوڑے دنوں زندہ رہ کر ۳ رجب کو سنہ ۱۳۰۱ھ میں انتقال کیا اس وجہ سے غالباً زندگی میں اصلاح سخن کی نوبت نہیں آئی۔ اگر آئی ہو تو دو ایک غزل کے سوا نہیں آئی ہوگی۔ جب میرے والد مرحوم کا انتقال ہو گیا، میرے چچا، محمد صدیق حسن خاں شاد مرحوم (جو اپنے بڑے بھائی حضرت نایاب سے برابر اصلاح لیتے تھے) حضرت امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے اور میرے والد مرحوم کے دیوان کو بھی اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں بھیجا۔ عم مرحوم سے تعلقات بہت زیادہ ہو گئے تھے، منشی صاحب کے سیکڑوں خطوط اُن کے نام آئے جن میں بعض بعض چار چار چھ چھ صفحوں کے تھے۔ خطوط میں شاعری کے متعلق ایک دو باتیں ایسی تھیں جو عام کتابوں میں نہیں مل سکتیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ سب خطوط عم مرحوم کی وفات (یکم رمضان سنہ ۱۳۱۱ھ) کے بعد ضائع ہو گئے۔ صرف دو چار خط میرے ہاتھ آئے جن کو میں نے "خطوط منشی امیر احمد" میں طبع کروا دیا ہے۔

جناب امیر مینائی عظیم آباد صرف ایک بار، وہ بھی میرے عم بزرگوار کی خواہش پر تشریف لائے تھے۔ تشریف آوری سنہ ۱۳۱۲ھ میں ہوئی تھی۔ عم مرحوم کے مکان لال کوٹھی میں (جہاں اب انجینیرنگ کالج ہے) ہفتے دو ہفتے قیام فرمایا تھا۔ اسی زمانۂ قیام میں امیر اللغات کے متعلق بھی لوگوں کو متوجہ کیا۔ اس کے علاوہ اور کبھی تشریف آوری کا اتفاق نہیں ہوا۔

جناب امیر مینائی مرحوم کا بطور یادگار ایک مرقع جس میں ان کی اور ان کے اعزہ کی تصویریں گروپ کی شکل میں ہیں، میرے عم بزرگوار کو بھیجا تھا وہ حسن اتفاق سے میرے پاس تھا۔

قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا نے جو ولایت کے تعلیم یافتہ ہیں اور برخلاف دوسرے تعلیم یافتوں کے ان کو اردو زبان کی طرف توجہ اور اس سے شغف ہے اس کا شائع کرنا پسند کیا اس لیے وہ مرقع میں نے اُن کے حوالے کیا۔ گروپ میں حسب ذیل حضرات کی تصویریں ہیں۔

۱ منشی لطیف احمد (امیر مینائی کے منجھلے صاحبزادے) آپ کا تخلص اختر ہے۔ ریاست حیدرآباد دکن سے وظیفہ پاتے ہیں۔ سابق میں وہاں کسی معزز عہدے پر ممتاز تھے۔

۲ منشی مسعود احمد (امیر مینائی کے چھوٹے بیٹے) "ضمیر" تخلص۔ علیگڑھ کالج میں بھی تعلیم پائی ہے۔

۳ منشی لیاقت حسین (امیر مینائی کے بھتیجے)

۴ منشی امیر احمد مینائی (خود)

۵ منشی محمد احمد (امیر مینائی کے خلف اکبر) پہلے "قمر" تخلص کرتے تھے پھر "محو"۔ اب "صریر" تخلص اختیار کیا ہے۔

۶ منشی عبدالرحمن (امیر مینائی کے نواسے)

۷ مفتی طالب حسن مرحوم (امیر مینائی کے برادر بزرگ)

۸ منشی خورشید احمد (امیر مینائی کے منجھلے صاحبزادے)

گروپ میں بھی اسی ترکیب کے ساتھ ہندسے ہیں۔ فقط

(یہ خط خود اس گروپ کی پشت پر لکھا ہوا ہے، اس لیے استعمال کیا گیا)

[جلوۂ خضر جلد دوم (ص ۲۰۹ تا ۲۹۴) میں صفیر بلگرامی مرحوم نے امیر مینائی کے عظیم آباد آنے اور ان سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے: "رمضان ۱۲۸۹ھ میں امیر مینائی کچھ اپنے شاگرد جناب شاد کی خواہش اور کچھ سرانجام لغت کی نظر سے پٹنہ آئے۔ ان کے ساتھ ریاض خیرآبادی بھی تھے۔ صفیر بلگرامی آرے سے بلوائے گئے۔ ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ امیر کا ارادہ زیادہ قیام کا تھا لیکن ایک ہفتے سے زیادہ نہ ٹھہر سکے۔ گھر سے لڑکوں کی علالت کی خبر آ گئی اور انھیں واپس جانا پڑا۔ شعرا امیر کی ملاقات کے لیے آتے رہے اور شعر و سخن کی صحبتیں ہوتی رہیں لیکن کوئی باضابطہ مشاعرہ منعقد نہ ہو سکا۔" "بزم خیال" میں جو رسالہ جادو ڈھاکہ میں کچھ دنوں بالاقساط شائع ہوتی رہی تھی مرحوم نصیر حسین خاں خیال نے لکھ دیا تھا کہ "امیر مینائی سال میں ایک مرتبہ عظیم آباد ضرور آتے، مشاعرہ ہوتا اور میر کے گھر بھی وہ مرحوم برابر آیا کرتے" (جادو جنوری فروری ۱۹۲۶ء ص ۱۵) یہاں تک ہر سال عظیم آباد آنے اور مشاعروں کے انعقاد کا تعلق ہے، یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ امیر کے شاگردوں کی تعداد صوبہ بہار میں کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس صوبے کو امیر کے مقابلے میں داغ اور تسلیم سے زیادہ فیض پہنچا۔ جہاں تک ہمیں علم ہے جناب شاد کے علاوہ صرف دو شخص اور شاگرد تھے۔ حسرت بنارسی (یہ دراصل ضلع عظیم آباد کے باشندے تھے) اور جناب شفق عماد پوری۔ اضافہ از جانب ادارۂ معیار۔]

# غالب

## اشعار غیر مطبوعہ

دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

شمشیر صاف یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

محفل شمع عذاراں میں جو آجاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامانِ صبا جاتا ہوں

ہوئے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سُبک رُوکے زہ نے سے اہو
کہ بہ یک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں

آگ گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

نیاز عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر
جو ہو جائے نثار برق مشت خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

# آثار ادبیہ

## مثنوی میر حسن در تہنیت عید

فلک کی یہ تھا کج روی سے بعید
کہ دو سال ہو مجھ کو بنگلے میں عید
کروں اس جگہ حمد پروردگار
کہ پہنچیں سے مجھ کو لیل و نہار
یونہی عید میں یاں میں آیا کروں
ثمر اپنے روزوں کا پایا کروں
سبب کہئے جس کے یہ سات دن
رہا فکر دنیا سے ہیں مطمئن
سلامت رکھے اس کو پروردگار
کہ بنگلے میں ہے اس کے دم سے بہار
اسی سے یہ سرسبز ہے سرزمیں
کہ ہیں ساتھ اس کے بہت مومنیں
جواہر علی خاں ہو اور یہ دیار
کہ بنگلے کو اس نے کیا سبزہ زار
سخاوت میں ہمت [illegible] وہ
عدالت میں کل سے اعلیٰ ہے وہ
شجاعت تو ہمت سے وابستہ ہے
غرض خوبیوں کا وہ گلدستہ ہے
ہے وہ رہبر راہ شرع شریف
قوی اس سے ہیں مومنان ضعیف
وہ جو شخص دنیا میں ہے متقی
اسے اس سے للہ ہے دوستی

غریبوں کی خاطر نجیبوں کی چاہ
ہر اک کے موافق کرم کی نگاہ
صلاحیت و اتقا بر ملا
نبی و علی پر وہ دل سے فدا
کدھر ہے تو اے ساقی لالہ فام
لے تہنیت سے پلا مجھ کو جام
کہ ہے آج دن عید کا میری جاں
خوشی ہر طرف ہے ترقی میں یاں
غرض اب کے ساون میں آئی ہے عید
سو ہے یہ گہر بار سال سعید
بہ رنگ گیاہ و مثال نہال
اگے ہے خوشی ہر جگہ اب کے سال
ہوئی ہے خوشی اپنے موسم میں یہ
کہ جوں دانہ کھلتی ہے اگ کر گرہ
برستی ہے اس طرح عیش و خوشی
کہ ہنستے ہے ہنسی کل تلک بے کلی
خوشی عید کی بس کہ پاتا ہے رعد
دمامے خوشی کے بجاتا ہے رعد
شفق سرخی پان پر ہے گواہ
لئے ہے مسی منہ میں ابر سیاہ
زبس شادیانے کی یاں ہے رواج
ہر اک عیدی اپنے سے مانگے ہے آج

پپیہا جو پی پی کرے ہے صدا
سو مانگے ہے عیدی یہ شہنا بجا
غرض ہر روش ہو گلستاں میں شور
نفیری بجانے کو آتے ہیں مور
گل و غنچہ نے مشت میں زر لیا
ہوا نے بھی جگنو سے زیور لیا
نہ کچھ بلبلیں ہیں غزل خواں یہاں
پڑھے ہیں مری مثنوی طوطیاں
کہ جس کے معانی سے یہ ہے مراد
کہ بندہ کرے اپنے خالق کو یاد
رہے یاد حق میں جو ثابت قدم
انھیں عید کیوں کر نہ ہو دم بہ دم
بھلا کیونکر ہوئیں نہ خوش روزہ دار
جنھیں ابر رحمت کرے بار بار
یہ برسات میں عید کا جو ہلال
پڑا ہے نظر سو یہ ہے اس پہ دال
کرم پر ہے اس کے تقاطر گواہ
کہ دھوئے گئے مومنوں کے گناہ
پڑا مہر سے سایۂ بو تراب
کہ برج اسد میں گیا آفتاب
یہ سبزہ یہ موسم یہ آب و ہوا
یہ پاکیزہ دھویا مکاں جا بجا

تر و تازہ گل اور چمن آبدار
سحاب سیہ سایۂ خوش گوار
مکانوں کا ہونا یہ آراستہ
صفا اور نفاست میں پیراستہ
شفق کا یہ خیمہ یہ سبزے کا فرش
پئے عید گویا ہوا تا بہ عرش
نماز جماعت کی ہونا قطار
گلستان دین نبیؐ کی بہار
گھٹاؤں کا ہونا ادھر سے طلوع
مبارک سلامت کی ایدھر شروع
پئے تہنیت مومنوں کا ہجوم
ہر اک دم میں اٹھ اٹھ کے ملنے کی دھوم
یہ نذروں کا لینا قرینے کے ساتھ
یہ قطعوں پہ کرنا نظر لے کے ہاتھ

تجمل نجیبوں کا کرنا نظر
نظر سب کی نذروں پہ کر سر بسر
منگا عطر ہر ایک کو بخشنا
اس انداز سے واں کہ حاصل علی
غرض منصفی سے جو کیجے نظر
تو عالم ہے یاں عید کا خوب تر
یہ تیاری عید و ہنگام عید
یہ جاہ و یہ حشمت یہ اکرام عید
مبارک ہو نواب ناظر کے تئیں
کہ حجت نہیں اس میں حاضر کے تئیں
موافق رہیں سب ملے یک دگر
سویوں میں جس طرح شیر و شکر
جو حق نمک اس کا بھولے رہیں
وہ سوجے رہیں اور پھولے رہیں

چھوارا ہو بھیگا ہوا جس طرح
ورم ان کے منھ پر رہے اس طرح
رہے جب تلک جگ میں ماہ صیام
رہے سبز نواب ناظر کا نام
دعائے حسن کی نہیں کچھ بعید
کہ خاطر رہے ان شب و روز عید
محب و موالی سلامت رہیں
سلامت رہیں بے ملامت رہیں
مخالف جو ہوں اُن پہ ماتم رہے
سدا عید ان کو محرم رہے
رہے جگ میں جوں گندم ان کا جگر
وہ فطرہ پھریں مانگتے در بہ در
دعا پر یہ کی مثنوی میں تمام
کہ ہے عید کی تہنیت اس کا نام

---

۱ بنگلہ فیض آباد کا دوسرا نام ہے۔ آصف الدولہ کے لکھنؤ چلے جانے کے بعد فیض آباد کی رونق بہو بیگم، مادر آصف الدولہ کے دم سے تھی۔ ان کے بھائی سالار جنگ اور دوسرے اعزہ لکھنؤ اور فیض آباد دونوں سے تعلق رکھنے پر مجبور تھے۔ جواہر علی خاں، خواجہ سرا، بہو بیگم کا ناظر تھا، اور اس حیثیت سے فیض آباد میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ حسن نے اس کی مدح میں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اس کا سال وفات غالباً ۱۲۱۵ھ ہے۔

۲ ان کی جگہ اس بہتر ہوگا۔ ۳ جناب خیال کے مجوزہ الفاظ یہ ہیں "گر ہے گی ہنسی گل سے تا گل"، ۴ شور بھی ہو سکتا ہے۔ ۵ کچھ بلبلیں ہی غزلخواں ہیں یاں، بہتر ہے۔ ۶ رواج آج کل مذکر ہے۔ اصل نسخے میں 'کی' ہی ہے۔ ۷ اصل نسخے میں یہ کا لفظ نہیں، اور کرنا کی جگہ گرنا ہے۔ ۸ اصل نسخے میں 'یہ جاہ' کی جگہ 'یہ جاذ' ہے۔

یہ مثنوی کلیات کے اسی نسخے سے ماخوذ ہے جس کا کسی دوسری اشاعت میں ذکر ہو چکا ہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۱۹۲ھ کے بعد ہے۔ ٭ ٭ ٭ ٭

نظم

# شملہ کی برکھا

(از پریم پجاری)

اُں وہ اُٹھی کالی گھٹا سرشار، متوالی گھٹا

سرمایۂ دریا لیے

دریائے گوہرزا لیے

بس گوہرِ یکتا لیے

مستوں کی صورت جھومتا چھاتا، اُمنڈتا، گھومتا

اُں وہ اُٹھی کالی گھٹا

سرشار، متوالی گھٹا

گرنے لگیں لو بوندیاں گوہرنشاں، انجم فشاں

جانِ مجسّم ہے پھوار

جوشِ نمو کی ذمہ دار

رُوحِ چمن، رُوحِ بہار

جس سے ہوا مینوش ہے رُوئے زمیں گلپوش ہے

گرنے لگیں لو بوندیاں

گوہرنشاں، انجم فشاں

بجنے لگے بارش کے تار فطرت نے چھیڑا، سرنگمار

چھم چھم چھما چھم کی صدا

اک نغمہ ہے فردوس کا

وجد آفریں وکیف زا

لیکن دلِ ہجراں زدہ ہے آج بھی ماتم کدہ

بجنے لگے بارش کے تار

فطرت نے چھیڑا سرنگمار

پڑنے لگا مینھ زور سے کہسار گونجے شور سے

اللہ ری بھادوں کی جھڑن

نالے بنے گنگ و جمن

سیلاب ہر سو موج زن

لیکن ابھی تھم جائے گا رنگ اور ہی جم جائے گا

پڑنے لگا مینھ زور سے

کہسار گونجے شور سے

ہر ایک شکلِ برشکال رکھتی ہے ندرت میں کمال

نیچے بخاراتِ سحاب

اور منفعل ہی آفتاب

تشبیہِ شاعر لاجواب

یعنی تہِ آتش دُھواں حیرت کنندئے مردماں

ہر ایک شکلِ برشکال

رکھتی ہے ندرت میں کمال

نیلا ابھی تھا آسماں کس طرح بدلا یہ سماں

اک پل میں دھانی ہوگیا

پھر زعفرانی ہوگیا

اب ارغوانی ہوگیا

پھر لاجوردی رنگ ہے جیند وچپ ہے، دنگ ہے

نیلا ابھی تھا آسماں

کس طرح بدلا یہ سماں

لو پھر برس کر کھُل گیا فطرت کا چہرہ دُھل گیا

عشوں سے بھر کر جھولیاں

زہرہ وشوں کی ٹولیاں

ہر قمر کی بھولبھلیاں

محوِ خرامِ ناز ہیں ذرہائے فتنہ باز ہیں
لو پھر برس کر کھل گیا
فطرت کا چہرہ دھل گیا
کچھ طور والی بجلیاں کچھ مستیاں، کچھ شوخیاں
رنگِ شفق، نورِ سحر
شادابیِ گلہائے تر
دوشیزہ فطرت کا اثر
سب مل ملا کر بن گئیں یہ لعبتانِ دل نشیں
کچھ طور والی بجلیاں
کچھ مستیاں، کچھ شوخیاں
چھپتے ہوئے خورشید کی اللہ ری جادوگری
پرتو سے جس کے ضوبار
بادل کے ٹکڑے شعلہ کار
جو ہیں سما میں بے قرار
آتش کی گویا کشتیاں ہیں بحرِ اخضر میں رواں
چھپتے ہوئے خورشید کی
اللہ ری جادوگری
یہ سحر یا اعجاز ہے یا اور کوئی راز ہے
سمتِ افق میں ابرِ تار
رنگِ شفق سے شعلہ زار
آتش فشاں یا کوہسار
اور پھر معلق در ہوا نیرنگِ فطرت مرحبا
یہ سحر یا اعجاز ہے
یا اور کوئی راز ہے
فطرت کی نادر کاریاں کیا کیا کرے کوئی بیاں
ہر چند بادل پردہ دار
خورشید کی ضو آشکار
اک روشنی کا انتشار
جو ہیں سما میں جلوہ ریز ساکن فضا میں حشر خیز
فطرت کی نادر کاریاں
کیا کیا کرے کوئی بیاں
چشمِ تماشا کے لیے دستِ تمنا کے لیے
خاموشی ہر جلوہ پاش
گویا صدائے دُور باش
لیکن نظر گرمِ تلاش
دل دادگانِ حُسن کی واماندگانِ حُسن کی
چشمِ تماشا کے لیے
دستِ تمنا کے لیے
ایک ایک گوشہ مال[1] کا پھر انجمستاں بن گیا
یہ فتنہ کاروں کا ہجوم
یہ ماہ پاروں کا ہجوم
اتنے ستاروں کا ہجوم
اس راہ سے شرما گئی اب کہکشاں چھپ جائے گی
ایک ایک گوشہ مال کا
پھر انجمستاں بن گیا

---

[1] مال روڈ شملہ۔

# افسانے :-

## حسنِ رائگاں :-

(۱) حسنِ رائگاں - مصنفہ موپاسان - مترجمہ آرزو جلیلی
(۲) دہات کی جھونپڑی - مصنفہ چیخوف - مترجمہ عبدالحفیظ ثمر

# حسنِ رائگاں

مصنفہ :- گی دُ موپاسان مترجمہ :- آرزو جلیلی

---

ایک عالی شان عمارت کی سیڑھیوں کے سامنے ایک نہایت نفیس وکٹوریا کھڑی تھی' جس میں دو اعلیٰ قسم کے شکی گھوڑے جتے ہوئے تھے' ماہ جون کا آخری دن اور ساڑھے پانچ بجے شام کا وقت تھا۔ ان مکانوں کی چھتوں کے درمیان سے جو صحن کو گھیرے ہوئے تھے' آسمان تیز روشنی' حرارت اور شادمانی سے معمور نظر آ رہا تھا۔

کونتس دی م... سیڑھیوں پر تھیں اس وقت بھی جب اس کا شوہر پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ اپنی بی بی کو بغور دیکھنے کے لیے وہ چند لمحوں تک رک گیا اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کی بی بی اپنے بیضاوی چہرے' ہاتھی دانت جیسے سفید رنگ' بڑی بڑی بھوری آنکھوں اور سیاہ بالوں کی وجہ سے بہت حسین' نازک اندام اور پروقار معلوم ہوتی تھی۔ وہ بغیر اپنے شوہر کی طرف دیکھے گاڑی کے اندر ایسے انداز سے داخل ہو گئی کہ وہ جذبۂ حسد و رقابت جو مدت سے اس کے شوہر کو الجھن میں ڈالے ہوئے تھا پھر جوش میں آ گیا۔ وہ اس کے قریب گیا......

"تم سیر کے لیے جا رہی ہو؟" اس نے کہا

اس کے لبوں سے جن سے حقارت ٹپک رہی تھی صرف چار الفاظ نکلے:

"تم دیکھتے ہی ہو!"

"بوا کی طرف جاؤ گی؟"

"غالباً"

"مجھے تمہارے ساتھ چلنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

"گاڑی تمہاری ہی ہے۔"

اس جواب کے لہجے پر تعجب کیے بغیر وہ گاڑی کے اندر داخل ہوا اور بی بی کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کوچبان کو حکم دیا۔

"بوا کی طرف!"

سائیس اچک کر کوچبان کے پاس بیٹھ گیا۔ اور گھوڑے جب تک سڑک پر پہنچے حسب عادت اپنے سروں کو ہلاتے رہے۔

شوہر اور بی بی ایک دوسرے کے بغل میں خاموش بیٹھے رہے۔ شوہر نے چاہا کہ گفتگو شروع کرے، مگر بی بی کے چہرے سے اس قدر ضد اور غصے کے آثار نمایاں تھے کہ وہ ہمت نہ کر سکا۔

آخر کار وہ چپکے سے اپنا ہاتھ اپنی بی بی کے ہاتھ کے قریب لے گیا، جو دستانے میں ملفوف تھا۔ اور اس کو آہستہ سے اس طرح چھوا کہ گویا اس نے محض اتفاقاً ایسا کیا ہو۔ لیکن بی بی نے بڑی پھرتی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا جس سے ایسی سخت حقارت نمایاں تھی کہ باوجود اپنی فطری خودسری کے وہ پریشان ہو گیا۔

آخر کار اس نے کہا:

"گیبریل"

بغیر شوہر کی طرف دیکھے ہوئے اس نے پوچھا:

"کیا چاہتے ہو؟"

"تم حد درجہ قابلِ پرستش ہو۔"

اس نے کچھ جواب نہیں دیا اور ایک غصے میں آئی ہوئی رانی کی طرح گاڑی میں تنی ہوئی بیٹھی رہی۔

اب وہ شانز الیزے کے راستے سے ارک دی ترایمف دلتوال کی طرف جا رہے تھے۔ یہ پرشکوہ محراب جو اس طویل رہ گزر کے اختتام پر تھی، سرخ آسمان کے مقابلے میں اپنا سر اٹھائے ہوئے تھی، آفتاب کی شعاعیں اس پر پڑ رہی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ افق سے آتشیں غبار اڑ رہا ہے۔

اور گاڑیوں کا ایک مسلسل دو طرفہ قطاروں میں پارک اور شہر کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑیوں کے ساز اور لالٹینوں سے جہاں چاندی اور تانبے کے پرزے جڑے ہوئے تھے، سورج کی کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔

کونت دسکابئیے نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔

"پیاری گیبریل"

اس نے آپے سے باہر ہو کر غصے کے لہجے میں کہا۔

"میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے چین سے رہنے دو۔ اپنی گاڑی میں بھی اطمینان سے بیٹھنے کی آزادی اب مجھے حاصل نہیں!"

"میری آنکھوں میں تم اب سے پہلے ایسی خوبصورت نہیں معلوم ہوتی تھیں۔" اس نے اس انداز سے کہا کہ گویا اس نے گیبریل کا جواب سنا ہی نہ ہو۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اپنے غصے پر قابو نہ پاسکی اور جھلا کر بولی "اس سے بیش کیا بحث؟ میں عہد کرتی ہوں کہ آج سے میں تم سے کچھ بھی واسطہ نہ رکھوں گی۔"

وہ مضطرب اور حیرت زدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی فطری بدمزاجی پر قابو پا کر کہا "کیا کہا تم نے؟" اس کے طرز تکلم سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محبت کرنے والا انسان نہیں، بلکہ ایک بے رحم آقا ہے۔

پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ کی وجہ سے لوگ اس کی آواز نہیں سن سکتے تھے، لیکن پھر بھی گیبریل نے دھیمی آواز میں کہا،

"کیا کہا تم نے؛ کیا کہا تم نے؟ میں تمہیں خوب پہچانتی ہوں میں بتادوں کہ تم کیا ہو؟"

"بتادو۔"

کیا میں ان جذبات کا اظہار کردوں جنہیں میں اپنے دل میں اس وقت سے لیے پھرتی ہوں جب سے میں تمہاری خودغرضی کا شکار ہوئی ہوں؟

تعجب اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے دانت پیس کر کہا،

"ہاں کہے جاؤ۔"

وہ ایک طویل قامت انسان تھا۔ اس کے شانے چوڑے تھے۔ داڑھی لمبی اور بھورے رنگ کی تھی۔ وہ حسین تھا، شریف تھا۔ اور دنیا کے سرد و گرم کا تجربہ کر چکا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا شوہر اور فرض شناس باپ تصور کیا جاتا تھا۔

گھر سے روانہ ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ گیبریل اس کی طرف پھری اور دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

"اچھا! اب تم بعض ناگوار باتیں سنو گے لیکن یہ سمجھ لو کہ میں سب کچھ بھگتنے کے لیے تیار ہوں مجھے کسی بات

کا خوف نہیں۔ اور آج تو تمہارا اتنا بھی ڈر نہیں جتنا کسی اور کا ہو سکتا ہے۔

اس نے گیبرئیل سے آنکھیں ملائیں، اور غصے سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا:۔

"تم پاگل ہو گئی ہو!"

"نہیں میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر اب میں اس طرح ہمیشہ حاملہ نہیں بنتی رہوں گی جس طرح تم نے مجھے پچھلے گیارہ سالوں میں بار بار بنائے رکھا ہے۔ میں اس طرح رہنا چاہتی ہوں جس طرح دنیا کی عورتیں رہتی ہیں۔ جس کی میں حقدار ہوں اور جس طرح دنیا کی کل بیبیوں کا حق ہوتا ہے"۔

اس کا چہرہ دفعتہً زرد ہو گیا اور اس نے ہکلا کر کہا:۔

"میں نہیں سمجھا"

"تم یقیناً سمجھ گئے ہو گے۔ ابھی تین ہی مہینے گزرے ہیں کہ مجھے بچہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ باوجود تمہاری کوششوں کے میں اب تک بہت حسین ہوں۔ جس کا اندازہ تم نے اس وقت کیا ہو گا جب تم نے آج دروازے کی سیڑھیوں پر مجھے دیکھا تھا۔ تم سوچتے ہو گے کہ میرے حاملہ ہونے کا وقت پھر آ گیا۔

"تم مہمل باتیں کر رہی ہو"

"نہیں ــــ میرا سن تیس سال کا ہے اور میرے سات بچے ہیں۔ ہماری شادی کو گیارہ سال کا عرصہ گذرا تم یہ امید کرتے ہو گے کہ اگر آئندہ دس سال تک یہی سلسلہ جاری رہا تو اس کے بعد تمہیں مجھ سے حسد کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

اس نے اپنی بی بی کے بازو کو زور سے دبایا:۔

"میں تمہیں اس قسم کی گفتگو نہیں کرنے دوں گا"

"مگر میں بولتی رہوں گی جب تک سب کچھ نہ کہہ لوں جو میں تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ اگر تم مجھے بولنے نہ دو گے تو میں اپنی آواز اس قدر بلند کر دوں گی کہ دونوں خادم بھی سن سکیں جو باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے نزدیک اسی وجہ سے بیٹھنے دیا تھا، کیونکہ ان خادموں کی موجودگی تمہیں میری باتیں سننے اور اپنے جذبات پر قابو رکھنے کے لیے مجبور کرے گی۔ سنو! میں ہمیشہ تم سے نفرت کرتی رہی اور میں نے تمہیں، اس کا احساس ہونے دیا، کیونکہ میں اب تک کبھی جھوٹ نہیں بولی ــ تم نے میری مرضی کے خلاف مجھ سے شادی کی۔ تم نے میرے والدین پر دباؤ ڈالا جنھوں نے میری شادی تم سے کر دی، کیونکہ تم بہت امیر تھے۔ انھوں نے مجھے مجبور کیا۔ میرے آنسوؤں کی بھی پروا نہ کی۔

گویا تم نے مجھے خرید لیا۔ جب سے میں تمہارے قبضے میں آئی، اور تمہاری بی بی بنی، میں نے کوشش کی کہ تمہاری دھمکیوں اور جابرانہ سلوک کو بھول جاؤں۔ کیونکہ میں ایک وفادار بی بی ہونا چاہتی تھی۔ جب میں تم سے ضرور جسم

محبت کرنے لگی، تم سخت بدگمان ہو گئے۔ شاید ہی کسی اور کو ایسی بدگمانی ہوئی ہوگی۔ تمہاری بدگمانی ذلیل درجے کی تھی، تو تمہارے لیے ننگ اور میرے لیے توہین کا باعث تھی۔ شادی کو آٹھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ تم نے مجھ کو ہر قسم کی دغا بازی کا مجرم سمجھا۔ بلکہ تم نے خود مجھ سے اپنے شک کا اظہار کیا۔ کیسی شرمناک بات ہے! چونکہ تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ مجھے حسن اور دلفریبی سے محروم کر دو، گھر گھر میرا چرچا نہ ہونے دو، اور اخباروں میں میری تعریف نہ چھپنے دو، تم میری طرف سے دوسروں کی توجہ ہٹانے کی کوئی صورت سوچنے لگے۔ تم نے قابلِ نفرت ترکیب سوچی کہ میں یکے بعد دیگرے بچے جنتی رہوں، یہاں تک کہ لوگ مجھ سے متنفر ہو جائیں۔ اس سے انکار نہ کرو۔ بہت دنوں تک تو مجھے اس کا شائبہ گمان بھی نہ تھا۔ لیکن پھر میں سمجھ گئی۔ تم نے اپنی بہن سے بھی یہ بات ظاہر کی تھی۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا، کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتی، اور تمہارے دہقانی بھونڈے پن سے گھبراتی ہے۔ ہماری آپس کی لڑائیوں کو یاد کرو۔ دروازے زبردستی کھولے جاتے، اور تالے توڑ دیے جاتے تھے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ تم نے گیارہ سال سے مجھے کس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے! ایسی زندگی، جیسی بچہ جننے والی گھوڑی اصطبل میں بسر کرتی ہے۔ پھر میرے حاملہ ہوتے ہی تمہیں مجھ سے رغبت باقی نہ رہتی، اور میں مہینوں تک تمہارے دیدار سے محروم ہو جاتی۔ میں دیہات بھیج دی جاتی کہ وہیں جا کر بچہ جنوں۔ جب میں واپس آتی، ویسی ہی حسین، دلفریب اور مرکزِ جاذبیت بن کر، جیسی پہلے تھی، میرے دل میں یہ تمنا ہوتی، کہ اب تھوڑے دنوں تک ایسی زندگی بسر کروں، جیسی ایک نوجوان اور تندرست عورت کو بسر کرنی چاہیے۔ لیکن تم پھر رشک کرنے لگتے اور وہی قابلِ نفرت خواہش سے مغلوب ہو کر، تم [illegible] میرے درپے آزار ہو جاتے تھے، جس خواہش سے مغلوب ہو کر، تم ابھی میرے پاس بیٹھے ہوئے ہو، یہ میرے حسن سے لطف اندوز ہونے کی خواہش نہیں، کیونکہ میں نے کبھی تم سے انکار نہیں کیا، بلکہ یہ مجھے بدصورت بنا دینے کی خواہش ہے۔

"اس کے علاوہ ایک اور بات ہے سخت قابلِ نفریں و ملامت۔ عجیب و غریب بات جس کا احساس مجھے دیر سے ہوا (کیونکہ میں تمہارے افعال اور خیالات کی غایت کو بہت جلد سمجھ جاتی ہوں) تم اپنے بچوں سے محض اس لیے محبت کرتے ہو کہ جب تک میں انہیں اپنے [illegible] لیے پھرتی ہوں، تمہیں میری طرف سے بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ تم انہیں پیار اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں مجھ سے نفرت ہے۔ جب تم میری جوانی کو روز بروز ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہو، تو تمہارے شرمناک وسوسے عارضی طور پر معدوم ہو جاتے ہیں۔

میں نے بارہا تمہاری اس خوشی کو محسوس کیا اور تمہاری آنکھوں میں اسے دیکھا ہے۔ تم اپنے بچوں کو اپنی فتح کی نشانی سمجھ کر پیار کرتے ہو، اس لیے نہیں کہ ان کی رگوں میں تمہارا ہی خون بہتا ہے۔ ہر بچہ ایک فتح ہے۔ جو تمہیں مجھ پر، میری جوانی، میرے حسن، میری دلفریبی اور ہر دلعزیزی پر حاصل ہوئی ہے۔ تمہیں ان بچوں پر فخر ہے۔ تم انہیں دکھاتے پھرتے ہو، بوا د بولون اور مان مورانسی میں سیر کراتے ہو، اور تھیٹر میں لے جاتے ہو تاکہ لوگ تمہیں ان سے گھرا ہوا دیکھ کر کہیں: "کیسا اچھا باپ ہے۔" اور اس جملے کو بار بار دہرائیں۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس نے وحشیانہ انداز سے گیبریل کی کلائی پکڑ لی اور اس سختی سے دبائے رہا کہ وہ چپ ہو گئی اور اس کے حلق سے گھگھراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔

کونت نے دھیمی آواز میں کہا:

"مجھے اپنے بچوں سے محبت ہے۔ تم تو ایسی باتیں کرتی ہو کہ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ ماں ہو کر ایسی باتیں! لیکن میں تمہارا مالک ہوں۔ مالک!... ........ میں جب چاہوں تمہیں اپنا حکم بجا لانے پر مجبور کر سکتا ہوں اور قانون بھی میری ہی مدد کرے گا۔

اس نے گیبرئیل کی انگلیوں کو اپنی بھاری مردانہ مٹھی میں جکڑ کر دبا دیا۔ شدت درد سے بے چین ہو کر گیبرئیل نے اپنے ہاتھ کو اس سخت گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی جس سے اس کا ہاتھ پسا جا رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر ہانپنے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

کونت نے کہا:

"اب تم محسوس کرتی ہو گی کہ میں تمہارا مالک ہوں اور تم سے زیادہ طاقتور!"

کونت نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ گیبرئیل نے جواب دیا:

"تم مجھے پارسا عورت سمجھتے ہو؟"

اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا: "بے شک!"

"تم یہ باور کر سکتے ہو کہ میں گرجا میں قربان گاہ کے سامنے جھوٹی قسم کھاؤں گی؟"

"نہیں"

"میرے ساتھ تم کسی گرجا میں چلو گے؟"

"کس غرض سے؟"

"وہاں پہنچ کر دیکھ لینا۔ چلو گے؟"

"اگر تمہیں اصرار ہے تو میں چلوں گا۔"

گیبرئیل نے بلند آواز سے کہا:

"فیلیپ!"

کوچبان نے گھوڑوں پر سے نظر ہٹائے بغیر اپنی گردن ایک طرف جھکائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے صرف اپنا کان اپنی مالکہ کی طرف پھیر دیا تھا۔ مالکہ نے کہا:

"سان فیلیپ دو رول کے گرجا کی طرف گاڑی لے چلو"

اور وکٹوریا گاڑی جو بوا دیوں کے پھاٹک تک پہنچ چکی تھی، پیرس کی طرف واپس ہوئی۔
گرجا پہنچنے تک میاں بی بی میں ذرا بھی گفتگو نہ ہوئی۔ جب گاڑی گرجا کے پھاٹک پر رکی تو مادام دسکارے کود کر باہر نکلی اور گرجا کے اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے کونٹ بھی داخل ہوا۔
وہ سیدھے کوائر[1] کے کٹہرے تک گئی اور ایک کرسی کے سامنے وہ زانو بیٹھ کر اس نے اپنا منہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور عبادت کرنے لگی۔ وہ دیر تک عبادت کرتی رہی اور کونٹ نے اس کے قریب کھڑے ہو کر دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ خاموشی سے رو رہی تھی، جس طرح عورتیں انتہائی رنج و غم کے لمحوں میں رویا کرتی ہیں۔ یہ رونا ایک قسم کا لرزہ تھا جو اس کے جسم پر طاری تھا اور ایک ضعیف سی سسکی پر ختم ہوتا تھا۔
لیکن کونٹ دسکارے نے فیصلہ کر لیا کہ یہ کیفیت بہت دیر تک قائم رہ چکی ہے، اور اس نے گیبریل کے شانوں کو چھوا۔
گیبریل چونک کر کھڑی ہو گئی اور کونٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے کہا:
"مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ میں تم سے نہیں ڈرتی۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ چاہو تو مجھے قتل بھی کر دو۔ ہمارے بچوں میں سے ایک بچہ تمہارا نہیں ہے۔ میں اس خدا کے سامنے تم سے قسم کھا کر کہتی ہوں، جو یہاں پر میری آواز سن رہا ہے۔ یہی ایک انتقام تھا جو میں تم سے لے سکتی تھی۔ تمہارے ظلم سے بغاوت کرنے اور بار بار دردِ زہ میں مبتلا ہونے سے بچنے کی کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ میرا عاشق کون تھا؟ تم کبھی نہ جان سکو گے۔ تم ساری دنیا پر شک کرو گے، لیکن اس شخص کا سراغ نہیں ملے گا۔ میں نے اپنے آپ کو بغیر کسی احساسِ محبت یا خوشی کے، اس کے حوالے کر دیا تھا۔ محض تم کو دغا دینے کی غرض سے۔ اور اس شخص نے بھی مجھے ایک بچے کی ماں بنا دیا۔ وہ بچہ کون ہے؟ یہ تم کبھی نہ جان سکو گے۔ میرے سات بچے ہیں، تم انہیں میں سے اس بچے کو تلاش کر کے نکال لو۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد تمہیں اس راز سے آگاہ کروں، کیونکہ محض بے وفائی سے انتقام مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ مرد ڈرنے بھی نہ لگے۔ تم نے مجھے آج یہ اقرار کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ بس! جو کہنا تھا میں کہہ چکی۔"
یہ کہہ کر وہ گرجا سے اس دروازے کی طرف بھاگی جو سڑک کے قریب تھا۔ وہ یہ خیال کرتی ہوئی بھاگ رہی تھی کہ اب اپنے شوہر کے قدموں کی چاپ سنے گی، جو اس کا تعاقب کر رہا ہوگا۔ کیونکہ آج اس نے اپنے شوہر سے بغاوت کی تھی اور اسے یقین تھا کہ عنقریب اس کے مکوں کی زبردست ضربیں کھا کر وہ خاک و خون میں لوٹتی نظر آئے گی۔
مگر اس نے کوئی آواز نہ سنی اور گاڑی تک پہنچ گئی۔ وہ اچک کر گاڑی میں بیٹھی اور اس نے گھبرا کر کوچبان سے کہا:
"گھر چلو"

---

[1] Choir وہ جگہ جہاں پر گرجا میں نغمے گائے جاتے ہیں۔　مترجم

گھوڑے تیز چال سے روانہ ہوگئے۔

(۳)

اپنے کمرے کی تنہائی میں کونتس دسکاورے کھانے کے وقت کا انتظار کر رہی تھی جس طرح سزا یافتہ مجرم اپنی پھانسی کا منتظر رہتا ہے۔ وہ کیا کرے گا؟ وہ واپس آگیا؟ وہ بالطبع تندمزاج تھا۔ ہر قسم کا ظلم ڈھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس نے کون سی تجویز سوچی تھی اور کیا فیصلہ کیا تھا؟ مکان میں کسی قسم کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہ بار بار گھڑی کی سوئیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی خادمہ اسے شام کا لباس پہنانے کے لیے آئی اور پھر واپس چلی گئی۔

آٹھ کا گھنٹا بجا اور اس کے ساتھ ہی دروازے پر کسی نے دو بار دستک دی۔

"اندر آؤ" گیبریئل نے کہا۔

خانساماں کمرے میں آیا اور اس نے کہا:

"کھانا تیار ہے" مادام

"کونت صاحب بھی ہیں؟"

"جی ہاں مادام، صاحب کھانے کے کمرے میں موجود ہیں"

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال گزرا کہ اس ڈرامے کا لحاظ کرتے ہوئے، جس کا خاکہ وہ اپنے ذہن میں تیار کر چکی تھی، اسے اس ریوالور سے مسلح ہو کر جانا چاہیے جسے کچھ دنوں قبل وہ خرید کر لائی تھی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ بچے بھی وہاں موجود ہوں گے، اور نمک کی شیشی کے سوا اس نے کچھ بھی اپنے ساتھ نہ لیا۔

جب وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی، تو اس کا شوہر اپنی کرسی کے قریب کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ صرف سر کے اشارے سے ان دونوں میں صاحب سلامت ہوئی۔ پھر یہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تینوں لڑکے اپنے اتالیق ابے موران کے ساتھ ماں کے دہنے بازو بیٹھے، اور تینوں لڑکیاں اپنی انگریزی استانی مس اسمتھ کے ساتھ، بائیں طرف بیٹھیں۔ سب سے ننھا بچہ جس کا سن محض تین مہینے کا تھا اپنی کھلائی کے ساتھ اپنے کمرے ہی میں رہا۔

تینوں لڑکیاں، جو سب کی سب حسین تھیں اور جن میں سب سے بڑی لڑکی کا سن دس سال کا تھا، نیلے رنگ کے فراک پہنے ہوئے تھیں، اور خوبصورت گڑیوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی کا سن ابھی تین سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ لڑکیاں حسین تھیں اور قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ جوان ہو کر وہ اتنی ہی حسین ہو جائیں گی جتنی حسین ان کی ماں تھی۔

دو لڑکیوں کے بال بھورے تھے، اور سب سے بڑے لڑکے کے بال، جس کا سن نو سال کا تھا، تقریباً بالکل سیاہ ہو چکے تھے۔ قرینہ تھا کہ یہ تینوں جوان ہو کر لمبے، طاقتور اور پھرتیلے ہو جائیں گے، اور ان کے شانے بہت چوڑے ہوں گے۔

یہ خاندان ہی کسی تندرست شخص کی نسل سے تھا۔

پادری نے حسبِ معمول دعا مانگی جس طرح وہ ہمیشہ مانگا کرتا تھا جب کھانے پر کوئی مہمان نہ ہوتا تھا کیونکہ مہمانوں کی موجودگی میں بچے کھانے میں شریک نہ ہوتے تھے۔ دعا کے بعد وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

کونتس جو ایسے جذبے سے مغلوب ہو رہی تھی جس کی توقع اُسے نہ تھی، نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ کونت تینوں لڑکوں اور تینوں لڑکیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں ایک سے دوسرے پر جاتی تھیں۔ یکایک اس نے اپنے گلاس کو زور سے گرا دیا۔ گلاس ٹوٹ گیا اور سرخ سیّال میز پر بہہ گیا۔ کونتس اس زور سے چونکی کہ وہ اپنی کرسی پر اچھل پڑی۔ اب گیبرئیل نے پہلی بار اپنے شوہر کو دیکھا۔ دونوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن اس حقارت کے باوجود، جسے وہ اپنے ماتھے کے بل اور دل کی دھڑکن سے محسوس کر رہے تھے، وہ بار بار ایک دوسرے کو گرم نگاہوں سے دیکھتے رہے۔

اگرچہ پادری اس کشیدگی کی وجہ نہیں سمجھ سکا، مگر فضا کو مکدر محسوس کر کے اس نے بات چیت کا سلسلہ چھیڑنا چاہا۔ اس نے مختلف موضوع پر اظہارِ خیال شروع کیا۔ مگر اس کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

کونتس نے اپنی فطری ہشیاری اور حسنِ اخلاق سے پادری کی باتوں کا جواب دینا چاہا، مگر ناکام رہی۔ خیالات کی الجھن میں اسے مناسب الفاظ نہ مل سکے۔ اس وسیع کمرے کی خاموشی میں جہاں چھریوں اور کانٹوں کی آواز کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہ دیتی تھی وہ خود اپنی آواز سن کر ڈر رہی تھی۔

یکایک اس کے شوہر نے، اس کی طرف جھک کر، کہا:

"یہاں اس کمرے میں، اپنی اولاد کی موجودگی میں تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، وہ سچ کہا تھا؟"

وہ حقارت، جس کا خمیر اس کی رگوں میں تیار ہو رہا تھا، یکایک بھڑک اٹھی۔ اس نے اس کے سوال کا جواب بھی اسی جوش سے دیا جس سختی سے اس کی نگاہوں کا جواب دیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے، دہنا ہاتھ لڑکوں کے سر کی طرف اور بایاں ہاتھ لڑکیوں کے سر کی جانب بڑھایا۔ پھر اس نے بغیر ہچکچائے ہوئے، ایسی آواز میں، جس سے عزمِ راسخ کا اظہار ہوتا تھا، کہا:

"میں اپنے بچوں کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے تم سے حقیقت بیان کی تھی۔"

کونت کھڑا ہو گیا اس کے چہرے پر اس کی الجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے رومال کو میز پر پھینک دیا، اور اپنی کرسی کو دیوار کی طرف ڈھکیل کر، کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس پر کونتس نے اس طرح گہری سانس لی گویا اس نے پہلے بار فتح پائی ہو۔ وہ مطمئن لہجے میں بولی:

میرے بچو! تم پریشان نہ ہو، تمہارے باپ کو کسی بات کا زبردست صدمہ ہے۔ اس لیے وہ مغموم ہیں۔ چند

دنوں میں یہ کیفیت دور ہو جائے گی۔"

اب اس نے پادری اور مس ایتھو سے گفتگو کی، بچوں سے پیار کی باتیں کیں۔ ایسے میٹھے الفاظ استعمال کیے اور ایسی شفقت کا اظہار کیا کہ بچوں کے ننھے دل مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ سبھوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں گئی۔ بڑے بچے آپس میں باتیں کرتے رہے، چھوٹے بچوں کو اس نے کہانیاں سنائیں، اور جب ان کے سونے کا وقت آیا، تو ان کے بوسے لے کر انہیں سونے کے لیے جانے دیا۔ پھر خود اپنے سونے کے کمرے میں تنہا واپس گئی۔

وہ اپنے شوہر کی آمد کا انتظار کرنے لگی، چونکہ بچے اس وقت اس کے پاس موجود نہ تھے، اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنے فانی جسم کی اسی طرح حفاظت کرے گی، جس طرح دنیا میں اس نے اپنی نسوانیت کی حفاظت کی تھی۔ اس نے اپنے لباس کی جیب میں اس چھوٹے پستول کو بھر کر رکھ لیا، جسے اس نے چند دنوں قبل خریدا تھا

کئی گھنٹے گزرے۔ گھڑیاں گھنٹے بجاتی رہیں۔ مکانوں میں شور و غوغا بالکل کم ہو گیا۔ صرف گاڑیاں سڑک پر چل رہی تھیں ان کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز دیواروں سے گزر کر بہت دھیمی، اور دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

وہ بڑے اطمینان سے اس کا انتظار کرتی رہی۔ اب وہ اس سے نہیں ڈرتی تھی بلکہ فاتحانہ خوشی محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے شوہر کو ستانے کا ایسا طریقہ نکالا تھا۔ جسے وہ ہر گھڑی، زندگی بھر محسوس کرتا رہے گا۔

صبح کی روشنی پردوں کے جھالر والے کناروں سے چھن کر کمرے کے اندر آئی مگر وہ اب تک واپس نہ آیا۔ کونتس گھبرائی اور اسے یہ خیال ہوا کہ وہ نہیں آئے گا۔ دروازہ بند کر کے اس نے کنڈی لگا دی اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ وہ نہ سمجھ سکی کہ اس کا شوہر اب کیا کرے گا۔

جب خادمہ چائے لے کر آئی تو اس نے کونتس کو ایک خط دیا، جو کونت نے لکھا تھا۔ اس نے اپنی بی بی کو اطلاع دی تھی کہ میں ایک طویل سفر کے لیے جا رہا ہوں اور اپنے قانونی مشیر کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ تمہارے اخراج کے لیے روپیہ دیتا رہے۔

(۳)

اوپیرا میں "شیطان رابرٹ" نامی ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔ ابھی دوسرا ایکٹ شروع ہونے والا۔ مرد، ٹوپیاں اور نیچی واسکٹ پہنے کھڑے تھے۔ واسکٹ کے اوپر سفید قمیص نظر آتے تھے۔ جن کے بٹن سونے اور جواہر کے تھے مردوں کی نظریں عورتوں کے درجے کی طرف تھیں۔ عورتیں شام کے لباس پہنے ہوئے تھیں۔ جن میں موتی اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس منور کمرے کی فضا، موسیقی اور انسانی آواز سے معمور تھی۔ عورتوں کے حسین چہرے اور چمکتے ہوئے شانے نگاہوں کے مرکز توجہ تھے۔

دو دوست جن کی پیٹھ آرکسٹرا کی طرف تھی گفتگو میں مصروف تھے، اور ان نفاستوں، حقیقی یا مصنوعی،

دلکشی' اور شان و شوکت کی مذمت کر رہے تھے' جن کا مظاہرہ اس عظیم الشان تھیٹر میں ہو رہا تھا۔
ان میں سے ایک نے' جس کا نام ژروشے دی سالاں تھا۔ اپنے ساتھی برنارد گراندان سے کہا۔
کونتس ذسکارے کو دیکھو۔ وہ ابھی تک بہت حسین ہے"
دوسرا شخص اس لمبی عورت کو دیکھنے لگا جو سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ اب بھی بہت کم سن معلوم ہوتی تھی۔ اور تھیٹر کے ہر گوشے سے نگاہیں اس کے چہرے کی طرف متوجہ تھیں۔ چہرے کی زردی کے باعث وہ ایک مجسمے کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بالوں پر جو اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے۔ ایک نیلا' قوس قزح کی شکل کا تاج تھا' جس پر ہیرے کے بے شمار ٹکڑے جڑے ہوئے تھے' اور جو کہکشاں کی طرح چمک رہا تھا۔
کچھ دیر اس کی طرف دیکھنے کے بعد' برنارد گراندان نے تیقن کے لہجے میں جواب دیا۔
"بے شک! وہ دلفریب اور حسین ہے"
"اس کا سن اب کتنا ہو گا؟"
"ٹھہرو۔ میں تمہیں اس کا صحیح سن بتا سکتا ہوں' اسے بچپن سے ہی جانتا ہوں۔ میں نے اسے ایک کم سن لڑکی کی حیثیت سے سوسائٹی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا سن ۔۔۔۔۔۔۔ تیس ۔۔۔۔۔ تیس ۔۔۔۔۔ چھتیس سال کا ہے"
"بالکل غیر ممکن"
"مجھے یقین کامل ہے"
"وہ تو پچیس سال کی معلوم ہوتی ہے"۔
"اور اس کے سات بچے ہیں"
"یہ بات ماننے کے قابل نہیں"
"ساتوں بچے ابھی زندہ ہیں۔ اور وہ ایک شفیق ماں ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے گھر پر جاتا ہوں۔ اس کا مکان بہت پرسکون اور دلفریب ہے۔ اسے خانہ داری کے فرائض کا احساس ہے"
"تعجب کی بات ہے نا؟ اور کبھی اس کے بارے میں چہ میگوئیاں نہیں ہوتیں؟"
"کبھی نہیں"
"مگر اس کا شوہر؟ وہ تو عجیب و غریب آدمی ہے نا؟"
"اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے آپس میں کوئی جھگڑا ہوا ہو۔ خانگی رنجشوں کے متعلق انسان صرف قیاس کر سکتا ہے کیونکہ اصل واقعہ اس کے سننے میں نہیں آتا"

"ان دونوں میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"میں نہیں جانتا۔ کسی زمانے میں مسکارے بہترین شوہر تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ اس شہر کے زندہ دل لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جب تک وہ ایک اچھا شوہر تھا، بہت تند مزاج اور شکی تھا۔ جب سے وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا، بہت بے پروا ہوگیا ہے پھر بھی ہر شخص محسوس کرسکتا ہے کہ مسکارے کسی پریشانی، فکر یا الجھن کا شکار ہو رہا ہے۔ اگر اس کی بی بی بوڑھی نہیں ہوئی تو وہ قبل از وقت بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔"

تھوڑی دیر تک یہ دونوں دوست ان خانگی جھگڑوں کے متعلق فلسفیانہ بحث کرتے رہے، جو تفاوتِ فطرت یا طبیعی اختلاف کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں۔

روژے دی سالاں نے — جو ابھی تک مادام مسکارے پر نظریں جمائے تھا — کہا:

"یہ باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کے سات بچے ہیں۔"

"ہاں۔ گیارہ برس کے عرصے میں اس کے سات بچے پیدا ہوئے۔ جس کے بعد تیس برس کے سن میں اس نے اس سلسلے ہی کا خاتمہ کر دیا۔ تاکہ اس کے حسن کی نمائش کا دور شروع ہو۔ یہ دور ابھی ختم ہونے والا نہیں معلوم ہوتا۔"

"غریب عورتیں!"

"تمہیں ان پر رحم کیوں آتا ہے؟"

"کیوں؟........ میرے دوست! ذرا غور تو کرو۔ ایک عورت کا گیارہ برس تک بار بار حاملہ ہونا بجائے خود عذاب ہے! اس کا شباب، اس کا حسن، کامیابی کی امید، شاندار زندگی کا شاعرانہ تخیل، یہ سب اس ظالمانہ قانون کے شکار ہوگئے جس نے عورت کو محض انڈا دینے والی مشین بنا دیا ہے۔"

"اس کا چارہ ہی کیا ہے؟ یہ فطرت کا تقاضا ہے۔"

"یہ صحیح ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ فطرت ہماری دشمن ہے۔ ہمیں زندگی بھر فطرت کے خلاف جنگ کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ ہمیں پھر جانور بنا دے۔ دنیا میں نفاست، حسن، اخلاق، اعلیٰ تخیل، جو کچھ بھی ہے اس کی تخلیق خدا نے نہیں کی۔ بلکہ انسان نے، انسان کے دماغ نے۔ جس نے دنیا کو حسن، لطافت، اور دلکشی عطا کی ہے، ان گیتوں کی بدولت جنہیں ہم اس کے متعلق گاتے ہیں، شعرا کے کلام کی تشریح، فن کاروں کی تخییل اور ان عاقلانہ اولیوں کے ذریعے جو غلط ہوا کرتی ہیں، مگر بظاہر قدرت کی معقول توجیہ کرتی ہیں۔ خدا نے صرف بھدی مخلوقات کو پیدا کیا ہے، جن میں بیماری کے جراثیم ہیں اور چند سالوں کے حیوانی ارتقا کے بعد ضعیف اور زیادہ بدصورت ہو جاتی ہیں۔ غالباً خدا نے انہیں قابلِ نفرت طریقے سے اپنی نسل کو پھیلانے اور شام کے قلیل الحیات کیڑوں کی طرح مر جانے کے لیے پیدا کیا ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا: "قابلِ نفرت طریقے سے اپنی نسل کو پھیلانے کے لیے" پھر اس جملے کو دہراتا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تخلیق

انسانی کے گھناؤنے طریقے سے بھی زیادہ شرمناک اور قابلِ نفرت کوئی دوسری چیز ہے، جس سے لطیف احساسات دور بھاگتے ہیں۔ اور ہمیشہ بھاگتے ہی رہیں گے کل اعضا جو اس کفایت شعار اور کینہ ور خلاق نے بنائے ہیں ان کے دو دو کام ہیں۔ اس نے ایسے اعضا کیوں نہیں بنائے جو آلائشوں سے پاک ہوتے۔ تاکہ ان اعضا سے اس پاک مقصد کی تکمیل ہوتی جو انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ منہ، جو مادی غذا کے ذریعے جسم کی نشوونما کرتا ہے، گفتگو اور خیالات کی بھی اشاعت کرتا ہے۔ ہمارے جسم کی بقا کا باعث ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ذہانت کو بھی ہویدا کرتا ہے۔ قوت شامہ جو پھیپھڑوں میں زندگی بخش ہوا پہنچاتی ہے، دماغ کو پھولوں، جنگلوں، درختوں اور سمندروں کی خوشبوؤں سے بھی معطر کر دیتی ہے۔ کان ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع دیتا ہے، اسی کان کی بدولت ہم نے موسیقی ایجاد کی، اور آوازوں سے، جسمانی انبساط اور ابدی مسرت کی تخلیق کرنا بھی سیکھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کینہ پرور خالق کا مقصد یہ ہے کہ مرد کے لیے ممکن ہی نہ ہو کہ عورت سے اپنے تعلقات کو لطیف بنا سکے۔ پھر بھی، مرد نے عشق کی بنا ڈالی، جو اس حاسد خلاق کا چنداں برا جواب نہیں لیکن اس نے عشق کے ساتھ ایسی شاعرانہ خود بینی وابستہ کر دی ہے، کہ عورت اکثر بھول جاتی ہے کہ اسے مجبوراً کیسے کیسے تعلقات قائم کرنے پڑتے ہیں لیکن ایسے لوگ جو اپنا کوئی نصب العین مقرر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اخلاقی جرائم اور مہذب عیاشی ایجاد کرتے ہیں، جو خدا کو دھوکا دینے اور حسن کی بے باکانہ پرستش کرنے کا دوسرا طریقہ ہے۔

انسان کے بچے تو اسی طرح پیدا ہوتے ہیں، جس طرح جانوروں کے، فرق یہ ہے کہ انسان کے فعل کو قانون جائز قرار دیتا ہے۔

"اس عورت کو دیکھو! کس قدر روح فرسا خیال ہے کہ یہ گوہر بے بہا، حسین عورت جو صرف اس لیے پیدا کی گئی تھی کہ اس کے حسن کی پرستش کی جائے، اپنی زندگی کے گیارہ سال کو نت دی مسکارے کے جانشینوں کو پیدا کرنے میں گزار چکی ہے!"

برنارڈ وگراندال نے ہنستے ہوئے کہا:

"تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر بہت کم لوگ تمہارا مطلب سمجھ سکیں گے۔"

سالانس جوش میں آگیا۔

"تم جانتے ہو کہ خدا کی حقیقت کے متعلق میرا کیا تصور ہے؟" اس نے کہا "ایک عظیم الشان تخلیقی آلہ جسے ہم نہیں جانتے جو فضا میں کروروں دنیائیں اس طرح پیدا کر دیتا ہے، جیسے مچھلی سمندر میں انڈے دیتی ہے۔ تخلیق اس کا "خدائی فرض" ہے۔ لیکن وہ جو کچھ کرتا ہے، اس سے بے خبر رہتا ہے۔ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے پھیلائے ہوئے جراثیم میں مختلف طریقوں سے ارتباط ہوتا ہے۔ انسانی نسل ایک اتفاقی حادثہ ہے جو بالکل خلاف توقع ہے۔ ممکن ہے کہ یہ زمین

کے ساتھ فنا ہو جائے اور پھر اسی شکل میں یا کسی دوسرے عنوان سے یا کسی دوسری دنیا میں معرض وجود میں آئے۔ اسی ذہنی حادثے کے باعث ہم اس دنیا میں جو ہمارے لیے نہیں بنائی گئی ہے' اس قدر بے چین رہتے ہیں نئی ذی شعور ہستیوں کا خیر مقدم کرنے' ان کو رہنے کی جگہ دینے' اور ان کی نشو و نما میں مدد دینے کے لیے ہم تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگ' جو حقیقۃً شائستہ ہیں' قدرت کے ارادوں کے خلاف مسلسل جنگ کرتے رہتے ہیں۔"

گراندان غور سے اس کی تقریر سن رہا تھا۔ وہ اس کی تخیل کی حیرت انگیز پرواز سے واقف تھا۔ اس نے اپنے دوست سے پوچھا:

"گویا تمہارا خیال ہے کہ خدا نے محض اتفاقاً انسانی تخیل کی تخلیق کی؟"

"بے شک! انسانی تخیل ہمارے دماغوں کے اعصابی مرکزوں کا اتفاقی عمل ہے' نامعلوم کیمیائی تغیرات سے مشابہ' یا مثل بجلی کے' جو رگڑ یا غیر متوقع اتفاقات سے پیدا ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ انسانی تخیل ان تمام مظاہر سے مشابہ ہے جو جاندار مادے کی پراسرار خمیر سے پیدا ہوتے ہیں۔

"میرے دوست! انسانی تخیل کو ایک حساس خالق نے پیدا کیا ہے اگر اس کی تخلیق کا مقصد وہی ہے جو ہم عام طور پر سمجھتے ہیں' اگر یہ جانوروں کے تخیل' اور جذبۂ صبر و رضا سے بالکل جداگانہ' جائز تجسس اور پریشانی ہے' تو یہ دنیا' جو ہمارے لیے بنائی گئی تھی' ایسی نہ ہوتی' لومڑی کی تنگ قیام گاہ' سلاد کے کھیت' اور پتھریلے خانہ باغ کی طرح نہ ہوتی' یہ کیسی دنیا ہے جہاں تمہاری تنگ نظر قدرت نے ہمیں رہنے کی جگہ دی ہے کہ ہم غاروں میں یا درختوں کے نیچے رہیں' اور مقتول جانوروں کے گوشت' یا کچی ترکاریوں کو جو دھوپ اور پانی سے نشو و نما پاتی ہیں' اپنی غذا بنائیں؟

"اگر ہم تھوڑی دیر غور کریں' تو ہم یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ دنیا ہم لوگوں کے لیے نہیں بنائی گئی۔ ہمارا تخیل جس کی پیدائش' اور پرورش' دماغی اعصاب کے کسی اعجازی صفت سے ہوتی ہے' بالکل بے بس' کم نگاہ' اور الجھا ہوا ہے' اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ اسی کی بدولت ہم دنیا میں جلا وطنوں کی حیثیت سے رہتے ہیں۔

"اس دنیا پر غور کرو' جو خدا نے اپنی مخلوقات کے رہنے کے لیے بنائی ہے۔ کیا یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ خاص کر جانوروں کے لیے بنائی گئی ہے؟ انہیں کے لیے یہاں درخت لگائے گئے اور جنگل آباد کیے گئے ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ مگر جانوروں کے لیے سب کچھ ہے' درخت' سبزہ زار' دریا' سیر و تفریح کے مقامات اور کھانے پینے کی چیزیں! اس لیے مجھ جیسے حریص لوگ یہاں ہرگز خوش نہیں رہ سکتے۔ صرف ایسے لوگ خوش و خرم رہ سکتے ہیں جو حیوانوں سے مشابہ ہوتے اور انہیں کی طرح قانع اور مطمئن رہتے ہیں۔ مگر اوروں کا کیا حشر ہوتا ہے؟ شعرا' بے صبر' عالم خواب میں رہنے والے' متفکر اور بے قرار لوگ' ......... بدنصیب ہستیاں!"

"ہم چقندر' کرم کلے' پیاز' گاجر اور مولیاں کھاتے ہیں' کیوں کہ ہم مجبور کر دیے گئے ہیں کہ ان چیزوں کے عادی نہیں' اور ہمیں ان سے رغبت ہو جائے۔ اس لیے کوئی دوسری چیز پیدا ہوتی ہی نہیں۔ لیکن یہ چیزیں تو صرف نیولوں اور بکریوں کی غذا کے لائق ہیں۔ جس طرح گھاس اور لونگ کے پودے' گھوڑوں اور گایوں کی غذا ہیں جب میں کھیت میں اناج کے خوشے دیکھتا ہوں' تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اناج کے خوشے بٹیروں اور دوسری چڑیوں کی چونچوں کے لیے زمین سے پھوٹ کر نکلتے ہیں' میرے منھ کے لیے نہیں۔ اسی طرح جب میں روٹی چباتا ہوں تو چڑیوں کی حق تلفی کرتا ہوں۔ جب مرغے کا گوشت کھاتا ہوں' تو نیولوں اور لومڑیوں کی ملک پر غاصبانہ قبضہ کرتا ہوں۔ کیا کبوتر اور اس جنس کی دوسری چڑیاں باز کی قدرتی خوراک نہیں؟ گائے اور بھیڑیے کے گوشت بڑے بڑے گوشت خوار درندوں کی غذا نہیں؟ لیکن ہمارے نصیب ایسے کہاں کہ ہم ساگ کے ساتھ گوشت پکا کر کھائیں!

"جانوروں کو دن کاٹنے کے سوا اور کیا کرنا ہے؟ ان کے رہنے کی جگہ بقدر اور ان کی غذا کا سامان مہیا ہے۔ ان کا کام صرف گھاس کھانا' شکار کرنا اور کسی غیر ارادی احساس سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے کو کھا جانا ہے۔ خدا نے دنیا میں امن وامان قائم کرنے کا خیال نہیں کیا' بلکہ اس کے مدنظر صرف اپنی مخلوق کی موت تھی' اس کے تصور میں ایسی مخلوق تھی' جس کے افراد ایک دوسرے کو برباد کرنے اور نوچ کھانے پر تلے ہوئے ہوں۔

"جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے' ہمیں محنت' کوشش' صبر' ایجاد' تخیل' ذاتی جوہر اور خداداد صفات سے کام لینا پڑتا ہے' تاکہ ہم اس پتھریلی زمین کو رہنے کے قابل بنا سکیں۔ ذرا غور تو کرو کہ ہم اس دنیا کو بھی طریقے سے زندگی بسر کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے؟۔ قدرت کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ہم اس تکلیف دہ ماحول میں زندہ رہ سکیں' جو ہماری شان کے لائق ہی نہیں۔

"ہم جس قدر مہذب' ذہین اور شائستہ ہوتے جاتے ہیں' اسی قدر ہمیں اس حیوانی جذبے پر قابو پانا پڑتا ہے جو ہماری فطرت کا جزو ہے۔"

"غور کرو کہ ہم نے کس طرح تمدن کی بنا ڈالی' جس کی بدولت ہمارے پاس موزے سے لے کر ٹیلیفون تک ہر قسم کی چیزیں موجود ہیں۔ یہ چیزیں جنھیں تم ہر روز دیکھا کرتے ہو' ہمارے لیے یہ ہر صورت کارآمد ہیں۔"

"اپنی قسمت سے جنگ کرنے کے لیے ہم نے ہر قسم کا سامان مہیا کر لیا ہے۔ مکانات' لطیف مٹھائیاں' کیک' شربت' شراب' کپڑے' زیور' بستر' چٹائیاں' گاڑیاں' اور مشینیں۔ ان کے علاوہ ہمارے قبضے میں سائنس' آرٹ' انشاپردازی اور شاعری کے ذخیرے ہیں۔ ہمیں نے آرٹ' شاعری' موسیقی اور مصوری کی تخلیق کی ہے۔ ہر وہ چیز جو تخیل کی پیداوار ہے' ہماری ہی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ دنیا کی ان گونا گوں لطافتوں کے باعث ہمیں

اپنی زندگی، جسے خدا نے محض افزائشِ نسل کے لیے مخصوص کیا تھا زیادہ حسین، زیادہ اہم، کم بے مزہ اور کم تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔"

"اس تھیٹر کو دیکھو۔ یہاں ایک ایسی دنیا ہے جس سے خود تقدیر بھی واقف نہیں۔ جس کی حقیقت صرف ہمیں سمجھ سکتے ہیں۔ ہم جیسے غیر قانع اور بے قرار حیوانوں کی بنائی ہوئی مضطرب اور حساس دنیا!"

"پھر ماد موازل مسکارے ہی کے وجود پر غور کرو۔ خدا نے اس کو تمام دوسرے جانوروں کے چرنے چگنے کر آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ کیا ایسی زندگی اس کے لیے موزوں نہ ہوتی؟ لیکن نہیں معلوم کہ اس کے ظالم شوہر نے یکا یک اسے چھوڑ کر آزاد عورتوں سے اختلاط کیوں بڑھا دیا، حالانکہ اس کے سات بچے بھی ہو چکے تھے؟"

گرانداں نے جواب دیا:

"میرے دوست! غالباً اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ اس نے محسوس کیا ہو گا کہ اپنی بی بی سے میل جول رکھنا مہنگا سودا ہے۔ خانگی اقتصادیات کی بنا پر اس نے بھی وہی نظریے قائم کیے ہوں گے جو تم نے اپنے فلسفے کی بدولت قائم کیے ہیں۔"

آخری ایکٹ کے لیے تین بار گھنٹی بجی، دونوں دوست ٹوپیاں اتار کر اسٹیج کی طرف چڑھے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

( ۴ )

تماشے کے بعد کونت اور کونتس مسکارے اپنی گاڑی میں بیٹھے گھر واپس جا رہے تھے۔ یکا یک شوہر نے بی بی کو مخاطب کیا:

"گیبرئیل!"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کیا تمہیں اس کا احساس نہیں کہ اس الجھن کی مدت بہت طویل ہو گئی؟"

"یعنی؟"

"وہ ناقابلِ برداشت الجھن، جس میں تم نے مجھے گزشتہ چھ سالوں سے مبتلا کر رکھا ہے؟"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"یہ بتا دو کہ وہ بچہ کون سا ہے؟"

"نہیں بتا سکتی!"

"تم نہیں جانتیں کہ جب میں اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں' یا مجھے ان کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے' تو اس شک سے میرے دل میں کیسی ٹیس اٹھتی ہے! خدارا' مجھے بتادو کہ وہ کون بچہ ہے؟ میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہارا قصور معاف کردوں گا۔ اور اس بچے کے ساتھ بھی' اپنے بچوں کی طرح سلوک کروں گا۔"

"مجھے یہ بتانے کا حق حاصل ہی نہیں۔"

"تم نہیں محسوس کرتیں کہ اب مجھے زندگی دوبھر معلوم ہوتی ہے؟ یہ سوال جو میں اپنے سے کرتا رہتا ہوں' یہ پریشان کن خیال جو مجھے ستانے لگتا ہے' جب میں اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں! میں پاگل ہوجاؤں گا!"

بی بی نے پوچھا:

"تم واقعی بہت پریشان ہو؟"

"بہت زیادہ پریشان ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا مجھے گراں معلوم ہوتا ہے۔ یہ احساس مجھے بار بار ستاتا ہے کہ ان بچوں میں ایک بچہ ایسا ہے جسے میں نہیں بچاتا' اور جس کی وجہ سے میں دوسرے بچوں سے بھی محبت نہیں کرسکتا۔"

بی بی نے دوبارہ پوچھا:

تم واقعی بہت پریشان ہو؟

اس نے مغموم اور دھیمی آواز میں جواب دیا:

"میں نے تم سے بارہا کہہ دیا کہ یہ الجھن بالکل ناقابل برداشت ہے' اگر مجھے اپنے بچوں سے محبت نہ ہوتی تو کیا میں اس گھر میں رہتا بھی؟ تمہارے اور ان بچوں کے نزدیک رہنا گوارا بھی کرتا؟ تم نے میرے ساتھ بڑا شرمناک سلوک کیا۔ میرے دل میں اگر کوئی جذبہ ہے تو صرف اپنے بچوں کی محبت کا۔ تم تو اس حقیقت سے بھی طرف واقف ہو۔ میرے دل میں ان کی ایسی ہی محبت ہے جیسی صرف پرانے زمانے کے لوگوں کو ہوسکتی تھی۔ تمہارے لیے میں ایسا شوہر ہوں' جس کا نصب العین قدیم طرز کی خانگی زندگی ہے۔ کیونکہ میں ذی حس آدمی ہوں' فطرت کی پیروی کرنے والا' اگلے زمانے کا انسان ——— ہاں' میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے مجھے بدگمان بنادیا' کیونکہ تم بالکل جداگانہ روش کی عورت ہو۔ میں وہ باتیں کبھی نہ بھولوں گا جو تم نے مجھ سے کہی تھیں۔ اسی دن سے مجھے تمہارے افعال کی پروا نہ رہی۔ میں نے صرف اس لیے تمہیں قتل نہ کیا' کہ پھر یہ معلوم کرنے کا آخری ذریعہ بھی باقی نہ رہتا کہ ہمارے ......... بلکہ ...... تمہارے بچوں میں کون بچہ میرا نہیں ہے۔ میں نے اس قدر صبر کیا اور اتنی الجھن برداشت کی' جس کا احساس تمہیں نہ ہوسکے گا۔ سب سے بڑے لڑکے کے سوا میں کسی بچے سے محبت کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ میں انہیں جی بھر کر دیکھ نہیں سکتا' انہیں پکار نہیں سکتا'

ان کو پیار نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو یہ سوچے بغیر گود میں نہیں لے سکتا: "کہیں یہ تو وہ بچہ نہیں؟" چھ برس سے میں تمہارے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آ رہا ہوں۔ سچ سچ بتا دو کہ حقیقت کیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ساتھ برا سلوک نہ کروں گا۔"

اگرچہ گاڑی میں اندھیرا تھا" مگر وہ یہ محسوس کر سکا کہ گیبریل اس کی گفتگو سے متاثر ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ شاید اب وہ بولے گی۔ اس نے پھر کہا:

"میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اصل واقعہ بیان کر دو۔"

گیبریل نے آہستہ سے کہا:

"شاید میرا جرم اس سے بھی زیادہ سنگین ہے جتنا تم اسے سمجھ رہے ہو۔ مگر میں بار بار حاملہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ تم سے الگ رہنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے خدائے برتر کی حضور میں جھوٹی قسم کھائی۔ اپنے بچوں کے سر کی قسم کھا کر جھوٹ بولی، کیونکہ میں نے کبھی تم سے بے وفائی نہیں کی۔"

اس نے بی بی کے بازو کو اسی طرح زور سے دبایا، جس طرح اس نے اس دن دبایا تھا، جب یہ دونوں سیر کے لیے ہوا کی طرف گئے تھے۔

پھر اس نے ہکلا کر کہا:

"سچ کہہ رہی ہو؟"

"حرف بہ حرف سچ کہہ رہی ہوں۔"

اس نے وحشت زدہ ہو کر کہا:

"اب تو میں نئے نئے شکوک کا شکار ہو جاؤں گا جن سے کبھی نجات نہ ملے گی۔ میں کس طرح سمجھوں کہ تم جھوٹ کب بولی تھیں، اس دن یا آج؟ تمہاری بات کا اب کیونکر یقین کروں؟ ایسے اقرار کے بعد میں کسی عورت پر کس طرح بھروسا کر سکتا ہوں؟ میں تو اب کچھ سوچ ہی نہ سکوں گا۔ میں بہت خوش ہوتا اگر تم مجھ سے کہتیں: "وہ بچہ ژاک ہے" یا "وہ بچہ ژاں ہے"۔"

اب گاڑی مکان کے صحن میں داخل ہوئی۔ جب گاڑی سیڑھیوں کے سامنے رکی تو کونٹ پہلے اترا اور حسب معمول اس نے سیڑھیوں پر چڑھنے کے لیے بی بی کو اپنے بازو کا سہارا دیا۔

"کیا میں تم سے تھوڑی دیر تک باتیں کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا:

بی بی نے جواب دیا:

"بہ شوق تمام۔"

وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں گئے۔ نوکر کمرے میں لیمپ جلانے آیا۔ انہیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔
جب انہیں تنہائی نصیب ہوئی تو کونت نے پھر گفتگو کا سلسلہ جاری کیا:
"آخر میں حقیقت سے کیونکر واقف ہو سکوں گا؟ میں نے ہزار بار تمہاری منت کی مگر تم خاموش رہیں اور کسی طرح بھی بولنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ آج تم کہا کہتی ہو کہ میں جھوٹ بولی تھی۔ چھ برس تک تم مجھے اس قسم کی عجیب بات کا یقین دلاتی رہیں! نہیں ـــ جھوٹ تو تم آج بول رہی ہو ـــ اس کی وجہ میں کیا بتاؤں؟ غالباً مجھ پر ترس کھا کر؟"
بی بی نے ایسے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا جس سے سچائی ٹپک رہی تھی۔
"لیکن اگر میں جھوٹ نہ بولتی تو گزشتہ چھ برس میں کم سے کم چار بچے پیدا ہو گئے ہوتے۔"
اس نے چلا کر کہا:
"ماں بھی کہیں ایسی باتیں کرتی ہے؟"
بی بی نے کہا:
"میں اپنے کو اپنے بچوں کی ماں کیوں کر تصور کروں جو اب تک پیدا ہی نہیں ہوئے؟ میرے لیے دس بچے کافی ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں۔ میں انہیں دل و جان سے پیار کرتی ہوں۔ اس مہذب زمانے کی عورتیں صرف دنیا کی آبادی بڑھانے کے لیے وقف نہیں۔"
وہ کھڑی ہو گئی مگر کونت نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے:
"صرف ایک بات بتا دو گیبرئیل۔ مجھ سے اصل واقعہ بیان کر دو گی؟"
"میں تو کہہ چکی ہوں کہ میں نے کبھی تم سے بے وفائی نہیں کی۔"
وہ بھی جھجک کے بی بی کا منہ دیکھتا رہا۔ وہ کس قدر حسین معلوم ہو رہی تھی! اس کی بھوری آنکھیں آسمان کی طرح خنک تھیں۔ اس کے سیاہ بالوں پر ایک مرصع زرنگار تاج کہکشاں کی طرح چمک رہا تھا۔ کونت نے دفعتہً محسوس کیا کہ یہ ہستی جو میرے سامنے ہے صرف ایک عورت ہی نہیں جس کا کام محض افزائشِ نسل ہے۔ وہ ان تمام عجیب و غریب خواہشوں کا پراسرار حاصل ہے جو صدیوں سے ہماری فطرت ہی میں داخل ہو گئی ہیں اور جو اپنی منزلِ مقصود سے ہٹ کر ایک دلفریب اور غیر مرئی چمنستانِ حسن کی طرف جا رہی ہیں۔ ہماری بعض خواہشیں ہمیں خوشگوار خواب دکھاتی ہیں۔ ان خواہشوں اور تمناؤں میں شعریت، خود بینی، جمالیاتی احساس، غرض وہ تمام لطافتیں جو قدرت نے عورت کو عطا کی ہیں، موجود ہیں۔ گوشت اور پوست کا یہ مجسمہ جسے ہم عورت کہتے ہیں، ہماری مادی خواہشوں اور لطیف جذبات کو یکساں برانگیختہ کرتا ہے۔
اس کا شوہر اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ اس انکشافِ حقیقت سے وہ ششدر و حیرت ہو گیا تھا۔ وہ اپنی عجیب و غریب

بدگمانی پر غور کر رہا تھا، مگر اس وقت کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔

آخر اس نے کہا:

"مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تم اس وقت سچ بول رہی ہو۔ مگر اس کے پیشتر مجھے یقین تھا کہ تم ہمیشہ جھوٹ بولتی تھیں۔"

کونتس نے شوہر کی طرف ہاتھ بڑھایا:

"خیر تو پھر ہماری دوستی قائم ہے؟"

اس نے بی بی کا ہاتھ چوما اور کہا:

"مجھے اب تم سے کچھ بھی رنجش نہیں۔ گیبریل! تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔"

وہ کمرے سے باہر نکلا مگر اس کی نظریں بی بی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گیبریل اب تک کس قدر حسین ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں اب ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ ایسا جذبہ جو اس کے پچھلے جذبۂ محبت سے زیادہ شدید ہے۔

# دہات کی جھونپڑی

مصنف:- چیخوف۔　　مترجمہ:- عبدالحفیظ قمر

ایک نوجوان اپنی کم سن بیوی کے ساتھ ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ شوہر کا بازو بیوی کی کمر میں حمائل اور بیوی کا سر شوہر کے کاندھے پر جھکا ہوا تھا۔ دونوں خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

چاند متحرک بادلوں میں سے جھانک رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کی خوشی پر جیسے جبیں اور اپنے تکلیف دہ اور لا حاصل تجرد پر متاسف تھا۔ ہوا ساکن اور نمناک اور شاہ دانے کی خوشبو سے گراں بار تھی۔ ریلوے لائن کے اس پار کہیں دور پر ایک [illegible] چمک رہی تھی۔

بیوی نے آہستہ سے کہا "ساشا! کیسا سہانا منظر ہے۔ یہ تو خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا دیکھنا یہ جھاڑی کس قدر خوشنما اور دل فریب ہے۔ اور دیوار کے ٹھوس اور خاموش کھمبے کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بدولت سارے منظر میں خاص مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اور گمان ہوتا ہے کہ انسانیت اور تمدن یہاں سے قریب ہی ہیں۔ جب دور سے ہوا پر گاڑی کی کھلکھلاہٹ کی آواز آتی ہے تو کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔"

"بے شک ورا! مگر تمہارے ہاتھ گرم کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ورا! آج شب کے کھانے کے لیے کیا کیا ہے؟"

"مرغ کا گوشت اور سلاد ہے۔ مرغ اتنا بڑا ہے کہ دو آدمیوں کے لیے کافی ہے اور پھر مچھلی اور سارڈین بھی ہیں جو شہر سے آئی ہیں۔"

چاند نے بادلوں کی آڑ میں منہ چھپا لیا　　- انسانی مسرت کے مشاہدے سے اسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا اور اس تجرد زندگی کی یاد تازہ ہو گئی جو وہ پہاڑیوں اور وادیوں سے پرے فضا میں بسر کر رہا تھا۔

"ٹرین [illegible] ہے" ورا نے کہا۔

ٹرین کی تین آنکھیں کچھ فاصلے پر نظر آئیں۔ اسٹیشن ماسٹر پلیٹ فارم پر آیا۔ سگنل کی روشنی لائن پر ادھر ادھر چمکنے لگی۔ ساشا نے جمائی لیتے ہوئے کہا "ٹرین یہاں پہنچ جائے تو ہم گھر واپس چلیں۔ ورا۔ ہم دونوں کس مزے سے وقت گزارتے ہیں۔ زندگی میں اتنا لطف! ............ یقین کرنا مشکل ہے۔"

وہ سیاہ ناگ بل کھاتی ہوئی پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہو گئی۔ انہیں ڈبوں کی دھندلی روشنی میں کھڑکیوں سے مسافروں کے [illegible] ٹوپیوں اور خواب آلود چہروں کی جھلک دکھائی دی

ایک ڈبے کے اندر سے یہ آواز آئی "دیکھو! دیکھو! وریا اور ساشا ہمیں لینے کے لیے آئے ہیں وریا ............ وریا ............ ادھر دیکھو!"

دو چھوٹی لڑکیاں اچھلتی کودتی ٹرین سے باہر نکلیں۔ اور وریا کے گلے سے لپٹ گئیں۔ ان کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اور ایک لمبا۔ دبلا پتلا مرد باہر نکلے۔ مرد کے بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ان کے پیچھے دو اسکول کے لڑکے تھیلے لیے ہوئے آئے لڑکوں کے بعد استانی اور استانی کے بعد لڑکیوں کی دادی۔

"ہم آگئے۔ ہم آگئے۔ پیارے بچے" مونچھ والے مرد نے ساشا کا ہاتھ زور سے دبا کر کہنا شروع کیا "تم تو ہم لوگوں کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہوگے؟ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تم اپنے بوڑھے چچا کو برا بھلا کہہ رہے ہوگے کہ اب تک آئے نہیں۔ کولیا۔ کوستیا۔ نانا۔ فیفا ............ بچو۔ اپنے بھائی ساشا کو سلام کرو۔ ہم لوگوں کی پوری جماعت یہاں پہنچ گئی۔ امید ہے تین یا چار دن کے لیے ............ غالباً ہماری تعداد زیادہ نہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں زحمت ہو"

ساشا اور وریا اپنے چچا اور اس کے خاندان کو دیکھ کر دم بخود ہوگئے۔ چچا نے ان دونوں کو پیار کیا اور ان سے باتیں کرنے لگا مگر ساشا محو خیال ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جھونپڑی میں اتنے لوگ کس طرح رہیں گے۔ اسے اور وریا کو اپنے کمرے خالی کر دینے پڑیں گے۔ تکیے اور بستر بھی مہمانوں کو دینا پڑے گا۔ تمام مسالے، پنیر اور مربے آن کی آن میں ختم ہو جائیں گے۔ چچا کی لڑکیاں باغیچے کے تمام پھول توڑ دیں گی۔ روشنائی گرا دیں گی اور جھونپڑی میں ہنگامہ برپا کر دیں گی۔ چچی بار بار اپنی بیماری کا حال سناتی رہیں گی اور فخریہ بیان کریں گی "کہ بیرن فون فنک میرا باپ تھا ............

ساشا نے نفرت کی نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا اور اس کے کان میں کہا:

"یہ سب تم سے ملنے آئے ہیں! ............ لعنت ہو ان پر!"

"نہیں، یہ سب تم سے ملنے آئے ہیں" وریا نے غصے سے لال پیلی ہو کر کہا۔ "یہ سب تمہارے رشتہ دار ہیں۔ مجھ سے کیا واسطہ؟"

پھر وہ اپنے مہمانوں سے مسکرا کر بولی "خوش آمدید"

چاند پھر نکل آیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ گویا وہ خوش تھا کہ اس کے کوئی رشتہ دار نہیں۔ اپنے غضب آلود اور رنجیدہ چہرے کو چھپانے کے لیے ساشا نے مہمانوں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے اپنی آواز میں گرمجوشی پیدا کرنے کی کوشش کی اور کہا:

"خوش آمدید۔ آپ نے میری جھونپڑی کو سرفراز کیا"

---

۱؎ ایک قسم کی چڑیا۔

# تمثیل

## بدگمانی

مصنف:۔ مولیئر مترجمہ:۔ آرزو جلیلی

### افراد تمثیل

بے باربوئیے: آنژیلیک کا شوہر
ڈاکٹر:
آنژیلیک:
کلیر: آنژیلیک کا عاشق
کاتو: آنژیلیک کی خادمہ
گورژیبو: آنژیلیک کا باپ
ویلبیرکین:
لاوالے:

### پہلا منظر — باربوئیے

باربوئیے ہر شخص کو یہ ماننا پڑے گا کہ میں نہایت بدنصیب انسان ہوں! میری بی بی مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے مجھے آرام پہنچانے اور میری خواہش کے مطابق کام کرنے کے بجائے وہ مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں دن بھر میں تین مرتبہ اسے ڈانٹوں۔ گھر رہنے کے بجائے وہ دعوتیں کھاتی پھرتی اور خدا معلوم کس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔ اُف! غریب باربوئیے! تو کس درجہ مظلوم ہے! لیکن اسے سزا دینی چاہیے فرض کرو کہ تم نے اسے قتل کر دیا؟ ........ اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس کے بعد تم پھانسی چڑھا دیے جاؤ گے۔ اگر تم اس کو جیل بھجوا دو؟ ........ وہ جیل سے نکل آنے کی تدبیر کرے گی۔ لیکن آخر تم کرو گے کیا؟ ہاں! ڈاکٹر ادھر آ رہا ہے۔ میں کیوں نہ اپنی پریشانیوں کے متعلق اس سے مشورہ کر لوں؟

### دوسرا منظر — ڈاکٹر اور باربوئیے

باربوئیے میں تمہیں بلانے جا رہا تھا۔ مجھے ایک ضروری بات کے بارے میں تم سے رائے لینی ہے۔

ڈاکٹر میرے دوست! تم نہایت بے تمیز اور غیر مہذب معلوم ہوتے ہو۔ تمہیں ٹوپی اتار کر سلام کرنا چاہیے تھا، اور عجز و انکسار کے ساتھ یہ کہنا چاہیے تھا کہ زبدۃ الحکما سحبانِ زماں جناب ڈاکٹر صاحب! غلام آداب عرض کرتا ہے! تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟

باربوئیے ڈاکٹر! میں تم سے نادم ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ میں آپے سے باہر تھا، اور میں نے سوچا ہی نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم بابت[1]

---

[1] مولیئر نے یہاں لفظ galant استعمال کیا ہے جو elegant کا مشتق ہے۔ کسی طرح بھی اس عبارت کا ترجمہ ممکن نہ تھا اس لیے میں نے galant کے عوض "بابت" استعمال کیا اور "بابت" کے بجائے وقت لے لیا ہے بابت بن جانے بابت galant کا ترجمہ نہیں۔ — مترجم

آدمی ہو۔

ڈاکٹر: تم جانتے ہو کہ "ہابت آدمی" آیا کہاں سے؟

باربوئیے: مجھے اس سے کیا بحث کہ وہ ویلز لیف[۱] سے آیا یا آؤبرویلیئرس سے۔

ڈاکٹر: نہیں جانتے تو مجھ سے سنو! ہابت آدمی ماستابہ سے آیا ہے۔ ماستاب کے آخری رکن سے بے اور الف لینے سے "با" ہوا۔ بے، میم اور تے ملا کر لفظ "ہابت" بنا۔ دونوں کو ملا دینے سے "ہابت" ہوا اور پھر "آدمی" جوڑ دینے سے "ہابت آدمی" ہو گیا۔ لیکن میں تم سے کہہ رہا تھا کہ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟

باربوئیے: میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک ڈاکٹر ہو۔ لیکن ذرا یہ تو سنو کہ میں تم سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ ..........

ڈاکٹر: پہلے تم یہ سنو کہ میں صرف ایک ڈاکٹر نہیں ہوں، بلکہ میں ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، اور دس ڈاکٹر ہوں۔ اول تو یہ کہ ایک کل اعداد میں پہلا عدد اور سبھوں کی جڑ ہے۔ اس لیے میں ڈاکٹروں میں اول ڈاکٹر ہوں، سب ڈاکٹروں سے زیادہ قابل۔ دوسرے کامل علم حاصل کرنے کے لیے دو صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ احساس اور سمجھ۔ میں مجسم احساس اور مجسم سمجھ ہوں۔ گویا میں دو ڈاکٹر ہوں۔

باربوئیے: میں مانتا ہوں۔ جو میں کہنا چاہتا تھا ..........

ڈاکٹر: تیسرے ارسطو کا قول ہے کہ "تین" کامل عدد ہے۔ میں خود کامل ہوں اور جو کام کرتا ہوں وہ بھی کامل ہوتا ہے۔

باربوئیے: بہت اچھا ڈاکٹر ..........

ڈاکٹر: چوتھے فلسفے کے چار حصے ہیں: منطق، اخلاقیات، طبیعات اور مابعد الطبیعات۔ میں چاروں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ گویا میں چار ڈاکٹر ہوں۔

باربوئیے: بس کرو۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے۔ اب میری سنو۔

ڈاکٹر: پانچویں کلیات خمسہ ہیں جنھیں جانے بغیر صحیح نتائج اخذ کرنا غیر ممکن ہے۔ جنس، نوع، فصل، خاصہ اور عرض۔ میں ان پانچوں سے کام لیتا اور ان کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہوں۔ گویا میں پانچ ڈاکٹر ہوں۔

باربوئیے: مجھے صبر کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر: چھٹے۔ چھٹا عدد "کام" کا عدد ہے۔ میں اپنی ناموری کے لیے مسلسل کام کرتا رہتا ہوں۔ گویا میں چھ ڈاکٹر ہوں۔

باربوئیے: اچھا، اچھا، جب تک جی چاہے بولے جاؤ۔

ڈاکٹر: ساتویں۔ ساتواں عدد خوشی کا عدد ہے۔ مجھے ان باتوں کا کامل علم ہے جن سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اپنے کمالوں کی بدولت میں بڑا خوش رہا کرتا ہوں۔ اس لیے مجھے اپنے بارے میں مجبوراً کہنا پڑتا ہے "میں سات ڈاکٹر ہوں"۔ آٹھویں۔ آٹھواں عدد انصاف کا عدد ہے۔ کیونکہ اس میں برابری پائی جاتی ہے۔ عقل اور انصاف کی بدولت جن سے میں اپنے کل کاموں [illegible]

[۱] ویلز لیف: شہروں کے نام۔

میں اٹھارہ ڈاکٹر ہوں۔ نو نیچے: تخیل کی نو دیویاں ہیں اور میں ان سبھوں کی آنکھ کا تارا ہوں۔ دسویں بغیر کل اعداد کو دہرائے کوئی شخص دسویں عدد تک نہیں پہنچ سکتا اور یہ عدد کل اعداد پر حاوی ہے۔ اسی طرح جب میں تمہیں ملا تو گویا تم نے ڈاکٹر در ڈاکٹر کو پالیا اور میری ذات دنیا کے کل ڈاکٹروں کا مجموعہ ہے۔ یعنی ان معقول، صحیح، واضح اور روشن دلیل سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میں ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس ڈاکٹر ہوں۔

بار بوئے: یہ کیا بک رہا ہے؟ میں نے سمجھا تھا کہ یہ ہوشیار آدمی ہے۔ اور مجھے معقول مشورہ دے گا۔ لیکن یہ تو ایک خاکروب معلوم ہوتا ہے جو مجھ سے بات کرنے کے بدلے پہیلیاں بجھا رہا ہے۔ ایک، دو، تین، چار —— !!!! —— !!!! چلو، چلو تمہیں میری بات سننا پڑے گی اور یاد رکھو کہ میں تمہارا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم نے میری تشفی کر دی تو میں تمہیں خوش کر دوں گا، اگر تم چاہو گے تو روپے بھی دوں گا۔

ڈاکٹر: او ہو [illegible] روپے؟

بار بوئے: ہاں روپے، اور اس کے علاوہ بھی تم جو کچھ مانگو۔

ڈاکٹر: (تیزی سے ۔۔۔ دامنے کو دن کو پیچھے کی طرف کھینچ کر) تم سمجھتے ہو کہ میں روپے کے لیے سب کچھ کر دوں گا؟ تم مجھے روپے کا لالچی سمجھتے ہو؟ سنو میرے دوست! اگر تم مجھے سونے کی ایک تھیلی دو، اور یہ تھیلی ایک بیش قیمت بکس میں ہو، یہ بکس ایک قیمتی صندوقچے میں ہو اور یہ صندوقچہ ایک صندوق میں، یہ صندوق ایک عجائب خانے میں، یہ عجائب خانہ ایک عالی شان عمارت میں، یہ عمارت ایک شاندار محل میں، یہ محل ایک حیرت انگیز قلعے میں، یہ قلعہ ایک مشہور شہر میں، یہ شہر ایک زرخیز جزیرے میں، یہ جزیرہ ایک بھرے بھرے صوبے میں، یہ صوبہ ایک ترقی یافتہ مملکت میں، اور یہ مملکت ساری دنیا میں ہو اور اگر تم مجھے یہ دنیا دے دو جس میں یہ ترقی یافتہ مملکت ہو، جس مملکت میں یہ بھرا صوبہ ہو، جس صوبے میں یہ زرخیز جزیرہ ہو، جس جزیرے میں یہ مشہور شہر ہو، جس شہر میں یہ حیرت انگیز قلعہ ہو، جس قلعے میں یہ شاندار محل ہو، جس محل میں یہ عالی شان عمارت ہو، جس عمارت میں یہ عجائب خانہ ہو، جس عجائب خانے میں یہ عجیب و غریب صندوق ہو، جس صندوق میں یہ قیمتی صندوقچہ ہو، جس صندوقچے میں بکس ہو اور جس بکس میں سونے کی تھیلی ہو، میں اتنی [illegible] بھی پروا نہ کروں گا (انگلیاں چٹکاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

بار بوئے: مجھ سے بھول ہوئی۔ اسے ڈاکٹر کے لباس میں دیکھ کر میں نے اسے روپے کا لالچ دیا اور کم ظرف سمجھا۔ لیکن چونکہ اسے روپے کی ضرورت نہیں اس کو خوش کرنا بہت آسان ہے۔ میں اس کے پیچھے دوڑوں گا۔

(دوڑتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

تیسرا منظر۔ آنژلیک۔ والیر۔ کاتو

**آنژلیک** — میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آئیں تو بڑا احسان ہو۔ میرا شوہر ایسا بدصورت، بے تمیز اور شرابی ہے کہ اس کے ساتھ رہنا میرے لیے بہت کٹھن ہے۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ ایسے احمق کے ساتھ رہنے سے کسی کو کیا خوشی نصیب ہو سکتی ہے؟

**والیر** آپ نے میری بڑی عزت کی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا دل بہلانے کی کوشش کروں گا۔ چونکہ آپ ازراہ مہربانی یہ کہتی ہیں کہ میری صحبت آپ کو ناگوار نہیں، میں آپ کی دلجوئی کر کے ثابت کر دوں گا کہ مجھے آپ کا خیال معلوم کر کے کتنی خوشی ہوئی ہے۔

**کاتو** جلدی سے کچھ اور بات شروع کرو وہ پاجی دولہا آ رہا ہے۔

چوتھا منظر۔ بار بوئے۔ والیر۔ آنژلیک اور کاتو

**والیر** بیگم صاحبہ! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو بری خبر سنانے آیا ہوں۔ لیکن آخر آپ کسی نہ کسی سے تو ضرور سنتیں، اور چونکہ آپ کے بھائی بیمار ہیں.....

**آنژلیک** اس سے زیادہ کچھ نہ کہیے جناب! میں آپ کی خادمہ ہوں، اور آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میرے لیے اس قدر زحمت گوارا کی۔

(والیر چلا جاتا ہے)

**بار بوئے** ہوں، ہوں! اب اس کی کیا ضرورت ہے کہ میں اپنی بی بی کی بے وفائی کی سند عدالت سے حاصل کروں؟ اچھا! اچھا! فاحشہ عورت! میری ہدایت کے باوجود تو غیر مرد سے التفات کرتی ہے، اور میری آنکھوں میں خاک جھونکنا چاہتی ہے۔

**آنژلیک** آخر اس بات کے لیے مجھے ملامت کرنے لگے؟ یہ شریف انسان تو مجھے اپنے بھائی کی بیماری کی خبر دینے آیا تھا۔ اگر تمہیں مجھ سے جھگڑنے کا بہانہ مل گیا؟

**کاتو** میں نے تو اسے دیکھتے ہی سوچا تھا کہ اب ہمیں چین نصیب نہ ہوگا۔

**بار بوئے** تم دونوں عورتیں ایک دوسرے کو تباہ کرتی ہو۔ کاتو۔ تم میری بی بی کو بہکاتی ہو جب سے تم اس کی خادمہ بنیں، اس میں پہلے کی سی آدمی خوبیاں بھی باقی نہ رہیں۔

**کاتو** خوب! آپ مجھ سے اچھا سلوک کرتے ہیں!

**آنژلیک** اس شرابی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔ تم دیکھتی نہیں کہ وہ نشے میں اتنا چور ہے کہ اس کے ہوش بجا نہیں۔

پانچواں منظر:۔

گورژیبو۔ ولیبر کین۔ آنژلیک۔ کاتو سے بار بوئے

**گورژیبو** دیکھو، میرا کم بخت داماد پھر میری بیٹی کو گالیاں دے رہا ہے۔

**ولیبرکین** اس دریافت کرنا چاہیے کہ معاملہ کیا ہے۔

**گورژیبو** تم ہمیشہ لڑتے ہی رہو گے! اگر بچے کبھی چین کی

نذر ہو گئے ؟

**بار بوئے** یہ بدبخت مجھے شرافی کہتی ہے! آنز لمیک! جی چاہتا ہے کہ تمہارے لوگوں کے سامنے تمہیں سخت سزا دوں۔

**گورژ یبو** شیطان کی مار ہو۔۔۔۔۔۔۔۔اگر یہ صحیح ہے جو' وہ کہتا ہے۔

**آنز لمیک** ابتدا تو ہمیشہ وہی کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

**کاتو** اس گھڑی کا برا ہو جب تم نے اس منحوس کو اپنا شوہر بنایا تھا۔

### چھٹا منظر:۔

(گورژ یبو۔ ویلیبرکین۔ آنز لمیک۔ کاتو۔ بار بوئے۔ ڈاکٹر)

**ڈاکٹر۔** اس کا مطلب کیا ہے! کیسی گڑبڑ! کیسا جھگڑا! کیسا ہنگامہ! کیسا شور و غوغا! لڑائی' دنگا فساد! تمہیں ہوا کیا ہے لوگو؟ آخر ہوا کیا ہے؟ کیا آپس میں صلح کرا لینے کا کوئی ذریعہ نہیں؟ اچھا میں اس جھگڑے کو طے کروں گا۔

**گورژ یبو** میرے داماد اور میری بیٹی میں کچھ جھگڑا ہوا ہے

**ڈاکٹر** کیسا جھگڑا؟ اچھا مجھے اس جھگڑے کی وجہ بتاؤ۔

**گورژ یبو** جناب!۔۔۔۔۔۔۔۔

**ڈاکٹر** بالکل مختصر الفاظ میں۔۔۔۔۔۔۔

**گورژ یبو** ہاں' ہاں' لیکن اپنی ٹوپی تو پہن لیجیے۔

**ڈاکٹر** ٹوپی! یہ تو نوٹ ہے۔ تم جانتے ہو کہ نوٹ کہاں سے نکلا ہے؟

**گورژ یبو** نہیں

**ڈاکٹر** یہ بونم ایسٹ سے نکلا ہے' جس کے معنے ہیں یہ اچھا ہے' "کوئی چیز جو اچھی ہے" کیونکہ یہ انسان کو سردی اور کھانسی سے بچاتا ہے۔

**گورژ یبو** بہت خوب! میں نہیں جانتا تھا۔

**ڈاکٹر** اچھا اب جلد جھگڑے کی وجہ بیان کرو۔

**گورژ یبو** واقعہ یہ ہے کہ

**ڈاکٹر** مجھے امید ہے کہ تم خواہ مخواہ دیر نہ کرو گے۔ مجھے ضروری کام سے شہر جانا ہے۔ پھر بھی اگر میں تمہارے گھر میں امن قائم کر سکوں' تو میں ایک منٹ ٹھہر جانے کے لیے تیار ہوں۔

**گورژ یبو۔** میں بہت جلد اپنا بیان ختم کر دوں گا۔

**ڈاکٹر** تو جلدی کرو۔

**گورژ یبو** میں ایک منٹ میں سب کچھ کہہ دوں گا۔

**ڈاکٹر** مسٹر گورژ یبو۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ چند الفاظ میں سب کچھ کہہ لینا بڑا کمال ہے۔ زیادہ بولنے والے کی بات کوئی نہیں سنتا ـــــ کیونکہ سننے والوں کو الجھن ہونے لگتی ہے۔ "اختصار کلام از ہمہ صفات اولی ست" ایماندار آدمی کی بہترین صفت خاموش رہنا ہے۔

**گورژ یبو** تو پھر آپ کو جاننا چاہیے کہ۔۔۔۔

**ڈاکٹر** سقراط اپنے شاگردوں کو تین کاموں کی ہدایت کرتا تھا۔ اپنے کام ہوشیاری سے کرنا۔ سنجیدگی سے کھانا' اور چند الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر دینا۔ گورژ یبو' اب شروع کرو۔

**گورژ یبو** میں تو چاہتا ہی ہوں۔

ڈاکٹر: محض چند الفاظ ہیں۔ بغیر کسی تمہید کے بغیر لمبی تقریر کیے ہوئے۔ بس ایک ہی فقرے میں سب کچھ بیان کر دو۔ جلدی جلدی جلدی موسیو گوزریو جلدی کرو۔

گوزریو: مجھے بولنے بھی تو دیجیے ...........

ڈاکٹر: تم بہت بولتے ہو موسیو گوزریو۔ اب کوئی دوسرا آدمی جھگڑے کی وجہ بتا دے

ولیپریکین: آپ کو جاننا چاہیے جناب کہ ........

ڈاکٹر: تم بالکل جاہل، ان پڑھ اور تہذیب سے ناواقف ہو جس کو ٹھیٹھ زبان میں گدھا کہتے ہیں۔ تم بغیر کسی تمہید کے بولنا شروع کر دیتے ہو! کوئی دوسرا شخص مجھے بتائے کہ کیا ہوا تھا۔ (آنژیلیک سے مخاطب ہو کر) کیا تم اس ہنگامے کی وجہ بتاؤ گی؟

آنژیلیک: تم اس موٹے موذی کو دیکھ رہے ہو، یہ شراب کے پیپے جیسا شخص جو میرا شوہر ہے۔

ڈاکٹر: مجھ جیسے ڈاکٹر کی موجودگی میں اپنے شوہر کا نام تمیز کے ساتھ لو۔

آنژیلیک: اچھا! تو جناب کا یہ خیال ہے؟ میں آپ کی یا آپ کے خیالات کی بالکل پروا نہیں کرتی۔ جب جی چاہے میں خود ڈاکٹر بن جاتی ہوں۔

ڈاکٹر: جب جی چاہے تم ڈاکٹر بن جاتی ہو! اچھی ڈاکٹری ہے۔ میرے خیال میں تم ہر بات اپنی خواہش کے مطابق ............ مگر جھگڑے کا سبب تو بتاؤ۔

باربوئے: جناب حضور عالی ........

ڈاکٹر: تمہید تو اچھی ہے۔ "جناب عالی!" یہ فقرہ کانوں کو کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے! بڑا شاندار فقرہ ہے! "جناب عالی!"

باربوئے: اپنی وصیت کے مطابق ........

ڈاکٹر: بالکل ٹھیک ........ "اپنی وصیت کے مطابق!" وصیت میں کسی خواہش کا اظہار ہو گا۔ خواہش کے لیے اس کی تکمیل کا ذریعہ اور ذریعے کے لیے کسی شے کا ہونا ضروری ہے۔ بڑا چست فقرہ ہے! "اپنی وصیت کے مطابق!"

باربوئے۔ میں غصے میں بھوت ہو رہا ہوں۔

ڈاکٹر: اس لفظ کو اپنی گفتگو سے خارج کر دو۔ "بھوت!" یہ نہایت غیر فصیح لفظ ہے۔

باربوئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب خدا کے واسطے میری بات تو سنیے۔

ڈاکٹر: اگر اس وقت تیمز زندہ ہوتا تو کہتا! "اسے پکڑ لو"

باربوئے۔ اگر میری بات نہ سنو گے تو تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ جملات کہنے سے تمہارا مطلب کیا ہے؟

(باربوئے، آنژیلیک، گوزریو کا تو، اور ولیپریکین جھگڑے کی وجہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر انہیں سمجھاتا ہے کہ مل جل کر رہنا اچھا ہے۔ سب کے سب بیک وقت بولنے لگتے ہیں اور بڑا خوفناک شور مچاتے ہیں۔ اس عرصے میں باربوئے ڈاکٹر

کے پاؤں رسی سے باندھ کر اس کو زمین پر جھٹکے سے گرا دیتا ہے اور گھسیٹنا شروع کرتا ہے۔ ڈاکٹر بوتا ہی رہتا ہے اور اپنے ولائل کو انگلیوں پر اس طرح گنتا ہے کہ گویا اسے اس کا احساس ہی نہیں کہ وہ زمین پر گرا ہوا ہے)

**گورژیبو** بیٹی اب گھر واپس جاؤ اور اپنے شوہر کے ساتھ امن و امان سے رہو۔

**ولیبرکین** غلام اب رخصت چاہتا ہے۔

(ولیبرکین گورژیبو اور آنژلیک جاتے ہیں)

## ساتواں منظر — والیر اور لاواٹے

**والیر** میں تمہارا بے حد ممنون ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ ایک گھنٹے میں اس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں تم نے مجھے بلایا ہے۔

**لاواٹے** اتنی دیر تک انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ پندرہ منٹ میں ناچ ختم ہو جائے گا اور تم اپنی محبوبہ سے ملاقات نہ کر سکو گے۔

**والیر** اچھا تو چلو۔

## آٹھواں منظر — آنژلیک (تنہا)

میرا شوہر گھر پر موجود نہیں۔ میں ایک پڑوسی کے یہاں ناچ دیکھنے جاؤں گی۔ شوہر کے آنے سے پہلے ہی واپس آجاؤں گی کیونکہ وہ کہیں شراب پی رہا ہوگا اور اسے خبر بھی نہ ہوگی کہ میں گھر سے باہر گئی ہوں۔ کم بخت مجھے ہمیشہ اپنے کتے کی طرح گھر پر تنہا چھوڑ جاتا ہے۔ (آنژلیک جاتی ہے)

## نواں منظر — بے باربوئیے

مجھے یقین تھا کہ میں اس احمق ڈاکٹر کی اچھی طرح مرمت کروں گا۔ اس جاہل گدھے پر شیطان کی مار ہو! میں نے اس کی ساری قابلیت کا خاتمہ کر دیا۔ اب ذرا گھر چل کر دیکھوں کہ میری خوش سلیقہ بی بی نے کھانے کے لیے کیا پکایا ہے۔ (چلا جاتا ہے)

## دسواں منظر — آنژلیک

ہائے رے قسمت! میں بہت دیر کے بعد پہنچی۔ دعوت ختم ہو چکی تھی۔ میں اس وقت پہنچی جب لوگ واپس جا رہے تھے۔ مگر اس کی پروا ہی کیا ہے، کبھی نہ کبھی پھر موقع ملے گا۔ میں اس طرح گھر پہنچوں گی کہ گویا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ خدا خیر کرے! دروازہ بند ہے، کاتو! کاتو!

## گیارہواں منظر

(بے باربوئیے (دریچے کے سامنے)، آنژلیک

**باربوئیے** "کاتو! کاتو!" کاتو کو ہوا کیا ہے؟ اور تم ایسے موسم میں رات کے وقت کہاں سے آ رہی ہو؟

**آنژلیک** میں کہاں سے آ رہی ہوں؟ دروازہ کھولو تو بتا دوں۔

**باربوئیے** یہ تو ہو چکا! جہاں گئی تھیں وہیں جا کر سو رہو۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔ رات کے پچھلے پہر تنہا مارے پھرنا! اُف! میرا سر چکرا رہا ہے۔

**آنژلیک** صرف اس لیے مجھے گالیاں دیتے ہو کہ میں تنہا ہوں؟ آخر میں کروں کیا؟

**باربوئیے** گھر پر رہو، کھانا تیار کراؤ، گھر کے کاروبار دیکھو اور بچوں کی پرورش کرو۔ مگر فضول باتیں

کرنے کا فائدہ کیا؟ اچھا اب رخصت! جہنم
میں جاؤ اور مجھے چین سے رہنے دو۔

آنٹرلیک تو کیا دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئے نہیں۔ تمہیں اندر نہ آنے دوں گا۔

آنٹرلیک میرے پیارے شوہر! دروازہ کھول دو
میرے عزیز از جان شوہر!

باربوئے اف! گھڑیال! موذی سانپ! تم مجھے
دھوکا دینے کے لیے کتنی پیار کی باتیں کرتی ہے!

آنٹرلیک کھولو دروازہ کھولو!

باربوئے الوداع! جاؤ جہنم میں۔

آنٹرلیک دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئے نہیں!

آنٹرلیک تمہیں اپنی بی بی پر ذرا بھی رحم نہیں آتا؟
وہ تو تم پر دل وجان سے فدا ہے۔

باربوئے نہیں میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم سے مجھے سخت نفرت ہو
انتقام کا جذبہ مجھے شیطان مجسم بنا دیتا ہے یعنی
یوں سمجھو کہ میں اپنی ضد پر اڑا ہوا ہوں۔

آنٹرلیک میں کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے مجھے زیادہ
غصہ دلایا تو میں کوئی ایسا کام کر بیٹھوں گی کہ تمہیں
پچھتانا پڑے گا۔

باربوئے کیا کر بیٹھو گی، میری ننھی؟

آنٹرلیک میں اعلان کرتی ہوں کہ اگر تم نے دروازہ
نہ کھولا تو میں یہیں پر اپنا خون کر ڈالوں گی۔ میرے
والدین ضرور ہم دونوں کو دیکھنے آئیں گے اور
مجھے مردہ پائیں گے۔ پھر تمہیں پھانسی دیدی
جائے گی۔

باربوئے !!!!!! ناسمجھ عورت! میرا کیا بگڑے گا؟
تم اتنی بے وقوف نہیں کہ ایسا کرو گی۔

آنٹرلیک تمہیں یقین نہیں آتا۔ دیکھو میرے پاس
ایک چھری ہے۔ اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو
میں ٹھیک دل کے سامنے چھری بھونک لوں گی

باربوئے ذرا ہوشیاری سے۔ چھری بہت تیز ہے

آنٹرلیک دروازہ نہ کھولو گے؟

باربوئے میں تم سے بیسوں دفعہ کہہ چکا کہ دروازہ
ہرگز نہ کھولوں گا۔ خودکشی کرو، مر جاؤ، جہنم
میں جاؤ — مجھے کچھ بھی پروا نہیں۔

آنٹرلیک (بظاہر چھری بھونک لینا چاہتی ہے) اچھا
تو الوداع..... آہ! میں مر گئی۔

باربوئے وہ ایسی بے وقوف تو نہیں کہ سچ مچ چھری
بھونک لے؟ میں روشنی لے کر نیچے جاؤں گا
اور اسے دیکھوں گا۔

آنٹرلیک (اپنے آپ سے) میں تم سے ضرور بدلا لوں گی
مجھے ڈھونڈھتے رہو۔ اگر اس عرصے میں میں مکان
کے اندر پہنچ گئی تو پھر میری باری آئے گی۔
(وہ باربوئے کی نظر بچا کر مکان کے اندر چلی جاتی ہے)

باربوئے — میں جانتا تھا کہ وہ بے وقوف نہیں۔ وہ
مر کر بھی بابا کوبے کے گھوڑے کی طرح دوڑتی ہے

---

ع "ولیشن اور آرسن" کے قدیم افسانے میں ایک لکڑی کے گھوڑے کا
ذکر ہے جو بہت تیز دوڑ سکتا تھا۔ اس کی تیز رفتاری ضرب المثل ہو گئی ہے
مترجم

دوڑتی ہے۔ میں تو ڈر گیا تھا۔ اس نے اچھا کیا
کہ بھاگ گئی۔ کیونکہ اگر میں آ جاتا تو ہو توں سے خبر لیتا
اب مجھے سو رہنا چاہیئے۔ اچھا! ہوا سے دروازہ
بند ہو گیا کا تو! کا تو! دروازہ کھولو۔

آنٹر لیک (دریچے کے سامنے) "کا تو! کا تو! کا تو کو ہو گیا
ہے؟" اور تم اس طرح نشے میں چور اس وقت کہاں
سے آ رہے ہو؟ ابھی میرے والدین یہاں نہیں گے
اور تمہاری حالت سے واقف ہو جائیں گے۔ شراب
کے پیچھے، نالائق انسان، تم دن رات شراب خانے
میں پڑے رہتے ہو، اور اپنی بی بی کو گھر پر چھوڑ دیتے
ہو کہ بچوں کے ساتھ دن بھر تمہارا انتظار کرے۔

باربوئے دروازہ جلدی کھول شیطان کی خالہ! ورنہ
تیرا سر پھوڑ دوں گا۔

## بارہواں منظر

(گورزیو، ویلیبرکمن، آنٹر لیک، لے باربوئے)

گورزیو کیوں؟ کیا ہے؟ اب تک لڑ رہے ہو؟

ویلیبرکمن تم کبھی مل جل کر نہ رہو گے؟

آنٹر لیک ذرا دیکھو تو سہی۔ وہ شراب پی کر آیا ہے
اور مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔

گورزیو وہ سچ کہہ رہی ہے۔ رات کو تمہیں دیر تک گھر
سے باہر نہ رہنا چاہیئے۔ تمہیں لازم ہے کہ سویرے گھر
واپس آ کر اپنی بی بی کے ساتھ پرامن زندگی بسر کرو۔

باربوئے اگر میں نے گھر سے باہر قدم رکھا ہو تو میرا ستیاناس ہو جائے۔
جو سامنے والے کوٹھے پر جو لوگ ہیں ان سے پوچھ
لیجیے۔ وہ تو خود ابھی گھر واپس آئی ہے۔ اف!

بے گناہوں پر ہمیشہ ظلم ہوا کرتا ہے۔

گورزیو اب غصہ تھوک دو اور آپس میں میل کر لو۔ تم
اپنی بی بی سے معافی مانگو۔

باربوئے میں اس سے معافی مانگوں! اس کو شیطان
لے بھاگتا تو بہتر ہوتا۔ میں غصے سے پاگل ہو رہا ہوں
ہائے اللہ! اب کیا کروں؟

گورزیو جی! اب اپنے شوہر کا بوسہ لو اور رنجش کی باتیں
بھول جاؤ۔

تیرہواں منظر:— (ڈاکٹر رات کا لباس پہنے ایک دریچے کے سامنے)

ڈاکٹر پھر وہی ہنگامہ، شور و غوغا، جھگڑا، فساد، لڑائی
طوفان بے تمیزی! ایک لحظہ بھی چین نصیب نہیں۔

ویلیبرکمن کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اب سبھوں میں اتفاق ہو گیا۔

ڈاکٹر کیا اتفاق کے متعلق ارسطو کی کتاب کا ایک باب پڑھ کر
تمہیں سناؤں؟ اس نے ثابت کیا ہے کہ کائنات کے
مختلف حصے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ہی قائم ہیں۔

ویلیبرکمن یہ باب بہت طویل ہے کیا؟

ڈاکٹر بہت طویل تو نہیں ہے۔ کل ۔۔ یا ۔۔ صفحات کا
مضمون ہے۔

ویلیبرکمن شکریہ! اب ہمیں جانا چاہیے۔ خدا حافظ!

گورزیو ہاں، اب اس وقت رہنے دیجیے۔

ڈاکٹر آپ ارسطو کا مضمون سننا چاہتے ہیں؟

گورزیو نہیں۔

ڈاکٹر جب آپ کی یہی مرضی ہے تو الوداع۔

ویلیبرکمن چلو، اب گھر چل کر کھانا کھائیں۔

(پردہ)

# مقالات



## میر تقی میر

از ق ع د

میر صاحب کب لکھنؤ گئے، اس سوال کا جواب تذکرہ نگاروں نے مختلف طور پر دیا ہے۔ میرزا علی لطف اٹھارہویں صدی کے اواخر میں لکھنؤ میں مقیم تھے اور جن کی آصف الدولہ کے دربار میں بھی رسائی تھی، لکھتے ہیں کہ میر صاحب میرزا سودا کی موت کے بعد لکھنؤ پہنچے، آزاد کا بیان ہے کہ ۱۱۹۰ھ میں دلی جانا ہوا۔ ذکر میر کے فاضل مترجم نے میرزا علی لطف کے قول کو آزاد کے بیان پر ترجیح دی ہے۔ تذکروں کی ورق گردانی سے بہت ممکن ہے کہ مزید اختلاف کا پتا چلے۔ لیکن چونکہ ہم اس سوال کا جواب خود میر صاحب کی زبان سے دینا چاہتے ہیں، تذکروں کے اختلافات کو دکھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

ذکر میر میں میر صاحب نے لکھنؤ جانے کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے مگر میر صاحب کی عادت ہے کہ بات کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو اس کا سال وقوع درج کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ لکھنؤ جانے کا سن بھی اونہوں نے نہیں بتایا۔ لیکن ذکر میر میں میر صاحب نے صرف اپنے ذاتی حالات ہی نہیں بیان کیے ہیں بلکہ اپنے زمانے کے تاریخی واقعات بھی لکھے ہیں اور دلی سے روانگی کے قبل و بعد کے واقعات جو اس کتاب میں موجود ہیں، ان کا زمانۂ وقوع عہد شاہ عالم کے مورخین سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد میر صاحب کے دلی چھوڑنے اور لکھنؤ جانے کا زمانہ بہ آسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

میر صاحب (ذکر میر ص ۱۳۰) امیر الامراء ذوالفقار الدولہ نجف خان بہادر کے متعلق لکھتے ہیں:- "با ستعمال منہیات و تماشائے زنان چناں پرداخت کہ قوت از بدن زائل شد۔ آخر بہ مرض سل گرفتار شد۔ اطبا کوشش بسیار در علاج او بکار بردند اما فائدہ مترتب نہ شد۔ چوں مایوس شد، بحسرت می گفت کہ من ہیچ نمی خواہم جز ایں قدر کہ زندہ بمانم۔ بہ بیماری او زمانہ رنگ دیگر گرفت"

اپنے لکھنؤ جانے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:- "فقیر کہ خانہ نشیں بود خواست کہ از شہر بدر زند، از جہت بے اسبابی حرکت متعذر بود۔ بولائے نگہ داشتن عزت من در خاطر نواب... آصف الدولہ... گذشت کہ میر پیش من بیاید" (ذکر میر ص ۱۳۰، ۱۳۱) لکھنؤ پہنچ جانے کے بعد، تحریر فرماتے ہیں:- "بعد از آمدن من ایں طرف آں جا کہ نجف خاں بر بستر افتادہ بود فوت کرد۔" (ذکر میر ص ۱۴۰)

اقتباسات بالا سے دو باتیں قطعی طور پر معلوم ہو گئیں، ایک یہ کہ ابھی میر صاحب دلی ہی میں تھے کہ نجف خان زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور معاملات حکومت میں ابتری پیدا ہو چلی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کا انتقال میر صاحب کے لکھنؤ پہنچ جانے کے بعد ہوا۔ اب ہمیں تاریخ کی مدد سے یہ معلوم کرنا ہے کہ نجف خان کی بیماری نے خطرناک صورت کب اختیار کی اور ان کی موت کب واقع ہوئی۔ میر صاحب کے

دہلی چھوڑنے کا زمانہ خود بہ خود معلوم ہو جائیگا۔

مسالال اور خیر الدین محمد الہ آبادی کی کتابوں سے اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں:-

"۱۱ ربیع الثانی روز یکشنبہ کو بادشاہ ، سیر باغ مقبرہ صفدر جنگ کے لیے تشریف لے گئے۔ امیر الامرا باوجود اس کے کہ انہیں خفیف تپ تھی، ہمراہ رکاب تھے ، بادشاہ نے کہا بھی کہ احتیاط لازم ہے، گھر جا کر آرام کرو ، لیکن اس پر بھی تین دن حاضر خدمت رہے۔ جب طبیعت پر ماندگی کا بہت اثر ہوا، رخصت ہوئے"[9]

"از دوم ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ از حویلی قمر الدین خان در حویلی صفدر جنگ آوردند لیکن مرض روز بروز در تزاید بود۔ مسالال اور خیر الدین محمد دونوں متفق ہیں کہ نجف خان نے ۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۱۹۶ھ کو انتقال کیا ۔ ۱۶ محرم تک نجف خان کو مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لیے میر صاحب نے غالباً اس کے کچھ ہفتے بعد دہلی چھوڑی اور ۲۲ ربیع الثانی سے قبل لکھنؤ پہنچ گئے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لکھنؤ میں میر و سودا کی یکجائی کی جو روایتیں ہیں وہ محض مصنوعی ہیں۔

میر صاحب کے سال وفات کا عام طور پر علم ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس دن کس مہینے کس تاریخ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس اطلاع کے لیے ہم میر احمد شفت ، داماد سید انشا کے ممنون ہیں۔ ان کے کلیات فارسی میں ایک صفحے سے زیادہ کی عبارت ہے جس کے ہر فقرے سے میر کا سال وفات نکلتا ہے۔ ایک فقرہ جسکی داد انہیں قتیل سے ملی تھی یہ ہے : "سنہ یک ہزار و دو صد و بیست و پنج ہجری"۔ آخر کے دو فقروں سے سن کے علاوہ 'مہینا' 'دن' 'تاریخ' سب معلوم ہوتے ہیں۔ فقرہ اول بلہجۂ فارسی صاف دل آیا ۱۲۲۵، "یوم الجمعہ و بست و یکم از مہ شعبان ۱۲۲۵"۔ فقرہ ثانی بزبان پاکیزہ ہندی "۱۲۲۵ جمعہ کا اکیسواں روز اور اکیسویں ماہ شعبان کی ۱۲۲۵"۔

---

[5] و [6] گلشن ہند طبع دوم ص ۱۹۲ و ص ۲۰۹ و ۲۱۰

[7] آب حیات طبع نہم ص ۲۰۵ آزاد نے میر کے حالات کے لیے گلزار ابراہیم سے مدد لی ہے۔ لیکن علی ابراہیم یوں لکھتے ہیں: "ہنگام تحریر کہ ۱۱۹۶ھ است شنیدہ شد کہ در جہاں آباد ... اقامت دارند" گلزار ابراہیم قلمی۔

[8] مقدمۂ ذکر میر ص ... فاضل مرتب نے سنہ ۱۱۹۶ھ کے لیے گلشن ہند کے ساتھ گلزار ابراہیم کا بھی حوالہ دیا ہے، لیکن گلزار میں میر کے لکھنؤ جانے کے متعلق ایک لفظ نہیں۔

[9] اصل عبارت فارسی ہے۔

[10] عبرت نامہ جلد دوم قلمی کتابیں سب کتب خانۂ خدا بخش خان مرحوم کی ہیں۔

# سال وفات حاتم

از ق ۔ ع ۔ ۔

شاہ حاتم کے سال وفات کے متعلق حسب ذیل اقوال ہماری نظر سے گزرے ہیں:

(۱) آب حیات آزاد طبع پنجم ص ۱۱۹ " ۹۶ برس کی عمر پاکر ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں دلی میں فوت ہوئے ۔ مگر مصحفی نے تذکرہ فارسی میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے اور ۸۳ برس کی عمر پائی "

(۲) تذکرہ ہندی مصحفی ص ۸۱ " عمرش قریب بہ صد رسیدہ بود و سہ سال ہست کہ از شاہجہان آباد ۔۔ بعیت حیات "

(۳) عقد ثریا مصحفی ص ۲۲ و ۲۳ " بقولش تاریخ تولدش شرف خود باشد ۔۔۔ ہشتاد و سہ سال عمر داد و در یک ہزار و یک صد و ہفت در ماہ رمضان رحلت کردہ ۔ و قطعۂ تاریخ وفاتش کے آخری دو شعر یہ ہیں:

سال تاریخ از خرد جستم ۔ ناگہ این مصرعہ بگوشم خورد ۔ کہ بگو مصحفی چو پرسیدت ۔ آہ صد حیف شاہ حاتم مرد "

(۴) تاریخ شعرائے اردو مولفہ فیلن و کریم الدین ص ۱۳۳ " وہ درمیان ۱۷۹۱ء دلی میں فوت ہوا "

(۵) تذکرہ بیجگر قلمی دفتر ہند لندن فارسی عبارت کا ترجمہ " سو سال کے قریب عمر پائی ۔ ۱۲۱۰ھ میں مرے رنگیں نے تاریخ کہی: ؎

| | | |
|---|---|---|
| نہیں کہنے میں کچھ آتا ہے افسوس | جہاں سے اٹھ گیا استاد حاتم | مرے تن میں رہیگی جان جب تک |
| نہیں ہونے کا دل سے دور یہ غم | گیا دنیائے فانی سے یکا یک | جسے استاد کہتا تھا اک عالم |
| تمامی ہند میں اس سال یارو | ہوا مرنے کا اس کے سخت ماتم | تھے جو اس کی سب شاگرد مل کر |
| ہوئے جب فکر میں تاریخ کی ہم | کہا ہاتف نے رنگیں ریختہ کی | میاں حاتم سے تھی بنیاد محکم |

میں نے " آہ حاتم برفت از دنیا " سے تاریخ نکالی " لیکن لالہ کندن سنگھ فارغ بریلوی کے دیوان میں خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قطعہ ملا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاتم کی وفات ۱۱۹۷ھ میں ہوئی:

" فارغ چو بہ جستجوئے تاریخ ۔ گشتم بہ تلاش و فکر ہمدم ۔ با نالۂ آہ ہاتف از غیب ۔ گفتا ز جہاں برفت حاتم "

۱۱۹۶ھ: آزاد نے محض سہو سے ۱۱۹۶ لکھ دیا ہے ۔ مصحفی کے تذکرہ فارسی " عقد ثریا " کے دو نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں دونوں میں ۱۱۹۷ھ ہے " اور قطعۂ تاریخ کے مصرع آخر سے بھی یہی نکلتا ہے ۔

۱۲۰۷ھ: کریم الدین نے سال وفات ۱۷۹۱ء لکھا ہے جو ۱۲۰۶ھ کے مطابق پڑتا ہے ۔ ۱۲۰۷ھ کی سند چونکہ کہیں اور نہیں تو خیال ہوتا ہے کہ آزاد نے اسے تذکرہ کریم ہی سے لیا ہے " لیکن حساب کرنے میں ایک سال کی غلطی ہو گئی ۔ آزاد نے کریم کا حوالہ نہیں دیا ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ آزاد نے بکثرت ایسا کیا ہے ۔

۱۲۰۵ھ مطابق ۹۱-۱۷۹۰ء: تذکرۂ کریم بڑی حد تک دتاسی کی تاریخ ادبیات سے ماخوذ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کریم نے حاتم کا سال وفات اسی کتاب سے نقل کیا ہے۔ دتاسی کا ماخذ تذکرۂ ہندی مصحفی ہے، جس میں لکھا ہے "سہ سال است کہ ۔۔ ودیعت حیات سپرد" اور دتاسی بھی تذکرۂ ہندی کے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پورا تذکرہ ایک ہی سال (۱۲۰۹ھ) میں لکھا گیا ہے، حالانکہ اس تذکرے کا آغاز ۱۲۰۰ھ میں ہوا ہے[۵۳] ۱۲۰۵ھ سال تکمیل ہے۔ مصحفی نے حاتم کا حال ۱۲۰۰ھ میں لکھا۔ اس حساب سے سال وفات ۱۱۹۷ھ ٹھہرتا ہے اور عقد ثریا اور تذکرۂ ہندی کے بیانات کا ظاہری اختلاف دور ہو جاتا ہے۔

۱۲۱۰ھ: رنگین کے قطعہ تاریخ کی بیت آخر سے سال تاریخ نکالنے کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہاتف کا پورا قول "ریختہ کی بیان حاتم سے تھی بنیاد محکم" بغیر تعمیہ و تخرجہ مادۂ تاریخ قرار دیا جائے۔ اس صورت میں ۱۲۴۰ سے زائد نکلتا ہے اور یہ صریحاً غلط ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صرف لفظ "ریختہ" کے اعداد لیے جائیں اور اس کی بنیاد یعنی "ہ" کا عدد اس سے خارج کر دیا جائے، اس صورت میں ۱۲۱۰ برآمد ہوتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ صرف مصرع آخر کے اعداد شمار کیے جائیں۔ اس سے بھی ۱۲۱۰ھ نکلتا ہے۔ دیوان رنگین ۔۔۔ ت سوئی ہماری نظر سے گزرا تھا، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قطعہ دیوان میں ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس حد تک صحیح نقل ہوا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بیجگہ سے اس کے نقل کرنے میں غلطی ضرور ہوئی ہے اور اسی بنا پر ہم ۱۲۱۰ھ کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

۱۱۹۷ھ: اس کی تین سندیں ہیں عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور قطعۂ فارغ۔ مصحفی ۱۱۹۰ھ میں لکھنؤ گئے ہیں۔ ۱۱۹۰ھ میں دہلی ہی میں موجود تھے، حاتم سے ان کے تعلقات عقیدت مندانہ تھے۔ مصحفی کا سال وفات میں غلطی کرنا بالکل خلاف قیاس ہے۔ فارغ بھی حاتم کے شاگرد تھے، اور اس معاملے میں ان کی شہادت بھی کافی وزن رکھتی ہے۔ رہا رنگین کا قطعۂ تاریخ، اگر وہ صحیح بھی نقل ہوا ہو تو مصحفی اور فارغ کی شہادتوں پر رنگین کی شہادت کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور جب تک رنگین کی تصدیق اور ذرائع سے نہ ہو، ۱۱۹۷ھ ہی کو حاتم کا صحیح سال وفات سمجھنا چاہیے۔

---

[۵۱] مصحفی نے لکھا ہے کہ "شصت و سہ سال عمر داد" جو ۸۳ سال عمر پائی، سے مختلف ہے۔ اصل یہ ہے کہ عقد ثریا کئی سال کی مدت میں لکھا گیا ہے۔ مصحفی نے ۔ ترجمۂ حال ان کی وفات کے قبل تحریر کیا تھا، تذکرے کی تکمیل سے پہلے ہی حاتم مر گئے تو مصحفی نے ان کی موت کا حال بڑھا دیا، لیکن اوپر جو کچھ لکھ چکے تھے اسے علیٰ حالہ رہنے دیا۔

[۵۲] جو کچھ لکھا ہے اپنی یاد سے لکھا ہے۔ اس وقت تاریخ ادب کی طرف رجوع مشکل ہے۔

[۵۳] تذکرۂ ہندی تذکرۂ فارسی کی تکمیل کے بعد شروع ہوا۔ تذکرۂ ہندی ص ۳۔ تذکرۂ فارسی کا سال تکمیل (۱۱۹۹ = ی) اس کے بعد بھی اضافے ہوئے ہیں) اس لیے تذکرۂ ہندی کا سال آغاز ۱۲۰۰ھ ہونا چاہیے۔ اس امر کا قطعی ثبوت کہ ۱۲۰۰ھ میں اس تذکرے کی ابتدا ہو چکی تھی یہ ہے کہ مصحفی درد کے متعلق جن کی وفات ۱۱۹۹ھ میں ہوئی ہے لکھتے ہیں "یک سال است کہ در بہبوش شفا یافتہ" ص ۹۳۔

# صوبہ بہار

## ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد

ماخوذ از مراۃ الاحوال مصنفہ آقا بہبہانی

از جناب یوسف الدین احمد بلخی، بی اے، بارٹن

۸ ذی قعدہ سنہ مذکور یعنی ۱۲۲۱[1] ھ میں ہم لوگ عظیم آباد پہنچے، چند دوستوں نے استقبال کیا۔ میرزا غلام حسین خاں[2] کے بھائی امیر علی خاں کی شادی مہاراجہ چھاجو لال دیوان خاص نواب آصف الدولہ کی بیٹی سے ہوئی تھی اس تقریب میں ان کے ہمشیر زادے بھی یہاں آئے ہوئے تھے، ان کی خواہش سے میں یہاں ٹھہر گیا۔ یہ صوبۂ بہار کا سب سے بڑا شہر ہے اور اس کا نام پٹنہ ہے ... عظیم الشان نے اپنے نام پر ایک شہر بسانا چاہا تھا، اخراج کا اندازہ ایک کروڑ سے زیادہ ہوا۔ بادشاہ نے عظیم الشان کے نام پر عظیم آباد نام رکھا۔ یہ شہر آباد ہوا تو اصل بہار ویران ہوکر محض ایک دیہات ہوگیا۔ عظیم آباد اب تک پٹنہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر فقرا پرور اور بہت پر لطف ہے، یہاں کی آب و ہوا بہت اچھی ہے، اور ہر قسم کے کپڑوں اور کھانے کی چیزوں کی اس قدر افراط ہے کہ لوگ یہاں سے باہر لے جاتے ہیں۔ بنگالے بلکہ ہندوستان میں اس جامعیت کے شہر کم ہیں۔ اسے جنت الہند اگر کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کا طول ڈیڑھ فرسنگ کے قریب ہے اور عرض نصف فرسنگ ہے یہ شہر گنگا کے کنارے واقع ہے جس کی لطافت اور شیرینی مشہور ہے۔ یہاں بڑی بڑی عمارتیں اور پرشکوہ بازار بہ کثرت ہیں۔ دریا کے کنارے مسجد اور مدرسے کی عالی شان عمارت ہے جسے زمانہ سابق میں نواب سیف خاں بہادر نے جو قزلباشی حکام سے تھے بنوایا تھا۔ اس کے خرچ کے لیے چند مکانات بھی تھے عمارات ابھی تک مضبوط و مستحکم ہیں اگرچہ کچھ کچھ خرابی کے آثار مرمت نہ ہونے کی وجہ سے نظر آنے لگے ہیں، تاریخ بنا بہ قاعدہ جمل اس آیت سے نکلتی ہے " ان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا[3] "

آج کل سراج الدولہ شہید کی اولاد دختری میں سے بعض ناسپاس و جہال نے اراضی وقف کے ایک حصے پر قبضہ کرکے مکان بنا لیا ہے، اور مومنین کو اتنی قدرت نہیں کہ مخالفت کر سکیں۔ المختصر میں چند روز اس شہر میں رہا۔ یہاں کے اعزہ اور اعیان، مقدسین و مومنین ملاقات کے لیے آتے رہے اور مسائل شرعی کی تحقیق کرتے رہے میں نے عظیم آباد کو اس معاملے

---

[1] یہ سن ایک نسخے میں ہے، دوسرے میں نہیں، لیکن دونوں نسخوں میں اس سے قبل جو گزرا ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۱ھ میں عظیم آباد آئے۔ [2] اصل عبارت فارسی " حسب الخواہش اولاد ہمشیرہ جناب میرزا غلام حسین خاں سابق الذکر کہ بہ تقریب وصلت عالی شان امیر علی خاں، برادر خود، با صبیہ دیوان خاص نواب آصف الدولہ بہادر مشہور بہ مہاراجہ چھاجو لال بہ اینجا آمدہ رفتہ بودند، منزل کردم "۔ [3] ۱۰۶۰ھ نکلتا ہے۔

ہیں بنگالے کے کل شہروں علی الخصوص دار الشرب مرشد آباد سے ممتاز پایا۔ خاندان قزلباش کے کچھ افراد بھی اس شہر میں آسودگی کے ساتھ سکونت پذیر ہیں۔ ازاں جملہ عالی جاہ ... عمدۃ امرائے عظام، نواب .. مقرب السلطانی مبارز الملک امیر الدولہ خان خاناں عباس قلی خاں بہادر نصرت جنگ، دام اقبالہٗ خلف .. نواب .. منیر الملک، منیر الدولہ رضا قلی خاں بہادر، نادر جنگ خراسانی، کہ زندہ فیل احمد جام کی اولاد سے ہیں۔ جیسا کہ میں نے سُنا ہے ان کے آباد اجداد سلاطین صفویہ کے امرا میں تھے، اور نواب منیر الدولہ مرحوم خود شاہ طہماسپ کے دربار میں کسی عہدے پر تھے۔ طہماسپ کے زوال کے بعد کچھ دنوں حق نمک کا خیال کرکے گوشہ نشیں رہے۔ نادر شاہ کو جب ان کی عقل اور ذہانت کی خبر ہوئی اس نے انھیں بلا کر اپنے امیروں کی جماعت میں داخل کیا، اور کچھ عرصے کے بعد سفیر بنا کر محمد شاہ کے پاس بھیجا۔ اُس وقت سے ہندوستان میں بھی سلاطین بابریہ کے یہاں معزز و محترم رہے۔ شاہ عالم ان کی بڑی عزت و حرمت کرتے تھے۔ منیر الدولہ اس کے دربار کے مشہور امیروں میں تھے اور آخر تک اسی کے وکیل مطلق تھے۔ نواب (یعنی عباس قلی خاں) روشن ضمیر، بلند ہمت، عالی مرتبت، نیک خصلت، با وقار، دیندار، نجستہ کردار، صاحب ذوق سلیم و طبع مستقیم ہیں۔ علوم درسیہ سے بھی ناواقف نہیں اور ان کی تحصیل کے بہت شائق ہیں۔ مجھ سے محبت فرماتے ہیں وہ برادری کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے، ملاقات کو برابر آتے اور اپنی پرلطف صحبت سے میرے دل حزیں کو مسرور کرتے تھے۔ ان کی اولاد بھی صاحب کمال، نجات کی طالب اور ابنائے جنس سے ممتاز ہے۔

......... عالی جناب .... سید کاظم علی خاں بہادر خلف ارشد ... غفراں مآب نواب فخر الدولہ سید تقی علی خاں بہادر ظفر جنگ، خلف مرحوم بخشی الممالک نصیر الدولہ سید ہدایت علی خاں بہادر اسد جنگ ابن سید علیم اللہ ابن سید فیض اللہ طباطبائی ان کی عالی خاندانی مشہور ہے اور بیان کی محتاج نہیں۔ وہ ایک عالی مرتبہ بزرگ اور خوش گفتار سید ہیں ان کے مزاج میں انکسار، تواضع، اور بے نفسی بہت ہے، اور انھیں علما اور اہل کمال کی صحبت کا شوق حد سے زیادہ ہے۔ اداب دوستی و محبت کے برتنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی بہت آرام اور عافیت سے گزرتی ہے۔ اور مجھ سے بے حد محبت ہے۔ اکثر اوقات اپنے رشتہ داروں اور متوسلین کے ساتھ ملاقات کو آتے اور میری طبیعت کو مسرور فرماتے ان کی والدہ ماجدہ نواب اسمٰعیل قلی خاں بہادر کی بیٹی ہیں جو مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ کے بھائی حاجی احمد کی منجھلی بیٹی منجھلی خانم کے بطن سے ہیں:

نژاد از دو کس دارد این نیک پے ✣ ز بہرام گور و ز کاؤس کے

ان کے چچا مرحوم مغفور سید غلام حسین خاں مصنف سیر المتاخرین۔ اور مرزا غلام حسین خلف حاجی اسمٰعیل مرحوم بن آقا علاء الدین محمد (جن کا ذکر ملا محمد صالح مازندرانی کے حالات میں ہو چکا ہے) ان کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ ان کے اجداد میں میر فیض اللہ قدس سرہ نہایت متقدس اور صالح تھے۔ اور مشہور ہے کہ حضرت حجۃ الامام علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے

اس شہر میں میر محمد مومن خلف میر محمد یوسف بہبہانی سادات طبا طبائی سے ہیں اور مدت دراز گزری کہ دار الایمان ایران سے آکر اس ملک میں مقیم ہیں۔ اب سے پہلے کچھ سامان معاش تھا مگر اب مفلس ہو گئے ہیں اور افلاس اور تنگدستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی کئی اولادیں ہیں۔

اسی شہر میں عالی حضرت .. .. .. .. .. آقا سید زین العابدین کل کلاب خلف حاجی محمد ناصر قزوینی ہیں۔ جو ایک خوش خلق مہذب اور خوش صحبت جوان ہیں۔ مجھ سے انھیں بہت انس تھا اور حاجتمندوں کی خدمت میں وہ کبھی کمی نہ کرتے حقیقت میں ان کا وجود دینی کاموں کی انجام دہی میں بہت مغتنم ہے جن دوستوں سے فیض آباد سے واپسی پر ملاقات ہوئی ان کا نام اس کے بعد لکھا جائیگا۔

مختصر یہ کہ چند دنوں کے بعد فیض آباد کی جانب روانہ ہوا۔ دانا پور میں جو عظیم آباد سے تقریباً تین فرسنگ ہے آدھی رات کو میں اور میرے تمام ہمسفر سوئے ہوئے تھے کہ راہ زنوں کی ایک جماعت کشتی پر چڑھ آئی۔ ہوشیار ہونے کے بعد ہم لوگوں نے مقابلہ کیا مگر ان کی جماعت زیادہ تھی ہم لوگ مقابلہ نہ کرسکے وہ لوگ کشتی پر آگئے اور کئی آدمی ننگی تلواریں لیے میرے اور میرے ناظر آقا محمد حسن خزانی کے سر پر کھڑے ہو گئے۔ ہم لوگوں کو قتل کا خوف ہوا رہزنوں نے تمام سامان لوٹ لیا اور بدن کے کپڑوں اور کتابوں کے سوا کوئی چیز نہ چھوڑی۔ اس کے علاوہ وہ ڈرا دھمکا کر شراب مانگتے تھے۔ مگر کتابوں کو دیکھ کر آپس میں بولے کہ یہ سب شرابی نہیں ہیں۔ کتابوں کی برکت سے اس خطرے سے نجات ملی۔ ان لوگوں نے کشتی کو الٹ پلٹ کر دیکھا کہ شاید روپے کی قسم کوئی چیز چھپی ہوئی ہو۔ اور آقا محمد حسن کے سوا تمام ملازموں کو ننگا کر دیا۔ صبح ہونے کو تقریباً آدھ گھنٹا باقی تھا کہ ان لوگوں نے اپنی راہ لی۔ صبح کو عازم عظیم آباد ہوا، دوستوں میں سب سے پہلے منشی رام چند نامی ایک ہندو کو اطلاع ہوئی انھیں بہت افسوس اور صدمہ ہوا۔ میرے چند روزہ قیام کے دوران میں یہ صاحب مجھ سے اخلاق ناصری پڑھتے تھے اور اپنی جماعت میں خاصا ہوش اور نیک سیرت تھے۔ ان کے بعد دوسرے دوست بھی پہنچے۔ میں نے سید کاظم علی خاں بہادر موصوف کے مکان میں جو دریا کے کنارے واقع ہے قیام کیا۔ خدا کے فضل اور دوستوں کی مدد سے تمام سامان پہلے سے بہتر مہیا ہو گیا۔

———:———

# عالم ادب

(۱) **مرقد غالب**: خواجہ حسن نظامی صاحب اپریل کے ہمایوں میں تحریر فرماتے ہیں۔
"غالب کا مزار نیز درگاہ کے قریب لب سڑک (کذا) واقع ہے۔ مزار کے بائیں یعنی جنوب میں اکبر کے کوکا... مرزا عزیز... کا مقبرہ ہے.... مزار کے غرب میں قبر سے ملی ہوئی بیگم صاحبہ حکیم واصل خاں مرحوم کے مکان کی دیوار ہے۔ اور شرق میں نواب لوہارو کے خاندان کی کچھ قبریں ہیں۔ پھر ایک دیوار ہے۔ پھر تین سو گز کا ایک قطعہ زمین ہے جس کو حکیم محمد... صاحب نے غالب ہال بنانے کے لیے خریدا ہے۔ اور شمال میں ایک دیوار ہے۔ اور اس کے باہر شکستہ قبرستان ہے جس کے وارث اب موجود نہیں۔ غالب سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ شمالی دیوار کو ہٹا کر شکستہ قبرستان درست کر دیا جائے۔ اور شمال کی طرف سڑک کے پاس ایک شاندار دروازہ بنا دیا جائے۔ اور جتنی زمین مرحومہ بیگم صاحبہ.. نے مزار کے غرب میں عطا فرمائی تھی اس کو شامل کر کے غالب کا مزار اتنا اونچا بنا دیا جائے جو سڑک سے نظر آنے لگے۔ اور شرق میں غالب ہال بنایا جائے تاکہ آیندہ جلسے اور مشاعرے مزار کے قریب ہی ہو سکیں۔ غالب کا مزار نواب صاحب لوہارو کے قبرستان میں ہے اس لیے قبرستان کے وارث غالب کا مزار بنانے میں مزاحمت کرتے ہیں۔ لہذا تجویز کی گئی ہے کہ.. صرف غالب کی قبر کو بنا دیا جائے لوہارو والوں کو اگر اپنے بزرگوں کی قبروں کا خیال ہوگا تو خود بنوا لیں گے..."

(۲) **مرقد ذوق**: خواجہ صاحب کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذوق کی قبر حکیم عبدالحمید صاحب مالک دواخانہ ہمدرد دہلی نے بنوا کر، چار دیواری درست کرا دی ہے۔ اور ایک نئی لوح لگا دی ہے۔

(۳) ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب، ناظم دینیات کو مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں ایک قلمی کتاب **ہشت گلشت** دستیاب ہوئی ہے۔ اس کی ضخامت... صفحات تقطیع ۹ × ۵½ ہے ہر صفحے پر بارہ یا تیرہ سطریں ہیں۔ شاہ میر حسن حقیقت نے امیر خسرو کی ہشت بہشت کا نثر فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ولیم بیل مارٹن صاحب کی فرمائش سے غلام احمد نے کلکتے میں اس کا ترجمہ اردو نثر میں کیا ہو کتاب کا سال تالیف ۱۲۱۱ فصلی ہے باغ بہار سے تاریخ نکلتی ہے۔ فاروقی صاحب اس کو طبع کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (رسالہ سہیل)

(۴) سید حسن عسکری صاحب پروفیسر پٹنہ کالج قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے **ہمایوں بادشاہ کا دیوان** ڈھونڈ نکالا ہے۔ یہ دیوان عرصے سے مفقود تھا۔ حافظ شمس الدین صاحب پروفیسر پٹنہ کالج اس دیوان کے متعلق ایک مضمون معیار کے لیے لکھ رہے ہیں۔

(۵) ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں.. یمن سے ایک قدیم کتاب آئی ہے جو [illegible] قبل کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا **نام خریدۃ القصر** ہے اور اس میں عراق، شام، مصر، شمالی افریقہ، ہسپانیہ اور صقلیہ کے شعرا کے کلام کا

انتخاب درج ہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف بارھویں صدی عیسوی ہے، اور مصنف عماد الدین کاتب اصفہانی۔ عماد الدین ۱۱۲۵ء میں بہ مقام اصفہان پیدا ہوا، اور بغداد میں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سلطان نور الدین اور سلطان صلاح الدین اس کے سرپرستوں میں تھے ۱۲۰۱ء میں اس کا انتقال ہوا۔

(۶) ڈاکٹر ابو النصر محمد نظام الدین نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے شعبۂ اسلامیات کے صدر کی حیثیت سے جو خطبۂ صدارت انگریزی میں پڑھا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ رہبر دکن میں شائع ہوا ہے۔ ذیل میں اس کے عنوانات درج ہیں، جس سے ناظرین کو اندازہ ہو گا کہ اس خطبے میں کون کون سے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ آخر میں ہم بعض حصے جو ہمارے نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں، نقل کریں گے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی اشاعت و وسعت، مشرق قریبہ اور مشرقی ممالک میں عربی اور فارسی کی تحصیل، زبان عربی کا جدید مرکز مصر، مشرقی ممالک میں فارسی زبان کا مرتبہ، فارسی زبان کا ارتقا، افغانستان اور زبان فارسی، ہندوستان میں علمی تحقیقات کی حیثیت و مقصد، قدیم مسالک، فرائض محقق، چند تحقیقی تصانیف، ہندوستان کے ممتاز علمی ادارے، صوبۂ پنجاب کی ادبی و علمی خدمات، سر محمد اقبال، ادارہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، دیگر جامعات، شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ، دار المصنفین اعظم گڈھ، حیدرآباد جدید کی علمی فضا، علوم اسلامی کی ترویج، معجم المصنفین، مدرسہ نظامیہ، اسلامک کلچر، دیگر علمی ادبی خدمات، مجلس مخطوطات فارسیہ، فرہنگ نظام، اردو لغت، محکمۂ آثار قدیمہ سرکار عالی، (آخر میں جامعۂ عثمانیہ اور اردو کا ذکر ہے) "مغربی خیالات کے تاثر اور مصریوں کی قوت اخذ کی صلاحیت نے مصر میں ایک ادبی احیاء کی صورت اختیار کی ہے۔ ادب عربی میں نثر کا ایک جدید دور، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ جیسے مصلحین اعظم، سعد زاغلول سے نجات دہندۂ مصر، احمد زکی پاشا جیسے مربی ادب، جرجی زیدان جیسے ادیب و فسانہ نگار، جریدہ نویس، احمد امین، علی عبد الرزاق، طٰہٰ حسین جیسے علم برداران حریت، رشید رضا، منفلوطی، خلیل مطران، فرید وجدی، اور امین ریحانی جیسے ادیب اور شیدائیان علم کی سرپرستی میں شروع ہوا۔ نظم بھی ترقی سے کچھ محروم نہیں رہی۔ شوقی اور حافظ ابراہیم کے دبستان نظم مغربی اثر کے مقابلہ میں اپنے مورچے پر قائم ہیں،

ادبیات عالیہ کی اشاعت، جدید ادبیات کی ترویج، مصری اخباری دنیا کی سرگرمی عملاً تمام عربی دنیا پر قبضہ جمائے ہوئے ہے لیکن اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بعض اعتبارات سے کمیت کو کیفیت پر ترجیح دی جاتی رہی ہے یورپی ممالک میں جس قسم کی اعلیٰ پایہ علمی تحقیقات ہوتی ہیں وہ شاذ و نادر ہی جدید عربی میں نظر آتی ہیں۔ اور حیثیت سے قاہرہ کی چہل پہل کسی دوسرے مشرقی و مغربی تمدنی مرکز سے کم نہیں۔ اخبار، رسالے، ناول، بولتی تصویریں (ٹاکیز) اشتہارات، ڈرامے، تقاریر، سبھی جلسے دفتری مراسلت، خانگی کاروبار سب کے سب عربی زبان میں انجام پاتے ہیں۔ اسی طرح دمشق و بیروت بھی عربی زبان کے دو بڑے مرکز ہیں جو عربی زبان کی نشو و نما میں کافی حصہ لے رہے ہیں، فرانسیسی اثرات کے باوجود عربی زبان نے مشرقی زبانوں میں سب سے اہم بین الاقوامی رتبہ حاصل کر لیا ہے۔"

**فرائض محقق** قدیم و جدید مسالک کے حسن تتبع سے قطع نظر اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تحقیق و تدقیق فی نفسہٖ صحیح تفحص و تجسس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت کا انکشاف صرف اسی طرح ممکن ہے محقق کا فرض عین ہے کہ وہ اپنے ذاتی خیالات و میلانات سے علیحدہ ہو کر صرف اسی مواد پر انحصار کرے جو اس کے پیش نظر ہو اور قیاسات سے کام نہ لے۔ اسے اپنی تحقیقات کو اس مقام سے شروع کرنا ہے جس نقطے پر اس کے پیش رو نے انتہا کی تھی۔ اس کے ہاں اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ سب سے پہلے موضوع زیر بحث کے متعلق جس قدر مواد موجود ہو اس پر اسے عبور حاصل کرنا لازمی ہے، پھر واقعات کا تجزیہ کر کے ایک مستحکم بنیاد پر اپنے نظریے کو قائم کرنا اس کا فرض ہے معلومات انسانی میں ایک مستقل اضافہ کرنا مقصود ہے، ایسا جو اخلاف کی رہنمائی کا موجب ہو۔ اس کے نظریے مرور زمانہ سے باطل نہ ہوسکیں۔ تحقیق و تدقیق کا یہی ایک صحیح طریقہ ہے اور یہی ایک صحیح عالم و محقق کا مسلک ہونا چاہیے۔ حالات حاضرہ کا لحاظ، نسل و رنگ و مذہب کا امتیاز، ذہنی و مادی ترقیوں کا تفوق، یہ وہ چیزیں ہیں جو کبھی کسی محقق کے نظام عمل کا جزو نہیں بن سکتیں۔

نواب صدر شعبہ نے مختلف اداروں اور بعض افراد کی علمی خدمات کے متعلق جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے:

پنجاب یونیورسٹی (۱) فہرست العقد ابن عبد ربہ کی عقد الفرید جیسی اہم کتاب کی تشریحی فہرست (۲) اقلید الخزانہ یعنی عبد القادر بغدادی کی خزانۃ الادب جیسی جامع تصنیف کی تشریحی فہرست۔ (۳) تتمہ صوان الحکمۃ بیہقی۔ تتمہ صوان الحکمۃ کے مصحح نسخے کی اشاعت (۴) زبدۃ التواریخ یا اخبار دولت سلجوقیہ کی تصحیح و تہذیب (۵) امیر خسرو کی زندگی اور کارناموں کا تاریخی مطالعہ (۶) میر قدرت اللہ کا مجموعہ نغز۔ حسب ذیل کتابیں مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں، یا آیندہ شائع ہونے والی ہیں۔ مجلس مخطوطات فارسی: نامہ امیر خسرو، شائع ہو چکا ہے۔ بربان المآثر زیر طبع ہے۔

**فرہنگ نظام**۔ فرہنگ نظام یا فارسی زبان کا جدید لغت بھی ایک اور بڑی اہم ہے جس کی تالیف میں آقای سید محمد علی داعی الاسلام صاحب پروفیسر فارسی نظام کالج مصروف ہیں اس وقت تک سرکاری مصرف سے اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ بقیہ حصہ زیر ترتیب ہے۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ: اس ادارے نے مسٹر کرنکو جیسے مشہور مستشرق کی خدمات اپنے لیے محفوظ کر لی ہیں۔ تذکرۃ النوادر اسلامی علوم کی اہم اور نادر کتابوں کے ذکر میں اس ادارے کی طرف سے چھپ چکا ہے اور المنہاج لطبع الکتاب، رسالہ لامحہ عمل حال میں مرتب ہو گیا ہے۔ اسی سے زیادہ مستند تصانیف اس ادارے نے اس وقت تک شائع کی ہیں۔

محمود حسن خاں صاحب عربی زبان میں مصنفین اسلام کا تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ اس وقت تک چار جزو شائع ہوئے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ اور اردو کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

**اردو کی تمدنی قیمت** اگرچہ زائر کا اس جامعہ کے تعلیمی لوازم، ساز و سامان، ماحول اور دیگر ذرائع کو دیکھ کر حیران ہو جانا ممکن ہے۔ لیکن کیا بیرونی ممتحن طلبہ کی قابلیت اور صلاحیت کے بہترین حکم نہیں ہیں؟ جو ان کو غیر جانب دارانہ طریقہ پر

اردو زبان کی اہمیت اور تمدنی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ بعض مختلف مسلک طلبا نے بھی بیانوں میں اس امر کا اعتراف
کیا ہے کہ خود ان کے طلبہ کو مضامین پر اس قدر قدرت حاصل نہیں اور نہ وہ اظہار ما فی الضمیر کے لیے ایسے اسلوب بیان کے حامل
ہیں جیسا کہ بعض فرزندان جامعہ کو اردو زبان میں اکتساب کی وجہ سے عبور حاصل ہے۔

**ذرائع اکتساب** جب جامعات کا اصلی مقصد ترویج علم ہے اور طالب علم سے توقع کی جاتی ہے کہ "ہر گوشہ
خرمنے" اور ہر زبان سے استفادہ اور ہر ملک میں تحصیل کی غرض سے جادہ پیمائی کرے تو پھر کیوں ایک جامعہ اور دوسری جامعہ
میں ذریعہ تعلیم کی بنیاد پر حدود فاصل قائم کیے جائیں۔ ؟ کوئی زبان خواہ انگریزی ہو یا فرانسیسی یا جرمن یا کوئی اور تنہا
زبان علم و حکمت کی اجارہ دار نہیں ہو سکتی۔ اسی خیال کے پیش نظر جدید جامعات میں پروفیسر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے
مضمون کے ادب پر زبان کی قید و بند سے آزاد ہو کر عبور حاصل کرے اور اپنے مخصوص موضوع پر خیالات کا اظہار ایسے سہل الفہم
طریقے سے اور ایسی زبان کے ذریعے کرے جو طلبہ کی ذہنیت سے بالکل قریب ہو اور تشنگان علم کی سیرابی کر سکے۔ جامعہ عثمانیہ
میں اسی اعلیٰ اصول کے مطابق ملک کی عام فہم زبان کو ذریعہ علم قرار دیا گیا ہے۔

**لسانی معیار** یہ بات ہندوستان کے ایک اور دلچسپ لسانی مسئلے کی طرف رہبری کرتی ہے جس کا ہمیں خالص
تعلیمی مدعا کے تحت حل کرنا ضروری ہے۔ کیا کسی زبان کو کسی خاص فرقے یا مذہب یا قوم کے مفاد کے ساتھ وابستہ اور علم کی
مقدس دیوی کو غبار آلود کرنا چاہیے ؟ کیا کسی زبان کی پختگی سے اس کی خصوصیات کا اندازہ کرنا چاہیے یا صرف اس کے
رسم الخط کے اعتبار سے ؟ کیا کسی زبان کی عمومیت اور مقبولیت پر غور کرنا چاہیے یا اقلیتوں کی مشکلات سے اس کو جانچنا چاہیے ؟
کیا کسی زبان کی سرمایہ داری اور اس کی علوم قدیمہ اور جدیدہ حکمیہ و عقلیہ کو بخوبی اخذ کرنے کی صلاحیت کو پیش نظر رکھنا چاہیے
یا محض جذباتی تعلق کی بنا پر مادری زبان ہونے کی حیثیت سے اس کی نسبت اظہار الفت کرنا چاہیے ؟

**اردو کی عمومیت** مجھے کامل یقین ہے کہ آپ مجھ سے اس معاملے میں اتفاق کریں گے کہ ہندوستان (یا ہندوستان
اعظم کی صورت میں ہم سب اپنی مادر وطن کو متشکل ہوتے ہوئے دیکھنا پسند کریں گے) کا ایک کثیر حصہ اردو بولنے اور سمجھنے پر
قادر ہے۔ کیا ہندوستان کے مختلف حصوں میں سوائے اردو کے کوئی اور ہندوستانی زبان اس عمومیت کے ساتھ
بولی جاتی ہے۔ اگر ہندوستان کا لسانی جائزہ لیں تو یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جائے گی کہ اردو کا میدان ہندوستان کی
تمام دوسری زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ وسیع ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم سب ایک عام
زبان کی تشکیل میں یک جہتی کا ثبوت دیں اور زبان کے صوبہ داری میلانات اور اختلافات کو رفع کر کے اردو کو
اظہار خیال کا واحد ذریعہ قرار دیں۔

**تشکیل جدید** ۔ حضرات! اردو زبان کی تشکیل جدید اور ہندوستانی زبانوں میں اس کے مرتبے پر
تقریر کو ختم کرنے سے قبل آپ کی اجازت سے اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا اور مجھے اس بات سے

انتہائی مسرت ہوگی اگر آپ بھی اس موضوع پر کشادہ دلی سے اظہار رائے کریں اور مفید تجاویز پیش فرمائیں۔ اس سلسلے میں آپ یقیناً منظم کوشش اور ایک مرکزی ادارے کی ضرورت محسوس کریں گے جس کا تمام ہندوستان میں یکساں احترام کیا جائے۔ جو مقامی اور صوبہ واری تعصبات سے تمام تر پاک ہو، دنیائے اردو میں اپنے اقتدار علمی کو قائم رکھ سکے اور زبان کی عظمت کے اضافے کا موجب ہو۔ اس خصوص میں اردو اکاڈمی، جامعہ ملیہ دہلی، دار المصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد، دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اور دوسرے ادارے جو اردو کی ترقی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں ہر طرح لائق تحسین ہیں۔ مگر مزید ترقی کے لیے ایک تمام ہندا ردو وفاق کی تشکیل ناگزیر ہے جس کی رہنمائی میں اصلاح زبان، توسیع ادب اور اعلیٰ علمی تحقیقات کا کام صحیح اصول پر انجام پائے۔

**اصلاح زبان** اصلاح زبان کے لیے اس کی ساخت، عناصر، ہیئت و ترکیب اور قواعد کی خامیوں کو دور کیا جائے، ایک متفق علیہ رسم الخط ایجاد کیا جائے، ایک مشترک نام اختیار کیا جائے، ایک ایسا معیاری اصول قائم کیا جائے جس کے ذریعہ ثقیل اور نامانوس الفاظ خارج کیے جائیں اور لسانی اتحاد کی خاطر مقامی محاوروں کے جزوی اختلافات اور مختلف مسلکوں کے رجحانات کو بالکل نظر انداز کیا جائے۔

**توسیع ادب** توسیع ادب کے لیے ضروری ہے کہ جدید اصول پر زبان سرمایہ دار بنائی جائے، مختلف زبانوں کی معیاری کتابوں کا ترجمہ کیا جائے اور مختلف علوم و فنون کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی جائے۔ ایک مستند لغت اور ایک انسائیکلوپیڈیا یا جامع العلوم، اجتماعی مساعی سے مرتب کیا جائے۔ جدید مفاہیم کے ادا کرنے کے لیے نئے الفاظ وضع کیے جائیں۔ علمی اصطلاحات متعین کی جائیں، اخباری و صحافتی ادب نیز طباعت و اشاعت کا معیار بلند کیا جائے۔ نثر کی طرز نگارش میں اعلیٰ علمی و فنی اسالیب اختیار کیے جائیں حقیقی شعر و سخن کی عظمت کا اعتراف کیا جائے اور ادبی جد و جہد میں بلند ہمتی اور اعلیٰ مقاصد پیش نظر ہوں۔

**تحقیقات علمی** زبان و ادب کو درجہ کمال پر پہنچانے کے لیے لازمی ہے کہ عالمانہ اصول کے تحت مخصوص موضوعوں پر مبسوط مقالے اور رسالے شائع کیے جائیں، محققانہ اصول پر تنقید و تبصرہ کا کام انجام پائے، تاریخی، تحقیقی و تنقیدی تالیفات مرتب کی جائیں، اور مستند و جامع تصانیف تحریر کی جائیں اور بلند پایہ شہکار پیدا کیے جائیں تاکہ ہندوستان حب الوطنی کے حقیقی جذبہ کا ثبوت قومی یکجہتی کی یکتا نظیر اور لسانی عظمت کی لاثانی مثال دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔

**روس اور انگریزی ادب** انگریزی کے جدید و قدیم ادب سے روسیوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ابھی حال میں شیکسپیر کے دو تماشے دکھائے گئے تھے، اور ڈکنس کا یک وکہ پیپرز بھی تمثیل کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں اہل قلم کی ایک کانگرس بمقام موسکو منعقد ہوئی تھی، جس میں بالشویکی مصنفوں کے علاوہ ممالک غیر کے وہ اہل قلم بھی شریک ہوئے تھے جو ان کے ہم خیال ہیں۔ اس کانگرس میں متعدد مقرروں نے اس پر زور دیا کہ ادب کے شاہکار پیش

کرنے کے لیے راسخ العقیدہ بولشوی ہونا ضروری نہیں، اور روسی افسانہ نگار اور شاعر بورژوا مصنفوں کے طریق کار کا مطالعہ کرکے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ میکسم گورکی، نکولائی بکارین اور کارل راڈک کی تقریروں سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ بالشوی حکومت بھی انقلاب کے ابتدائی زمانے کے ادبی مسلک کو ناپسند کرتی ہے۔ بالشویک نقطۂ نظر کے تغیر کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا کہ ۱۹۳۰ء میں اولڈس ہکسلے کے پوائنٹ کونٹر پوائنٹ کا ترجمہ روسی زبان میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا لہجہ مایوسانہ ہے، اور ایک لمحے کے لیے بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ بالشوی عقائد کی تبلیغ میں اس سے مدد مل سکتی ہے۔ ولز کی روسی انقلاب پسند ہمیشہ تضحیک کیا کیے۔ لیکن ابھی حال میں اس کی ۶ کتابوں کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ انگریز اور امریکی مصنفین کی اور کتابیں جو حال میں چھپی ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:- دن مور ریور از گولز ورذی، ہیرو کی موت از ا، گرنل کی بیٹی، از رچرڈ ایلڈنگٹن، سورج بھی طلوع ہوتا ہے، از ارنسٹ ہمنگوے، ایرو اسمتھ از سنکلیر لیوس، ڈورتھی سکنڈ پیریلل از جون ڈوس پاسوس، افسانہ نویس کا افسانہ از شروڈ اینڈرسن۔

(۸) ابھی حال میں ممالک متحدہ امریکہ کے تین سربرآوردہ ادیب اڈورڈ ویکس (اڈیٹر اٹلانٹک منتھلی پریس) جون ڈیوی (استاذ فلسفہ کولمبیا یونیورسٹی) اور چارلس لے بیرڈ نے ایسی ۲۵ کتابیں منتخب کیں جو پچاس سال کے اندر شائع ہوئی ہیں اور جن کا اور نئی کتابوں کے مقابلے میں دنیا کے عمل اور خیال پر زیادہ اثر ہوا ہے۔ تینوں کی فہرستوں میں سب سے آگے یہ تین نام ہیں۔ سرمایہ مصنفہ کارل مارکس، نوکنگ بیکوارڈس مصنفہ اڈورڈ بلیمی، دی گولڈن باؤ مصنفہ سر جیمس فریزر۔ حسب ذیل کتابیں بھی کسی نہ کسی فہرست میں ہیں:- میرڈوا از ڈاکٹر میری اسٹوپس، دی میتھیمیٹکل تھیوری اوف الکٹریسٹی اینڈ میگنیٹزم از سر جیمس جینز، نظریہ اضافت از آئنسٹائن، بیرک روم بیلڈز از کپلنگ، پلیز پلیزنٹ اینڈ ان پلیزنٹ از برنرڈ شا، تاریخ عالم از ولز، میری لشکرکشی از ہٹلر، زوال مغرب از اشپنگلر۔

(۹) عبدالرزاق الخیری صاحب اپنے والد بزرگوار مرحوم عبدالراشد الخیری کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں۔ مرحوم کے مضامین اور متفرق تحریریں جو اخباروں اور رسالوں میں گزشتہ ۳۰ سال میں شائع ہوئی ہیں جمع کی جارہی ہیں۔ اندازہ ہے کہ ان کا مجموعہ ۲۰ جلدوں میں شائع ہوگا۔

(۱۰) رسالہ ہمایوں کے مشہور مضمون نگار فلک پیما کے مضامین کا مجموعہ بہت جلد دفتر ہمایوں سے شائع ہوگا۔

(۱۱) انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ اپریل کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ اس میں ایک دن صرف اُردو کے لیے مخصوص تھا۔ اور اس دن صدر جلسہ عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اُردو تھے۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے زبان کو ترقی دینے کی تجاویز پیش کیں، جامعۂ اُردو کی تحریک کا ذکر کیا؛ اور اردو کے ادیبوں کو رومانیت کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرکے ادب کو قوم کی ضروریات اور حالات کے مطابق بنانے کی اہمیت پر زور دیا۔ اردو اور ہندی

کی نزاع کے متعلق انھوں نے جو کچھ کہا اس کا ایک حصہ یہ ہے۔ "ہنس کے فاضل اڈیٹر اکتوبر کے رسالے میں فرماتے ہیں۔ اگر اصل زبان سناؤں تو آپ کے سمجھانے کے لیے مترجم کی ضرورت ہوگی:

" اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سرداروں نے اسے **زندہ ملکی زبان** بنانے کا عہد کر چکے ہیں:

خود مہاتما جی کا خط ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے ہنس کے متعلق تحریر فرمایا ہے:۔

" ہنس ہندوستان بھر میں انوکھا پرتن ہے۔ یہ ہی ہندی اتھوا ہندستانی کو راشٹر بھاشا بنانا ہے تو ایسے مالک کی آوشکتا ہے۔ پرتیک پرانت کی بھاشا میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کا پریچے راشٹر بھاشا دوارا سب کو ملنا چاہیے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب ایسا پرچے دل چاہے اُن کو ہنس دو اپرت ماس آدھے روپے میں ملا کرے گا۔"

اس ہوشیاری کو آپ نے دیکھا، اب تک ملک کی زبان "ہندستانی" تھی اور سب سے زیادہ منظم اور باوقعت کانگریس نے اسے علی الاعلان تسلیم کر لیا تھا۔ لیکن اب ہندی یا ہندستانی ہو گئی۔ یا ہندستانی الفاظ خاص ذہنیت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ حذف ہو جائیں گے بلکہ یہ سمجھیے کہ ہو گئے جیسا کہ ہنس کے اڈیٹروں کی تحریر سے صاف ظاہر ہے۔ اب اس تحریر کا اسے مہاتما جی ہندستانی کہتے ہیں، مہاتما جی کے اس خط سے مقابلہ کیجیے جو انھوں نے حکیم اجمل خاں کو اُردو زبان اور اُردو رسم خط میں لکھا تھا اور جس کا عکس بعض رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ان دونوں پر سے ہم کس زبان کو ہندستانی کہیں۔ زبان کو سیاسیات کے خارزار میں گھسیٹنے اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنانے کا یہ نتیجہ ہے کہ دو طبقوں میں بجائے اتفاق کے نفاق اور بڑھتا جاتا ہے۔

اب مہاتما جی جس زبان کو ہندی یا ہندستانی کہتے ہیں اس کا ایک نمونہ تو آپ نے خود ان کے خط میں دیکھ لیا، دوسرا نمونہ ہنس کے فاضل ایڈیٹر منشی پریم چند کی تحریر سے پیش کیا جاتا ہے:۔

" آپ نے بہت ٹھیک کہا کہ کوتا کیوں منورنجن کی وستو نہیں اور نہ کا کا کر سنانے کی چیز ہے۔ وہ تو ہمارے ہردے میں پر پرناؤں کو ڈالنے والی، ہمارے اوساد گرست من میں آنند ے ابھوتی کا سنچار کرنے والی، ہم میں کومل بھاو ناؤں کو جگانے والی استرین بھاوناؤں کی نہیں) وستو ہے۔

اسے مہاتما کا دس ہی ہندوستانی کہہ سکتے ہیں ورنہ کسی اور زبان داں کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ میں نے آسان جملہ آپ کو سنایا ہے اگر میں اس رسالے کے کسی مضمون کا کوئی حصہ سناتا تو آپ کانوں میں انگلیاں دے لیتے اور کہہ اُٹھتے:

گر تو ہندی بدیں نمط خوانی ببری رونق زباں دانی

اور یہ بھی یاد رہے کہ جو جملے میں نے ابھی آپ کو سنائے ہیں وہ ایسے شخص کی تحریر ہے جو اُردو کا بھی ایسا ہی اچھا ادیب ہے جیسے ہندی کا، اور جو اُن لوگوں میں سے ہے جو ہندوستانی زبان کے فروغ کے حامی ہیں۔ مجھے اس کی زبان پر مطلق اعتراض نہیں

یہ بہت صحیح اور فصیح ہندی ہے لیکن اسے ہندوستانی کہنا لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ ممکن ہے کہ مہاتما گاندھی جو جو توجیہ و تاویل کے فن کے اُستاد کامل ہیں لفظ "اتھوا" یا "کے" کچھ اور معنی پیدا کرلیں ورنہ بحالت موجودہ "ہندی یا ہندستانی" کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہوسکتا۔ زبان کا آسان یا مشکل ہونا ایک دوسری بات ہے۔ ہر ایک کا ایک اسلوب بیان یا طرز تحریر ہوتا ہے اور خاص کر ادبی اور سائنٹفک مضامین میں لامحالہ زبان مشکل ہوجاتی ہے لیکن جو تحریر جس زبان میں ہے اسے اُسی زبان سے منسوب کرنا مناسب ہے۔ لفظوں کے ادل بدل سے غلط فہمیاں پیدا کرنا درست نہیں۔ میں یہ بھی عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے "ہنس" کے قابل اڈیٹروں نے اپنے رسالے کی زبان کو کبھی ہندستانی نہیں کہا۔ یہ مہاتما گاندھی ہی ہیں جو "ہنس" کی زبان کو ہندستانی کہتے ہیں اور ایسی بڑی جسارت ایسا ہی بڑا آدمی کرسکتا ہے۔ اگرچہ "ہنس" کے اڈیٹروں کو اس قول کے تسلیم کرنے میں بہت تامل ہے کہ اب ہندی زبان تمام ہندوستان کی عام زبان ہوگئی ہے۔

(۱۲) لاہور میں ایک انجمن "انجمن اردو پنجاب" کے نام سے قائم ہوئی ہے، جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔ (۱) اردو زبان اور رسم الخط کی ترقی اور ترویج، (۲) اردو کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کی حیثیت سے فروغ دینا۔ (۳) [illegible] اور معیاری زبان کو جدید اور مقامی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے وسعت دینا۔ (۴) ایک شعبۂ ادب کا قیام جس میں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مقالے پڑھے جائیں اور جس کے ماتحت تصنیف و تالیف اور تراجم اور تحقیق و تدقیق کا کام کیا جائے (۵) اردو کے نشوو ارتقا کا جائزہ لیتے رہنا۔ (۶) اخبارات، رسائل، سینما، ریڈیو وغیرہ کے ذریعے سے اردو کی نشرو اشاعت۔ (۷) اردو زبان کی موجودہ دفتری، عدالتی اور تعلیمی حیثیت کا تحفظ۔ (۸) پنجاب یونیورسٹی اور محکمۂ تعلیم میں اردو کے فروغ کی کوشش کرنا۔ (۹) اردو کی کتابوں کی زبان کا احتساب، انتقاد اور اصلاح۔ (۱۰) مختلف مقامات میں باقاعدہ ملحقہ انجمنوں کا قیام اور الحاق اور جہاں کہیں ایسی انجمنیں موجود ہوں ان کو الحاق کی دعوت دینا۔

انجمن کے سرپرستوں میں سر محمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو، سر اکبر حیدری، سر راس مسعود، سر عبدالقادر کے نام نظر آتے ہیں اس کے صدر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ہیں، اور معتمد میاں بشیر احمد صاحب مدیر ہمایوں۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۲ مئی کے جلسے میں ۱۲۰۰ روپے بھی جمع ہوئے۔ میاں بشیر احمد صاحب کا چندہ سب سے زیادہ تھا یعنی ۵۰۰ روپے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انجمن اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی۔

(۱۳) مان پوری صاحب کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ دفتر ندیم سے بہت جلد شائع ہونے والا ہے۔

# اوراق پارینہ

(۱) دیوان دوم معروف، از ق ۔ ع ۔ د

(۲) دریائے لطافت حصہ منطق نوشتۂ قتیل، از ق ع د

(۳) حیدر آباد کے کتب خانوں میں اردو کی قلمی تحریریں، از معین الدین دردائی صاحب

(۱) **دیوان دوم معروف** یہ مسلمات سے ہے کہ معروف کے دو دیوان ہیں۔ دیوان اول طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے سطور ذیل کا مقصد دیوان دوم کا تعارف کرانا ہے۔ اس دیوان کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کی ابتدا میں تمہید کے ۵ صفحے ہیں جو نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کے لکھے ہوئے ہیں ۔ اس تمہید کا بیشتر حصہ دیوان اول کے ساتھ چھپ گیا ہے۔ وہ حصہ جو کسی وجہ سے خارج کر دیا گیا تھا، ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"معروف مرحوم کا سرمایۂ اولاد دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بیاہتا بی بی سے تھا، اور ایک بیٹا حرم سے تھا....

معروف مرحوم کی حرم سے جو صاحبزادے تھے ان کا بیان بسبب جوالت ہم نے ترک کر دیا ہے"

"حافظ غلام رسول ویران مرحوم نابینا تھے، اور ذوق کے اولین و بہترین شاگردوں میں تھے، اور اتنے معمر تھے کہ شاید دو چار سال ذوق مرحوم سے عمر میں کم ہوں گے۔ ان کا مزار بیرون احاطہ حضرت خواجہ باقی باللہ سمت شمالی واقع ہے۔ اور پروفیسر آزاد مرحوم تو غدر سے پہلے جب ذوق مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے بالکل نو عمر تھے، شاید پندرہ سولہ سال کا سن ہوگا جو حاضر باشی ویران مرحوم کو حاصل تھی وہ آزاد کو کہاں میسر، یہ ان کی صحبت کے قابل تھے نہ یاران طریقت تھے (کذا) ان کو اپنی طالب علمی سے ہی اتنی فرصت کہاں تھی جو ذوق مرحوم کے جلیس ہوتے یہ تو کچھ اپنی نوجوانی کے جوش میں کہتے تھے اس کی اصلاح ذوق مرحوم سے لے آتے تھے۔ بہ مزید احتیاط حافظ ویران صاحب سے بھی جو حضرت قبلہ ام کی خدمت میں اکثر تشریف لایا کرتے تھے، یہی امر دریافت کیا تو انھوں نے صاف کہا کہ کبھی استاد مرحوم یعنی ذوق مرحوم سے میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے فرمایا ہو کہ حضرت معروف میرے شاگرد تھے، یا میں ان کو کلام بنایا کرتا تھا۔ بلکہ اثنائے سخن میں جب معروف مرحوم کا ذکر آتا تھا تو فرماتے تھے کہ ان کو مذاق سخن اعلیٰ درجے کا تھا، اکثر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، اپنا کلام سناتے تھے اور میرا سنتے تھے، داد سخن کی بزرگانہ نوازش فرماتے تھے:

"ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے، آزاد مرحوم کی تحریر و عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ معروف مرحوم فخر الدولہ کے بڑے بھائی تھے، حالاں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت معروف کے زہد و ورع اور متبع شریعت و اہل طریقت و صاحب سنت ہونے نے بہ فحوائے آیۂ کریمۂ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم، بڑے بھائی کے دل میں چھوٹے بھائی کی وہ وقعت و عظمت قائم کی تھی کہ وہ حفظ مراتب میں بہت ہی غلو کرتے تھے۔ غالباً جس سے اجنبی دیکھنے والے یہ سمجھتے ہوں کہ معروف بڑے ہیں اور فخر الدولہ چھوٹے۔ مگر ایک وقائع نگار کی ایسی

ادائے تحریر پر ضرور انجان لوگوں کو خلاف واقعہ علم ہوتا ہے، اور جاننے والے مولف کی بے علمی یا سہو و خطا کا گمان کرتے ہیں۔ اب ہم کسی قدر اس جملے کی تشریح کرتے ہیں جو آزاد مرحوم نے مبہم طور پر لکھا ہے۔ "یہ ساری سخاوتیں اسی سعادت مند بھائی کی بدولت تھیں جو دن بھر سرانجام مہام میں جان کھپاتا تھا، راتوں سوچ میں گھلتا تھا اور خاندان کے نام کو زندہ کرتا تھا، اور ان سے فقط دعا کی التجا کرتا تھا۔" جملہ مذکورہ بالا صفحہ ۴۰۱ دور پنجم ذکر ذوق میں تحریر ہے۔ یہاں سے تشریح کا جو لکھتا ہوں یہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے۔ معروف مرحوم کی تمام خانہ داری کا خرچ یعنی مایحتاج خانہ، جاڑے گرمی کا کپڑا، زنانہ و مردانہ مکانات سکونت، ان سب باتوں کی کفالت فخرالدولہ مرحوم کی طرف سے ہوتی تھی۔ علاوہ بریں، ایک پالکی، ایک ہوادار، آٹھ کہار، دو گھوڑے خاصے اور دو گھوڑے رفیقوں کے لیے اور چار سوار، اردلی کے لیے، منشی، داروغہ، خدمتگار، چوبدار، ہرکارہ، فراش، اعلیٰ ادنیٰ کل ملازمین جو ایک سرکار کے لیے لازمی ہیں، یہ سب اسی سعادت مند مگر عمر میں بڑے بھائی کی طرف سے تعینات تھے۔ تین سو روپے ماہوار صرف جیب خرچ کے لیے ملتے تھے جو روزمرہ کی خیرات، صدقہ، تازے میوہ خوری کے لیے مقرر تھے، تاہم ہر سال دو تین ہزار روپیہ اور قرض بھی ادا کیا جاتا تھا، جو حضرت معروف کا دست تنگی اپنے اوپر بار کر لیتا تھا۔ حضرت معروف کی تصنیف سے دو دیوان کامل اور ایک تسبیح زمرد راقم کے پاس تھے، لیکن کوئی بزرگوار دیوان اول اور تسبیح زمرد اڑا لے گئے، صرف یہ دیوان دوم میرے پاس رہ گیا ہے۔ فقط

راقم میرزا سعیدالدین احمد خاں عرف احمد سعید طالب عفی عنہ، روز دوشنبہ ۲۷ محرم الحرام سنہ ۱۳۳۱ ہجری القدسی
مطابق ۶ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء

تمہید کے بعد چند اوراق سادہ چھوڑ دیے گئے ہیں۔ دیوان کے پہلے صفحے میں ۱۰ شعر ہیں، مسطر ۱۱ سطروں کا ہے، لیکن چونکہ مقطع عموماً دو سطروں میں لکھا گیا ہے، اشعار کی تعداد فی صفحہ ۱۰ سے کم ہے۔ غزلیں ۳۱۳، ۱۱۱ اوراق میں ہیں۔ اشعار کی تعداد ۳۵۵۹ ہے، ۷ شعروں کی جگہ خالی ہے، ۲ شعروں کے صرف ابتدائی الفاظ لکھے ہوئے ہیں، اور ۶ کے صرف ایک ایک مصرعے ہیں۔ دیوان کا آغاز اس مطلع سے ہوتا ہے:؎

منھ اپنا کہاں اس کہ جو حقوں کے بیاں کا ✣ بندے کی زباں ایک، وہ خالق دو جہاں کا

معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کی تصحیح اور مقابلہ دوسرے نسخوں سے بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ ذیل کی عبارتیں پنسل سے لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ "یہ غزل نصیر مرحوم کے دیوان میں نہیں ہے۔" "یہاں تک تمام کلام وہی ہے جو میرے دیوان میں موجود ہے" "یہ شعر زائد ہے" "سری رام کے ہاں کے دیوان میں یہ غزل نہیں ہے" "نہیں" کا لفظ کاٹ دیا گیا ہے۔ ایک جگہ سرخ روشنائی سے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں "یہ شعر درست ہے اور دیوان میں نہیں ہیں" کہیں کہیں پنسل ہی سے تصحیح بھی کی گئی ہے اور نسخوں کے اختلاف بھی دکھائے گئے ہیں۔

سے سامنے تم آجاتے ہو جب دھیان تمھارا کرتے ہیں، اس غزل کے صرف ۴ شعر دیوان میں ہیں، بعد کا ورق اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔ ؎

نشے میں جب وہ کہتا ہے کہ مجھ کو نیند آتی ہے ٭ تو پھر اس کو اٹھا کر میں چھپرکٹ پر لٹاتا ہوں

یہاں پر سے ۱۰۰ ورق کسی نے پھاڑ لیے ہیں، نشان موجود ہے، غزلیات کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے:

خارجی سن کے جلے جی میں نہ کیوں اے معروف ٭ جب کہ تو منقبتِ حیدرِ کرار پڑھے،

ورق ۱۱۳ کے خاتمے پر کاتب نے یہ عبارت لکھی ہے " تمام شد دیوان معروف بخط بے ربط بندہ لال جی پرشاد کایتھ ملازم ریاست نواب صاحبان کرنال تحریر یافت۔ ۲۰ جون ۱۸۵۳ء۔ اس کے بعد ۲ ورقوں میں متفرق کلام حسب تفصیل ذیل ہے:

غزل ناتمام ۳ ½ شعر، مصرع اول " اگر وہ خاک پا ہم دیکھ پاتے اپنی آنکھوں سے "

رباعیاں ۲، رباعی اول: کوئی پابند زلف عنبر مو ہے ٭ اور کوئی اسیر حلقۂ گیسو ہے "

جو ہے انھیں دل لگے بلا ہیں وہ ٭ ان سادہ رخوں کی یہ تو سادہ خو ہے "

آخری رباعی۔ یہ در اصل رباعی نہیں، لیکن دیوان میں اس کا شمار رباعیوں میں کیا گیا ہے:

' پاس غیر اتنا ہے اس کو کچھ کہا جاتا نہیں ٭ خواب میں بھی دور ہی رہتا ہے پاس آتا نہیں '

' واقعی وہ ایک ہی ظالم ہے لیکن دوستو ٭ کیا کروں ایسا حسیں تن دوسرا پاتا نہیں۔

متفرق اشعار ۱۰، ان میں ۳ ایک ناتمام غزل کے ہیں۔ ؎

دل کے سوز غم سے جب اپنے کو کاجل سا کرے ٭ تب کوئی ہاں یار کی آنکھوں میں اپنی جا کرے

ہماری آنکھ سے جس نے ضیا کو دیکھا ہے ٭ قسم خدا کی کہ اس نے خدا کو دیکھا ہے

یہ نہیں خواہش کہ ہر ہو یا ستائے حسکم میں ٭ جس کے ہم محکوم ہیں وہ ہو ہمارے حکم میں

بات کیا سامنے اس کے کرے انسان درست ٭ دیکھ کر اس کو تو رہتے نہیں اوسان درست

شعر آخر: جب تک کہ ہاں یار کی یارب خبر آئے ٭ ہوئے نہ خبر بے خبری اس قدر آئے

خاتمہ: تمام شد دیوان بلاغت عنوان نواب الٰہی بخش خاں صاحب المتخلص بہ معروف، کہیں پور مرزا عارف جان، برادر زادہ شرف الدولہ قاسم جان، امرائے نجف خانی، باشندۂ دہلی، شاگرد رشید جناب حضرت شاہ نصیر الدین دہلوی، چشتی، صابری، المتخلص بہ نصیر، قدس سرہ البصیر۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر محمد اسمٰعیل خاں ذبیح دہلوی کی طرف سے آزاد پر چند اعتراض ہیں مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۱۳ء (دو ورق)

دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر اور ناسخ کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ جرأت کے رنگ کی بھی غزلیں ہیں لیکن کم۔ درد کی طرز میں بھی غزلیں ہیں لیکن اتنی نہیں کہ آزاد کے اس قول کی تصدیق کے لیے کافی ہوں کہ آخر میں درد کی طرز میں آگئے تھے۔ محاورہ بندی کا بھی انہیں خاص شوق ہے خیال تھا کہ ایسے اشعار یا مصرعے جن میں محاورے بندھے ہوں جمع کیے جائیں لیکن اس نیت سے چند صفحات سے زیادہ پڑھنے کا ہمیں موقع نہ مل سکا۔ بعض مصرعے اور اشعار ملاحظہ ہوں:
آتش دل پہ مرے ہے کوئی نکھا کرتا + توسن فکر کو معروف بے کوڑا کرتا + ضلع وہ غیر سے دریا کا بولا کرتا + گر کبھی اس لب شیریں سے یہ ہوتا دو کش  تو میں شہد کو پانی سے بھی پتلا کرتا + چوٹ تجھ سے لے فلک نہ امیر کلاں گرا  تھا تھا نہیں پر پھر کبھی ہاتھی جہاں گرا + مر ہی گئے تھے ہجر کی شب لیک بچ گئے  کیا جانے کب کا آگیا آڑے دیا دیا + سن لیجو جلجلنے میں یہ آج کل پڑا + سب راز ہو گیا وا آنکھیں جو ڈبڈبائیں  تو وہ ہی پیش آیا تھا جو کہ جی میں ڈوب گا۔

دو تین غزلیں ملاحظہ ہوں:-

کیا کیجیے اگر دل سے غم اس کا نہیں جاتا — گھر آئے کو تو گھر سے نکالا نہیں جاتا
پاس اب ترے بیمار کے بیٹھا نہیں جاتا — دیکھا ہے یہ حال اس کا کہ دیکھا نہیں جاتا
ہم اور نہ کہتے اسے احوال دل اپنا — باعث ہی کچھ ایسا ہے کہ بولا نہیں جاتا
مت ڈھونڈھ اسے جو گم ہے تری یاد دہن میں — عنقا سے بھی کھوج اس کا تو پایا نہیں جاتا
ہم جان سے جاتے ہیں اگر اس کو عزیزو — لے آؤ تو کچھ اس میں تمہارا نہیں جاتا
ایسا نہ ہو وہ قبر پہ ساتھ اور کو لائے — یہ دل سے پس از مرگ بھی دھڑکا نہیں جاتا
یہ حال ہے اب تو دل پر درد کا اپنے — بیدرد سے بھی ہاتھ لگایا نہیں جاتا
کیونکر ثمر نخل تمنا کو نہ ترسیں — واں ہے کہ جہاں ہاتھ ہمارا نہیں جاتا
گو خوب رعاب خوب دکھائی نہیں دیتے — پر دیکھنے کا ہم سے یہ لپکا نہیں جاتا
قاصد جو مرا جاتے ہی سے آئے ہے بے پیغام — کیا جانے کہ جاتا بھی ہے واں یا نہیں جاتا
جاتے تو ہیں واں یار بہت میری طرف سے — لائے جو اسے یاں کوئی ایسا نہیں جاتا
ہے حق کی طلب تجھ کو تو جو یا ہو کہ معروف — پیاسے کو کبھی ڈھونڈھنے دریا نہیں جاتا
رتبہ دیکھو اپنی نسبت کا کہ اس محفل میں ہے — قرب دیکھو اپنے کینے کا کہ اس کے دل میں ہے
ہم جان سے دل نہیں اپنا لرزتا وقت قتل — ہے یہی دھڑکا کہ رعشہ پنجۂ قاتل میں ہے
خالق ارض و سما جس میں سمایا دیکھنا — دل ہے وسعت کتنی وسعت [illegible] دل میں ہے
وصل گرچہ سعی سے ممکن نہیں لیکن کوئی — ہم سے پوچھے جو مزہ اس سعی لاحاصل میں ہے

تو اگر مجنون ہے تو ہم نے خبر کر دی تجھے
دل سے مت رہ بے خبر لیلیٰ ہی محمل میں ہے

ہفت خواں کی منزلیں ہیں جس کے آگے ایک گام
ہر قدم پر بیم جاں یہ عشق کی منزل میں ہے

عشق سے کرتا ہے کیوں اتنی ملامت تو مجھے
ناصحا یہ عشق تو انساں کے آب و گل میں ہے

اس کے سایے کو اٹھانے جا زمیں سے اے فلک
مردمک در کار گر چشم مہ کامل میں ہے

جوں گل نرگس سے مجھے چشم کشادہ کار رو
دخل کب ناخن کو میرے عقدۂ مشکل میں ہے

دیں مجھے وقت شہادت بھر کے حوریں لاکھ جام
لیک میری روح آب خنجر قاتل میں ہے

جو تپ غم سے کہ میری نبض میں ہے اضطراب
یہ تپش معروف کو ہو گو رگ بسمل میں ہے

معروف نے اس دیوان کی بعض زمینوں میں سہ غزلے بھی لکھے ہیں، دو غزلوں کے مقطعے ملاحظہ ہوں:۔

تیسری بھی غزل ایک اور مری سن معروف
ہوں نئی طرح سے اظہار تمنا کرتا

سنائے تیسری بھی اب غزل معروف پھر ایسی
کہ منھ تھک جائے تحسیں کرتے کرتے نکتہ سنجاں کا

ایک مطلع حضرت علی کی شان میں ہے۔ اس شعر سے بہت ملتا جلتا ہے جو آزاد نے مظہر کی طرف منسوب کیا ہے

ہوں تو سنی پہ علی سے دوستی جانی مجھے
خواہ ایرانی کہو اور خواہ تورانی مجھے

اعظم الدولہ سرور اور حسام الدین حیدر خاں نامی کی طرف دو شعروں میں اشارے ہیں:

لکھ غزل اک اور بھی معروف سرور کے لیے
آج اس پر نکتہ فہمی نکتہ دانی ختم ہے

حسام الدین حیدر خاں سے امید وفا مت رکھ
بہ رنگ گل وہ نغمہ دوست اے معروف نامی ہے

بعض اشعار جن سے معروف کے ذوق سخن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہے پسند اپنی وہی شعر کہ جس میں معروف
طرز ہو میر کی انداز ہو جرات کا سا

ہے پسند خاطر معروف گر شعر مثال
دیکھیے دیوان منگا کر صائب تبریز کا

سن کے معروف غزل کو ترے امکان نہیں
دہن مصحفی و میر سے نکلے آواز

معروف یوں تو سب شعرا خوب ہیں وے
بھاتی ہے مجھ کو درد کی یا میر کی زبان

شعر لکھ معروف اب آگے قلم کو تھام کر
یہ غزل ہے واسطے ناسخ کے بھجوانی مجھے

## دریائے لطافت حصہ منطق نوشتہ قتیل

یہ حصہ ۲۰۹ صفحے پر شروع ہو کر ۲۳۰ پر ختم ہو جاتا ہے۔ زبان اس کی فارسی ہی ہے، لیکن بغیر کسی وجہ کے اردو لکھنی شروع کر دیتے ہیں، جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہوگا۔ علمی حیثیت سے اس رسالے کی کوئی وقعت نہیں لیکن اصطلاحات علمیہ کو ٹھیٹ ہندی الفاظ میں ترجمہ کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے اس باب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"بندہ سراپا گناہ یعنی قتیل روسیاہ گوید کہ چوں افصح فصحائے روزمرہ اُردو و رواج دہندۂ نقد بلاغت در ہر برزن و کو، متکلم بلیغ عالی مرتبت، شاعر لیق والا منزلت، بارندہ لآلی متلالی مضامین جدیدہ از دریائے طبع نغاد و فروزندہ مجالس اصحاب معنی بشمع رقت ذہن وقاد یعنی میر انشاء اللہ خاں صاحب متخلص بہ انشا کہ لاآتش از کثرت اشتہا مستغنی از بیان عمر دزیدہ است، بحسب ایمائے بندگان جناب وزادت مآب ...... صرف و نحو از زبان اردو تمام کرد نظر بلطف قدیم ...... خواست کہ ایں بے تشخص را نیز چند کس صاحب تشخص بدانند و از باغ عنایت حضور پرنور میوہ احسنت روزی ایں کمینہ غلام دامی گردد ...... بنا بریں راقم کثیر الاثم نخست زباں را بنطق خیال وا می نماید کہ از بعضے دانایان ہند آشنا زبان اردو چنیں بسماعت رسیدہ کہ جاننا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں جاننا اور جاننے والا اور جانا گیا تینوں ایک ہوں اور اس کا نام عربی میں علم حضوری اور میں نے آپ گیان نام رکھا ہے اس واسطے کہ جب جاننا اور جاننے والا اور جانا گیا تینوں ایک ہوئے تب آپ کو آپ ہی جاننے کا جس طرح سے کہ خدا اپنی ذات کا آپ جاننے والا ہے اور اس کی ذات جانی گئی ہے اس صورت میں جاننے والا اور جانا گیا دونوں ایک ہوئے کس جہت سے کہ ذات شخص کی ہی شخص ہے جس وقت وہ شخص ہو جاننے والا اور ذات ٹھہری جانی گئی تو ثابت ہوا کہ دونوں ایک ہیں۔ اب آیئے اس بات پر کہ جاننا کیوں کر ایک ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ جاننے والے اور جانے گئے میں تفاوت ہوگا وہیں جاننا ان دونوں کے سوا تیسری چیز ہوگا، اور جہاں یہ دونوں ایک گنے جائیں گے وہاں وہی جانا گیا جاننا بھی ہے۔ اس صورت سے کہ فلانے کو بڑا علم ہے اور فلانے کی بڑی معلومات ہے۔ دونوں ایک معنی رکھتے ہیں اور ایک مقام میں مستعمل ہوتے ہیں۔ اس بیان سے یہ بات کھلی کہ جب جاننا اور جانے گئے میں کچھ فرق نہ رہا اور جانا گیا اور جاننے والا دونوں ایک ٹھہرا اور حاصل اس کا یہ ہوا کہ جاننے والا اور جاننا اور جانا گیا تینوں باہم ایک ہیں دلیل اس پر یہ ہے کہ جو دو چیزیں آپس میں سب وجہ سے باہم برابر ہوئیں گی تو ان دونوں میں سے ایک کی نظیر بھی دوسرے کی ہو بہو نظیر ہوگی ...... آگے یہ کہتا ہوں کہ آدمی کو بھی جو اپنی ذات کا علم ہے وہ بھی حضوری ہے اور یہ علم کچھ پڑھنے پڑھانے سے نہیں آتا تو خود بخود اپنی روح کا علم انسان کو ہوتا ہے جو ہیں بدن کے ساتھ علاقہ ہوا وہیں یہ علم انسان کو حاصل ہوا اگر وہ علم جو حق تعالیٰ کو اپنی ذات کا ہے حضوری کہلاتا ہے اور وہ علم حصولی جو ہمیں اپنی ذات کا ہے حضوری حادث کہلاتا ہے و نیز باید دانست کہ بعضے براں رفتہ اند کہ خدا الٰہی را سوائے علم ذات خود علم اشیاء موجودہ کہ آنہا را اعیان ثابتہ گویند ہم حضوری باشد ......" ص ۲۰۹ تا ۲۱۳

"ازیں جا شروع کنیم قضایائے شرطیہ را اور وہ دو قسم ہے متصلہ و منفصلہ اول متصلہ کو سنئے کچھ چھپا نہیں کہ ایک شرطیہ دو جملوں سے بنا ہے دلیل اس پر یہ ہے کہ جس وقت حرف شرط اور علامت جزا دور ہوئے ایک شرطیے کے دو جملے باقی رہ جائیں گے مثال جو آفتاب نکلے تو دن موجود ہو جو کہ حرف شرط و تو علامت جزا ست دور باید کرد باقی ماند دو جملہ آفتاب کا نکلنا اور دن کا موجود ہونا و ایں ہر دو جملہ است لیکن ایں ہر دو مصدر را ماضی باید ساخت

یعنی آفتاب نکلا ہے اور دن موجود ہوا ہے وایں قضیہ متصلہ لزومیہ نامند قسم دیگر از متصلہ اتفاقیہ است یعنی برسبیل اتفاق ایک دوسرے کی شرط پڑے ............" ص ۳۵۱ تا ۳۵۲

ذیل میں اصطلاحات اور ان کے تراجم کی مکمل فہرست دی جاتی ہے۔ بہت سی اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے ترجمے صرف انہوں نے توجہ ہی نہیں کی۔

| علم حضوری | = آپ گیان | موضوع | = ٹھکانا | انشا | تھوڑی بات |
|---|---|---|---|---|---|
| علم حصولی | = پروجیان | عوارض ولوازم | = لگ | تقییدی | پھنسا ہوا |
| تصور | دھیان | معرف | پتا | غیر تقییدی | چھپا ہوا |
| تصدیق | جوں کا توں | حجت | بت کماؤ | مفہوم | سمجھا ہوا |
| خصوص | دہری اونچ نیچ | دلالت | = بات بتانا، رستہ سجھانا، پایا جانا | کلی | سپورن |
| موضوع | بول | وضع | ٹھہرانا | جزئی | اچھوتی |
| محمول | بھرپور | مطابقت | ٹھیک ٹھیک | مصداق | سچل |
| رابطہ | جوڑ | تضمن | گھسر | مساوی | وہی |
| اذعان | مان لینا | التزام | اوپر کا لگاؤ | تباین | دو اور |
| قضیہ | بات | وضع | ٹھہراؤ | عموم | اکہری اونچ نیچ |
| نسبت | ملاپ | طبع | آپ سے آپ | عین | اصل |
| موجبہ | پورا جوڑ | عقل | سوچ | نقیض | اکہرا انیل |
| سالبہ | پورا توڑ | لفظی | بولتی ہوئی | ضد | دہرا انیل |
| بدیہی | پرگھٹ | غیر لفظی | چپ چپاتی | خاصہ | اپنا اپنا کام |
| نظری | گپت | دال | رہبر | ماشی | جیتا جانور |
| تسلسل | الجھا سوت | معنی | مراد کا گھر | معرف | بتانے والا |
| دور | ایر پھیر | مفرد | ٹھیکل | معرّف | جانا بوجھا |
| عام | بنگھشا | مرکب | ملا جلا | حد | اصل اصل |
| حادث | نیا | تام | پورا | رسم | باہر باہر |
| قدیم | پرانا | ناقص | گھٹی | تناقض | بگاڑ |

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| صغریٰ | پہلی بات | کبریٰ | دوسری بات | نتیجہ | ہندی سوائے ۔ اردو پھل |
| استقرا | جانچنا | تمثیل | پھیلاؤ | | دور اُردو دو چھل |

بعض قلیل الاستعمال الفاظ و تراکیب

| | | |
|---|---|---|
| کھٹنٹھا | بعضاً گنبذ | گگی خال (قسم کبوتر) |
| غٹ غوں غٹ غوں (آواز کبوتر) | پندرہ پوک تین بیسی | داری (قسم انار) |
| کھٹنٹی شتث | کنوے (جمع کنوا) | تر دو دو پارہ دوری جاؤں (ام ہوؤں تن ہیں) |

کلام گوپی ناتھ کاتھہ ساکن شاہی باپدر خود کہ ذوقی رام نام داشت و بہ جوگی رام مشہور بود " بابو جی میں نے کھایا ہے ہم کمد کا لڈو کہیں ہیں اسے کھا لوگ کی کہیں ہیں نارائن جانے ہوروں کے کھانڈ بھی آوے ہے کہ نانہیں بھلا بابو جی ہم لوگ تو سب کمد کا لڈو کہیں ہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ یا نے اس کا نانو کچھ اور بھی کہیں ہیں کہ یونہی کہیں ہیں ص ۳۱۸

کلام مولوی نطیق اللہ پوربی با یکے از شاگردان رسید خودش: یہ جو ملا صدرا میر باقر کبیر اعلم معقول ہاں شاگر درشید آہ کچھ بوجھے نانہیں پڑت کہ معقول کیری کتب کہ سے پڑھی رہیں" ص ۳۱۹

حکایت متعلق خاں عالم بقا اللہ خاں: روزے عزیزے بہ دراو تاق امیرے وارد شد، مادیانے بر سر شخصے ایستادہ دید، پرسید کہ "ایں مادیان از کیست" جواب داد کہ "جس کا میں نوکر ہوں" سایل باز سوال کرد، تو ملازم کیستی؟ گفت "جس کی یہ گھوڑی ہے" و بعضے گویند کہ ایں نقل نقل نوکر مادیاں نواب خان عالم بقا اللہ خاں مرحوم است، چنانچہ از ہماں روز نواب مذکور بہ گھوڑی والا مشہور شد ...... ظاہر است کہ سبب مشہور شدن او بہ ایں لقب بخل و دنائت او باشد کہ نوکران او بہ صفت حق نمک و مسیح بے آشنا کردن حدہ بیک دو لقمہ نام او را نمی بردند، دیگراں درچہ شمار اند" ص ۳۱۷ ۔

---

# حیدرآباد کے کتبخانوں

## میں

# اُردو کی بعض قلمی مثنویاں

از محمد معین الدین دردائی صاحب

حیدرآباد کے کتب خانوں میں ابھی تک بہت سی قلمی کتابیں ایسی موجود ہیں جن کا علم عام طور پر لوگوں کو نہیں ہے۔ آج کی صحبت میں بعض مثنویوں کا ذکر کرتا ہوں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کے متعلق پہلی بار کچھ لکھا جا رہا ہے:

(۱) مثنوی ریاض الحسنین[1]۔ اس کا صرف ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے۔ اور اگرچہ اس نسخے کے کاتب نے اپنا نام نہیں دیا ہے لیکن اس کے مطالعے سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

اس مثنوی کا مصنف غلام علی عشرت ایک غیر معروف شاعر ہے۔ بعض جگہ مصنف نے خود اپنے تخلص کا اظہار کیا ہے:

یا ابن علی روح الثقلین — آرام دل فاطمہ یعنی کہ حسین

اب عشرت غمگیں کی تمنا ہے یہی — روضے پہ پڑھوں ریاض الحسنین

---

کر عشرت زیادہ نہ طول کلام — پر آل نبی و محمد سلام

لکھا عشرت نے جب حال شہیداں — تو رضواں نے بہ صد خیر و سعادت

تو یہ نسخہ کی ہے بر صفحۂ گل — لکھی تاریخ لستان شہادت (۱۲۲۳ھ)

اس مثنوی میں آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کے واقعات درج ہیں اور پھر شہادت کے مفصل حالات مذہبی رنگ میں بیان کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ خود مصنف کے ایک شعر سے ظاہر ہے۔

---

[1] اس مثنوی کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس قابل ہے کہ اسے گمنامی کے پردے سے نکال کر دنیائے ادب میں پیش کیا جائے۔ – دردائی۔

کہ از ذکر آدم علیہ السلام | دراں یا ختم تا آخر الانام
---|---

اپنے والد کے انتقال کے بعد یزید نے تخت خلافت پر متمکن ہو کر جو ایک خط عبد الملک کو حضرت امام حسین و ابن عمر و ابن ابوبکر و ابن زبیر علیہم السلام سے بیعت لینے کے لیے لکھا تھا اس کا ذکر اس مثنوی میں اس طرح کیا گیا ہے ؎

یزید لعیں ہو کے قائم مقام | ہوا سرگروہ لعینان شام
---|---
وفات پدر سے جو بس شاں میں شاد | ہوا کار فرما جو وہ نامراد
رفیقوں کو سن قصہ کوتہ کلام | مدینے کو نامے لکھے نام نام
تھا عبد الملک ابن مروان وہاں | لکھا اس کو خط شقاوت نشاں
بہ ابن علی و بہ ابن عمر | بہ تہدید بیعت کا پیغام کر
بہ ابن ابوبکر و ابن زبیر | یہ کہدے کہ اس میں تمہاری ہے خیر
کہ چاروں ہم آکے بیعت کریں | ارادہ اطاعت کا دل پر دھریں
نہ مانیں تو چاروں جواں ہم دگر | تو پھر کاٹ کر بھیج چاروں کا سر

اس مثنوی کا سال کتابت ۱۲۲۴ھ ہے جیسا کہ ختم کتابت کے اس جملے سے ظاہر ہے :

"تحریر فی التاریخ دوم در شہر رمضان المبارک ۱۲۲۴ھ"

**(۳) مثنوی چندر بدن** اس کا مصنف یاسینی واقف دکن کا ایک غیر معروف شاعر ہے اس کے حالات کے لیے میں نے متعدد تذکرے دیکھے لیکن کسی میں کچھ نہ ملا اپنے کلام سے یہ ایک ذی علم اور صاحب لیاقت شاعر معلوم ہوتا ہے تعجب ہے کہ تذکرہ نویسوں نے اس کے حالات قلمبند کرنے میں غفلت سے کام لیا۔ اپنی مثنوی میں واقف نے ایک جگہ خود اپنے دکنی ہونے کا ذکر کیا ہے :

کہ بندہ تو سراپا پر خطا ہے | خطا کا بخشنا عین عطا ہے
---|---
اگرچہ میں بھی تو اہل دکن ہوں | نہیں کچھ ہند کا صاحب سخن ہوں
ولے ہندی سے اپنے حسب مقدور | بیاں کرتا ہوں سنیے اس کا مذکور

مصنف نے کئی جگہ خود اپنے تخلص کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً

ارے واقف کیا اپنی ہے جو حرمن | تو ہے گا نعت کا کہنا تجھے فرض
---|---
سخن بیر جہاں میں کر تو مشہور | سدا رکھ عارفوں کے پاس منظور
یہی واقف کی ہر دم التجا ہے | تری درگاہ میں صبح و مسا ہے
وہ منصف ہو کہیں گے سب بجا کر | لے واقف مرحبا ہے مرحبا ہے

باحسین واقف کی مثنوی چندر بدن دراصل مقیمی کی مثنوی چندر بدن و مہیار کا (جو دکنی زبان میں ہے) صاف اُردو (ہندی) میں ترجمہ ہے جیسا کہ خود واقف کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

مقیمی نے گر دکنی زبان میں لکھا ہے قصہ ایک ان کے بیاں میں
لکھا ہے فارسی کوئی رسالہ یہ سب قصے کا ہے اس میں حوالہ
تخلص فارسی والے کا تھا عشق سراپا عشق کا قصہ لکھا عشق
لکھے ہندی میں گر تو اس کو سارا تو دنیا میں رہے گا آشکارا خیال اس بات کا جب دل میں آیا قلم تب ہاتھ میں میں نے اٹھایا

واقف کے ان اشعار سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ چندر بدن و مہیار کے قصے کو مقیمی سے پہلے کسی شاعر نے فارسی زبان میں لکھا تھا اور مقیمی کی مثنوی چندر بدن و مہیار اسی سے ماخوذ ہے۔

واقف کی مثنوی چندر بدن کا صرف ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ اور اب تک اس کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔

اس مثنوی کا سال تصنیف ۱۲۲۷ھ ہے۔ مصنف کے ان اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

پس از شکر خدا تاریخ کا فکر مجھے لازم ہے کرنا اب بیاں فکر
سن ہجری سے دیکھا میں نے فی الحال تھا بارہ سو پہ ستائیسواں سال
نہیں تاریخ کوئی اس سے فائق وہ پہنچے وصل کو معشوق عاشق

کتب خانہ آصفیہ میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے اس کا کاتب ایک ہندو پورن سنگھ نامی ہے۔ خاتمہ کتاب میں خود کاتب نے اپنے نام کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جس سے کاتب کے حالات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

"زنار دار پورن سنگھ پسر ہزاری دھن سنگھ نبیرہ ہزاری بھکم سنگھ کار پرداز سرکار نواب آصف جاہ نظام الملک بہادر باشندۂ شتعد پورہ حالا سکونت در مکان مہاراج موصوف بندہ اقامت دارد و ہیچ غرض از کسے ندارد سوائے ذات عالی صفات دیا مہاراج دھرم مورت دھراوتار راجہ چندو لعل بہادر"

کتابت کرتے وقت کاتب نے چند اشعار اپنی طرف سے بھی لکھ دیے ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ کاتب بھی اردو کا شاعر تھا۔ اس کے صرف دو اشعار اس وقت یاد میں جو درج ذیل ہیں:

الٰہی بخش دے اس فدوی کے گنہ کو تو طاقت دے مرے تازیست دست و پا کو
میرے فرزند مہاجن رائے کو تو شاد رکھ مرے مہاراج ندیا دھرمی کو تو آباد رکھ (کذا)

اس کی تاریخ کتابت ۱۶ صفر المظفر ۱۲۳۵ھ ہے۔ خود کاتب کے الفاظ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:

"تاریخ شانزدہم ماہ صفر المظفر ۱۲۳۵ھ بنا بر فرمایش مہاراج بیادھرجیو پسر گنیش رائے در محلہ حسینی علم تیاری کتاب چندر بدن مہیار نمودہ شد۔"

اس مثنوی میں سب سے پہلے حمد ہے پھر مناجات، نعت، منقبت حضرت علیؓ، منقبت بندہ نواز گیسو دراز۔ اس کے بعد خود مصنف نے اپنے نام اور وطن وغیرہ کے متعلق اشارہ کیا ہے۔ ان سب کے بعد قصے کا آغاز ہوا ہے۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

حمد:-

کرم سے اپنے اے ساقی وحدت — پلا مجھ کو تو صہبائے محبت
کیا تو عشق کو پیدا ازل سے — نہیں کچھ عشق ہنگا آج کل سے
دیا یوسف کو ایسی حسن و خوبی — زلیخا جا وہ غم میں جس کے ڈوبی
سنا شیریں کی تو شیریں زبانی — کیا فرہاد کے سر تیشہ رانی
دکھا چندر بدن کا ماہ رخسار — کیا مہیار کو دیوانہ اک بار
کیا تو ہیر پر رانجھا کو قربان — کیا عذرا کو وامق کا پریشان
حقیقی اور مجازی عشق باہم — وہ دونوں ایک ہو معنی میں توام
تو خود معشوق خود عاشق و خود عشق — تو خود مشتاق تو خود مشتاق و خود عشق

آغاز داستان:- ارے ساقی کہاں ہے آفتابی — لگا منہ سے مرے کی صراحی
سنو یہ داستاں اے عشق بازو — سنو اے دردو غم کے جاں گدازو
زمن ایں داستان عشق بشنو — بشنو از حرف گنہ معنی تو
کوئی ہے ہند میں ایک شہر اوجین — ہے آنکھوں سے دیکھے دل کو چین
وہاں رہتا تھا کوئی ایک تاجر — وہ تھا مال و منال اپنے سے فاخر

**(۳) مثنوی مرآۃ الحشر:** اس کا صرف ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں میری نظر سے گزرا ہے۔ یہ ایک مذہبی مثنوی ہے جس کا مصنف سید محمد فراقی ہے۔ مصنف نے خود اپنے تخلص اور نام کا ایک جگہ ذکر کیا ہے۔

فراقی تخلص ہے میرا مدام — دلے اصل سید محمد ہے نام

سبب تصنیف پر ایک جگہ فراقی نے خود ہی روشنی ڈالی ہے۔ نصرتی اور غواصی کی شہرت کا سبب ان کی تصانیف کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

جو دیکھا ہوں ایسے تماشے اپار — مرا بھی ہوا شوق بے اختیار
پڑیا آخرت نامہ میری نظر — دیکھا دل رگ میں تس کے بتر

.................................

اسی سے مرے دل میں گذریا ہو بات — کروں نظم میں سکوں دکھنی میں سب

اس مثنوی کے کاتب نے نہ اپنا نام لکھا ہے اور نہ سال کتابت ہی کی طرف صرف اشارہ کیا ہے۔ البتہ سال تصنیف کے

متعلق خود مصنف نے ایک جگہ دو اشعار لکھے ہیں جس سے اس مثنوی کے سال تصنیف کا پتا چلتا ہے وہ دو اشعار یہ ہیں:

کیا قصد تاریخ جب بولنا — یو اجمال تفصیل کر کھولنا
تو یک دل کیا اس ادا انتخاب — یو دیکھو جو ہے بابرکت کتاب

نمونہ کلام درج ذیل ہے:

خداوند بیچوں نرنکھار توں — ہمارے جیوں کا ہے ادھار توں
ہماری مرادوں کا تو جہار ہے — ہر امید کا توں بکا پار ہے
تیرے مغفرت کے ہیں امیدوار — گو بل وقت کا تو بچہ بھنا ہر یار (کذا)
الٰہی مجھے ذوق طاعت کا دے — نپٹ شوق اپنی عبادت کا دے
مجے زندگی ہی تلک برقرار — تری بندگی بیچ رکھ استوار
ترا یاد کار رات دن دھیان دے — تجھے پوجنے کا مجھے گیان دے
عبادت کا توت مجھے کر عطا — رکھ اپنی محبت مرے پر سدا

**(۴) گلشن عشق نصرتی** — اس مثنوی میں شہزادہ منوہر اور مدمالت کی داستان عشق ہے۔ اس کے دو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ایک کتب خانۂ آصفیہ میں جس کا کاتب غلام احمد ہے اور دوسرا حمد یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے ذاتی کتب خانے میں۔ کتب خانۂ آصفیہ والے نسخے کا سال کتابت ۱۱۹۴ھ ہے۔ اس کے شروع کے چند اوراق غائب ہیں اور کتابت بھی کچھ اچھی نہیں برخلاف اس کے نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے پاس جو اس کا نسخہ ہے اس کی کتابت بہت پاکیزہ اور صاف ہے۔

**(۵) علی نامہ نصرتی** — حیدرآباد میں اس کا صرف ایک نسخہ دفتر دیوانی (فائنینس) کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس نسخے کا کاتب محی الدین بن سید عبدالرسول نبیرہ مخدوم اشرف جنگ ہے۔ کاتب کی تحریر کے مطابق اس نسخے کا سال کتابت ۱۱۰۷ھ ہے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے جس میں بقول مؤلف "یورپ میں دکنی مخطوطات" یہ شعر موجود ہے

لکھا شہ کا میں جب جو یو کراوں — ہزار یک ہور ستر پتے چھ برس

اس شعر سے علی نامہ کا سال تصنیف ۱۰۷۰ نکلتا ہے۔ بطور نمونہ دو اشعار درج ذیل ہیں:

حمد اول ہے خدا کا جس نے روز اول — دیا ہے ہمت مرداں کوں جو توفیق سوبل
رکھا اس نامہ نامی کو علی نامہ ناؤں — تا جنم جگ یو زمانی کی گلی ہوئے ہیکل

ل؎ "اس ادا" کا مفہوم واضح نہیں ہوتا (معیار) ۲؎ اس مصرعے سے ۱۱۳۳ نکلتا ہے (معیار)

# استفسارات

(۱) مصنف مغل اور اردو نے گلزار ابراہیم مصنفہ علی ابراہیم خاں کے حوالے سے حسب ذیل باتیں لکھی ہیں۔
گلزار ابراہیم انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، اور اس کے تین قلمی نسخے بھی میری نظر سے گزرے ہیں لیکن یہ باتیں نہ مطبوعہ نسخے میں ملتی ہیں نہ قلمی نسخوں میں۔ کیا کسی صاحب کو کوئی قلمی نسخہ ایسا معلوم ہے جو مصنف مغل اور اردو کا ماخذ رہا ہو اور اس میں حوالہ ہائے ذیل ملتے ہوں؟

(ا) ص ۶۳ مغل اور اردو "نواب شجاع الدولہ اور بکسر کی لڑائی تک اردو کا وہ مکتب اودھ میں کھلا رہا" اردو کے مکتب سے مراد وہ ادبی انجمن ہے جو امیر خاں انجام نے بقول مصنف مغل اور اردو دہلی میں قائم کی تھی اور جس کا دفتر ان کے مقتول ہونے کے بعد صفدر جنگ کے قبضے میں آیا تھا۔

(ب) ص ۸۵ "فدوی... مسلمان ہونے پر محمد حسن ہو گئے... احمد شاہ کی تعریف میں انھوں نے ایک قصیدہ عرض کر کے گزرانا... حضور نے ہزار روپے نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی۔"

(ج) ص ۱۱۵-۱۱۶ "صاحب عالم نے اردو شعرا کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دیا تھا جو ان کی وفات کے سبب پورا نہ ہو سکا... وہ ناقل ہیں کہ وارن ہیسٹنگز... بنارس آئے تو صاحب عالم نے اپنے شعروں کی بیاض بطور تحفہ بخش دی جو ان کے ساتھ ولایت گئی الخ"۔ صاحب عالم سے مراد جہاندار شاہ ہیں اور ناقل سے علی ابراہیم خاں۔

(د) ص ۱۱۲ "شاہ صاحب نے ۱۱۷۶ھ میں رحلت کی" شاہ صاحب سے شاہ ولی اللہ صاحب مراد ہیں۔

(ہ) ص ۱۳۱ مراد شاہ... ایک مشہور پنجابی اردو گو... جب یورپ کے سفر سے لوٹ کر دلی آئے ہیں تو بادشاہ انھیں انعام و اکرام دیتا ہے" مراد شاہ وہی ہیں جن کا ذکر پنجاب اور اردو میں ہے اور بادشاہ اکبر ثانی ہیں جو ۱۲۲۱ھ میں تخت پر بیٹھے ہیں۔ مصنف گلزار کا انتقال ۱۲۰۸ھ میں ہوا ہے، اور کتاب کی تکمیل اپنی زندگی ہی میں کر چکے تھے، اکبر ثانی کے زمانے کا واقعہ گلزار میں کیوں کر درج ہو سکا، سخت حیرت ہے۔

(۲) میر امامی ہروی میر حسن کے اجداد سے تھے، حسن نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ عالم و فاضل خطاط اور شاعر تھے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ وہ عہد شاہ جہانی میں ہندوستان آئے اور شاہ جہاں کے منصبداروں میں تھے۔ اگر ایسا ہو تو عہد شاہ جہاں کی کسی نہ کسی کتاب میں شاعر، خطاط، عالم یا منصبدار کی حیثیت سے ان کا ذکر ہونا چاہیے۔ مجھے باوجود تلاش کسی کتاب میں تذکرہ میر حسن کے سوا میر امامی ہروی کا حال نہیں ملا۔ میں نے ایک صاحب سے جن کا یہ دعویٰ تھا کہ میر امامی عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے، دریافت بھی کیا کہ اس دعوے کی کون سی سند ہے، لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اگر کسی صاحب کو میر امامی کے متعلق کچھ علم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ میں نہایت ممنون ہوں گا۔

قاضی عبدالودود

**محاکمہ**

(۱) دیوان معروف و دیوان جوشش وغیرہ از ق ا ع ۔ د (۲) مخمس مصحفی وغیرہ، از ڈاکٹر شادانی و ق ا ع ۔ د (۳) گو گی، از ڈاکٹر شادانی، اعجاز نستوی (۴) معیار کی زبان، از ڈاکٹر شادانی۔

## دیوان معروف

ص ۵ ۔ دیکھو خاصے سن و رلے معروف ؛ یہ تو بیچیں تھا جس پر میرا ۔ بیچیں : وہ کپڑا جس میں گوٹا کناری یا قیمتی کپڑے رکھ کر لپیٹتے ہیں۔

ص ۱۶ ۔ ذکر جب کہ تیرے تبسم کا آپڑا ؛ گلشن میں خفل غنچۂ گل کھل کھلا پڑا ۔ غنچہ کا دل ؟

ص ۲۰ ۔ یوسف اُو کان ملاحت حسن کے بانٹے ہوئے ؛ دیکھتا تجھ کو تو پھر تیری سی صورت مانگتا ۔ ؟

ص ۲۹ ۔ گرچہ واحد میں ہوں دوری دید پر دونوں کی ایک ؛ دیکھنے میں دو ہیں آنکھیں ہے نظر دونوں کی ایک ، واحد بیش ل دویی۔

ص ۸۵ ۔ سمجھ کے کیونکر اس دل کو چاک شش ایاز ؛ بجائے دانہ ہم اس میں شرارہ رکھتے ہیں ۔ انار

ص ۸۷ ۔ تسم دیکر انھوں کے آدمی سے میں نے جو پوچھا ؛ کہ سچ بتلا وہ مجھ کو قید میں بھی یاد کرتے ہیں ۔ کہا اس نے کسی کے دل کی کیا معلوم ہے لیکن ؛ تمہارا ذکر سنتا ہے تو اکثر آہ کرتے ہیں ۔ بھرتے ۔ قطعہ بند اشعار میں علی الخصوص جب ان کی تعداد بہت کم ہو قافیے مختلف ہونے چاہییں۔

ص ۹۱ ۔ تحقیق یہی پڑ جانے ہے کل جن کو تو پھر وہ ؛ منھ دو ہیں نظارۂ دیدار سے آنکھیں ۔ ہے ، اگل ۔

ص ۹۲ ۔ روز پہ پہنچی ہے دستک ہم پہ اس کی عشق نے ؛ دم بدم کرتا ہے خوں دل طلب غم ان دونوں،
روز ہی پہنچے ہے دستک ہم پہ اس کے عشق کی ؟

ص ۹۲ ۔ شاخ نرگس کے قلم سے اس کی یاد چشم میں ؛ برگ گل پر میں لکھا کرتا ہوں صاحب ان دونوں ، صاحب
قافیہ طاقت ، حلاوت ،

ص ۹۶ ۔ منع مت کر مجھ کو ہمدم ، وزدوستی نہ کھا ؛ بھید یہ ہے راز عشق اس میں عیاں ہوتا نہیں ۔ ؟

ص ۹۸ ۔ تم تو پاس غیر کے کب پاس جا دوگے ہمیں ؛ دور ہی بیٹھی کے گر ہم کو اُٹھا دوگے ہمیں ۔ دور بھی بیٹھینگے گو ہم تو ۔

ص ۹۹ ۔ کیوں نہ تاب رخ سے ہوئے مہروش خط کی بہار ؛ یعنی رہتا ہے ترا اکثر جوانشا دھوپ میں ۔ جوانسا یہ ایک درخت ہے جو دھوپ ہی میں شاداب رہتا ہے۔ مصحفی اپنی مثنوی گرما میں لکھتے ہیں : سادہ سبزے سے دشت و صحرا ہے ؛ سبز ہے سو وہ اک جوانسا ہے۔

ص ۱۰۳ ۔ خدنگ عشق میری جان تیر دستی ہے ؛ عبث چڑھائی ہے یوں حاجت کمان نہیں ۔ مرکھا تیر دستی

ص ۱۰۰ سے یہ اگر وہ جو نشہ پی کر کہیں لائے نہ فعل * تو ابھی تم ساقیا اپنے سے پلا کر دیکھ تو = فعل

ص ۱۰۰ سے ایسا نہیں ہوا غم فغفور کا دگر * جس سے جگر میں کاسۂ چینی کی بو نہ ہو = دگر ، مو

ص ۱۰۹ سے حسرت ہے کعبے کے جلنے کا یخ اے زاہد * نہیں جو ہو لے پیدا تم اس سے ادا کرو = ؟

ص ۱۱۱ سے برگ گل تو ترسے ہے اور دعوی عشق اے بلبل * دیکھ تو بھول ہوئی آنکھوں سے منقار کو تو = بھول

ص ۱۱۲ سے گرچہ سب باتوں سے ثابت ہوئے لیکن معروف * دیکھ لیتے ہیں کن انکھوں سے طرف اک تو = تاب انکھیوں

ص ۱۲۰ سے دل میں یوں یاد ہے اک پردہ نشیں کی ہمدم * جیسے ذاکر جو پڑا ذکر خفی کا کوئی = پڑا

ص ۱۲۲ سے جو سوز غم کی لکھوں اپنے داستان ساری * تو تیغ شاخ میں جل جائیں انگلیاں ساری = کرہ باطن میں اسی طرح تو تیغ شاخ نہیں جل سکے الخ ۔ میں کی جگہ جو بھی ہو سکتا ہے یعنی اسی طرح تو تیغ شاخ ہو جل جائیں الخ

ص ۱۲۲ سے لگا ہے اس بت سفاک سے دل اپنا جدا * کہ جس سے مانگتی ہے خلق الاماں ساری = خدا ، یا ، خود آ ؟

ص ۱۲۷ سے زلفوں ہی میں پھنسائے بلا سے یہی سہی = پھنسائے

ص ۱۳۰ سے شہ اب تیرے تو بی کے اہل بزم کو دیکھ * جو قصد قتل ہے تیغ نگہ کو آب تو دے = تیز ، سی

ص ۱۳۰ سے تو بلا شوخ طبع ہے اے رحم * غم زدوں کو ہنسا دیا تو نے = زخم

ص ۱۳۵ سے کیونکر ایسے سے ملاقات کی تدبیر بنے * جیسے بدخوئی کے مانی سے نہ تصویر بنے = جس کا ، کی

ص ۱۳۹ سے جب سے پہچانا الف تب سے وہ قامت یاد کر * راستی ہو یہ کہ ہنسی بھی قیامت یاد ہے = اپنی

ص ۱۶۲ سے کیا کرے اس میں شنا کوئی غواص آہنگ * وام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ = شنا کا کوئی غواص

ص ۱۶۵ سے کیا اے عزیزو تم نے بھی تم عدم سے * اس گلشن جہاں کو جانے قضا سمجھ کر = تم یہاں ، فضا

ص ۱۶۸ سے یوں تپ غم میں جوانی گئی ہیات شتاب = ہیہات ۔

ص ۱۶۸ سے کشتہ چشم معشوق کو لو باوام نہ بھیج = کشتۂ تو ۔

ص ۱۶۹ سے دیکھ کر محفل میں سب کو عارض جانانہ شمع * کرکے وا شعلے کی بال و پر ہوئے پروانہ شمع = شب ، کیا ہی

ص ۱۷۱ سے طفل اشک کو مژگاں پہ چشم تر نکالے ہے * یہ چور اب تیلیوں کی ناچ میں ہاں سر نکالے ہے = جو طفل تیلیوں

ص ۱۷۱ سے جو رات بام پر اپنے وہ رشک ماہ چڑھے * چہار دہم کس کے پھر نگاہ چڑھے = مہ چہار دہم

ص ۱۷۹ سے کہا فقیر نے جو غش میں تم پہ سارے لوگ * تو ہنس کے بولے کہ اک خدا کے پیارے لوگ = اگر کوئی صاحب اس شعر کا مطلب بیان فرمائیں ۔

سے عکس تہہ پانی میں دیکھے ہے تو وہ یار طبع * منہ کو دھوتا ہے کہ صورت مری گوری ہو جائے ۔

گلشن بیخار میں ایک مطلع اور ہے جو مطبوعہ دیوانِ معروف میں نہیں ہے

؎ مے کے پینے سے تو ہر چند بنا ہی توبہ ÷ پر مغاں سے وہ خجل ہوں کہ الٰہی توبہ ،

دیوان جوشش کے متعلق لکھا گیا تھا کہ اس میں غزلوں کے کل اشعار کی تعداد ۲۷۵۰ اور ۷۵/۱ اشعار ایسے ہیں جنھیں کاتب نے لکھ کر قلم زد کر دیا ہو ان اشعار میں ۲ ایسے ہیں جو مکرر ہونے کی بنا پر کاٹ دیے گئے ہیں، اس لیے دراصل ایسے اشعار کی تعداد ۵۵ ہے۔ ۷ شعروں کی ایک غزل ایسی بھی ہے جو قلم زد نہیں لیکن حاشیے پر اس کے متعلق لفظ 'خارج' لکھا ہوا ہے۔ مطلع یہ ہے:

؎ محبت ابھری ہو گئی ہوا ہوائے ہوا ÷ ہمارے خانۂ دل میں نہیں ہے جائے ہوا ،

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کاتب بیاض نے محمد تقی خاں مشتاق کا نام غلطی سے محمد علی خاں مشتاق لکھ دیا ہے۔

مارچ کی اشاعت میں دریائے لطافت مطبوعۂ مرشد آباد کے سرورق کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کا سال طبع ۱۲۶۶ھ ہے، لیکن تمہید کے آخر میں جو قطعۂ تاریخ ہے اس کا آخری مصرع یہ ہے "بگفتا اینا است دریائے لطافت" (مارچ کی اشاعت میں این است کی جگہ ایں ست چھپ گیا ہے۔ اس غلطی کی اپریل کے پرچے میں تصحیح کر دی گئی ہے)۔ اس سے ۱۲۶۷ نکلتا ہے۔ جناب خیال فرماتے ہیں کہ ایں ست ہی صحیح ہے، الف کا اضافہ کاتب نسخۂ مرشد آباد کی غلطی ہے۔ اس صورت میں مصرع آخر سے بھی ۱۲۶۶ ہی نکلیگا۔ اور اختلاف دور ہو جائیگا۔

دریائے لطافت کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ سال تکمیل ہے۔ کتاب کا آغاز شاہ عالم کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا ملاحظہ ہو ص ۱۳ نسخۂ مطبوعہ ۱۹۱۶ء "شاہ عالم بادشاہ غازی۔ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ" شاہ عالم کا سال وفات ۱۲۲۱ھ ہے تذکرۂ بیجگر کا حال فہرست بلہارٹ میں صفحہ ۳۰ پر درج ہے نہ کہ ص ۳۴ پر جیسا کہ کاتب کی غلطی سے درج ہو گیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تذکرۂ باطن کا نام اشپرنگر نے گلشن بے خزاں لکھا ہے' یہ صحیح نہیں۔ اس کا ایک نام گلستان بے خزاں ہے اور دوسرا نغمۂ عندلیب۔

## مخمس مصحفی وغیرہ

از ڈاکٹر عندلیب شادانی و قاضی عبد الودود

(۱) مخمس مصحفی: "... سب اگیں کو نہ جی ہے یہ بات بے حساب" آپ کا خیال ہے کہ موجودہ صورت میں مصرع غلط ہے، میرے نزدیک اس میں کوئی غلطی نہیں۔ "بے حساب بات ہے" کے معنی ہیں لغو بات نامعقول بات فارسی میں بھی ایک محاورہ ہے "حرف حسابی زدن" یعنی معقول بات کہنا۔ عجب نہیں کہ اردو میں یہ محاورہ فارسی سے آیا ہو۔ اب آیئے مطلب کی طرف۔ پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ "کسی نے جھوٹ یا سچ شہزادے کے کان میں پھونک دیا کہ مصحفی نے آپ کی ہجو کہی ہے، اس الزام سے اپنی بریت کے لیے مصحفی نے اپنا مشہور قصیدہ 'دزدائیہ ...' لکھا" مطلب شعر کا یہ ہے کہ اے بادشاہ تو

میرا انصاف کرتا کہ حقیقت حال دنیا پر روشن ہو جائے اور سب کہیں کہ یہ بات کہ مصحفی نے سلیمان شکوہ کی ہجو کہی محض لغو ہے اس لیے مصحفی تو کسی کی ہجو نہیں کیا کرتا وہ تو مدح گو ہے۔

دوسری چیز اس میں قابل لحاظ "نہ" کا املا ہے۔ میرے نزدیک "نا" لکھنا چاہیے۔ امروہے کے لوگ آج بھی ناہی بولتے ہیں۔ نہ صرف امروہے میں بلکہ پورے ضلع مرادآباد میں (امروہہ مرادآباد کا سب ڈویژن ہے۔) عوام الناس "ناہی" بولتے ہیں۔ ہائے مختفی صرف دو دال کے اظہار کے لیے لکھی جاتی ہے اور لونگ دو دل کے لیے الف ضروری ہے۔ جو لوگ نا بولتے ہیں وہ کھینچ ہی کر بولتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مصرعے میں وزن کا لحاظ کرتے ہوئے بھی ناہی چاہیے۔

(۲) غزل آصف الدولہ۔ "پڑے راستہ صبح دم دیکھتے ہیں" اس کی جگہ "پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں" ہونا چاہیے ورنہ مصرع بے معنی ہو جائیگا۔ شمس النسا بیگم کی غزل میں بھی یہ مصرع اسی طرح ہے۔

(۳) مثنوی میر حسن۔ "عیش کی ہر طرف بچھتی تھی بساط" میر حسن نے ایسا نہیں کہ طرف بہ سکون را نظم کیا ہو۔ غالباً انھوں نے سمت لکھا ہوگا۔ کیا میر حسن کے کلام میں کہیں اور بھی یہ لفظ اس طرح استعمال ہوا ہے؟ اسی مثنوی کے اس مصرعے میں یہ لفظ صحیح تلفظ کے ساتھ نظم ہوا ہے "شعلوں کے ہر طرف روشن تھے جھاڑ"۔
"شعر کا بھی غرض طرفہ ہے یہ فن" جب تک غرض کو بہ سکون را نہ پڑھیں مصرع موزوں نہ ہوگا۔ میرے نزدیک حسن نے مصرع اس طرح لکھا ہوگا "شعر کا بھی ہے غرض طرفہ یہ فن"

(۱) "تا سب کہیں" الخ اس مصرعے کے متعلق میں نے صرف اپنے شبہے کا اظہار کیا تھا کہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کوئی قطعی رائے نہیں دی تھی۔ اس کی صحت میں شبہے کی کئی وجہیں تھیں۔ ایک تو مصرعے کی بندش چست نہیں۔ دوسرے یہ کہ "بے حساب بات" لغو یا نامعقول بات کے معنی میں نہ لغت میں ہے اور نہ کسی شاعر کے کلام میں آیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے خود مصحفی نے بھی کسی دوسری جگہ لفظ بے حساب اس معنی میں استعمال نہیں کیا۔ تیسرے یہ کہ شعر میں "نہ" کی جگہ "نا" پڑھنا کانوں کو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم یہ بخوبی ممکن ہے کہ مصحفی نے اسی طرح لکھا ہو۔ رہا لفظ "نہ" کو "نا" لکھنا، اس کے متعلق گزارش ہے کہ کسی لفظ کو ہائے مختفی سے لکھنا اور اس طرح پڑھنا کہ گویا الف سے لکھا ہوا ہے اردو اور فارسی میں کثرت سے رائج ہے۔ دیوان کے قلمی نسخوں میں بھی اسی طرح درج ہے جیسا کہ معیار میں ہے۔

(۲) "پڑے راستہ" الخ یہ مصرع دیوان جہاں نسخۂ لندن میں اسی طرح ہے، لیکن جناب شادانی کا یہ خیال صحیح ہے کہ "راستہ صبح دم" کی جگہ "راہ تا صبح دم" ہونا چاہیے۔ ابھی حال میں یہ بات بھی میں نے دریافت کی ہے کہ یہ شعر دیوان مصحفی اول یا سوم میں بھی خفیف اختلاف کے ساتھ موجود ہے، اور صرف یہی نہیں ایک اور شعر بھی جو آصف کی غزل میں ہے مصحفی کے دیوان میں پایا جاتا ہے۔ دونوں شعر حسب ذیل ہیں:

تم آئے نہ آنے والے ہو تو ہر شب
تری راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں

بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے
بھلا یہ بھی تیری قسم دیکھتے ہیں

میاں 'نے' یہاں سے 'والے' بہتر ہے اور پڑے راہ پر 'تری راہ' کو ترجیح ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں شعر غلطی سے جہاں نے آصف کی طرف منسوب کر دیے ہیں، اور در اصل مصحفی کے ہیں۔

(۳) طرف کو حسن نے دوسری جگہ بھی بہ سکون را نظم کیا ہے، مثال یہ ہے:

سب حسرتیں ہاتھ اٹھا کے اکرام "سر بر قدمت نہادہ بودم" افسوس کہ روزگار نہ گذاشت

شیخ محمد عابد دل معاصر حسن کا مطلع ملاحظہ ہو:

منہ دیکھیے اس طرف ہو دشنام سیاہ دیکھتا ہی ہو
دل اپنی جان کا دشمن تو مت خواہی نخواہی ہو

لفظ غرض حسن نے بہ سکون را لکھا تھا یا نہیں اس کا فیصلہ مشکل ہے، لیکن جب طرف بہ سکون را استعمال ہو سکتا ہے تو غرض بھی ممکن ہے کہ اسی طرح حسن کی زبان پر ہو۔

## گومتی

(۱) از ڈاکٹر عندلیب شادانی (۲) از اعجاز نستوی

(۱)

"اور اگرچہ آنکھوں میں سرمہ اور چہرے پر غازہ مل کر الخ۔" سرمہ اور غازہ دونوں کے لیے فعل 'مل کر' استعمال کیا گیا ہے، حالاں کہ سرمہ لگانا محاورہ ہے 'سرمہ ملنا' نہیں۔ لہذا انھیں ایک ہی فعل کے تابع نہ ہونا چاہیے تھا۔

(۲)

اس قصے میں ایک بات بالکل سمجھ میں نہ آئی۔ گومتی شہزادے کے محل میں بیٹے کو لے کر واپس جاتی ہے، اس موقع پر لکھا ہے کہ "اگرچہ گومتی شاہزادے کو بہت عزیز تھی .. لیکن یہ الفاظ اس سے کسی نے نہ کہے" گومتی میرا جذب دل تجھے پھر کھینچ لایا ہے" "بیٹے کی پیدائش کے بعد گومتی نے نہایت صبر کے ساتھ .. شہزادے کی سرد مہری کو برداشت کیا" گومتی اگر شہزادے کو بہت عزیز تھی تو پھر شہزادے کی سرد مہری اسے کیوں برداشت کرنی پڑی؟

[**معیار** اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اصل قصہ ہماری نظر سے نہیں گزرا اس لیے ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ غلطی مصنف کی ہے یا مترجم کی]

## معیار کی زبان

از ڈاکٹر عندلیب شادانی

صحت زبان کا جہاں تک تعلق ہے آپ کو زبردست کامیابی ہوئی ہے۔ عموماً اردو کا کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا جس میں

زبان کی وہ ڈھائی سو غلطیاں نہ ہوتی ہوں۔ معیار میں زبان کی غلطیاں بہت ہی کم ہیں اور جو ہیں ان میں سے بھی اکثر نظرانداز کرنے کے قابل ہیں۔ لیکن معیار چونکہ زبان کے معیار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اس لیے ہر وہ چیز جو مجھے کھٹکی آپ کو دکھا رہا ہوں عام اس سے کہ اس کی اہمیت کم ہو یا زیادہ۔

ص ۱۹ "سانپ کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے" اتنی زبردست کہ باوجود خواہش اور ارادے کے انسان اس کے زیر اثر آجاتا ہے" باوجود غالباً "ان اسپائٹ آف" کا ترجمہ ہے، یہ اس جگہ بالکل غلط ہے۔ برعکس یا خلاف ہونا چاہیے ورنہ مطلب بالکل الٹا ہو جائے گا۔

ص ۲۰ "کرایت" صحیح نہیں کراہت چاہیے

ص ۲۲ "میں اتنا بڑا بزدل نہیں کہ خود اپنے نزدیک خوف زدہ معلوم ہونے سے ڈروں" اس کا کیا مطلب ہے؟

ص ۲۲ "یکایک پراسرار دلکش منظر تیزی اور آہستگی سے ابھرا اور ابھرتا ہوا معلوم ہوا" تیزی اور آہستگی متضاد صفتیں ہیں، بیک وقت تیزی اور آہستگی سے ابھرنا کس طرح ممکن ہے؟

ص ۲۲ "ایک لمحے کے لیے اسے سکتہ سا ہو گیا اور آنکھیں بند کیے گھر زمین پر رکھ کے وہ پڑ رہا" وہ آنکھیں سے پہلے آ چکا ہے۔

ص ۲۳ "کیوں، خدا کی پناہ، الحذر" یہ "کیوں" زائد معلوم ہوتا ہے، مگر اس محل پر جب کہ حیرت و استعجاب کا اظہار مقصود ہے استفہامیہ "کیوں" درست نہیں، اس کی جگہ خوب! اچھا! ماشاء اللہ! سبحان اللہ! وغیرہ میں سے کوئی کلمہ ہونا چاہیے

ص ۳۴ "وہ دو دو سیڑھیوں کو تڑپتا ہوا وہ بلیز میں آیا" "سیڑھیوں کو تڑپنا" کیا معنی؟ "ایک ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں طے کرتا ہوا" یا "دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا" اس مفہوم کو ادا کر سکتا ہے (تڑپنا پھاندنے کے معنی میں لغت میں موجود ہے۔ معیار)

ص ۴۴ "بھونسا" یو پی میں بھوسا بولتے ہیں، بھس بھی کہتے ہیں بلکہ بھوسا بھس ہی کا مزید علیہ ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ نون کا اضافہ درست نہیں۔ شاید یو پی کے باہر اس طرح بولتے ہوں (اعتراض صحیح ہے، بہار میں بھی بلا اعلان نون کے بغیر ہی ہے، لیکن بہت سے لوگ نون کے ساتھ بولتے ہیں۔ معیار)

ص ۵۰ "میں نے کئی خط لکھے لیکن جواب نہیں آیا"! ص ۵۰ "تو کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا" ص ۵۰ بہتر ہے کہ "تنہا نہیں" "ہیں نہیں" کی جگہ نہ چاہیے۔

ص ۵۰ "میں رنج و غم کی سراپا تصویر بن کر رہ گیا" "سراپا" "میں" کے بعد آنا چاہیے، بصورت موجودہ "سراپا" تصویر کی صفت معلوم ہوتا ہے۔

ص ۵۰ "اجنہ کی بستی" جن کی جمع اجنہ بالکل غلط ہے، "جنوں کی بستی" لکھنا چاہیے۔

ص ۵۰ "صدائے برنجوات" "برنخاست" چاہیے (یہ کتابت کی غلطی ہے جس کی تصحیح نہ ہو سکی۔ معیار)

ص ۶۰ "اور میں اس کو چھوڑ کر وہاں چلا گیا" "اگر میں اس خیال سے تم کو خط لکھنا چاہتا" ضمیر جب مفعولی حالت میں ہو تو "کو" کے ساتھ اس کا استعمال متروک ہو چکا ہے۔ اسے نہیں بولتے ہیں۔ جلیل اور ریاض کے کلام سے ایسے مواقع پر "کو" کے استعمال کی سند دی جا سکتی ہے، ممکن ہے کہ "مجھ کو" کی جگہ "مجھے" اور "تم کو" کی جگہ "تمہیں" بہتر ہو لیکن یہ خیال ہو کہ اس "کو" کو متروک کہا جائے [illegible] (معیار)

# اقتباس

## خسرو کی ہندی شاعری

خسرو کی ہندی شاعری (ماخوذ از حالات و تصانیف خسرو مصنفہ ڈاکٹر وحید مرزا پی۔ ایچ۔ ڈی) زمانۂ حال کے مصنف ان ہندی اشعار کو جو خسرو کے نام سے قدیم تذکروں میں درج ہیں خسرو کی طرف منسوب کرنے میں تامل کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اشعار جس زبان میں ہیں وہ کھڑی بولی سے بہت ملتی جلتی ہے اور قدیم ہندی کے جو مسلم الثبوت نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے مشابہ نہیں۔

خسرو ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ماں ہندوستانی نژاد تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اچھی طرح ہندی جانتے تھے، چنانچہ خود فخریہ لکھتے ہیں:

"ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب ۔ شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن" (دیباچۂ غرۃ الکمال)

ان کے فارسی اشعار میں ہندی الفاظ مثلاً [illegible] دھان، مار، گنوار وغیرہ ملتے ہیں:

"سر آں دو چشم گرد سر کو بند دان از زن ۔ چہ ہمہ راہ نوک مژگاں بہ جگر تمکتارہ"

یہ صحیح ہے کہ ایسے الفاظ فارسی کلام میں کثرت کے ساتھ نہیں ملتے، لیکن اس کی وجہ جیسا کہ وہ خود دیباچۂ غرۃ الکمال میں لکھتے ہیں یہ ہے کہ فارسی میں خواہ مخواہ ہندی الفاظ داخل کرنا انھیں پسند نہ تھا۔

رہا یہ سوال کہ خسرو نے ہندی میں اشعار کہے یا نہیں۔ اس کا جواب خود خسرو کی زبان سنیے:

"جزوے چند نظم ہندی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است۔ ایں جا بہ ذکرے بسندہ کردم" (دیباچۂ دیوان سوم)

خسرو کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ایسے الفاظ ہیں جو ہندی فارسی دونوں میں بامعنی ہیں۔

آری آری ہمہ پیاری آئی ۔ ماری ماری برہ دکھ ماری آئی

یہ ذیل بھی خسرو کی طرف منسوب ہے لیکن کسی قلمی نسخے میں مجھے نہیں ملی:

گفتم تماشائے کنار جوئے ۔ دیدم بہ لب آب زن ہندوئے

گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود ۔ فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے

موجودہ مواد کی مدد سے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ خسرو کا ہندی کلام کس قدر تھا۔ بعض اصحاب کا یہ قول کہ ہندی کلام مقدار میں فارسی اشعار سے زیادہ تھا، مبالغے سے خالی نہیں، کیونکہ خود خسرو کے قول (دیباچۂ دیوان سوم) سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ خسرو نے جزوے چند لکھا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مقدار میں

زیادہ ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ دیباچہ مذکور کی تحریر کے بہت بعد تک خسرو زندہ رہے۔ اور انھوں نے اپنے ہندی کلام میں ضرور اضافہ کیا ہوگا۔ دتاسی کا یہ قول بھی صحیح نہیں کہ خسرو بڑھاپے میں ہندی گوئی کی طرف مائل ہوئے اس لیے کہ غرۃ الکمال کی تدوین کے وقت ان کی عمر ۴۰ سال کی تھی اور ہندی گوئی کی اس سے قبل ابتدا ہو چکی تھی۔

بدقسمتی سے خسرو نے اپنے ہندی اشعار کی تدوین کی اور ان کو جمع کرنے کی کوئی فکر نہ کی۔ خسرو ہندی محض تفنن طبع کے لیے کہتے تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میرزا غالب کے زمانے تک فارسی گو عموماً اپنے ہندی کلام کو چنداں خاطر میں نہیں لاتے تھے، چنانچہ میرزا غالب جن کی شہرت کا دار و مدار ان کے دیوان اردو پر ہے کہتے ہیں:

"فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ ÷ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است"

یہ یقینی ہے کہ خسرو نے ہندی اشعار کا دیوان مرتب نہیں کیا، اور غالباً قریب العصر شخصوں میں سے بھی کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہی اشعار باقی رہ گئے ہیں جو زبانی نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے چلے آتے ہیں یا بیاضوں میں نقل ہو گئے ہیں۔ کچھ دوہے، کچھ پہیلیاں، ایک غزل جس کے اشعار میں یہ التزام ہے کہ ایک مصرع فارسی ہے اور دوسرا ہندی، ایک مخمس جس کا ہر پانچواں مصرع فارسی ہے، چند رباعیاں اور رسالہ خالق باری یہی چیزیں ہیں جو آج کل خسرو کی طرف منسوب ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ تذکروں میں نقل ہوتا چلا آیا ہے اور قدیم تذکرہ نگار بلا تامل انھیں خسرو کی ملک سمجھتے ہیں، لیکن آج کل یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ اشعار اس زمانے کی زبان میں ہیں۔ خسرو تیرھویں صدی عیسوی میں کیوں کر اس زبان سے آشنا ہو سکتے تھے جو آج کل نواح دہلی میں بولی جاتی ہے، اور کسی قدیم ہندی مصنف نے یہ زبان کیوں نہیں استعمال کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اول تو یہ علم نہیں کہ خسرو کے زمانے کی ہندی کیسی تھی، خسرو کے اشعار کے علاوہ کوئی اور نمونہ موجود نہیں، گو یہ علم ہمیں ضرور ہے کہ خسرو کے زمانے میں ہندی یا ہندوی نام کی ایک بولی دہلی اور نواح دہلی میں رائج تھی، اور یہ اس قدر ترقی یافتہ تھی کہ نظمیں اس میں لکھی جاتی تھیں (نہ سپہر و عشیقہ)

یہ باور کرنے کی کیا وجہ ہے کہ خسرو کے زمانے کی زبان آج کل کی زبان سے بالکل مختلف تھی۔ زبان جب ایک شکل اختیار کر لیتی ہے تو بہت کم بدلتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی اور بھی وجہ ہے کہ اجنبی باتوں کے اثر سے یہ ملک بہ نسبت دوسرے ممالک کے زیادہ محفوظ رہا ہے۔ جب ہندوستان کے باشندوں کی جسمانی حالت، لباس، رسم و رواج اور معاشرت اب بھی وہی ہے جو تیرھویں صدی عیسوی میں تھی تو کیوں مان لیا جائے کہ ان کی زبان ان کے اجداد کی زبان سے بہت مختلف ہے۔ ان وجوہ سے یہ کہنا قرین عقل نہیں کہ یہ اشعار جعلی ہیں، گو یہ بخوبی ممکن ہے کہ دوسروں نے ان میں رد و بدل کر دیا ہو اور کچھ اپنی طرف سے بھی ملا دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ اب یہ پتا چلانا کہ خود خسرو نے کیا لکھا تھا اور دوسروں نے اس میں کیا کچھ اپنی طرف سے ملایا بہت مشکل ہے، لیکن یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ موجودہ اشعار اصلی اشعار سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوں گے ورنہ انھیں خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا۔ ایک ایسا مصور [illegible]

انسانوں کی شبیہ کھینچتا ہے، اس کی طرف شبیہیں منسوب کی جا سکتی ہیں۔ لیکن مناظر قدرت کی تصویریں اس کی جانب منسوب نہیں کی جا سکتیں۔ ان اشعار کی ذاتی خوبی۔ اور اسلوب بیان کی جدت کو دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ضرور کسی بڑے استاد کے کہے ہوئے ہیں، اور اس قدیم روایت کو کہ خود خسرو ان کا مصنف ہے مسترد کرنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتے۔ چوں کہ ان اشعار کی تعداد کم ہے، یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ الحاقی اشعار زیادہ ہوں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خسرو کے اشعار کھڑی بولی میں ہیں اور قدیم ترین نمونے ہندی ادب کے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ ہائی ہندی (               ) میں ہیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ خسرو کی سب سے بڑی خصوصیت جدت طرازی ہے، وہ قدما کے نقش قدم پر چلنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی راہ خود نکالنا چاہتا ہے۔ ہندی میں اس نے تفنن طبع کے طور پر کہا، اور اس کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ اس زبان میں کوئی ایسی نظم لکھے جس سے اس کی یاد قائم ہے اور جو یہ عادت کی طرح مستند سمجھی جائے۔ اس لیے اس نے بالارادہ بول چال کی زبان کو شعر گوئی کے لیے منتخب کیا، اور جب تک معترض کوئی خاص ثبوت نہ پیش کرے، خسرو کے ہندی اشعار خسرو ہی کے سمجھے جائیں گے

(مصنف نے خالق باری کے متعلق محالات اور دلائل نقل کر کے یہ لکھا ہے کہ قطعی فیصلہ موجودہ مواد کی مدد سے نہیں کیا جا سکتا، اور کتاب اس پایے کی ہے بھی نہیں کہ اس کے متعلق مناظرے میں وقت صرف کرنا مفید ثابت ہو سکے

معیار)

# مُراسلت

## "بھارتیا ساہتیا پرشد کی اصل حقیقت"

بہت سے احباب اس مجلے کے معنے نہیں سمجھیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر انھیں الجھن ہوگی۔ اس لیے سب سے اول یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنے ہیں "ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن"۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۶ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انھیں تاریخوں میں "ہندی ساہتیا سمیلن" کے جلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے۔ اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی آشان نزول سے مختصر طور پر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی۔

مسٹر کاکا کالیکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیا ساہتیا پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں اس کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں کیوں کہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۰۹ء میں مہاراشٹ ساہتیا سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجا بڑودہ نے بھارت ساہتیا پرشد کا خاکہ بہت پُر زور طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنھیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیا سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی، جسے عمل میں لانے کے لیے مسٹر کنھیا لال منشی، ہری ہر شرما اور گردھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیا سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹ ساہتیا سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لیے ہندی ساہتیا سمیلن سے تبادلہ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیا سمیلن نے کاکا کالیکر ہری بھاؤ اپادھیائے اور بابا راگھو داس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹ ساہتیا سمیلن نے اپنی ساہتیا پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیا کے لیے ایک مہاراشٹ کمیٹی قائم کی جائے جو ہندی ساہتیا سمیلن کو بھارتیا ساہتیا سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیا سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اس قرارداد سے ظاہر ہے جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"اس پرشد کا ادیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں)

اور ساہتکاروں ادیبوں میں آپس میں میل کرانا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا اب اس سبھا کا کام ہندی یعنی ہندوستانی میں ہوگا......

اس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی تھی پہلا کام یہ کیا کہ ماہنامہ "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی ایڈیٹری میں جاری تھا اپنے سایۂ حفاظت میں لے لیا اور اب اسے پریشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنھیا لال منشی بھی اس کی ایڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی پیدائش اور مقاصد کے متعلق تھی میں آپ کو اس کے پہلے جلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو تقریباً ۸ بجے دن کے اس کا پہلا جلسہ شروع ہوا۔ سب سے اول مسٹر کاکا کالیکر نے اپنا ایڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ ایڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے وہ آپ خود پڑھ لیں گے، زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

پریشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولیوشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جزو سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جزو پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پریشد (انجمن) کی ساری کارروائی "ہندی ہندوستانی" میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شائع کی اس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندوستانی ہوگی۔ اس کے کیا معنے۔ فرمانے لگے کہ کانگریس کا ریزولیوشن بھی میں نے ہی "بنایا تھا" میں نے عرض کیا یہ صحیح ہے لیکن اس وقت ہندوستانی کے معنے ہم ہرگز ہندی نہیں سمجھے تھے۔ کہنے لگے کہ اب میں نے اس کے معنے بتا دیے ہیں جو ہنس کی تحریر میں آپ نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہے۔ انہوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے یعنی "ہندی ہندوستانی" جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پریشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیکر صاحب نے اپنے ایڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا "کہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم "اردو" لے سکے۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ "ہندی ہندوستانی" سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی ہونے والی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی یہ تو آپ کی خواہش یا منشا ہے۔ اس سوال

جواب میں کہ ہندی کون سی زبان ہے اور ہندوستانی کون سی مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے اور عام لوگ کہتے ہیں اور ہندوستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا۔ اپنے مطبوعہ ایڈریس میں انھوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں شائستہ عربی فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اس پر ختم ہو گیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

تیسرے پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ ریزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رہنے دیجئے یا ہندوستانی کا۔ ہندی ہندوستانی کے کوئی معنی نہیں۔ تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی بھی ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگرس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے۔ اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگرس کے ضرور میری تائید کریں گے۔ لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگرس کے صدر موجود تھے دو سابق اور ایک حال اگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھ دیے۔ اس پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ ریزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی۔ کیوں کہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں اور اس لیے ہندی یعنی ہندوستانی بے معنی ہوگا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھیے اور میں اس کی تائید کروں گا اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنہیا لال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہیے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ فیصلے کی یہی ایک "مدبر" ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا جو اس وقت اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی جس کا انھیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ گو مہاتما گاندھی بھارتیہ ساہتیہ پریشد کو ہندی سمیلن کا بچہ سمجھتے ہیں اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پاتیں حالانکہ بقول منشی پریم چند یہ خیال صحیح نہیں۔ پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہو گئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن تیسرے پہر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رُخ بدلنا چاہیے۔ بار بار پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دہرانا موجودہ حالات

کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہیے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا اور ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنھیا لال منشی اور دو ایک اور اصحاب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہارتھوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت ریزولیوشن پیش نہ کر دیں، رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا ریزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے اسے پڑھ کر سنایا اور بلا اختلاف منظور کر لیا گیا۔ لیکن یہ ریزولیوشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا۔ اس لیے ان صاحبوں نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مصر تھے، ایک ایک بیان شائع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا۔ ان میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کیے اور کچھ مہاراشٹ ساہتیہ سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی اور ہندی کے معنی ہندوستانی بتاتے ہیں، پھر "ہندی ہندوستانی" کے جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کر کے ہندوستانی اختیار کیا گیا تھا۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروک میں داخل ہو گیا اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لیے ان کے پاس جواب موجود ہے، وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی ہندوستانی"۔ گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی یعنی ہندوستانی فرمایا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے تو انھیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے ایڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں"۔ اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبہ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی اور اس کا پہلا اجلاس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی"۔ کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے ایڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے انھوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا

(قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چھپے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے۔ تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں۔"

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا یہ مقصد بے شک قابل تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہہ ہندی زبان کا پرچار ہے۔ جس میں وہ اور ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پریشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر اسے انھیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا۔ تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے۔ غرض یہ کہ پریشد ادبیات کے مسئلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آگئی ہے اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحاد عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہو۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بد دل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔۔۔

اس گفتگو میں بنگال، مہاراشٹر، اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمایندوں نے یہ کہا (اور غالباً ان کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے) کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا یا داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ ان سنسکرت لفظوں کا سمجھنا ہمارے لیے زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں اس لیے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ ان زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے اس خیال کی تائید کاکا کالیکر کے ایڈریس سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں اہل دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنی شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے۔ پنڈت جواہر لال کی ہندی آپ کے لیے عام فہم ہوگی مگر ہمارے لیے کٹھن ہے ........ وہ ہندی بھی جو دلی لکھنؤ کے بازاروں میں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ پیدل ہندی ہے لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں ..... کانگرس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی کہ دکھن سے آنے والے نمایندوں کے لیے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں"۔۔۔

اس دوران میں لغت کی بحث نکلی یعنی ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں عام فہم الفاظ کے علاوہ وہ تمام الفاظ جمع کیے جائیں جو ہندی بنگالی گجراتی مرہٹی وغیرہ میں مشترک ہیں اور ان تمام الفاظ کی تعداد دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہ ہو اس میں دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ ہندی اور خاص کر فارسی الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ بگڑ کر ایسی ہو گئی ہیں کہ

ایک لفظ ہونے پر بھی ان کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظ تو ایک ہی ہے لیکن مرہٹی میں اس کے معنے کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور۔ علاوہ اس کے ایسی ڈکشنری ان مبتدیوں کے لیے کسی قدر کارآمد ہو سکتی ہے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں لیکن ادب کی ضروریات کے لیے بالکل کارآمد نہیں ہو سکتی۔ میں نے ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوا تھا، یہ تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی ادب اور زبان کو پڑھ کر اردو فارسی عربی الفاظ اور محاورے چن لیے جائیں اور اسی طرح اردو ادب اور زبان کا مطالعہ کر کے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لیے جائیں اور ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترک سرمایہ کیا ہے۔ اس کے بعد جن الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہو یا جو اصطلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمائندے ہوں۔ لیکن موجودہ حالات دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سود ہیں۔

میں ایک بات کہنی بھول گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے اور نہایت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے درخواست کی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندوستانی" قرار دی ہے۔ انھوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز "ہنس" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن میں ہندی یا ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے معنے ہندوستانی قرار دیے ہیں۔ جو درست نہیں۔ اردو یا ہندوستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان کے بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے لیکن ہنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہے۔ مجیب صاحب ساہتیہ پریشد کے ساتھ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیوں کہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستان ہوتا ہے اور اس لیے اس سے نہ صرف مسلمان اور ان کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کیے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھارت کی بجائے ہندوستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے لیکن ہماری عام اور مشترک زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہیے۔ عربی اگر غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ بعینہٖ حالت میں نہیں پائے جاتے۔ تلفظ کی سہولت نے ان کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ مثلاً گرام کا گانو ہو گیا۔ درش کا برس بن گیا۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کرنا یا تو اظہار شیخت ہے

یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہے بلکہ انہیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے۔ مجیب صاحب نے اس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو مسٹر کنھیالال منشی نے عاقل صاحب اجابعد علیہ ا کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں مرہٹوں بنگالیوں اور کرانیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے ان میں اردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے۔ مجیب صاحب سے تسلیم نہیں کرتے وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور "میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ انہیں آپس میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب تر کرنے کے لیے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے صرف خالص اردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے۔ اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ (مسلمان) اور ان کی تمام خدمات جو انہوں نے ہندی بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں" ناقابل لحاظ ہیں۔ ان حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی اور جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا۔ یعنی وہ زبان ہندی ہوگی کیوں کہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لہٰذا ہندوستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں۔ یہ فرقہ وارانہ تصفیہ کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتما جی کے غور کے لیے پیش کیے ہیں اور ان سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں وہ امور یہ ہیں :-

۱— ہماری مشترکہ زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی نہ کہ ہندی کے نام سے۔

۲— ہندوستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات سے مطلق کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۳— لفظ کا معیار اس کا رواج ہوگا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

۴— تمام وہ الفاظ جو اردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کیے ہیں سند تسلیم کیے جائیں۔

۵— اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ اردو، ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجائش رکھی جائے۔

۶— دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلم خیال کیے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندوستانی کے

کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو، دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

میں نے خط کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ پورا خط پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی اور خط داخل دفتر ہو گیا۔ البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ حبیب صاحب جیسے تعلیم یافتہ شخص کو ٹنڈن صاحب کے بیان پر اعتراض ہے، ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ ان کا کیا مطلب تھا یہ سمجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور امید اور لجاجت کے ساتھ یہ خط مہاتما جی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتما جی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی ان کے اور ان کے رفقا کے رویے سے پیدا ہو گئی ہے اسے رفع کرتے۔ لیکن افسوس انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

اجلاس کے دوران میں جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سرتاسر غلط بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہر چند یہ توجیہ کر کے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے میں نے ایک آدھ بار ٹوکا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں، بلکہ بحث ہندی اردو یا ہندوستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اردو ہے، وہ اردو کے ادیب ہیں، اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس لیے اس بحث کو فرقہ داری رنگ نہیں دینا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں۔ یہ سن کر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے اس پر خوب غور کیا ہے اور میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہوا۔ میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے جو اس وقت بولی جاتی تھی اور اس لیے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آ گئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہے۔ عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہے۔ اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنی اردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے

حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آگیا ہے کہ اُردو تو اُردو وہ تنہا ہندوستانی کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں جو برسر اجلاس ہوئی تھی ایک بار نہیں کئی بار فرمایا کہ اگر ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائے گا۔ لیکن ان کو نیشنل کانگرس کے ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیئت change of heart کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر و تبدل' توڑ جوڑ' اور داؤ پیچ کا باعث ہمارے ملک کی بدنصیب پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائے گا اس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے جو ٹھیک کر سلانے کے لیے اچھی خاصی لوری تھی۔ لیکن جب انہیں اس کی توقع نہ رہی یا انھوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریا کی چادر اتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں۔ وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اردو نہیں چھوڑ سکتے ان کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اُس کی اشاعت و ترقی کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق ہم ایک مفصل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔

عبدالحق

آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو

# ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

سالنامہ **سہیل** ۱۹۳۶ء، علی گڑھ، مرتبہ رشید احمد صدیقی صاحب و آل احمد صاحب سرور۔

**اردو اور اس کے بعض تاریخی ماخذ** از محمد ابواللیث صدیقی ص ۵ تا ۱۱۔ (۱) تمہید میں اردو کی ابتدا کے متعلق چند اقوال نقل کر کے خسرو کے ہندی اشعار لکھے ہیں، ایک غزل یہ بھی ہے ؎

خوار شدم زار شدم لٹ گیا + درد غم عشق تو کر توڑ (کذا) ہے۔

مضمون نگار نے اس مصرع کی قدامت کو مشکوک قرار دیا ہے۔ "چمن میں آئی ہے کیسی بہار مرغ بہ ہے کوئی نہائے" (۱) اس مصرع کے متعلق حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کا قول ہے کہ خسرو سے سیکڑوں برس قبل کا ہے۔ (۲) مغل اور اردو، اس عنوان کے تحت وہ اشعار نقل کیے ہیں جو خیال مرحوم نے اکبر، نورجہاں اور زیب النسا کی طرف منسوب کیے ہیں۔ یہ بھی جو کچھ کہ مجھ سے ہو ، اوعادت الخ اس رباعی کے متعلق م کی تحقیق ہے کہ اصلی رباعی فارسی میں ہے جو تزک جہانگیری میں موجود ہے۔ مترجم تزک جہانگیری نے فارسی رباعی کا نظم ہی میں ترجمہ کر دیا، اور اسی طرح غلطی سے اردو کی رباعی اکبر کی طرف منسوب ہو گئی۔ نورجہاں والے اشعار خفیف اختلاف کے ساتھ تذکرہ حسن میں میں بداونی کے نام درج ہیں۔ زیب النسا کی طرف جو تین شعر منسوب ہیں، م انھیں بھی مشکوک سمجھتے ہیں، لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ کس کے ہیں۔ پہلے دو شعر کے متعلق تو ہم بھی سر دست کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن تیسرے کے متعلق یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عظیم علوی کا ہے ؎ اگر ہماری لاش پر کیا یار کر چلے + خواب عدم سے فتنے کو بیدار کر چلے۔ "معیار" (۳) دکنی اور اردو دوسرا عنوان ہے، ضمناً رسالہ تصوف و اخلاق مصنفہ خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (۷۰۶ تا ۸۰۸ھ) کا ذکر بھی سالنامہ، سالار یادگار، ۱۹۳۵ء کے حوالے سے آگیا ہے۔ (م نے عمر ۱۲۰ سال، سال تصنیف ۷۰۰ھ بتایا ہے، لیکن سال ولادت صریحاً غلط ہے معیار)۔ گلشن عشق مصنفہ نصرتی کا ایک نسخہ نواب حیدر یار جنگ کے کتب خانے میں ہے اور نقیہ رضوان شاہ و روح افزا کا مصور نسخہ منو لال لائبریری گیا میں ہے۔ اس کے علاوہ بھی معلومات فراہم کی ہیں، لیکن دوسرے مقالوں سے ماخوذ ہیں معیار)۔ (۴) تیسرا عنوان اردو کے قدیم نمونے ہے۔ م چند گوپی کے اشعار کی قدامت کے قائل ہیں۔ انھوں نے اردو سرے رپورٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ دلیل دیوا سو (مصنفہ زپت لال، سال تصنیف ۱۱۵۵ھ شائع کردہ ناگری پرچارنی سبھا) میں حسب ذیل عربی فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں کلا (کلاہ) کیانی (قبا) جرہ وغیرہ، موجا (موزہ)، تاجی (تازی) کتمک (قسمت) وغیرہ۔ تاریخ فیروز شاہی مصنفہ ضیاء برنی میں حسب ذیل ہندی الفاظ ٹھگ، ٹیکہ ہندوان، منڈل، گھٹی، بہی، پٹواریان، ڈھولک، چبوترہ، مٹھ، منڈھی غلہ، ماش، موٹھ، ریوڑی، تھانہ، موڑ (موڑھا) چودھری، بلبل، بھٹی (تاریخ فیروز شاہی مصنفہ عفیف سراج میں

حسب ذیل الفاظ لت (لات) گھڑیال، درخت سنبھل، چونہ، گھڑیال خانہ، نانگ اور کبیر کے اشعار نقل کرنے کے بعد ہم نے
عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۵ء کے حوالے سے یہ شعر لکھے ہیں جو بقول مضمون نگار عالمگیر تاریخ اردو میں درج ہیں۔ "نوسے
اوپر تھا بتیا پانی پت میں بھارت ذیسا، آجکیں رجب سکروار بابر جیتا براہیم ہارا" ہم نے کانجرے راجہ
کے اشعار کا ذکر کیا ہے جو محمود کا معاصر تھا۔ اور اردو کی ابتدا کے متعلق بعض مستشرقین کے اقوال کی تردید کی ہے
(۵) ہم نے سید سلیمان صاحب ندوی کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات، اور نواب صدر یار جنگ کے مضمون مندرجہ
مقالات، اردو مرتبہ انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حوالوں سے یہ لکھا کہ اردو کی داغ بیل مسلمانوں کی اولین
یعنی فتح سندھ کے زمانے میں پڑی۔ یہ اعتراض کیا ہے کہ طلوع اسلام سے قبل عرب اور فارس کے ہند سے تعلقات تھے
تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اردو کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی۔ (اہل عرب و فارس کے ہند سے تجارتی تعلقات اور اردو کی
داغ بیل اولین مسلمان اور اردو، سندھی اور اردو، پنجابی اور اردو، دکن میں اردو کی داغ بیل ان عنوانات کے تحت
جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سرسری ہے اور کافی تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ معیار) (۶) آخر میں حسب ذیل تذکروں کا ہم نے ذکر کیا ہے
(الف) تحفۃ الشعرا، مصنفہ محمد افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی، آزاد بلگرامی نے "تحفہ اصحاب شعر" سے تاریخ نکالی
ہے۔ ۱۱۶۵ھ۔ اس کے دو نسخے ہیں پہلا چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰ صفحات کا جس کا سال کتابت نا معلوم ہے۔ دوسرا ۱۱۸۹ھ
کا لکھا ہوا (یہ تذکرہ فارسی گو شعرا کے حالات میں ہے۔ لیکن فارسی گو شعرا کا اردو کلام بھی انتخاب میں آگیا ہے چمنستان شعرا
کے ساتھ اس کتاب کے وہ اجزا جن کا تعلق شعرائے ریختہ گو سے ہے عبدالحق صاحب نے شائع کر دیے ہیں۔ اس تذکرے
کے ذکر میں ہم نے ضمناً تین عجیب باتیں لکھی ہیں ایک تو یہ کہ نکات الشعرا کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ ہے، دوسرے یہ کہ
میر حسن کا اپنے تذکرے کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ سب سے پہلا تذکرہ ہے۔ تیسرے یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میر حسن کا
تذکرہ میر کے تذکرے کے بعد سب سے پہلا تذکرہ ہے معیار۔)
(ب) بہار و خزاں مصنفہ میر بہاء الدین عروج اورنگ آبادی" صاحب تذکرہ نے اس کی ترتیب کے وقت ہی ۱۲۳۲ھ میں
انتقال فرمایا، اور عرصے تک پڑا رہا۔ مرحوم کے صاحبزادے نے اس کو ترتیب دیا" چھوٹی تقطیع کے ۱۲۶ صفحے ہیں کم و بیش
۷۹ شعرا کا حال درج ہے غالباً صرف ایک ہی نسخہ اس وقت موجود ہے۔ (ہم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۳۲ سال
تصنیف ہے، لیکن اس کی ترتیب کا زمانہ اس کے بھی بعد ہے۔ سید عبدالولی عزلت کا ترجمہ جو ہم نے اس تذکرے سے نقل
کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی تصنیف کے وقت عزلت زندہ تھے۔ عزلت کا انتقال بارہویں صدی
ہی میں ہو چکا تھا۔ مضمون نگار نے کتاب کے سال تصنیف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ معیار)
(ج) ریاض حسینی مصنفہ عنایت اللہ فتوت، مصنف نے اس رباعی سے تاریخ نکالی۔ دوسری بیت سے
"از روئے سرور بدل ہاتف بگفت گلدستۂ ریحان بہار معنی" اصل نسخے میں ۱۱۷۵ ہے مگر اس تاریخ

صرف ۱۱۶۶ نکلتے ہیں، پہلے مصرعے کے بدل کی ب کا تعمیہ ہو کر ۱۱۶۸ ہونا چاہیے۔ (دوسری بیت کا پہلا مصرع معلوم ہوتا ہے کہ صحیح نقل نہیں ہوا۔ ... بدل کے کیا معنی؟ ـ معیار) تعداد صفحات ۲۰۱، ہر صفحے میں تقریباً ۱۲ سطریں، کل ۲۰۱ شاعروں کا حال درج ہے۔ کاتب ... کی فرمائش سے یہ کتاب تصنیف ہوئی خواجہ اکرم۔ غالباً حضرت ایک نسخہ موجود ہیں ہے۔

(د) طبقات الشعرا مصنفہ قدرت اللہ سنبھلی (ہم کا یہ قول کہ یہ تذکرہ دکن میں تصنیف ہوا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا، اور نہ یہ قول کہ سال تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اس لیے کہ اس تذکرے کے بہت سے اندراجات اس کے بعد کے ہیں یہ ممکن ہے کہ اس کی ابتدا ۱۱۸۸ھ میں ہوئی ہو۔ ـ معیار)

**مضطر خیرآبادی** از سید جان نثار حسین اختر علیگ ابن مضطر صفحہ ۱۳۳ تا ۱۴۵ (مضطر کے متعلق من جملہ اور باتوں کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوائل میں اصلاح اپنی والدہ سے لی، اور امیر مینائی کی شاگردی برائے نام ہے خطابات خاں بہادر اعتبار الملک اقتدار جنگ ریاست ٹونک سے ملے تھے ان کی نظمیں "نذر دیکھی محبت" "دنیا کا بدلا بدی" "اللہ بس باقی ہوس" "اور دکھی کی پکار" کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ متصوفانہ شاعری کا مختصر سا مجموعہ بھی "یادگار الہامات" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں مضطر کے کلام کا عمدہ انتخاب بھی ہے مضطر کے حالات سے جن اصحاب کو دلچسپی ہو اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ ـ معیار)

(مضمون نگار نے سوز کا یہ مطلع سے دعویٰ کیا تھا گل نے اس رخ سے رنگ و بو کا الخ غلطی سے مصحفی کے نام سے لکھ دیا ہے۔ معیار)

**بہار اور اردو شاعری** از معین الدین دردائی صاحب صفحہ ۲۲۱ تا ۲۰۸ (ابتدا سے کر اس زمانے تک کے شعرا کے حالات اس مضمون میں ملیں گے۔ بعض باتیں نئی ضرور اس سے معلوم ہوتی ہیں لیکن اغلاط سے بھرا ہوا ہے اور بہت بے پروائی سے لکھا گیا ہے۔ مطبوعات جدیدہ کے تحت سہیل کے تبصرے میں اس کے اغلاط ملاحظہ ہوں۔ معیار)

(۱) فال نامہ حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری از بیاض سید شاہ نجم الدین صاحب نجم ... چار کچھ اکم آدے + آٹھ پانچ ... مانگے پاوے + تین گیارہ پہنچے راج + نو سو ستر کرے اکاج + (کذا)

(۲) حضرت شاہ احسان اللہ چشتی نظامی المتخلص بہ فخری حضرت مخدوم فرید طویلہ بخش کی اولاد میں تھے، اور بہار شریف محلہ چاند پورہ میں رہتے تھے۔ فارسی اردو دونوں کہتے۔ اردو کلام نایاب ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سے مضمون نگار کو حضرت فخری کی ایک اردو نظم دستیاب ہوئی۔ قلمی بیاض میں اس کی شان نزول یوں لکھی ہے۔ حضرت فخری اور حضرت شاہ علیم الدین سجادہ نشین حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری

سے گہرے تعلقات تھے حضرت شاہ عظیم الدین کے کوئی اولادِ ذکور نہ تھی اور یہ ان کے ملال کا باعث تھا۔ حضرت نزہی نے آستانۂ مخدوم صاحب پر حاضر ہونے کی صلاح دی، اور خود یہ نظم لکھ کر انھیں اپنے ساتھ وہاں لے گئے اور سوز و گداز کے ساتھ اسے پڑھا۔ دعا کی برکت سے حضرت شاہ ولی اللہ عالمِ وجود میں آئے۔ سال تصنیف ۱۱۸۵ھ۔ ا کل ۹ بند ہیں، اول و آخر کے بند درج کیے جاتے ہیں۔ معیار

| | |
|---|---|
| یا شرفِ دیں تجھ شرف ہے جملہ عالم پر شرف | جملہ عالم پر شرف ہے تجھ شرف سے ہر طرف |
| ظلم کرنا چاہتا ہے حاسدِ نادان حرف | مشکلیں آسان کر دو میری اے شاہِ نجف |
| رات دن ہو ورد فخری یا مظفر شاہِ دیں | یا مظفر شاہِ دیں حاجت روائے سرزمیں |
| آرزو کو تم سے پوچھوں دل کو ہو میرے یقیں | مشکلیں آساں کرو میری اے شاہِ نجف |

(۲) حضرت شاہ امیر الدین بہاری ظاہر وجد تخلص، فارسی دیوان مطبوعہ، اردو کا ضخیم دیوان جس میں متعدد مثنویاں بھی ہیں، اب تک بہار شریف میں محفوظ ہے۔ سال ولادت ۱۲۱۰ھ۔

(۳) حضرت سید شاہ امین احمد متخلص بہ ثبات و شوق خلف حضرت وجد۔ ولادت ۱۲۴۰ھ وفات ۱۳۲۱ھ۔ گلِ بہشتی، گلِ فردوس، روضۃ النعیم، شجراتِ طیبات، سلسلۃ اللآلی، عبرت افزا، شہد و شیر مثنویاں آپ کی تصنیف سے ہیں۔ کل تصانیف دیوانِ اردو کے سوا مطبوعہ ہیں، فارسی اردو دونوں کہتے تھے (اشعار ۱۱)

(۴) صاحب مضمون نے شاہ مرحوم کا ایک قطعہ بھی نقل کیا ہے اس میں بہت سے بہاری شعرا کے تخلص آگئے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

| | |
|---|---|
| فلک کیوں کر نہ دوئے اب عظیم آباد کے اوپر | نہ اب باقی بلاغت ہے نہ یاں شورِ فصاحت ہے |

حسب ذیل شعرا کا اس قطعے میں ذکر ہے۔

بیدل، تحقیق، راسخ، سوزدل، عشق، شیفتہ، شیدا، کاہش، کیفی، مفتوں، ذبیح یاس، تسکیں، شرر، احمد، منشا، الفتی، ضمیر، وحشتی، عبرتی، قمر، ضیا، تسلیم، مائل، فقیر نہادی، مهدوی، آشفتہ، مجنوں۔

**حالی ایک محبِ وطن کی حیثیت سے** ــ از ڈاکٹر ذاکر حسین، پی ایچ ڈی، صفحہ ۲۴۷ تا ۲۵۸۔

**ادبِ لطیف**۔ لاہور، فروری۔ **اردو کی تاریخ اور حالت، (ایک محققانہ مقالہ)** از میر محمد عامر عباس ایم اے۔ ص ۹ تا ۱۲۔ [اردو سے ہندوؤں کا تعصب دکھایا گیا ہے، مناظرانہ مضمون ہے۔ معیار]

**ادبِ لطیف** مارچ "**اردو شاعری پر ادبِ انگریزی کا اثر**" ص ۹ تا ۱۵، از ساغر جعفری

بی اے۔ (سرسری ہو، پر گھمالیا ہے۔ معیار)

**میر انیس و فردوسی**۔ ص ۲۰ تا ۳۰، از مرزا عظیم بیگ چغتائی صاحب بی اے ایل ایل بی (مرزا صاحب نے
انیس کے بہت سے اشعار ایسے دکھائے ہیں جو فردوسی کا ہو بہو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں "یا تمدے اور بدل کے سب تو"
مضمون نے اہل نظر سے سوال کیا ہے کہ کیا میر صاحب کی رزمیہ شاعری محض فردوسی سے استفادے کا نتیجہ ہے؟ معیار)

**اردو کی تاریخ و حالت پر ایک متعلمانہ نظر** ص ۳۰ تا ۴۲، از عبدالرشید صاحب منشی فاضل
(میر محمد عامر عباسی صاحب کے مضمون پر اعتراض ہے معیار)

**ادب لطیف**۔ اپریل **چغتائی صاحب کا ایک استفسار**، ص ۴ تا ۶، از محمد اسحاق جبا ایم

**تنویر کراچی**۔ مئی۔ **منور خاں غافل لکھنوی**، از حضرت افسر صدیقی۔ ص ۹ تا ۱۳۔ (۱) ان کے
والد کا نام صلابت خاں۔ یوسف زئی افغان تھے۔ ان کے بزرگ سپاہی پیشہ تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں "شاعر نہیں
کہ فخر کرے شاعری پہ وہ، ہو غافل سپاہی جسے کیا شاعری سے کام"
شاعری میں مصحفی کے شاگرد تھے ۔۔ (۲) با شاعران شیریں غافل مرا چہ کار ہست، جز خوش کردہ ایم حرز استاد مصحفیؔ
(۳) غافل گویا کے ہمعصر تھے اور ان کے فیض صحبت کے خود معترف تھے: "سے محمود اتنی کہاں تک شاعری میں میری او غافل
میں اس شہرت کو فیض صحبت گویا سمجھتا ہوں" (۳) مصحفی نے ۱۲۳۶ھ میں غافل کی عمر ۳۵ سال بتائی ہے۔ سراپا سخن
۱۲۶۹ھ کی تصنیف ہے اس میں ان کا ذکر اس طرح ہے کہ گویا اس وقت زندہ تھے۔ شمیم سخن ۱۲۸۸ھ کی تصنیف ہے
اس میں ان کا شمار مرحومین میں کیا ہے۔ قیاساً ان کی وفات ۱۲۶۹ھ اور ۱۲۸۸ھ کے درمیان ہوئی۔ (۴) اولاد
میں ایک جھمو خاں ملازم منشی نول کشور تھے۔ اس سلسلۂ ملازمت کی وجہ سے مطبع نول کشور نے دیوان غافل کو چھاپ دیا۔
جھمو خاں کا ایک لڑکا عبداللہ خاں عظمت تخلص کا ان پور وشش رحمت بنارسی و بالا کشن قمر لکھنوی تھا۔ غافل کے
ایک اور بیٹے امجد علی خاں تخلص واجد کا ذکر تذکرہ گلدستۂ سخن میں آیا ہے۔ (۵) تذکرہ روز روشن سے پتا چلتا ہے
کہ فارسی بھی کبھی کبھی کہتے تھے۔ (غافل کا حال مصحفی نے تذکرہ ریاض الفصحا میں لکھا ہے، اس تذکرے کا سال آغاز ۱۲۲۱ھ
اور سال تکمیل ۱۲۳۶ھ ہے۔ صاحب مضمون کا یہ لکھنا کہ مصحفی نے ۱۲۳۶ھ ہی میں غافل کا حال لکھا ثبوت کا محتاج ہے معیار)

**شاعر آگرہ**۔ مارچ مرتبہ جناب اعجاز صدیقی **متغزلین اردو**، ص ۱۵ (اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے
کہ بزم اکبر آبادی، مرزا [illegible] کے بیٹے اور مرزا جعفر علی فصیح لکھنوی کے پوتے ہیں۔ علی حسین قیصر ان کے حقیقی ماموں تھے
اور ضمیر ان کے والد کے ماموں تھے معیار)

**ندیم**۔ اپریل۔ **مصنف سیر المتاخرین کی آل و اولاد**، از سید مرتضیٰ حیدر صاحب نقاد، ص ۴۲
تا ۴۴ (۱) "غلام حسین خاں کے اہل و عیال کا مقبرہ حسین آباد (جیلا) میں موجود ہے، اس کی بہت سی اولادیں تھیں"

ناکتخدا بیٹی، اصلہ بیگم کی وفات غلام حسین خاں کی زندگی میں ہوئی اور اس کی قبر پر جو کتبہ نثر فارسی میں ہے وہ انھیں کا لکھا ہوا ہو۔ اس لڑکی کو مذہبی مشاغل کے سوا کسی دوسرے کام سے دلچسپی نہ تھی" اپنی حیات میں شاید اس نے اپنا ترکہ دختری اسے کر وقف کر دیا تھا جس کا سلسلہ اب تک حسین آباد میں باقی ہے"(بقیہ مضمون حیات فریاد' مصنفہ میر علی محمد شاد مرحوم کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ معیار)

**ندیم** گیا مارچ۔ **میر صاحب کی اصلاحیں**: از حکیم سید احمد اللہ صاحب ندوی ص ۹ تا ۱۰ (الکات الشعرا سے ماخوذ ہے۔ معیار) **اردو کے یوروپین شعرا**: از سید رضا آغا امام صاحب ص ۴۴ تا ۶۴ (۱) شائق، واکر، فلاطوں، اسفان، شور، جمیت (؟) صاحب، صاحب سمی، جورج فانوم، شاکر، اسیر، خفی، ایرن کے مختصر حالات ہیں۔ (۲) صاحب مضمون نے ؟ کا کے متعلق یہ صحیح نہیں لکھا کہ نصیر اس کے آقا تھے۔ اس تذکرے کا سال تالیف بھی انھوں نے غلط لکھا ہے۔ معیار) (۳) (اعظم الدولہ سرور کا سال وفات صاحب مضمون نے ۱۲۲۵ھ لکھا ہے، یہ صحیح نہیں۔ ۱۲۲۵ کے بہت بعد کی باتیں تذکرۂ سرور میں درج ہیں۔ صحیح سال وفات کے لیے گلشن بیخار ملاحظہ ہو۔ معیار)

**ادبی دنیا** فروری **کلیات دعا**: از ارز وجیلی صاحب ص ۷۷ تا ۸۰ (۱) علی بخش دعا عظیم آباد کے رہنے والے تھے یا کم از کم عظیم آباد سے انھیں گہرا تعلق تھا۔ ایک فارسی قطعے میں عظیم آباد کی تعریف ہے، جنت الہند عظیم آباد است۔ (صاحب مضمون نے دعا کو بہاری شعرا میں شمار کیا ہے لیکن اس کا کوئی قطعی ثبوت ان اشعار سے نہیں ملتا جو انھوں نے نقل کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ غالباً دعا تفضیلیہ فرقے کے شیعہ تھے۔ تفضیلی در اصل ان سنیوں کو کہتے ہیں جو حضرت علی کو دوسرے خلفا سے افضل سمجھتے ہیں۔ معیار) (۲) کلیات کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدا بخش میں ہے جس میں عربی فارسی اور اردو کی غزلیات اور متفرق کلام کے نمونے ہیں۔ حصہ اردو پر منتخب از دیوان ہندی، لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اردو علحدہ مرتب ہوا تھا۔ کتابت ۱۲۲۶ھ میں شروع اور ۱۲۲۸ھ میں تمام ہوئی کاتب کا نام مہدی بخش ہے۔ (۳) دیوان میں خلفائے اربعہ کی تعریف موجود ہے اور انشا کو بھی جا بجا یاد کیا ہے: حضرت انشا تلک تھی ساری بات بد رہ گیا ہے اب دعا نام سخن۔ (۴) دیوان میں ۴۹ غزلیں ۹ رباعیاں اور ۹ فردیات اور ۳ مثنویاں ہیں حکایت عشق، مبارک البیان' شیر و شکر۔ اس کلیات میں دیوان ریختی بھی شامل ہے جس میں ۱۶ غزلیں ۱۱ رباعیاں ۱۹ مختلف اشعار اور ۵ قبسنیں ہیں۔ ہجری کی فارسی غزل پر ایک مخمس ہے: ؎

ہوتی ہو ان کے آتو سے تم آیا گستاخ ... دیکھ کر تم کو تو کہہ بیٹھے گی انا گستاخ
چھوڑو غفلت یہ سنو اور نہ ہو تنہا گستاخ (کذا) رفت دوشینہ چو آہم بہ ثریا گستاخ

بردعا دست بر آور د مسیحا گستاخ

دو مخمس اور ہیں جن میں سے ایک انشا کی غزل پر ہے۔ نسبت کا نمونہ یہ ہے :-

ہم اسے دیات بھلا کون سی نسبت ٭ گر پوچھے تو انا میں ہوں ترے قربان

کیا سمجھے گی تو میرے تجھے سمجھا آئی ہوں ہتی ٭ ان دونوں میں ہے بارہ ابسمجھ تو نادان

کلیات کے آخر میں ایک واسوخت اور جس کے اشعار کی تضمین ہے۔ ایک قطعے میں ۷ زبانوں کے اشعار ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے اردو، فارسی، زبان برج، لہجہ بنگالیان، زبان سرکار سارن، لہجہ انگریزان، زبان عربی (صاحب مضمون کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ گرچہ نگر سے مراد ضلع ور بھنگہ ہے لیکن اقرب یہ ہے تو رنگین نے وہاں کی صحیح زبان نہیں لکھی۔ رنگین نے جو زبان لکھی ہے وہ بہ پور کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ بہ گرچہ پور کا بھی نام تھا۔ معیار)

جاڑوں ہوا آپ کیا یہ مکا رام جا ڑی ہے ٭ جا رہوں ہوں تم کو چھاڑ کے پنجاب سرکام آئی، بہ لہجہ برج۔

---

**تذکیر** مارچ تعلیم (اردو) ص ۳۳ تا ۱۰۰ (از خواجہ عشرت لکھنوی) (۱) آصف الدولہ جب حکمراں ہوئے شاہ عالم الہ آباد میں تھے۔ اسی زمانے میں میر محمدی سوز لکھنو آئے اور نواب نوازش کی شاگردی اختیار کی (شاہ عالم شجاع الدولہ کے زمانے میں ہی جا چکے تھے۔ سوز کا نام محمد میر تھا۔ آصف کب سوز کے شاگرد ہوئے اس کی تحقیق علم نہیں۔ معیار) (۲) صاحبقران توسل میر الدولہ ۵۰ روپے ماہوار پاتے تھے۔ جرات محبوب خاں کے ملازم تھے (یہ دونوں باتیں کسی تذکرے میں نہیں ملتیں۔ معیار) ۳۔ مصطفیٰ علی خاں یکرنگ جہاندار کے ہمراہ لکھنو گئے (صحیح نام مصطفیٰ خاں۔ ۱۱۹۵ھ سے بھی قبل مر چکے تھے۔ معیار) ۴۔ میر قمر الدین منت خوش حال رئیس تھے۔ مرزا فاخر نوازش اور میر ضیا ان کے ملازم تھے (منت شاعری پیشہ تھے، نوازش اور ضیا ان کے ملازم نہ تھے۔ معیار) ۵۔ (افسوس اور سبقت سلیمان شکوہ کے ملازم نہ تھے۔ معیار) ۶ (میر کو ملک الشعرا لکھا ہے) یہ صحیح نہیں۔ یہ غلط ہے کہ میر نے لکھنو جانے کے حالات نظم کیے ہیں اور وہاں پہنچتے ہی شریک مشاعرہ ہوئے۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ سودا میر کے لکھنو پہنچنے کے بعد دہلی سے نامر الدولہ کے عہد میں فرخ آباد گئے۔ سودا اس سے بہت پہلے ۱۱۷۰ھ کے قریب جنگ احمد خاں کے زمانے میں فرخ آباد چلے گئے تھے۔ وہ فیض آباد شجاع الدولہ کے عہد میں گئے۔ (ذکر آصف کے عہد میں۔ معیار) ۷۔ "شیخ مصحفی سلیمان شکوہ کے یہاں آگئے" (اس سے شبہ ہوتا ہے کہ سلیمان کے بانے سے لکھنو گئے تھے۔ یہ صحیح نہیں ۱۱۹۸ھ ہی میں وہ لکھنو پہنچ چکے تھے۔ معیار)

---

# مطبوعات جدیدہ:-

(۱) خطبات گارساں دتاسی    از ق۔ع۔و
(۲) اسانات سہیل    از ؟
(۳) کلیم عجم    از ؟

**خطبات گارساں دتاسی** مترجمہ سر راس مسعود و دیگر اصحاب و مرتبہ عبدالحق صاحب (سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو) ص ۳۰ + ۱۴ + ۸ قیمت مجلد عہ/ غیر مجلد للعہ/ گارساں دتاسی جو سال ولادت ۱۷۹۴ء ہے اور سال وفات ۱۸۷۸ء - وہ پیرس کے مدرسۃ السنہ مشرقیہ میں اردو کا استاد تھا، ہندوستان کی کبھی اس نے صورت بھی نہیں دیکھی، لیکن جہاں تک اردو سے دلچسپی کا تعلق ہے، وہ مغربی مستشرقین بھی جن کی عمریں ہندوستان میں گزر گئی ہیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ راقم کو اس کا ذاتی علم ہے کہ یورپ میں اگر کبھی اردو کے متعلق بحث چھڑتی ہے، تو اختلافی امور کے فیصلے کے لیے اب تک دتاسی کی تصانیف کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ دتاسی استاد اردو کی حیثیت سے ہر سال کے آخر میں ایک لکچر دیتا تھا، جس میں وہ اس سال کے ادبی ارتقا پر تبصرہ کرتا تھا، یعنی اس سال ہندوستانی اور ہندی میں کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں، کون کون سے نئے اخبار یا رسالے جاری ہوئے، کتنے جدید مطابع قائم ہوئے، کن کن مصنفین نے ادب میں اضافہ کیا، دتاسی مستشرقین یورپ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا کرتا، اور کبھی کبھی ہندوستان کی سیاسیات اور معاشرت پر بھی نظر ڈالا کرتا تھا۔ ان لکچروں کی ابتدا دسمبر ۱۸۵۰ء سے ہوئی، اور یہ سلسلہ ۱۸۶۹ء تک جاری رہا۔ اس درمیان میں صرف ایک سال یہ لکچر ناغہ ہوا۔ یہ بیس سال جدید ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہم ہیں، اور اس زمانے کی ادبی، ذہنی، اصلاحی اور تعلیمی تحریکوں میں شاید ہی کوئی ہو جسے دتاسی نے ان لکچروں میں نظر انداز کر دیا ہو۔ یہ لکچر فرانسیسی زبان میں تھے۔ اور اب انجمن ترقی اردو نے ان کا ترجمہ کتابی شکل میں شائع کیا ہے، جس کی بدولت وہ اردو داں اصحاب بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو فرانسیسی سے ناآشنا ہیں۔

فاضل مرتب بجا طور پر ان خطبات کو دتاسی کے اہم ترین ادبی کارناموں میں شمار کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر ہم انہیں تاریخ ادبیات سے بھی زیادہ اہم سمجھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کا مواد جن تذکروں سے لیا گیا ہے، وہ ایک ایک کر کے منظر عام پر آ رہے ہیں، اس کی قدر اسی وقت تک ہے، جب تک کہ یہ تذکرے غیر مطبوعہ ہیں، ان کی اشاعت ہو گئی، تو اس کی اہمیت باقی نہ رہے گی لیکن خطبات کا مواد دتاسی نے سرکاری رودادوں، اپنے زمانے کے اخباروں، رسالوں، کتب فروشوں کی فہرستوں اور نجی خطوط سے حاصل کیا ہے، اس ذخیرے کا معتدبہ حصہ امتداد زمانہ سے ضائع ہو چکا، جو کچھ باقی ہے وہ اس قدر منتشر ہے کہ اس کو از سر نو جمع

کرنا جو مسٹر شپرنگر نے لکھا ہے، اس کتاب سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں، اور بظاہر کوئی صورت اس کی نظر نہیں آتی کہ آئندہ بھی کوئی کتاب اس کی جگہ لے سکے۔

دتاسی نے اسی کتاب میں کہیں لکھا ہے کہ کتاب اگر بحیثیت مجموعی مفید ہو تو اس کے عیوب سے چشم پوشی کرنی چاہیے۔ ممکن ہے کہ انیسویں صدی میں تبصرہ نگاروں کا اس پر عمل ہو، لیکن بیسویں صدی میں تو تصویر کا صرف ایک رخ دکھانا ادبی شریعت میں گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے، اور ہمارے لیے باوجود اس کے کہ دتاسی کی بڑی عزت اور محبت ہمارے دل میں ہے۔ اس مشورے پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔

فاضل مرتب نے اپنے مقدمے میں دتاسی کے اغلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں جابجا غلطیاں پائی جاتی ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سی ایسی معلومات ظہور میں نہیں آئی تھیں، جو اس وقت ہماری دسترس میں ہیں۔ دوسرے آخر وہ غیر ملک کا شخص تھا، اور کبھی ہندوستان آنے کا اسے اتفاق نہیں ہوا تھا، اس لیے ہمارے ادب اور ہمارے معاملات کے سمجھنے میں کہیں کہیں غلطی کا سرزد ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔" ہماری رائے میں اس کے اغلاط کی توجیہ کے لیے صرف اسی قدر کہنا کافی نہیں۔ کچھ غلطیاں صحیح ہے کہ ان وجہوں سے سرزد ہوئی ہیں جو فاضل مرتب نے بیان کی ہیں، لیکن ہمارا سب سے بڑا اعتراض دتاسی پر یہ ہے کہ اس نے اس مواد سے جو اس کے سامنے تھا اچھی طرح کام نہیں لیا، اور ان کی مدد سے جیسی کتاب اس نے لکھی ہے، اس سے بہت بہتر کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ اس کی تصانیف کے مطالعے سے جن خاص عیوب کا پتہ چلتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) اردو فارسی سے عالمانہ واقفیت نہیں رکھتا، اور مشرقی مصنفین کی مخصوص طرز ادا کا اسے کافی علم نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عبارت کا مطلب غلط سمجھتا ہے، اور فاحش غلطیاں کرتا ہے۔

(۲) شعرائے اردو کے حالات لکھنے کے لیے محض تذکروں کا مطالعہ کافی نہیں، ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ کا علم بھی ضروری ہے۔ دتاسی نے ایک تو یہ کہ فارسی گو شعرا کے تذکروں کی طرف بالکل توجہ نہیں کی، حالانکہ بہت سے ریختہ گو شعرا کا حال فارسی گو شعرا کی حیثیت سے فارسی کے تذکروں میں ملتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس ملک کی تاریخ و جغرافیہ سے مطلقاً ناواقف ہے۔ ایک تخلص یا ایک نام کے اگر دو شاعر ہوں، تو خواہ ان کے درمیان ستر اسی برس کا بھی فرق کیوں نہ ہو اور ایک دوسرے سے سینکڑوں کوس کے فاصلے پر کیوں نہ ہوں، وہ ضرور انہیں ایک کر دیتا ہے۔

(۳) اس کا حافظہ کمزور ہے، اس کی کتابیں متناقض بیانات سے بھری ہوئی ہیں، اور بہ کثرت حوالے غلط ہیں۔

(۴) دتاسی دقت نظر سے بالکل محروم ہے، اس کی ناقدانہ رائیں عجیب و غریب ہوتی ہیں، اور مختلف فیہ مسائل میں مختلف شہادتوں پر نظر کر کے معقول نتیجے پر پہنچنے کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتا۔

(۵) کتاب اتنی بے پروائی سے پڑھتا ہے کہ اگر کوئی دقت زبان و بیان کی نہ ہو جب بھی مطلب غلط سمجھتا ہے۔

دتاسی کے ان نقائص کا ثبوت اس کی تصانیف علی الخصوص تاریخ ادبیات میں بکثرت ملتا ہے۔ دتاسی کا پایۂ تحقیق کس قدر بلند ہے۔ اس کا اندازہ ناظرین کو بھی ذیل کی مثالوں سے ہو جائے گا۔ مثالیں صرف خطبات سے لی گئی ہیں۔ اور وہ اغلاط جن کی فاضل مرتب اور ان کے لائق شاگرد نے تصحیح کر دی ہے، نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔

(۱) ص ۹ دتاسی مصنف مجمع الانتخاب کو نام فقیر محمد کامل لکھتا ہے۔ اس کو اتنی واقفیت نہیں کہ لفظ فقیر نام کا جزو نہیں بعض انکسار بڑھا دیا گیا ہے۔

(۲) ص ۵ "مگر ویزی ذات کا شیخ ہے" یہ اپنے زمانے کے مشہور صوفی تھے اور ان کی سیادت میں کبھی کسی نے شک نہیں کیا۔ دتاسی نے کہیں ان کے متعلق یہ پڑھا ہوگا کہ شیخ وقت یا شیخ طریقت تھے۔ فوراً انہیں سید سے شیخ بنا دیا۔

(۳) ص ۹ شیفتہ کے متعلق دتاسی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں اپنا ذکر بڑے انکسار کے ساتھ کرتے ہیں۔ واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے جس کو تحقیق چاہے گلشن بے خار کا دیباچہ دیکھ کر اپنا اطمینان کر لے۔

(۴) ص ۲۰ ۔۔۔ صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ معز اللہ خاں نے اس پر ایک مثنوی قول غمین لکھنؤ میں لکھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی تذکرہ نگار مومن خاں کا نام لکھ کر دوبارہ جو ان کا ذکر آیا تو خاں معزی الیہ لکھا۔ معزی الیہ معز اللہ بن گیا۔ اور ایک ایسی مثنوی جس کے متعلق دتاسی کو علم ہونا چاہیے تھا کہ مومن کی تصنیف ہے ایک خیالی شاعر کی طرف منسوب کر دی گئی۔ ایک تذکرے میں جو دتاسی کی نظر سے گزر چکے ہیں اس مثنوی کا ذکر ہے اور ہر جگہ مومن ہی اس کے مصنف بتائے گئے ہیں۔

(۵) ص ۲۱ "ایک اور عورت شاعر جو باوجود ہندو نام کے غالباً مسلمان تھی چپا ہے یہ حسام الدولہ کے حرم میں تھی" مولانا قاسم شیخ محمد چاند صاحب نے یہ صحیح اعتراض کیا ہے کہ چپا کا ذکر تذکرہ قاسم میں نہیں لیکن دتاسی کی اس غلطی کی وجہ انہوں نے نہیں بتائی۔ تذکرہ قاسم (جلد ا ص ۲۷۱) سے ایک اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے اس غلطی کی وجہ خود سمجھ میں آ جائے گی "جھجھا تخلص شخصے ست از پیش خدمتان حسام الدولہ کہ نامش از صفحہ خاطر حک شدہ" جھجھا کو چپا پڑھنا تو کوئی بڑی غلطی نہیں لیکن دتاسی تخلص اور نام میں فرق کرتا تھا۔ اور لفظ شخص کے بعد اسے کوئی حق نہ تھا کہ جھجھا کو عورت سمجھے تذکرہ قاسم دتاسی کے ماخذوں میں ہے اور اسی کی نظر سے گزر چکا ہے۔ اس لیے اس غلطی کا ذمہ دار دتاسی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

(۶) ص ۲۱ "میر نے اپنا تذکرہ مخلص کی وفات سے ایک برس قبل لکھا مخلص کی وفات ۱۱۶۴ھ میں ہوئی" اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ تذکرے کا سال تصنیف ۱۱۶۳ھ ہے دوسری جگہ سال تصنیف ۱۱۶۵ھ بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں بیان یکجا نہیں ہو سکتے۔

(۷) ص ۲۲ تذکرۂ شورش نکات الشعرا کے دس برس بعد یعنی ۱۱۶۸ + ۱۰ = ۱۱۷۸ھ میں لکھا گیا۔ ص ۹۷ تذکرۂ شورش ۱۱۹۳ میں لکھا گیا۔ ان دونوں بیانوں میں تضاد ہے۔

(۸) ص ۱۷ جہاں تک ہمیں علم ہے سب سے پہلا سب سے پرانا میر کا تذکرہ ہے۔ ص ۲۸ پر اس کے خلاف لکھا ہے۔

(۹) ص ۲۶ مصحفی نے شاہنامے میں شاہ عالم کے عہد تک کے حالات نظم کیے ہیں۔ تذکرۂ ہندی میں مصحفی لکھتے ہیں کہ ایک دو جز،

نسب نامہ شاہ عالم تک لکھا گیا۔

(۱۰) ص ۱۰۰ مصحفی کو یہ واقعہ کہ ا۔م عشق نے ان کے تذکرے سے سرقہ کرکے دوسرا تذکرہ لکھا حقیقت سے معلوم ہوا' تذکرہ ہندی میں ہے کہ خود حقیقت بھی اس سرقے میں شریک تھے۔ حقیقت سے اس واقعے کا معلوم ہونا دتاسی نے غلط فہمی سے لکھا ہے۔

(۱۱) ص ۱۳۱، جو نزاکت تخلص کا نام دتاسی نے رام جی پڑھا ہے اور اس کو ہندو قرار دیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔

(۱۲) ص ۱۳۱ جان صاحب ریختی گو کو ایک تو عورت سمجھا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ جان تخلص کی ایک عورت کا تذکرہ ناصر میں موجود ہے) دوسرے یہ کہ جان صاحب کو کریم الدین صاحب تذکرہ کا استاد قرار دیا ہے' کریم الدین نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے اس کا شبہہ بھی ہو، اور خود کریم الدین شعر کہتا تھا۔ ریختی سے بھلا ایک مولوی کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔؟

(۱۳) ص ۱۴۰ دتاسی نے لکھا ہے کہ حیدر شاہ نے مخمس لکھے ہیں اور اس میں ولی سے ترقی کی ہے۔ دتاسی نے کسی کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن حیدر شاہ کا حال صرف گلزار ابراہیم میں ہے، اور دتاسی نے وہیں سے لیا ہے۔ گلزار میں خلیل نے یہ لکھا ہے کہ حیدر نے دیوان ولی کی کل غزلوں کو مخمس کیا تھا۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

(۱۴) ص ۱۴۰ مرزا علی لطف صاحب تذکرہ کا باپ ہجری تخلص اردو میں شعر کہتا تھا۔ لطف نے ہجری کی فارسی گوئی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ریختہ گوئی کا ذکر سوا دتاسی کے کسی نے نہیں کیا۔

(۱۵) ص ۱۵۰ دتاسی لکھتا ہے کہ قاسم نے ۱۰۹ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ حوالہ کریم الدین۔ کریم الدین نے صرف یہ لکھا ہے کہ بڑی عمر پاکر انتقال کیا۔

(۱۶) ص ۱۸۲ مصحفی کا سال وفات کریم کے حوالے سے ۱۲۴۸ء لکھا ہے' حالانکہ کریم نے ۱۲۴۰ھ لکھا ہے' جو غالباً کاتب کی غلطی ہے۔

(۱۷) ص ۱۸۲ مصحفی کے متعلق لکھا ہے کہ دیوان زادۂ حاتم کے دیباچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاتم کے ہم عصر تھے' حاتم نے دیباچے میں مصحفی کا بالکل ذکر نہیں کیا۔

(۱۸) ص ۱۸۸ محمد جان ساقی تخلص کے متعلق لکھا ہے" ساقی معروف بہ سامی' اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ ساقی نام تھا اور سامی عرف حالانکہ ساقی نہ ان کا نام تھا نہ تخلص' اور سامی تخلص تھا، جیسا کہ تذکرہ قاسم اور تذکرہ سرور کے مطالعے سے واضح ہوگا۔

(۱۹) ص ۱۹۰ گلستان سخن: اس نام کے تین تذکرے ہیں' جوش' مبتلا اور صابر کے لکھے ہوئے۔ مبتلا کے تذکرے کا نام گلشن سخن ہے' اور جوش نے غالباً اس نام کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا، بلکہ جہاں تک ہمیں علم ہے، جوش کسی تذکرہ نگار کا تخلص نہیں۔

(۲۰) ص ۱۳۶۔ خاص طور پر قابل ذکر شاعروں میں سودا، میر اور حسن کے بعد' درد اور یقین وغیرہ کے ساتھ امجد دہلوی' امین الدین بناری' اور عاشق غازی پوری سے گمنام شاعروں کا نام لکھا ہے۔

(۲۱) ص ۱۴۴ "ہمارے ہم عصر شاعروں میں ذوق و آتش نوید اور نظیر کے دیوان زیادہ قابل لحاظ ہیں" اگر کسی صاحب کو نوید تخلص کے کسی ممتاز شاعر کا حال معلوم ہو تو وہ ہم سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔

(۲۲) ص ۹۲ گلشن بےخار سب تذکروں سے زیادہ صحیح ہے۔ یہ سچ ہے کہ شیفتہ سخن فہم اور نکتہ رس تھے، لیکن یہ بالکل غلط کہ انہوں نے واقعات کے لحاظ سے تذکرے کو صحیح بنانے کی کوئی خاص کوشش کی تھی۔ صحت کے لحاظ سے دوسرے تذکروں پر اسے ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

(۲۳) ص ۹۳ باطن کا انتقال ۱۲۵۹ھ میں ہوا، ان کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۲۵۹ھ کے بعد ہوئی

(۲۴) ص ۱۳۵ دتاسی کے نزدیک داسوخت سوز سے مختلف نہیں، اور واسوخت کا مسدس ہونا ضروری ہے

(۲۵) غیاث الدین محمد رفاری لغت ہفت قلزم کے مولف تھے ص ۱۹۸

(۲۶) ص ۲۲۲ دتاسی نے غدر ۱۸۵۷ء کے زمانے میں یہ تماشا ظاہر کی ہے کہ مرزا داراہجت ... تخلص ظفر، اکبر، مرزا قتل یا ہلاکت سے محفوظ ہیں، حالانکہ یہ غریب غدر سے بہت قبل مرچکا تھا، مرزا دوسرے ولی عہد بھی غدر سے قبل انتقال کرچکے تھے، لیکن دتاسی کو اس کی بھی خبر نہ تھی

(۲۷) ص ۲۴۲ - ۳۴۳ دتاسی عشق عظیم آبادی صاحب تذکرہ اور الٰہی بخش عشق لکھنوی شاگرد رشک کو ایک سمجھتا ہے۔ عشق کا تذکرہ اس نے نہیں دیکھا، لیکن اشپرنگر نے جو کچھ عشق کے متعلق لکھا ہے، اس کی نظر سے گزرا ہے، اور عشق کے زمانے کے متعلق وہ رائے قائم کرسکتا ہے۔ خود اپنی تاریخ ادبیات میں عشق کا نام اس نے رحمت اللہ لکھا ہے، جو غلط ضرور ہے۔ لیکن الٰہی بخش سے مختلف ہے۔ دتاسی کو یہ علم ہے کہ تذکرۂ عشق میں آخری حوالے جو ملتے ہیں وہ ۱۲۱۵ھ کے ہیں (یہ اشپرنگر کا قول ہے جو صحیح نہیں) اور ۱۲۱۵ھ میں الٰہی بخش عشق کا کیا ذکر ہے ان کی استاذ الاستاذ ناسخ بھی منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ خود رشک کی پیدائش ۱۲۱۵ھ یا اس کے لگ بھگ ہوئی تھی۔ یہ تمام باتیں دتاسی کو معلوم ہیں یا معلوم ہونی چاہییں، لیکن وہ بے تامل الٰہی بخش عشق اور وجہ الدین عشق کو ایک بنا دیتا ہے

(۲۸) محسن صاحب تذکرہ دتاسی کی رائے میں اعلیٰ درجے کے شاعر نہیں ہیں، اور ان کا تذکرہ اردو کے اور تذکروں کی طرح بے مزہ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ محسن کا شمار کسی نے اعلیٰ درجے کے شاعروں میں نہیں کیا، اور نہ اس کا کلام اس کا مستحق ٹھہراتا ہے، اور اس کا تذکرہ اردو کے کل تذکروں میں سب سے زیادہ خشک اور بے مزہ ہے۔

فاضل مرتب اور ان کے لائق شاگرد شیخ محمد چاند صاحب نے مصنف کی غلطیوں کی کہیں کہیں حواشی میں تصحیح کی ہے، جس سے ان کی وسعت نظر کا پتا چلتا ہے، لیکن بعض مقامات پر ان صاحبوں سے خود غلطی ہوگئی ہے، جس کی طرف ہم ان کی توجہ منعطف کرانے کی جرأت کرتے ہیں:-

(۱) عبدالحق صاحب کا خیال ہے کہ علی ابراہیم کا ایک تخلص خلیل اور دوسرا اعلیٰ تھا۔ دتاسی لکھتا ہے کہ ایک تخلص خلیل اور دوسرا حال تھا۔ دتاسی کا قول صحیح ہے، تذکرۂ عشقی میں حال تخلص دیا ہے، اور علی کسی تذکرے میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر فاضل مرتب کے پاس اس کی کوئی سند ہو تو ہمیں آگاہ فرمائیں، تاکہ ہمیں اپنی رائے کو بدلنے کا موقع ملے۔ (حاشیہ ص ۸)

(۲) شیخ چاند صاحب کہتے ہیں کہ خاکسار نے اپنے تذکرے کا نام معشوق چہل سالہ قرار دیا تھا، یہ نام کسی تذکرے کا نہیں ہو سکتا کیونکہ بقرت

کو موزوں کر دیا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ تذکرہ اپنے معشوق کے نام معنون کیا تھا۔ پرانے زمانے میں کسی شخص کے نام پر کتاب لکھنے کا وہی
مطلب ہوا کرتا تھا، جو آج کل کسی کے نام سے کتاب معنون کرنے سے نکلتا ہے۔ حاشیہ ص ۱۰۶۔
(۳) شیخ چاند صاحب کا خیال ہے کہ امام الدین سرخو کی رسالہ دار شاہی تھا' یہ صحیح نہیں' اس کا باپ اس عہدے پر مامور تھا۔
امام الدین کا حال گلزار ابراہیم میں دیکھیے حاشیہ ص ۱۰۷
(۴) شیخ محمد چاند صاحب لکھتے ہیں کہ طپش کا قید ہونا کسی تذکرے میں نہیں پایا جاتا۔ یہ قول صحیح نہیں، عشقی نے اس کا حال لکھا ہے' اور
تعجب نہیں کہ اشپرنگر نے بھی اس سے نقل کیا ہو کلیات طپش سے بھی قید ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔
ترجمہ صحیح معلوم ہوتا ہے' گو بعض مقامات مشکوک ہیں۔ صریح غلطی سوا ایک کے نظر نہیں آئی۔ ص ۱۲۹ شاہزادی خالہ' یہ غلطی انہوں نے
اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے عماد الملک کے محل میں اسی نام سے پکاری جاتی تھیں" دتامی ۲ خالہ بیگم کو شاہزادی خالہ بنا دیا'
اور غلطی سے اسے تخلص سمجھ لیا' حالانکہ یہ تخلص نہیں' مترجم کا سہو یہ ہے کہ انہوں نے فرانسیسی لفظ نیوو کا ترجمہ بھانجے کی جگہ بھتیجے کیا ہے' اس
لفظ کا اطلاق بھتیجے اور بھانجے دونوں پر ہو سکتا ہے' لیکن عماد الملک اگر بھتیجا ہوتا تو یہ شاہزادی خالہ بیگم کے لقب سے نہ پکاری جاتی۔
مؤرخوں اور تذکرہ نگاروں نے بھی یہی لکھا ہے۔ کتابت کی غلطیاں زیادہ نہیں، لیکن ان کی تصحیح کے لیے غلط نامہ ہوتا تو بہتر تھا۔

## سالنامہ سہیل علی گڑھ ۱۹۳۶ء

مرتبہ رشید احمد صدیقی صاحب' ص ۳۴۴ + ۴۴۸' تصاویر سرورق علاوہ تقطیع ......
قیمت تین روپیہ (عہ)۔

رشید احمد صدیقی صاحب اُردو کے مقبول انشا پردازوں میں ہیں' اور سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں قسم کے مضامین
اچھے لکھتے ہیں۔ ہم نے معیار کی کسی اشاعت میں یہ شکایت کی تھی کہ ان کے ایک مضمون میں سنجیدگی اور ظرافت کو جمع کرنے کی
کوشش کامیاب نہیں ہوئی' یہ شکایت ایک خاص مضمون کے متعلق تھی' یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے کل مضامین کے متعلق ہماری یہ
رائے ہے۔ صدیقی صاحب چند سال قبل سہیل نامی ایک سہ ماہی رسالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اُردوئے معلی کی طرف
سے نکالا کرتے تھے۔ اس کی اشاعت بعض وجوہ سے معرض التوا میں آ گئی تھی' یہ رسالہ انہوں نے پھر جاری کیا ہے' لیکن اب
اس کی زیارت سال بھر میں ۴ بار کی جگہ صرف ایک بار ہوا کرے گی' علی گڑھ سے علمی اور تعلیمی مرکز میں ایک ایسے رسالے کی جو
وہاں کے نوجوانوں کو ادب اُردو کی خدمت کی طرف مائل کرے' شدید ضرورت ہے' ہم سہیل کی کامیابی کے دل سے خواہاں ہیں
اور یہ چاہتے ہیں کہ ایسے اسباب پیدا ہوں کہ صدیقی صاحب اسے جلد ماہوار شائع کر سکیں۔ سہیل کے سرورق پر علمی و ادبی
سالنامہ لکھا ہوا ہے' لیکن سوا دو کے کل مضامین ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادب میں تخلیقی، تحقیقی اور ناقدانہ مضامین مناسب تعداد
میں ہیں۔ سجاد علی انصاری مرحوم کی "ناتمام تمثیل" دو جزا قابل دید ہے، اسے پڑھ کر ہمیں اپنی بے خبری پر افسوس ہوا کہ اس سے
قبل ان کی کسی تحریر کے مطالعے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر افسوس ہمیں ان کی جوان مرگی کا ہوا۔ اگر مرحوم نے عمر طبیعی
پائی ہوتی تو اُردو کے تخلیقی ادب کی کم مائگی بڑی حد تک دور ہو جاتی۔ صدیقی صاحب نے اس تمثیل کی اشاعت سے اُردو پر بڑا احسان

کیا ہے' اور اگر اپنے رسالے میں وہ اس کے سوا کچھ اور نہ بھی شائع کرتے' جب بھی خریدنے والوں کو یہ سودا مہنگا نہ پڑتا۔ ایک دوسری تمثیل 'دیوانے' کسی طالب علم کی لکھی ہوئی ہے، ممکن ہے کہ مصنف کا نقطۂ نظر ہماری نظر میں نہ آیا ہو' اگر ایسا ہے تو یہ خود ان کا قصور ہے، انہیں تمہیداً اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ مصنف کی مدد کے بغیر جو رائے ہم قائم کر سکتے ہیں' وہ یہ ہے کہ اس میں تخیل کی بڑی بے اعتدالیاں ہیں' اور قواعد فن سے بے ضرورت انحراف کیا گیا ہے۔ افسانوں میں سلطان حیدر صاحب جوش کا افسانہ قابل ذکر ہے، اور نظموں میں کوئی بھی قابل ذکر نہیں' ناقدانہ مضامین میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا مضمون اچھا ہے' اور تبصروں کا معیار عام رسائل کی سطح سے بلند تر ہے۔ اودھ کے متعلق جو تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہیں' ان میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مضمون کو چھوڑ کر کسی کا پایہ بلند نہیں۔ دو مضمون مرتب کے شاگردوں کے ہیں' ایک صاحب نے "اودھ اور اس کے بعض تاریخی ماخذ" کے عنوان سے چودہ پندرہ سو برس کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے' یہ ایک ایسا وسیع اور مشکل موضوع ہے کہ منتہی بھی اس پر آسانی سے نہیں لکھ سکتے، چہ جائیکہ مبتدی۔ اس کے لیے جس وسعت مطالعہ اور دقت نظر کی ضرورت ہے، اس کے واسطے ایک عمر چاہیے' دوسرے صاحب نے "بہار اور اردو شاعری" کے موضوع پر لکھا ہے اور اس مضمون میں بھی آٹھ نو سو برس کی ادبی تاریخ زیر بحث آگئی ہے۔ ان دونوں مضمون نگاروں کو اردو سے جو شوق ہے' وہ دوسرے نوجوانوں کے لیے قابل تقلید ہے' مضمون لکھنا بھی محنت سے ہے' لیکن انہوں نے اتنا بھاری بوجھ اٹھایا ہے کہ ان کے کمزور کاندھے اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ دونوں کسی ایک مصنف یا کسی خاص دور کے متعلق اچھے نمونوں کو سامنے رکھ کر لکھیں' تو بہت زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ذیل میں ہم مفصلاً بہار اور اردو شاعری کے اغلاط کا ذکر کرتے ہیں۔ اعتراض مقصود نہیں اور نہ ہم طالب علموں کے مضامین کو کاملین فن کے معیار سے پرکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ غرض ضرور ہے کہ صدیقی صاحب کو مرتب یل اور استاذ اردو کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو' اور آئندہ کہیں غلط معلومات کی اشاعت کا ذریعہ نہ بنے۔

(۱) "ناصرالدین اور اس کے بیٹے معزالدین کیقباد کی جنگ کے حالات کو فارسی میں حضرت خسرو سے بہت پہلے ایک بہاری شاعر نے ...... اردو میں نظم بند کیا تھا۔ خسرو کی قرآن السعدین ہر جگہ مشہور ہے' لیکن غریب بہاری شاعر کا بھی ایک شعر یاد رہے۔

من کی اجڑی نگری کو تب کرنی آباداں ناصر دین کو جب ملیں تو چھڑیں کی داں"

یہ بیان سخت تعجب خیز ہے' ایک تو کیا ایک ہی نظم فارسی اور اردو دونوں میں کیونکر نظم بند ہوئی! دوسرے یہ کہ خسرو کیقباد کے درباری شاعر تھے' قرآن السعدین باپ بیٹے کی مصالحت کے تھوڑے ہی دن بعد خسرو نے کیقباد کے حکم سے لکھی تھی۔ کسی شاعر کا خواہ وہ بہاری ہو یا غیر بہاری' اردو گو ہو یا فارسی گو' اس موضوع پر خسرو سے بہت پہلے نظم لکھنا قطعی ناممکن ہے۔ شعر بالا کے زمانۂ تصنیف سے قطع نظر بھی کی جائے، تو اس کا کیا ثبوت کہ یہ شعر کسی بہاری شاعر کا ہے۔ صاحب مضمون کو یہ ضرور بتانا تھا کہ یہ شعر انہوں نے کہاں

ہے۔ یہ اور ان کو بیان مصنف اور زمانہ تصنیف کے متعلق کہاں سے ماخوذ ہے

(۲) ذیل کے دو شعر علی الترتیب حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری اور ان کے مرید مولانا مظفر بلخی کی طرف منسوب کیے ہیں لیکن کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔

"شرفا گور ڈراون نس اندھیاری رات — واں نہ پوچھے کون تمہاری جات

جی لگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں — جن کے کارن مجھے بہت تن سے بنائیں گتیں"

(۳) ملا علیم تحقیق کے اشعار ذیل بغیر کسی حوالے کے نقل کیے ہیں اور زمانی حیثیت سے انہیں بیدل سے بھی مقدم قرار دیا ہے۔ تحقیق کا سال ولادت ۱۰۰۵ھ کے لگ بھگ ہے اور سال وفات ۱۱۲۲ھ (تذکرۂ خوشگو) اس حساب سے بیدل کی ولادت کے تقریباً ۴۰ برس تحقیق پیدا ہوئے اور بیدل کی وفات ذکرم عرض ۳۰ برس بعد ہوئی یعنی تحقیق کے زمانے میں ریختہ گوئی عام ہو چکی تھی۔ اور بغیر کسی معتبر سند کے ہم ان اشعار کو تحقیق کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ قولے وطن کی سند (مضمون نگار نے اشعار کے لیے تو نہیں، لیکن حالات کے لیے اس کتاب کا حوالہ دیا ہے) ناکافی ہوگی۔

"سرجن ترے مکھڑے میں سورج کی کرن دھا ہے — دیکھوں ہوں جو تجھ مکھ کوں نیناں مری چندھا ہے

جھمکوڑا باندھ دل ہوں سماجا دکا — سلونو سانورے ادھر کوں آجا"

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی عظیم آبادی تذکرہ نگار نے ریختہ گو کی حیثیت سے تحقیق کا ذکر نہیں کیا

(۴) یکتی اور جالی درد کے شاگرد نہ تھے۔ یہ لوگ عمر کے لحاظ سے بہت بعد کے ہیں، اشکی کو عشقی نے اپنا شاگرد لکھا ہے مضمون نگار کو اس قسم کی حکایتوں کو اس قدر آسانی سے قبول نہیں کرنا چاہیے۔

(۵) میر تقی میر نے میر جعفر عظیم آبادی سے فارسی ضرور پڑھی، لیکن مضمون نگار نے میر کی شاگردی کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ میر فن سخن میں میر جعفر کے شاگرد تھے، حالانکہ یہ واقعے کے خلاف ہے" (ذکر میر ملاحظہ ہو)

(۶) مضمون نگار کے خیال میں طالب آملی بیدل کا ہم عصر تھا، لیکن طالب کا انتقال ۱۰۳۶ھ میں بیدل کی ولادت سے کم و بیش ۲۰ سال قبل ہو چکا تھا (سرو آزاد)

(۷) مضمون نگار کی رائے میں "بہار اسکول کی اردو شاعری میں بیدل کا اسکول یقیناً سب سے پہلا کہا جا سکتا ہے"۔ سجاد اور فغاں وغیرہ کی شاعری بیدل اسکول سے اثر پزیر ہے جس شاعر کی تصنیف سے اردو کو صرف دو شعر دستیاب ہوئے ہوں اسے کسی اسکول کا بانی قرار دینا حیرت انگیز ہے۔ ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ قدما کی تصانیف سے کوئی ثبوت اس امر کا نہیں دیا جا سکتا کہ بیدل نے اردو میں بہت سے اشعار کہے تھے اور وہ ضائع ہو گئے۔ اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ دو شعر جو میر اور قائم نے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں دہلی میں نہیں بلکہ عظیم آباد میں لکھے گئے، فغاں کا ذکر بہاری شعرا کے ساتھ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، ان کے فارسی اور اردو کلام پر بیدل کا بالکل اثر نہیں پڑا۔ اس قسم کے بے بنیاد دعووں سے

ان مجموعوں کو احتراز لازم ہے۔

(۸) مضمون نگار کی رائے میں "بیدل و راسخ کے علاوہ ایک اسکول بلگرامی سادات کا ہے" اس اسکول میں خورشید امامی، صفیر، بیدؔ، آروی وغیرہ داخل ہیں، لفظ اسکول سے نہ معلوم صاحب مضمون کی کیا مراد ہے۔ صفیر بلگرامی اور ان کے تلامذہ کے متعلق تو یہ مسلمات سے ہے کہ وہ ناسخ کے پیرو ہیں۔

(۹) بیدل کے عظیم آبادی ہونے کی تائید میں آزاد کے علاوہ کسی قدیم تذکرہ نگار کا قول نہیں پیش کیا جاسکتا۔ بیدل کا بہاری ہونا ہرگز قدما کے مسلمات سے نہیں ہے۔ نصیر آبادی نے ان کا وطن لاہور، قاسم نے بخارا، خوشگو اور عشقی نے اکبرآباد بتایا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی تذکرہ نگار نے خوشگو سے زیادہ مفصل بیدل کے حالات نہیں لکھے' اور جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے' اسے سیکڑوں بار بیدل کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا تھا' رہے عشقی' ایک تو وہ خود عظیم آباد کے ہیں' دوسرے یہ کہ بیدل ان کے استاد الاستاد تھے، خوشگو اور عشقی کی شہادت اس معاملے میں آزاد کی شہادت سے مرجح ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بیدل کا وطن عظیم آباد تھا ایسی شہادت پیش کرنی چاہیے جس سے خوشگو اور عشقی کی تردید ہوسکے اور بارہویں صدی کے اکثر تذکروں کے مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ایسی شہادت موجود نہیں۔ ہم نے اس مسئلے کی تحقیق کے لئے کلیات بیدل کا بھی مطالعہ کیا۔ اس سے یہ تو ثابت ہوا کہ طفولیت اور آغاز شباب تک بہار میں رہے لیکن یہ پتا نہ چلا کہ کس جگہ پیدا ہوئے۔ یہ بخوبی ممکن ہے کہ مرزا عبدالخالق پدر بیدل کی وفات کے بعد میرزا قلندر عم بیدل جو ایک ملازمت پیشہ شخص تھے بیدل کو بہار لے آئے ہوں۔ میرزا بیدل کی طرف جو شعر صفیر بلگرامی نے منسوب کیا ہے' وہ دراصل پیر سوز کا ہے اور انہیں کے نام نکات الشعرا اور مخزن نکات میں درج ہے۔ شعر ذیل مضمون نگار نے سید نجیب اشرف صاحب کے ایک مضمون سے نقل کیا ہے، اس کے متعلق ان کی یہ رائے صحیح ہے کہ بیدل کی تصنیف نہیں۔ مضمون نگار نے شکایت کی ہے کہ سید نجیب اشرف صاحب نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ کمی ہم پوری کیے دیتے ہیں۔ ان کا ماخذ نوائے وطن ہے اور شعر یہ ہے:۔

سر اوپر کوئی نہیں تب دشمن آپن کہیں — پٹنہ نگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بدیں

شعر مذکور:۔ شہرہ حسن سے از بس کہ وہ محبوب ہوا — اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

(۱۰) جوشش کے تذکرے کا ذکر حسن کے سوا کسی نے نہیں کیا، خود حسن کو بھی اپنے بیان پر اعتماد نہیں۔ اگر انہوں نے تذکرہ لکھا ہوتا تو عظیم آبادی تذکرہ نگار شورش، خلیل، عشقی میں سے کوئی نہ کوئی اس کا ذکر ضرور کرتا۔ مضمون نگار کا یہ قول دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ "جوشش کے ہر شعر میں جدت پائی جاتی ہے" ایسی مبالغہ آمیزی سے احتراز چاہیے۔ دل کو جوشش کا چھوٹا بھائی بتایا ہے، یہ فاحش غلطی ہے۔ جسونت رائے ناگر کو بیٹا بتانا بھی صحیح نہیں۔ مضمون نگار کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ دل عربی کے جید عالم تھے اور فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے؟ "چوں آئینہ یہ ستم رسیدہ" الخ۔ یہ شعر دل کا نہیں، جوشش کا ہے۔

(۱۰) یہ صحیح نہیں کہ مظہر علی جذب کا حال تذکرۂ حسن کے سوا کہیں اور نہیں ملتا، تذکرۂ عشقی میں ان کا ذکر موجود ہے اور صاحب تخلص

کے تحت تو فارسی گو شاعروں کے متعدد تذکروں میں ان کا ذکر ہے۔

(۱) اشتعل عظیم آبادی نہ تھے "دہلوی تھے۔ ممکن ہے کہ عظیم آباد بھی آئے ہوں، لیکن دہلی چھوڑنے کے بعد ان کا قیام زیادہ تر مرشد آباد میں رہا۔ (گلزار ابراہیم و تذکرہ عشقی)

(۲) مضمون نگار کو اصرار ہے کہ حسرت کا نام بیعت قلی نہیں، بیعت قلی تھا، یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ کل قدیم تذکروں میں ان کا نام بیعت قلی خاں درج ہے۔ یہ مصرعہ غلط نقل کیا ہے۔ "ادھر بہار ادھر اک شیشۂ دل ہے" بہار کی جگہ پہاڑ ہونا چاہیے۔ یہ غلطی اور لوگوں سے بھی ہوئی ہے 'میخانے میں کیا پھرے ہے شکل شکل' یہ رباعی دیوان آبا اس میں بھی درج ہے' غالباً حسرت کی نہیں۔

(۳) شورش کا سال وفات مضمون نگار نے ۱۱۹۰ بتایا ہے اور ۱۱۹۵ کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ اپنے ماخذوں میں انہوں نے گلزار ابراہیم (اس کا نام وہ گلزار ابراہیمی سمجھتے ہیں) کا نام بھی لکھا ہے' حیرت کی بات ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد بھی شیفتہ کے قول کو وہ مرجح جانتے ہیں

زمانہ گرچہ ہے بر خلاف ہو شورش — ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

گلشن بیخار سے مقطع بالا نقل کرنے کے بعد مضمون نگار نے اسی زمین کے دو اور شعر شعرالہند کے حوالے سے لکھے ہیں:۔

"کسی کو خم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام — قسم مغاں کی ہے ساقی کہ مجھ کو نام سے کام"

"ہماری صبح رخ یار شام زلف نگار — نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح و شام کے کام"

مضمون نگار ان دو شعروں کو رباعی سمجھتے ہیں۔ تعجب ہے کہ صدیقی صاحب نے اس غلطی کی تصحیح نہیں کی وہ سہیل کے مرتب ہی نہیں مضمون نگار کے استاد بھی ہیں۔ ان کی ذمہ داری دہری ہے۔

(۵) عشق کافی عمر پاکر پٹنہ آئے تھے، ان کو عظیم آبادی شعرا میں شمار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ فدوی کو بھی عظیم آبادی شعرا میں نہیں گننا چاہیے' یہ بھی غلط ہے کہ وہ احمد شاہ کے وقائع نگار تھے' ان کا عرف بجو نہیں بجو یا بچو ہے۔ ۱۱۹۰ تک ان کے قیام کی کوئی جگہ متعین نہ تھی، کبھی فیض آباد، کبھی مرشد آباد اور کبھی عظیم آباد میں رہتے تھے۔ (تذکرہ حسن و تذکرہ قاسم)

(۶) راسخ کے متعلق مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ سودا اور تاباں کے شاگرد نہ تھے۔ میر سے بھی برائے نام اصلاح لی' نوائے وطن میں جو حکایت راسخ کے لکھنؤ جا کر میر سے ملنے اور اپنا دیوان برائے اصلاح پیش کرنے کی لکھی ہے' اسے مضمون نگار تسلیم کرتے ہیں، انہوں نے دو غیر مطبوعہ اشعار راسخ کے نقل کیے ہیں' اور ان سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاگرد دراصل فدوی کے تھے' میر سے محض ارادت تھی۔

"شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار — راسخ نہ ہوں اک میں بھی وہ کس شمار میں"

"ہوا ہوں عالم بالا میں برسوں تربت راسخ — اویسیہ ارادت ہے جناب میر سے مجھ کو"

سال وفات اور شاگردی سودا وتاباں کے متعلق مضمون نگار کی رائے صحیح ہے، باقی کل بیانات محل نظر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ راسخ عظیم آباد کے رہنے والے تھے، ابتدا میں انہوں نے فدوی سے اصلاح لی اور ان کے غیر مطبوعہ دیوان میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں فدوی کی شاگردی کا اقرار کیا ہے، لیکن یہ اشعار ان کی ہدایت کے مطابق بعد میں دیوان سے خارج کر دیئے گئے، چنانچہ مطبوعہ دیوان میں جو قدیم قلمی نسخے کی نقل ہے، ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا۔ کسی روایت سے تو اس کی تائید نہیں ہوتی، لیکن قیاس کہتا ہے کہ مشق کی پختگی کے بعد فدوی سے منحرف ہو گئے ہوں گے، ورنہ ایک آدھ شعر تو دیوان میں ایسا رہنے دیتے جس سے ان کی ارادت مندی کا پتا چلتا۔ رہی میر کی شاگردی، اس کے متعلق نوائے وطن والی حکایت تو محض سنی سنائی بات ہے، جس کا کچھ اعتبار نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ شاد مرحوم کو کوئی خاص واقفیت راسخ کے حالات سے رہی ہو۔ اگر واقعی انہیں راسخ کے حالات کی کچھ تحقیق ہوتی تو مشق کو جو راسخ کے استاذ الاساتذہ تھے، ان کا شاگرد نہ سمجھتے۔ اس حکایت کو رد کرنے کے یہ معنی نہیں کہ راسخ میر کے شاگرد نہ تھے، اس کی نہایت معتبر شہادت ہمارے پاس موجود ہے۔ عشقی عظیم آبادی معاصر راسخ لکھتے ہیں:-

"در مبادی حال مشق اشعار بہ استصلاح مرزا فدوی می نمود، چنانچہ در کم مایہ فرصتے فی الجملہ استعدادے بہم رسانید وقتے کہ شناسائے پایۂ سخن گردید طریقۂ پیروی کلام میر پیش نہاد ہمت ساخت، آخر بہ ہماں دسوسے کہ لکھنؤ شتافت بہ باریابی درصحبت میر صاحب … فائز شد و حلقۂ انقیاد شاگردی بہ گوش جاں انداخت"

اس اقتباس سے اولیں یہ ارادت کی حقیقت بھی کھل گئی اور میر کی شاگردی بھی مسلّم ہو گئی۔ میر سے ارادت غائبانہ راسخ کو مدت سے تھی، لیکن حضرت اویس قرنی کے خلاف جو عمر بھر محروم زیارت رہے، راسخ لکھنؤ گئے اور ان کی مدتوں کی آرزو پوری ہوئی۔ رہا یہ سوال کہ میر سے کس حد تک مستفید ہوئے، اس کا جواب موجودہ مواد کی مدد سے نہیں دیا جا سکتا۔ راسخ کا سال ولادت عام طور پر ۱۱۶۲ھ سمجھا جاتا ہے، لیکن کسی نے اس کی تائید میں نوائے وطن سے قدیم تر سند نہیں پیش کی۔ ہماری رائے میں قدیم روایات کی عدم موجودگی میں سال ولادت کا تعین ناممکن ہے۔ رہا ۱۱۶۲ھ وہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ عبرتی نے جو بقول بعض شاد مرحوم کے اساتذہ میں تھے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ راسخ نے ۹۰ برس کی عمر پائی۔ اس حساب سے سال ولادت ۱۱۴۸ھ کے لگ بھگ ٹھہرتا ہے، ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ۱۱۵۰ھ زیادہ قرین قیاس ہے۔ ہم اپنے دلائل اس موقع پر پیش کرنا نہیں چاہتے۔ سائیں کا مولد ہونا بھی کسی قدیم روایت سے ثابت نہیں۔

(۸) امین الدین امین کے متعلق یہ لکھنا کہ ۱۲۵۷ھ میں یہ عالم ضعیفی زندہ تھے، فاحش غلطی ہے، کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ امین کے زمان حیات ووفات کے متعلق مضمون نگار لالہ سری رام کے بیان کو مرزا علی لطف کے بیان پر کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امین کا انتقال ۱۲۰۰ھ سے بھی قبل ہو چکا تھا، جیسا کہ ایک قدیم بیاض سے ثابت ہوتا ہے، جو ہمارے پاس موجود ہے۔

(۹) غلام مرتضیٰ جنوں کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ہر تذکرے سے ان کا عظیم آبادی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ گلزار ابراہیم اور تذکرۂ عشقی دونوں میں اس طرح ہے "جنوں الہ آبادی، اسمش شیخ غلام مرتضیٰ ابن شاہ تیمور سہرامی" "ہمیشہ کوئی کہے سو کوئی

ویرے پہنچا اور یہ شعر مضمون نگار نے غلام مرتضیٰ جنوں کے نام لکھا ہے۔ عشقی نے اسے جنوں اکبرآبادی کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۲) خواجہ امام بخش امامی کو عظیم آبادی لکھنا بھی مشکوک ہے۔ عشقی نے انہیں دہلوی لکھا ہے۔ بالفرض اگر عظیم آبادی ہوں بھی تو ان کے باکمال شاعر ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ ہمارے یا تو مضمون نگار نے امامی کا کلام دیکھ کر خود یہ رائے قائم کی ہے یا کسی تذکرے سے نقل کی ہو۔ ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ سوا اس شعر کے جو انہوں نے نقل کیا ہے، امامی کا کلام انہیں کہاں ملا، اور کس تذکرہ نگار کی رائے انہوں نے نقل کی ہے۔

(۳) حضور کا نام غلام بخش نہیں غلام یحییٰ تھا۔ عشقی نے انہیں حزیں کا شاگرد بتایا ہے، اور بہ روایت گلزار ابراہیم بہ تقلیل تجارت معاش می کرد۔ "عظیم آباد کا مشہور رئیس ہونا"، اور بچپن ہی سے شعر کہنا صاحب مضمون نے کہاں سے لکھا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

## کلیم عجم

مصنفہ جناب سیماب اکبرآبادی ص ۲۰ + ۴۰۰ تقطیع ۲۶×۱۶/۸ قیمت مجلد عہ

پتا:۔ دارالاشاعت قصر الادب، آگرہ۔

جناب سیماب کا اپنے متعلق یہ دعویٰ کہ:

میں نے اس خوابیدہ عالم کو ہلایا تھا
گرمیٔ محفل نتیجہ ہے مرے پیغام کا

ممکن ہے تعلّی پر مبنی سمجھا جائے لیکن اس عہد کے ممتاز غزل گو شعرا کی فہرست سے ان کا نام خارج نہیں کیا جا سکتا۔ کلیم عجم ان کے دیوان غزلیات کا نام ہے۔ غزلیات کے ساتھ (۱۶) خطبے بھی شامل ہیں، جو مصنف نے مختلف مقامات میں صدر مجلس شاعرہ کی حیثیت سے پڑھے۔ ۴۰۰ صفحوں میں ۱۶۰ صفحے ان خطبوں نے لے لیے ہیں، ۱۵ صفحوں میں مصنف نے اپنے حالات زندگی لکھے ہیں، اور باقی ماندہ صفحات میں غزلیں، تضمینیں وغیرہ ہیں۔ کلیم عجم میں جناب سیماب صرف شاعری کی حیثیت سے جلوہ گر نہیں، بلکہ مؤرخ ادب اردو اور نقاد کی حیثیت سے بھی دنیا کے سامنے آئے ہیں۔ ہم ان تینوں حیثیتوں پر الگ الگ نظر ڈالیں گے۔

جناب سیماب کے یہ خطبات جو دس پندرہ برس کی مدت میں لکھے گئے ہیں، انہیں ان پر نظر ثانی کرنے کا کافی موقع ملا ہے، اور کتابی شکل میں ان کے جمع کرانے سے یہ پتا چلتا ہے کہ جناب سیماب کی رائے میں یہ خطبے وقتی ضرورت کے لیے نہیں لکھے گئے، بلکہ ادب میں مستقل درجہ رکھتے ہیں۔ ہم نے انہیں استفادے کی نیت سے پڑھا، لیکن ہمیں بہت سے ایسے بیانات ملے جنہیں پڑھ کر ہم حیران رہ گئے، یا تو جناب سیماب واقعی اس صدی کے محقق اعظم ہیں یا بہ حیثیت محقق ان کا مرتبہ صفر کے برابر ہے۔ سرسری مطالعے میں جو باتیں ہماری نظر میں کھٹکیں، ہم ذیل میں انہیں درج کرتے ہیں۔ مشکوک کا اظہار ہے، اگر ہم نے اپنی موجودہ معلومات کی بنا پر کیا ہے، اگر جناب سیماب اپنے دعووں کی تائید میں ایسے ثبوت پیش کریں جو ہمیں مطمئن کر سکیں تو ہمیں اپنی رائے بدلنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

(۱) "منشی چندر بھان برہمن اکبرآبادی تھے"۔ ہمیشہ بہار کے مصنف کا بیان ہے کہ برہمن کا وطن لاہور تھا۔

(۲) "نواب لطف اللہ خان صادق وغیرہ شعرائے دہلی کے مطلع سخن کو چمکایا"۔ نواب لطف اللہ کا لقب 'خان صادق' تھا۔

عادی ان کا تخلص نہ تھا۔ اگر کسی کتاب میں شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر ہو تو اس کا نام بتایا جائے۔

(۳) "عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر آگرے ہی کی خاک سے اُٹھے" کیا مصنف کے نزدیک ان دونوں شاعروں کا زمانہ پیدائش عالمگیر ثانی کا عہد حکومت ہے؟ یا ان کی مراد یہ ہے کہ عالمگیر ثانی کے عہد میں آگرے سے دہلی گئے؟ دونوں صورتوں میں انہیں ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ ہمارا موجودہ علم یہ ہے کہ یہ دونوں عہد عالمگیر ثانی کے بہت پہلے سے دہلی میں تھے اور آرزو نے بہت تھوڑا زمانہ عالمگیر ثانی کا پایا۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ آرزو کبھی عہدہ قضا پر فائز رہے۔ اور نہ وہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔

(۴) آبرو کی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزرا اور وہ عہد عالمگیر ثانی کے بہت مشہور شاعر ہیں۔ ممکن ہے کہ آبرو آگرے گئے ہوں، لیکن کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں۔ عمر کا زیادہ حصہ وہاں بسر کرنا تو بڑی بات ہے، ایک دن بھی وہاں گزارنے کا اگر ثبوت عنایت ہو تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔ معیار کے ایک مضمون میں خوشگو کے حوالے سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آبرو کا سال وفات ۱۱۴۹ھ ہے۔ یہ زمانہ محمد شاہ کا تھا، محمد شاہ ۱۱۶۱ھ میں مرے ہیں۔ ان کے بعد احمد شاہ کا زمانہ ہے، عالمگیر ثانی کا عہد حکومت احمد شاہ کے بعد آتا ہے۔ آبرو ان کے زمانے کے شاعر کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ جناب سیماب کا قول صحیح ہو سکتا ہے، لیکن اس کی صرف دو صورتیں ہیں: یا تو وہ خوشگو کے قول کو غلط ٹھہرائیں، یا جمہور کے خلاف یہ ثابت کریں کہ ۱۱۴۹ھ میں عالمگیر ثانی ہندوستان کا بادشاہ تھا۔

(۵) میر باقر علی مخلص ایک گمنام شاعر ہیں۔ کم تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اصل وطن ان کا اکبر آباد تھا، لیکن ممکن ہے کہ خود دہلی ہی میں پیدا ہوئے ہوں۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کس سند سے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ "عہد محمد شاہی میں مخلص نے نقل وطن کیا اور دہلی کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیے"۔

(۶) "پیام اُردو میں کم تر شعر کہتے تھے"۔ میر کا قول ہے کہ اُردو میں صاحب دیوان تھے۔

(۷) "میر تقی میر، میر عبداللہ کے فرزند اور ہمشیرزادہ ...... آرزو تھے، آگرے میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم و تربیت پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا، اور پھر باپ کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے۔ ...... دہلی میں آپ کا قیام زیادہ نہ رہا اور وہاں سے آپ لکھنؤ چلے گئے" ذکر میر سے ثابت ہے کہ میر کے والد کا نام محمد علی اور لقب محمد متقی تھا۔ آرزو کی بہن کے سوتیلے بھتیجے تھے۔ ابتدائی تعلیم ضرور آگرے میں پائی لیکن اس کے علاوہ سب کچھ دہلی میں سیکھا، شعر کہنے کا شوق انہیں سعادت امروہوی نے دلایا۔ دہلی میں ان کا قیام کم از کم چالیس سال رہا۔ اکبر آباد میں بارہ تیرہ اور لکھنؤ میں اٹھائیس انتیس برس۔ دہلی کے قیام کے متعلق یہ کہنا کہ وہاں قیام زیادہ نہ رہا، عجیب بات ہے۔

(۸) "عارف اکبر آبادی ... اپنے دوست (میر تقی) کی مفارقت برداشت نہ کر سکے اور ترک وطن کر کے دہلی چلے گئے" عارف کے میر کے تعلقات دوستانہ ضرور تھے، لیکن کسی تذکرے میں یہ نہیں لکھا کہ ان دونوں میں آگرے ہی کی ملاقات تھی اور عارف کے ترک

وطن کو سبب میر کا آگرہ چھوڑنا تھا۔

(۹) "سودا کے شاگرد، شیدا، شاہ نصیر" ہمیں تو یہ علم ہے کہ نصیر، مائل کے شاگرد تھے" اور مائل بعض تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق قائم (شاگرد سودا) کے تلامذہ میں تھے۔ قائم نے مخزن نکات میں مائل کو قدرت کا شاگرد لکھا ہے۔

(۱۰) "ابراہیم علی خان ذوق دہلوی" ذوق کا نام محمد ابراہیم تھا، کسی تذکرے میں ابراہیم علی خان نہیں۔

(۱۱) "من جملہ اور شعرا کے مصنف آبرو کے متعلق بھی لکھتے ہیں (ص ۱۴-۱۵) کہ یہ آگرے ہی میں پیدا ہوئے، آگرے ہی میں پروان چڑھے، یہیں تعلیم پائی" حالانکہ دوسری جگہ (ص ۱۳) خود لکھ چکے ہیں کہ آبرو کا مولد گوالیار تھا۔ ان دو متناقض بیانوں میں کسے قبول کیا جائے؟

(۱۲) "میرزا غالب" جب کوئی نئی غزل کہتے تو جب تک حقیر اکبرآبادی کو آگرے آ کر سنا دیتے، انہیں چین نہ آتا" میرزا نے ہزاروں غزلیں کہی ہیں! اگر یہ بیان صحیح ہے تو ہزاروں بار آگرے جانے کا اتفاق ہوا ہوگا۔

(۱۳) "یورپ کے متعلق بھی تحقیق ہو چکا ہے کہ وہاں سب سے پہلا شاعر چاسر تھا" چاسر یورپ کیا، انگلستان کا بھی پہلا شاعر نہیں۔ اگر جناب سیماب اس دعوی کو ثابت کر سکے تو کل ممالک یورپ کی ادبی تاریخ از سرنو لکھنی پڑے گی۔

(۱۴) "عروض خلیل بن احمد اور ابوالحسن اخفش عربی کی ایجاد ہے۔ جو بحریں اہل عرب نے ایجاد کیں ان کا اتباع فارسی شعرائے بھی کیا، لیکن یوسف نیشاپوری اور بزرجمہر (کذا) وزیر نوشیرواں نے ان میں بعض تصرفات کیے اور بعض عربی بحریں ترک کر دیں" عجیب بیان ہے۔ مدرسے کے لڑکے بھی اس کی تردید کر سکتے ہیں۔

(۱۵) "معلقہ اور اخفش کے ادبی کارنامے" کیا معلقہ جناب سیماب کے نزدیک کسی شاعر یا ادیب کا نام ہے؟ عربی دان سے ایسی غلطی سرزد ہونا حیرت انگیز ہے۔ ص ۳۷

(۱۶) "انشا نے اردو شعر کی تقطیع کے لیے بعض اردو ارکان وضع کیے۔ مثلاً مفاعلین کے لیے پری خانم ....." وغیرہ۔
"خوش وقتی کے لیے نوابی دربار میں عروض انشائی کچھ عرصے تک جاری رہی" یہ غالباً انشا کی نہیں قتیل کی ہے، اور سعادت علی خاں کے دربار میں مقبول ہوئی یا نامقبول، اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں، مصنف نے اپنے قیاس کو روایت کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔

(۱۷) حضرت سیماب نے ظہیری کو بڑے فارسی گو شاعروں میں گنا ہے، حالانکہ اس تخلص کا کوئی بڑا شاعر نہیں گزرا۔

(۱۸) شاہ مبارک آبرو کا سال وفات ۱۱۶۱ھ لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔

(۱۹) آرزو کا سال ولادت ۱۱۰۲ لکھا ہے، یہ بھی صحیح نہیں۔ (تذکرہ خوشگو)

(۲۰) مظہر کا سال وفات ۱۱۹۴ لکھا ہے، ۱۱۹۵ صحیح ہے۔ (کلیات منت)

(۲۱) حاتم کا سال وفات ۱۱۹۶ نہیں، ۱۱۹۷ھ ہے (عقد ثریا)

(۲۲) تاباں کا سال وفات ۱۲۱۰ لکھا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو مصحفی نے تذکرہ ہندی میں جس کا سال تکمیل ۱۲۰۹ھ ہے، ان کی وفات کا ذکر کیا ہوتا۔

(۲۳) تاباں کا سال وفات ۱۱۲۰ لکھا ہے۔ نکات الشعرا کا سال تکمیل ۱۱۶۵ھ ہے، اور اس کی تکمیل کے قبل ہی تاباں کا انتقال ہو چکا تھا، نکات الشعرا جناب سیماب کے ماخذوں میں ہے، اس کتاب کے مطالعے کے بعد تاباں کا سال وفات کیوں کر انھوں نے ۱۲۱۰ھ قرار دیا، بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔

(۲۴) میر سوز اور میر حسن کے سنین ولادت ۱۱۳۳ اور ۱۱۴۰ لکھے ہیں، یہ بھی صحیح نہیں۔

(۲۵) جرات کا سال وفات ۱۲۲۵ھ نہیں ۱۲۲۴ھ ہے۔

(۲۶) مصحفی اور رنگین کے سنین ولادت غلط دیے ہیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ کل خطبات کا مطالعہ کر کے ان مقامات کا جو محل نظر ہیں، ذکر کریں، لیکن ایسے مقامات اس کثرت سے نکل رہے ہیں، کہ اگر ہم اپنے ارادے پر قائم رہتے تو تبصرہ بہت طویل ہو جاتا، اس لیے صفحہ ۶۵ پر ہم اپنے مطالعے کو ختم کرتے ہیں۔

حضرت سیماب داغ کے شاگرد، آگرے کے رہنے والے، ایک دبستان شاعری کے بانی، اور جیسا کہ ان کے خود نوشت حالات سے معلوم ہوتا ہے، عربی فارسی کے فارغ التحصیل عالم ہیں، توقع تھی کہ ان کی نثر میں اور خوبیاں ہوں یا نہ ہوں، زبان تو ضرور صحیح و فصیح ہوگی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس میں صرف استدلال کی کمزوری اور خیالات کی بے ربطی ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ غلط اور اجنبی الفاظ، تراکیب اور محاورات کی بھرمار ہے، مشتے نمونہ از خروارے، ذیل میں چند مثالیں دی جاتی ہیں کہ ناظرین کو ہمارے قول کی صحت کا اندازہ ہو سکے۔

(۱) ص ۳ "صدارت کا اعزاز جناب چکبست کے لیے مقدر تھا، لیکن ... مجلس انتظامیہ نے بار صدارت میرے کاندھوں پر رکھ دیا" اگر صدارت چکبست کے لیے مقدر ہوتی تو حضرت سیماب صدر نہ بنتے۔

(۲) ص ۳ "شاعری صرف تفریح خاطر کا ایک ذریعہ مسرت سمجھی گئی" ذریعہ کیونکر مسرت ہو سکتا ہے سمجھ میں نہ آیا۔

(۳) ص ۴ محاورین جمع الجمع قاعدہ عربی کے خلاف ہے اردو میں بھی ثقات احتراز کرتے ہیں۔

(۴) ص ۴ "وہ ہندوستان میں سب سے پہلے قومی شاعر تھے، جن کے رشحات شاعری کو خدائے سخن نے ایک نئی قوت بخشی"۔ یہاں پر خدا کے لیے خدائے سخن، قطعی بے محل ہے۔ (۵) ص ۴ اثر کی جمع اثرات صحیح نہیں۔

(۶) ص ۵ "جب ہندوستان کو عروج حاصل تھا، تو شاعری کا عروج بھی نقطۂ کمال کی آخری حد پر نظر آرہا تھا"۔ نقطے کی آخری حد کیا ہوتی ہے؟ کیا جناب سیماب کے نزدیک نقطے کی تعریف جو اقلیدس نے کی ہے صحیح نہیں؟

(۷) ص ۵ "اب ہندوستان زوال کے خطوط انتہائی پر آ پہنچا ہے۔ تو روایات شاعری بھی اسی نسبت سے انحطاط پذیر ہیں۔ جس وقت

ہندوستان کا ستارہ چمکے گا' اس وقت شاعری کا آفتاب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ نور باری کرتا نظر آئے گا۔

(۸) ص ۶ "اگر وہ (یعنی کانگریس) ڈھونڈے تو ہندوستان میں اسے آج بھی والمیک اور نصرتی مل سکتے ہیں' اگر وہ آواز دے تو آج بھی گنگا اور جمنا کے کنارے سے بیسیوں دنیا پو اور بائرن اس کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں" ایک جگہ تو شاعری کے انتہائی زوال کا ذکر ہے' اور دوسری جگہ یہ دعوی کہ ہندوستان میں آج بھی والمیک اور بائرن کے سے شعرا موجود ہیں۔

(۹) ص ۹ جلسہ رضا۔ جلسے کی صفت رضا کوئی نہیں (۱۰) ص ۱۲ شرادگاہ مولد کے معنی میں صحیح نہیں۔

(۱۱) ص ۱۵ "میں نے جو کچھ کہا ہے میں اسے تحقیقی نقطۂ نظر یقین کرتا ہوں" نقطۂ نظر کا یہ استعمال محل نظر ہے۔

(۱۲) ص ۱۶ "مرزا غالب آج بھی ہندوستان کے ادبی معیار کا آخری نقطۂ نگاہ ہیں" یہاں نقطۂ نگاہ کا استعمال صحیح نہیں۔

(۱۳) ص ۱۸ "ہم اپنا محاذ شاعری واقعات وحادثات عالم کے دوش بدوش قائم کریں" محاذ شاعری کا کیا مطلب ہے؟

(۱۴) ص ۱۸ "جب کوئی سانحۂ شرکت دقت ہو" یہ الفاظ جناب سیماب کے خیال کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔

(۱۵) ص ۳ "ولی کے کلام میں... قدامت الفاظ باقی رہی' تاہم اس کے مشق یافتہ قلم سے بعض اشعار ایسے بھی نکل گئے جو اگر آج کہے جاتے تو غالبًا ان میں کسی مزید تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی" ایک تو قلم کی صفت "مشق یافتہ" عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ لفظ مزید بالکل بیکار ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ پہلے بھی تغیر ہو چکا ہے حالانکہ مصنف کا یہ مدعا نہیں

(۱۶) ص ۲۱ "عام غیر دلچسپ" ص ۲۲ خیالات پیدائی عجیب ترکیبیں ہیں۔ (۱۷) صوفیانی... جذبہ "صوفیانی" نہ عربی ہے نہ فارسی نہ اردو۔

(۱۸) ص ۲۵ "کیا ہندوستان کا سواد... شعر نگار نہیں" سواد کیوں کر شعر نگار ہو سکتا ہے سمجھ میں نہ آیا۔

(۱۹) ص ۲۸ "ماحولی خصوصیات" لفظ ماحولی اگر صحیح بھی ہو تو کانوں کو بہت برا معلوم ہوتا۔

(۲۰) ص ۳۳ "تبدیلی فضا" صحیح نہیں

(۲۱) ص ۴۰ مونع کی جمع الجمع موانعات غلط ہے۔ (۲۲) محاورے کی جگہ "محاورۂ فصحا کی زبان پر نہیں" ص ۴۰۔

(۲۳) ص ۴۹ پیغام کی جمع پیغامات غلط ہے۔ (۲۴) ص ۴۲ "چکر تو نیپی" غلط العام کے تحت نہیں آ سکتے۔

(۲۵) ص ۵۰ "وہ انتشار جو امتداد ایام سے ارژنگ سخن میں پیدا ہو چکا ہے۔ منظم و مرتب ہو جائے" انتشار مبدل بہ تنظیم و ترتیب ہو سکتا ہے لیکن منظم و مرتب نہیں ہو سکتا۔

(۲۶) ص ۵۱ "تشہیر لسانی" "تشہیر" شہرت دادن رسوائی کے را حپاں کر کے رابر خر سوار کردہ بشہر گردانیدن"

(۲۷) حضرت سیماب کی زبان پر لفظ "قلم کار" نویسندہ کے معنی میں ہے' اس کی سند عنایت ہو۔

(۲۸) "مشاعرہ پڑھنا" فصحا کی زبان نہیں "مجلس پڑھنا" صحیح ہے لیکن محاورے میں قیاس کو دخل نہیں'

حضرت سیماب کی نثر کے بعد ان کی نظم کا مطالعہ کیجیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نخلستان کی طرف آ گئے ہیں' جہاں سبزہ بھی ہے' آب رواں بھی ہے' اور سایہ دار درخت بھی ہیں' لیکن نظم کا تبصرہ ہم آئندہ کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

# انجمن ترقی اردو صوبہ بہار

ہماری انجمن مرکزی انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی شاخ ہے۔ ہمیں اس کی اجازت ہے کہ ہم صوبہ بہار میں اپنی شاخیں قائم کریں۔ ناگپور میں حال ہی میں بھارتیا ساہتیہ پرشد کا جلسہ ہوا تھا' جس میں گاندھی جی نے اپنی عجیب و غریب ذہنیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے متعلق عبدالحق صاحب کا ایک مضمون مئی کے معیار میں چھپا ہے۔ ناظرین اس مضمون کو غور سے پڑھیں۔ اب ہمیں اردو کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہوجانا چاہیے۔ اور ہندوستان کے ہر شہر بلکہ ہر قصبے میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کرکے اس کے مقاصد کی تکمیل کرنی چاہیے۔ صوبہ بہار میں جو شاخیں قائم ہوں' وہ ہمارے پاس منظوری کی درخواست بھیجیں۔ عدالتوں میں اردو رسم خط کو رائج کرنے کے لیے ہماری انجمن عنقریب ایک عملی تجویز پیش کرے گی۔ امید ہے کہ ہمدردان اردو ہماری معاونت کریں گے۔

"معتمد"

---

## دیوان جوشش! دیوان جوشش!

### عنقریب شائع ہوجائیگا

جوشش عظیم آباد کا نامور شاعر ہے۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ دنیا میں موجود ہے' جسے ہم نے بڑی کوشش سے حاصل کیا ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کا ایک ناقدانہ نسخہ مرتب کرایا ہے' جس میں جوشش کے حالات کے علاوہ' اس کے بھائی محمد عابد دل کے حالات بھی ہوں گے۔ دیوان کی چھپائی شروع کرادی گئی ہے۔ فہرست خریداری میں بہت جلد اپنا نام درج کرا لیجیے جن حضرات کی درخواستیں ۱۵ جولائی تک آجائیں گی ان سے قیمت ۲۵ فی صدی کم لی جائے گی۔ رعایتی قیمت کے لیے آخری تاریخ ۳۰ اپریل مقرر کی گئی تھی' مگر شائقین کلام جوشش کے اصرار سے ۱۵ جولائی تک درخواستیں بھیجنے کا موقع دیا گیا ہے۔ قیمت عہ کے قریب ہوگی۔

منتظم معیار' بانکی پور (پٹنہ)

# مطبوعات شاد بک ڈپو

**مثنوی مادرِ ہند**:- اس وقت تک جتنی مثنویاں تصنیف ہوئی ہیں ان میں سے کسی کا تعلق موجودہ سیاست سے نہیں ہے۔ یہی ایک مثنوی ہے جو ایسے اہم موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اور وہ بھی شاد عظیم آبادی مرحوم جیسے شاعر کے قلم سے۔ مزید براں مولانا سیماب اکبرآبادی اور حضرت رشید صدیقی جیسے ادیبوں کے مقدمے بھی شامل ہیں۔ ص ۹۹، قیمت صرف ۱۲ر

**فکرِ بلیغ**:- مصنفہ شاد عظیم آبادی۔ اس کتاب کو ایک مرتبہ پڑھیے اور نکاتِ شاعری سے واقف ہو جائیے۔ شعر و سخن کا مذاق رکھنے والے حضرات ضرور منگوائیں۔ سائز ۲۰×۲۶ ص ۱۶۰، قیمت ۸ر

**ظہورِ رحمت**:- یہ چھوٹی سی کتاب ڈیڑھ سو مسدسات کا مجموعہ ہے جس میں حسبِ ذیل مضامین ہیں (۱) بیانِ ولادت (۲) معراج (۳) شبیہ مبارک (۴) آپ کے آنے کی ضرورت (۵) حالاتِ براق (۶) طلبیۂ معرفت (۷) آپ کا مرتبہ (۸) آپ کا اخلاق۔

**داستانِ عجم**:- ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال عظیم آبادی مصنف "مغل اور اردو" کی زندگی کا آخری کارنامہ جس میں شاہنامہ فردوسی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا تعارف اور حضرت عباس شوستری کے مقدمے بھی ہیں۔ ص ۱۷۰۔ اس عدیم المثال تصنیف کی قیمت صرف (عہ) ایک روپیہ ہے۔

شاد بک ڈپو، چوگھڑا، پٹنہ سیٹی


---

# معذرت

برقی مشین پریس کی مشین ٹوٹ جانے کی وجہ سے مئی کے پرچے کی اشاعت میں بہت دیر ہوئی اور ہمیں مجبوراً برقی پریس سبزی باغ میں رسالہ چھپوانا پڑا۔ امید ہے کہ جون کا پرچہ جون ہی میں شائع ہو جائے گا۔ اب سے معیار ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا کیوں کہ اس طرح ہمیں رسائل کے خلاصے اور ادبی خبریں مرتب کرنے میں آسانی ہوگی۔

"منتظم معیار"

انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کا ادبی رسالہ

# معیار

مرتب
قاضی عبدالودود

بانکی پور (پٹنہ)

معاون
آرزو جلیل

| جون سنہ ۱۹۳۶ء | فہرست | جلد ۱ شمارہ ۴ |
|---|---|---|



**تصحیح**: (ہوئی، بہم، لیجیے، دیجیے، چاہیے میں ہمزہ نہیں، اگر ہو تو کاتب کی غلطی ہے) ۱۳۸/۵ ہندؤں ۔ ہندوؤں ۔ ۱۴۰/۱۲ ہوئی نہیں ہوئی ۔ ۱۴۳/۹ بجا ۔ بجا ۱۴۴/۲۵ اللہ ۔ اللہ ۱۴۴/۹ خاطر ہے اس ۔ خاطر ہے یاں ۱۴۵/۱۹ الدوا ۔ الدولہ ۱۴۶/۲ زز ۔ زر ۱۵۰/۲۲ اردو ۔ اور ۱۵۲/۲ مجھ کو ۔ مجھے ۱۵۴/۹ شان گمان ۔ شان گمان ۱۵۵/۵ دوری ۔ دور ہی ہے ۱۵۶/۱۵ اے ۔ لائے ۱۵۹/۲۱ کی ۔ کے ۱۶۰/۱۲ جان ۔ جاں ۱۶۱/۱۲ دیکریں ۔ دیر ۱۶۲/۲ جسمہ ۔ جیسے ۱۶۵/۱۲ طبیعات ۔ طبیعیات ۱۶۶/۱۱ ادہوں ۔ انھوں ۱۶۸/۱۲ تیز اید ۔ تزاید و اشتداد ۱۶۹/۱۲ دل آیا ۔ دل آرا ۱۷۳/۱۲ اللہ ۔ اللہ ۱۷۴/۵ ۱۰۲۰ ۔ ۱۰۳۰ ۱۷۴/۹ کرتے تھے ۔ کرتا تھا ۱۸۱/۹ اسی ۔ اس ۱۸۳/۱۸ اور ۔ انھیں ۱۸۳/۲۰ زمانے ۔ زمانہ تھے ۱۸۴/۱۹ مقابلہ ۔ مقابلے ۱۸۵/۱۱ غبدریہ ۔ حیدریہ ۱۸۸/۱۴ بان ۔ زبان ۱۸۹/۲۵ طریقہ ۔ طریقے ۱۹۰/۲۰ ذریعہ ۔ ذریعے ۱۹۵/۲۰ جذبہ ۔ جذبے ۱۹۸/۲ رنم ۔ نیم ۲۰۸/۲۴ صامت ۔ صامت ۲۱۳/۱۴ املا اطلاق ۔ املا ۲۱۴/۱۹ زبان ۔ زبان سے ۲۱۵/۴ قدرت ۔ قدر ۲۱۸/۱۴ جز ۔ جزو ۲۲۱/۲ گرائیوں ۔ گرایوں ۲۲۳/۲۲ سورج ۔ مزاج ۲۲۶/۱۹ فقیہ ۔ قصہ ۲۲۸/۲۲ حسینی ۔ حسنی ۲۳۲/۱۹ ے ۔ بے ۲۳۶/۱۹ جان ۔ جان بیگ ۲۳۸/۱۲ جالی ۔ جمال ۲۳۹/۱۲ واقعی ۔ قلمی ۲۴۱/۲۱ کرنی ۔ کر ۲۴۳/۱۲ مقامات ۔ مقامات میں۔

مثنوی برشکال میں بندوں کی ترتیب غلط ہو گئی ہے ۔ بند ۵ کے بعد نویں دسویں اور گیارہویں بند ہیں، پانچویں، چھٹے اور ساتویں بند گیارہویں کے بعد ہیں۔

محمد علیم الدین پرنٹر و پبلشر نے برقی پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر معیار واقع انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ سے شائع کیا

# معروضات

اردو کو اس کے مخالفین کے حملوں سے بچانے، اسے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے حامیان اردو کا منظم ہونا ضروری ہے، تنظیم کس اصول پر مبنی ہو اس کے متعلق ہم اپنی رائے درج ذیل کرتے ہیں:۔

(۱) انجمن ترقی اردو کو مرکزی انجمن قرار دینا چاہیے۔ جو انجمنیں اردو کی خدمت کے لیے اس وقت قائم ہیں، ان میں سب سے زیادہ خدمات اسی کی ہیں۔ اور یہ سب سے پرانی بھی ہے۔ کسی نئی انجمن کی بنیاد ڈالنے کی قطعی ضرورت نہیں،

(۲) ہر صوبے میں اس کی شاخ ہونی چاہیے، اس وقت جو انجمنیں قائم ہیں، ان کا مرکزی انجمن سے الحاق لازمی ہے، ہم نے بڑی مسرت کے ساتھ ہمایوں میں یہ خبر دیکھی کہ لاہور میں بشیر احمد صاحب سرگرم حامی اردو کی کوششوں سے ایک انجمن "انجمن اردو پنجاب" کے نام سے قائم ہوئی ہے۔ اس کے مقاصد سے ہمیں بالکل اتفاق ہے اور ہم اس کی کامیابی کے دل سے خواہاں ہیں۔ لیکن یہ دیکھکر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ اس انجمن کو انجمن ترقی اردو سے کسی قسم کا تعلق نہیں، نا ممکن ہے کہ بشیر احمد صاحب جو اس انجمن کے روح رواں ہیں، مرکزی انجمن سے وابستہ ہونے کے فوائد سے آگاہ نہ ہوں۔ یہ بھی قیاس میں نہیں آتا کہ انہوں نے اپنی انجمن کو بالارادہ انجمن ترقی اردو سے بے تعلق رکھنا چاہا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ محض بے پروائی سے ایسا ہوا ہے، اور کارکنان انجمن بہت جلد قواعد میں تبدیلی کرکے انجمن ترقی اردو سے اس انجمن کو ملحق کریں گے۔

(۳) صوبے کی انجمنیں شہروں اور قصبوں میں اپنی شاخیں قائم کریں۔

(۴) انجمن ترقی اردو کو جلد از جلد کسی مرکزی مقام پر منتخب اشخاص کی ایک کانفرنس منعقد کرنی چاہیے جو من جملہ اور باتوں کے امور ذیل پر غور کرے:۔ ۱؎ کیا اردو کا نام ہندوستانی رکھنا چاہیے؟ ۲؎ اردو ہندی دو زبانیں ہیں یا ایک؟ اگر دو ہیں تو شمالی ہند میں ذریعۂ تعلیم اردو ہوگی یا ہندی، عدالتوں اور سرکاری دفتروں کی زبان کون سی ہوگی؟ ۳؎ حامیان ہندی کی یہ کوشش کہ ہندی انگریزی کی جگہ لے لے، اس کے متعلق حامیان اردو کا کیا طرز عمل ہونا چاہیے۔ ۴؎ ایسے صوبوں میں جہاں کی مادری زبان اردو نہیں، اردو کی کیا حیثیت ہونی چاہیے؟ ۵؎ کیا اردو میں فارسی عربی کے الفاظ بہت زیادہ، اور سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ بہت کم ہیں؟ ۶؎ کیا اردو کے رسم خط کو آسان بنانے کی ضرورت ہے؟ اور اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟

## تعارف

حسن کی مثنوی کلیات میں بہت غلط لکھی ہوئی ہے، قیاسی تصحیح میں جو مدد جناب خیال سے ملی، اس کے ہم نہایت ممنون ہیں۔ قصر جواہر، جواہر علی خان خواجہ سرا ناظم بہو بیگم کی ملک تھا۔ حزیں کی رباعی ایک قدیم بیاض سے ماخوذ ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔ تیج نرائن، رام نرائن موزوں کے بھائی تھے۔

# آثارِ ادبیہ

## مثنوی میر حسن در وصفِ قصرِ جواہر

حمد و ثنائے خالقِ دنیا و دیں
و ثنائے صانعِ ایوانِ عرشِ بریں
ثنا چاہیے اس خالقِ پاک کو
دیا جس نے رتبہ کفِ خاک کو
اُسی خاک سے خلقِ عالم کیا
ہوا کر کے دَم اُس میں آدم کیا
پھر آدم کی خاطر بنایا جہاں
عدم اور ہستی دو رویہ مکاں
رکھی شرق سے غرب تک اک بنا
سراسر شمالِ خطِ استوا
بنا اس پہ پھر گنبدِ آسماں
احاطے میں اس کے دیا سب جہاں
عناصر کی چوکور اینٹیں لگا
زمانے کا ایوان برپا کیا
کیے برج پھر اس میں بارہ عیاں
لگا پیش رو ابر کا آسماں
شفق سے اس ایوان کو رنگیں کیا
طلائے شعاعی سے زریں کیا
کیے بر سرِ بامِ سقف و جدار
خیالاتِ عالم سے نقش و نگار
کیا کہکشاں کا جو طاق انتخاب
دیا اس کو قوسِ قزح سے جواب
بنا جب یہ والانِ عالی مکاں
رکھے مہر و مہ اس میں دو تابداں
زرافشانِ انجم کا ابرک لگا
سفیدی سے دی مہر و مہ کی جِلا
ہوا جب یہ ایوان کرسی نشیں
ترنجوں سے تب سب میں باندھی زمیں
رکھی وسعتِ صحن لا انتہا
ازل اور ابد بیچ میں کر لیا
عجب طور کھینچا تن سے وَ ذی الطول
........ اس کا سب عرض و طول
کیا مخملِ اطلسی اس میں فرش
لگا دامنِ خاک سے تا بہ عرش
شب و روز اُدنیٰ میں اک فرشِ راہ
برنگِ گلیمِ سفید و سیاہ
ہے سجدے کے لائق درِ یزدانِ پاک
میں صنعت گری پر ہوں اس کی ہلاک
اسی نے دیا عقل کو یاں علاج
کرایا عمارت نے جس سے رواج
یہ گرمی اسی کی ہے اور کس کا کام
یہاں موم ہے کار رنگ و رخام
کرے کون ایجاد یہ بے ستوں
یہاں تیشۂ عقل ہے سرنگوں
بجا ہے جو حیران بنائے فہم
کہ اس دستکاری کو کب پائے فہم
مگر ذہن میں یہ بھی آتا ہے یاں
کہ احمد کی خاطر بنا یہ مکاں

### در نعت حضرت سید المرسلین

بیا ساقیا مے پرستی کنیم
محمد بگوییم و مستی کنیم
محمد ہے وہ صاحبِ دوسرا
نہیں دوسرا کوئی ایسا ہوا
خداوندِ معراج و لولاک ہے
سمجھ بات گر تجھ میں ادراک ہے
ہے لازم مکاں کو مکیں چاہیے
کہ انگشتری پر نگیں چاہیے
مدینہ ہے وہ علم کا جانِ پاک
خدا اس کے در پر کرے ہم کو خاک

### در منقبت شمع حرمِ کبریا بمصداق انا مدینۃ العلم و علی بابہا

در اُس کا ہے وہ جو علی ولی
وہ ہے شیرِ حق اور وصیِ نبی

رسائی ہے اس گھر میں اکثے سبب
بجز حب حیدرؓ کوئی پہنچے کب
وہ ہے شہ نشین مقام نبی
کہ جس سے ہوئی آل کے بارہ دری
وہ ہے قبۂ نور دار السلام
درود اس گھرانے پہ ہو صبح و شام
تصدق ہوں میں بر سر اہل بیت
میں دل سے ہوں خاک در اہل بیت
اسی در کا ہوں میں ازل سے فقیر
ہے ایماں مرا قول سعدیؒ پیر
خدایا بحق بنی فاطمہ
کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ
اگر دعوتم رد کنی ور قبول
من و دست و دامان آل رسول

ساقی نامہ

پلا ساقی مجھ کو وہ جام شراب
نمک سے ملاحت کے ہو جس میں آب
کہ مستی مری شرع کے ساتھ ہے
مرا دین و ایماں ترے ہاتھ ہے
تو ہیں حب محمدؐ کی خاطر حسن
کیا حق نے ظاہر زمین و زمن
بنا جب یہ قصر زمرد سرشت
بنائے مکاں اس میں رشک بہشت
خصوصاً یہ قصر جواہر نگار
رکھے اس کو آباد پروردگار

نمونہ بہشت بریں کا ہے یہ
محل وہ مکاں مومنیں کا ہے یہ
کہوں کس زباں سے میں اسکی ثنا
جو دیکھے سو جانے کہ صل علیٰ

شرح مدح مکان از دروازۂ عالی شان

مجھے اس کا نقشہ ہے کرنا رقم
سرے سے اٹھاؤں ستون قلم
وہ دروازۂ قصر عالی مکاں
رہے جس کے سایہ میں سارا جہاں
اگر آئے کیسا ہی واں مضمحل
جہاں اس کو دیکھے تو کھل جائے دل
وہ دل سے از بس وہ ہمراز ہے
اسی سے در عیش یاں باز ہے
ہر اک اس کا حلقہ ہے چشم بتاں
ہر اک زلف ہے کاکل مہوشاں
سرافرازیوں کا رسالہ ہے وہ
بلندی کے عالم سے بالا ہے وہ
بلند اس سے کوئی نہ ہوگا مکاں
زمیں اس کی ہے ہمسر آسماں
چڑھے جو کوئی اس کے بالائے بام
کرہ سا نیچے ہو بنگلہ تمام
عجب طرح کا در شہ ہے وہ خوش فضا
کہ آتی ہے جنت کی اس میں ہوا
اور اک خنکی اس میں دیکھی ہیں اور
جو دیکھا اسے کھول کر چشم غور

جہاں تک کہ عمدے ہیں سرکار کے
وہ رہتے ہیں حجروں میں اسکے بھرے
یہ وسعت کو دل کی یہ وسعت نہ ہو
کسی جا میں ایسی فراغت نہ ہو
یہ وہ جا ہے کان زر فیض بخش
کہ ہر در ہے اس کا در فیض بخش
رہے چشم بد دور اس سے سدا
کہ ہے شیعیان علیؑ کی وہ جا

ساقی نامہ

نہ کرنے کے دینے میں ساقی قصور
کہ ہے قصر کی مدح اس کے ضرور
پلا مجھ کو صہبائے الفت کا جام
کہ ہے دل میں ساقی کوثر کا نام
عجب قصر دیکھا میں وہ پر شکوہ
کہ مستحکمی اس کی مانند کوہ
مربع، مسطح، مصفّٰی تمام
نگیں کی طرح خوش نما وہ مقام
ہوا اس کی شرح بیان نشاط
فضا اس کی طرح زمان نشاط
فلک سے زمیں اس کی ہمداستاں
کف خاک در جبہۂ آسماں
صفا گچ کی رشک صفائے گہر
چمک برق ابرک سے براق تر
کہ دور سے چونا وہاں کا بری
کہے تو چنبیلی کی جیسے کلی

ہے افشاں ابرک سے اس پر طلا
سراسر ہے موتی کا چونا لگا

ہے سرخی کی جا سرخیٔ لعل واں
ہو شرمندہ جس سے لبِ گلرخاں

نظر کو نہ ہو وقتِ نظارہ تاب
بھر آئے ہے سورج کی آنکھوں میں آب

وہ ایواں پُر از طاق و محرابِ طاق
کہ ابرو نما دل ربائی میں طاق

پر از طاق واں کا جو ایوان ہے
نظر میں ہلالی کا دیوان ہے

وہ کرسی بلند اور وہ شہ نشیں
منقش گل اس کے بہ گلہائے چیں

وہ پردوں کی سرخی کہ لالہ ہو داغ
وہ سبزی چقوں کی کہ ہو سبز باغ

ادھر دیکھیے یا اُدھر دیکھیے
مرقع کا عالم جدھر دیکھیے

ہے بارہ دری ایک واں شرق رو
منور ہے جوں عارضِ نیک خو

کرے صبح اس آستاں کو مدام
تفاوت سے خورشید اٹھ کر سلام

وہ سرخ اس کے آگے لگا سائباں
شفق جوں فلک پر ہو جلوہ کناں

بلندی میں وہ سائباں جوں سحاب
ہے قوسِ قزح اس کی رنگیں طناب

وہ استادے دونوں یمین و یسار
کہ جیسے دو بازوئے دستِ نگار

ہے اک توشک اس سائباں کے تلے
کہ پانی ہے اس میں گہر یا گلے

لبالب رہے ہو وہ آئینہ وار
ہے عکسِ عمارت سے اس میں بہار

خوشا چاہ وہ جس سے ہو اس میں آب
ہر جا ہو چشمہ پہ دریا کا آب

ہے بنگلا بھی جو ہیں وہاں ایک سو
کسی کا ہے گویا دلِ نیک خو

وہ بنگلا کہے تو ہے بنگلے کا دل
کنول کی طرح جس سے دل جائے کھل

ہے اک دست چپ اور بارہ دری
کہ در ہے ہر اک اس کا چشمِ پری

دو رویہ وہ ایوان ہے فرخندہ فال
ادھر کو جنوب اور ادھر کو شمال

لگے واں ستونوں میں آئینے سب
وہ دالان گویا ہے شہرِ حلب

درخشندہ یا ہم مہ و مشتری
خرامندہ عکس اس میں کوکبِ دری

ان آئینوں میں ہے سماں جلوہ گر
ادھر کا ادھر اور ادھر کا ادھر

ہر اک اس کے جلوے سے دیوانہ ہو
وہ آئینہ گویا پری خانہ ہو

وہاں عکس جس کا نمودار ہے
وہ حیرت سے بس نقشِ دیوار ہے

ہے اس آئینے سے دلِ شمع داغ
کہ ہے ہر ستوں کا وہ چشم و چراغ

مقابل بہم آئینے دو طرف
قرانِ دو اختر بہ بیت الشرف

ستونِ سرو آئینہ آبِ چمن
نظر اس کے قمری و بلبل سخن

مثالِ ستوں جو کہ ہیں راست باز
انہوں کے قدم پر ہے چشمِ نیاز

کرے جب کہ فوارہ گردن بلند
اور آئینے میں عکس اس کا ہو بند

ہے اس وقت نقد تماشا بہ کف
کہ ساتھ اس بزرگی کے در نجف

وہ نقطہ یہ آئینہ ہے یاں کہ بس
ستوں کے الف کو کیا اس نے دس

## در مدح پائیں باغ

ادھر پائیں باغ اس کے زیرِ قدم
ادھر وہ عمارات رشکِ ارم

کہوں باغ پائیں کا کیا میں بیاں
حنا جیسے ہو زیرِ پائے بتاں

وہ ایواں کا روشن ہو یاں بیچ جال
کہ ہے کوکبِ قطب اس رو کا خال

ہوا ہو جیسے باغ و گلزار کی
ہے اینٹ جو اس کی دیوار کی

گھٹا نت برستی ہے رحمت کی واں
نہیں نام کو گرد کلفت کی واں

عجائب وہاں صحن ہے جاں فزا
دم عیسوی ہے جہاں کی ہوا

ہوا میں[۲۴] رطوبت ہے واں اس قدر
کہ ہے دھوپ میں چاندنی کا اثر

یہ ستھرائی اور یہ صفائی کہیں
کسی صحن کی ہم نے دیکھی نہیں

گل نرگسی کا ہے اس جا ظہور
اُگے[۲۲] ہیں گل عیش و عشرت سرور

نہیں بات کچھ میری یاں بے محل
یہ ہے صاف اس میں تو کیا ہے خلل

ہے صحن مصفا بدن حور کا
سدا وقت رہتا یہاں[۲۵] نور کا

منور ہے ازبس کہ دیوار و در
برابر ہے اس جا[۲۶] پہ شام و سحر

ہے پتھر پھسلنا بھی واں ایک صاف
نظر گر نہ ٹھہرے تو رکھیو معاف

---

[۱] قلمی نسخہ ق۔ ق میں لگا اور بنا دونوں میں [۲] ق رنگیں بجائے زریں [۳] ق ندارد [۴] ق کو کی جگہ کا [۵] ق کی کی جگہ کو [۶] ق طور کی جگہ شور۔ دوسرا مصرع جناب خیال کی رائے میں اس طرح ہو سکتا ہے۔ مسطح کیا اس کا سب عرض و طول [۷] ق اوق کی جگہ دونوں ہو سکتا ہے۔
[۸] یہ مصرع تمام مرتبہ ناموزوں اور غلط ہے [۹] ق کروں بجائے کرے [۱۰] ق میں فہم اور وہم دونوں ہے [۱۱] یہ بھی ق میں نہیں قیاسی اضافہ ہے
[۱۲] ق میں وہ نہیں [۱۳] ق میں مل کے کی جگہ ملک [۱۴] ق اگر آئے کیا ہے وہاں مستعمل [۱۵] ق میں اک ندارد [۱۶] ق میں اس کے ندارد [۱۷] ق دل بجائے در [۱۸] ق عہدہ و بجائے عہدے [۱۹] ق آستاں بجائے راستاں [۲۰] ق کی ندارد [۲۱] ق برق بجائے براق [۲۲] ق برفی کی جگہ مرغ نغز
[۲۳] ق رنگ بجائے لب [۲۴] ق کل بجائے گل [۲۵] ق میں اسی طرح ہے [۲۶] ق سا بجائے سماں اللعب ق میں اسی طرح ہے [۲۷] ق میں اسی طرح ہے [۲۸] ؟ [۲۹] ق، حال بجائے خال [۳۰] ق بت بجائے نت [۳۱] مصرع غلط ہے۔ جناب خیال کی رائے میں یوں ہوگا "اُگے ہیں گل عشرت و عیش و سرور" [۳۲] ق ہوائے رطوبت بجائے ہوا میں رطوبت [۳۳] ق نہیں بجائے یہ ہیں [۳۴] ق جس بجائے اس [۳۵] ق صفائی بجائے صفائی۔

---

# صوبہ بہار
# رباعی شیخ علی حزیں

پیوستہ غزالان حرم رامت بار
وحشی نگہان شوخ درو رامت باد

در شعر تخلصے زمن خواستہ
آرام تخلص است آرامت باد

یہ رباعی ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کی ایک قلمی بیاض میں ملی جو عہد عالمگیر ثانی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق یہ عبارت بھی درج ہے "رباعی کہ ... حزیں در عنایت فرمودن تخلص بہ میرزا آرام برادر راجا رام نرائن صوبہ دار عظیم آباد ارشاد فرمودہ بودند۔"

# مراسلت

## صوبہ بہار میں قلمی کتابوں کے ذخیرے

جناب مدیر معیار تسلیم

رسالہ معیار سے علمی اور ادبی خدمات کی جو توقع ہے، اُس کی بنا پر سطور ذیل کے ذریعے سے ناظرین کی توجہ صوبہ بہار کے چند علمی خزائن کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ بہار کو کتب خانہ مشرقی پٹنہ پر بجا ناز ہے، لیکن اس نادر کتب خانے کے علاوہ بھی بعض لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں بیش بہا مخطوطات گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ علمی ذخیرے بے توجہی کے باعث کیڑوں کی نذر ہوئے جا رہے ہیں۔

جب انڈین ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن کا اجلاس سنہ ١٩٣٠ء میں پٹنے میں منعقد ہوا تو مجھے قدیم کتب تواریخ کی جستجو میں صوبے کے مختلف مقامات کی سیر کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں راے سلطان بہادر کے تباہ حال کتب خانے کو دیکھنے کا موقع ملا، جو دیوان محلہ پٹنہ سیٹی میں ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر سوبی مل چند، سرکار صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج، پروفیسر کالی کنکر دت، اور راقم الحروف نے تین دن کی محنت کے بعد کئی قدیم مخطوطات، اس علمی ذخیرے سے منتخب کیے۔ لیکن ہمیں اجازت نہ ملی کہ انھیں تاریخی نمائش میں پیش کریں۔ محلہ ہر مندر، پٹنہ سیٹی میں ایک ہندو بھائی کے پاس قلمی کتابوں کا ذخیرہ ملا، جسے انھوں نے بہ وقت تمام ہمیں دیکھنے دیا۔ اگر ان علمی ذخیروں کی حفاظت نہ کی گئی تو یہ بہت جلد ضائع ہو جائیں گے۔ پٹنہ کے علاوہ، گیا اور آرہ کے اضلاع میں بھی چند نادر الوجود نسخے موجود ہیں۔ گیا میں منو لال صاحب کا ذاتی کتب خانہ نادر روزگار مخطوطات سے مالا مال ہے۔

مذکورۃ الصدر تاریخی نمائش کی مجمل فہرست، جسے مطبع حکومت ہند کلکتہ نے سنہ ١٩٣١ء میں شائع کیا تھا، اس کے مطالعے سے صوبے کی علمی دولت کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس فہرست میں نمبر ٦٢١ سے نمبر ٦٦٧ تک کی جو کتابیں، وصلیاں اور مخطوطات ہیں، وہ دیوان ناصر علی مرحوم کے وقفی کتب خانے سے حاصل کیے گئے تھے یہ کتب خانہ، کھجوا ضلع سارن میں بہ حالت تباہ موجود ہے۔ اس مردم خیز بستی کو شہنشاہ عالمگیر نے ایک سیدہ کو "بہ تصدق فرق مبارک" بہ طور معافی مدد معاش عطا فرمایا تھا۔ دیوان سید ناصر علی انھیں سیدہ کی اولاد سے تھے۔ اور شاہ عالم ثانی کے ہم عصر تھے جیسا ان کی مہر اور عالی شان عمارتوں کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے۔ موصوف نے لاکھوں کی جائداد چھوڑی جس میں اٹھارہ ہزار سالانہ کا وقف بھی شامل ہے۔ موصوف نے اپنے وصیت نامے میں جو فارسی میں ہے، سب سے محبوب چیز جسے وقف کیا ہے وہ کتب خانہ ہے جس میں شاہی کتب خانوں کے چند مخطوطات ابھی تک موجود ہیں۔ دیوان موصوف نے وصیت نامے میں اپنے اخلاف سے بار بار تاکید

کی ہے کہ کتب خانے کے تحفظ اور اس کی بقا کا سامان کریں۔ افسوس یہ ہے کہ گو موصوف کی اولاد میں فرسٹ کلاس، ایم ایس سی، انگلستان کے تعلیم یافتہ گریجوئٹ، ڈپٹی مجسٹریٹ، اور سابق ایم ایل سی بھی ہیں لیکن کسی کو آج تک توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے بزرگ کے وصیت نامے کی سب سے اہم ہدایت پر عمل کریں۔

دیوان ناصر علی کے کتب خانے سے چند کتابیں بطور مشتے نمونہ از خروارے، تاریخی نمائش میں لائی گئی تھیں۔ تاریخی نمائش کی فہرست کے مطالعے سے ان کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مرتب نے چند ضروری باتیں نظر انداز کر دی ہیں بلکہ کہیں کہیں حقیقت سے بھی دور پڑ گئے ہیں۔ مثال کے طور پر فہرست مذکورہ کے صفحات ۴۷، ۴۸، ملاحظہ ہوں:

(۱) مخطوطہ نمبر ۶۳۲، دیوان ہمایوں کے لیے صرف دو الفاظ "منقش" اور "خوش خط" کافی سمجھے گئے۔ حالانکہ بقول مسٹر مانک، بیرسٹر پٹنہ اس دیوان میں جو نقاشی ہے، وہ سولھویں صدی عیسوی کے کشمیر آرٹ کا نمونہ ہے۔ مسٹر مانک مغل آرٹ کے ماہر ہیں اور ان کے پاس مغل آرٹ کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ تاریخی نمائش کی فہرست سے دیوان ہمایوں کی اہمیت نہیں ظاہر ہوتی۔ دیوان ہمایوں کا یہ واحد نسخہ ہے جو دیوان ناصر علی کے کتب خانے میں ہے۔ کتب خانۂ مشرقی کے دیوان کا مصنف ہمایوں اسفرائنی ہے، اور دیوان موصوف کے کتب خانۂ قلمی کے دیوان کا مصنف کا مہان کا بھائی اور ہندوستان کے سب سے بڑے بادشاہ کا باپ ہمایوں ہے۔

(۲) مخطوطہ نمبر ۶۴۲، "دلکشا" کے متعلق شکر ہے کہ فہرست میں چند سطریں لکھ دی گئیں ہیں: "مصنف بھیم سین کایستھ۔ سال تصنیف ۱۱۲۰ھ = ۱۷۰۸ء۔ عہد اورنگ زیب میں دکن کے حالات کے لیے یہ کتاب بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ بہت کمیاب۔" ہندوستان میں دلکشا کا شاید یہی ایک نسخہ ہے۔ ناچیز اس کتاب پر ایک مقالہ حوالۂ قلم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، جو رسالۂ معیار کی کسی اشاعت میں شائع ہوگا۔

(۳) مخطوطہ نمبر ۶۴۳، منتخب الوزراء، یہ بھی ایک نادر الوجود نسخہ ہے۔ جس پر متعدد مہریں ہیں، اور بعض پر تاریخ بمقامات "عرض دیدہ شد" مع تاریخ لکھا ہوا ہے۔ کتب خانۂ مشرقی کا نسخہ "آثار الوزراء" اس سے مختلف ہے۔ منتخب الوزراء کا مصنف قاضی احمد الابراہیمی حسینی ہے۔ سال کتابت ۹۸۶ھ ہے۔ مصنف نے جا بجا اپنے ماخذوں کے حوالے دیے ہیں، اور دوسری جلد لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

(۴) مخطوطہ نمبر ۶۶۰، مآثر الاقبال۔ "تاریخ اسلام تا عہد امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ۔" اوراق ۳۱۰۔ سطریں ۱۷ فی صفحہ، خوشخط، نستعلیق۔ دو مہریں ہیں ایک دیوان ناصر علی کی اور دوسری میر معصوم خاں کی۔ کتابت روز چہار شنبہ شہر رجب المرجب ۱۰۹۲ھ۔ قدرے کرم خوردہ۔ دوسرا صفحہ کرم خوردہ ہے۔ مصنف کے نام کا پتا نہیں چلتا۔ آغاز کتاب ذکر احوال سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے۔ کتب خانۂ مشرقی اور برٹش میوزیم میں اس کا کوئی نسخہ نہیں۔

(۵) مخطوطہ نمبر ۶۵۲، بیان واقع۔ اس کی اہمیت سے بے ایبٹ کی تاریخ ہند کی آٹھویں جلد، صفحہ ۱۲۴ تا ۱۲۶، ملاحظہ ہو۔

(۶) مراۃ الاسرار، ایک مشہور کتاب ہے، جس کا ایک نسخہ کتب خانہ مشرقی میں بھی ہے۔ لیکن کھجوا کا نسخہ قدیم ترین معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بیشتر صفحات کے حاشیے پر جو تحریریں موجود ہیں ان کے متعلق کتاب میں عبارت درج ہے: "نسخہ مسطور در نظر مبارک حضرت ملا شیخ عبدالرحمن حسینی رسیدہ است واکثرہ دستخط خاص......" اس کے بعد کاغذ پھٹا ہوا ہے۔ شیخ عبدالرحمن مذکور اس کتاب کے مصنف ہیں۔ تاریخ کتابت ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) ہے۔

میں انجمن ترقی اردو، صوبہ بہار سے گزارش کرتا ہوں کہ صوبہ بہار میں جتنے نانگی کتب خانے ہیں، ان کے مخطوطات کی فہرست بنانے کی کوشش کرے۔ دیوان ناصر علی کا کتب خانہ خصوصاً قابل توجہ ہے۔ یہ کام بے شک بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر کتب خانوں کے مالک انجمن کی معاونت کریں تو فہرست بنائی جا سکتی ہے۔ میں آگے بیان کر چکا ہوں کہ صوبہ بہار میں مختلف مقامات پر نادرالوجود مخطوطات موجود ہیں، جن کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر جلد توجہ نہ کی گئی تو یہ بیش بہا مخطوطات ضائع ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کے پاس مخطوطات کے ذخیرے ہیں، ان سے میری یہ استدعا ہے کہ ان علمی خزائن کو برباد نہ ہونے دیں، لوگوں کو اجازت دیں کہ ان کتابوں کو دیکھ سکیں اور اگر ضرورت ہو تو بعض کتابیں انجمن ترقی اردو صوبہ بہار، یا کتب خانہ مشرقی کو عطا کر دیں، تاکہ یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچیں، اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔ کتابوں کو کیڑوں کی نذر کر دینے کا کیا فائدہ ہے؟ اگر انجمن ترقی اردو تمام مخطوطات کی فہرست شائع کر دے تو یہ بڑی کارآمد چیز ہوگی۔

سید حسن عسکری

شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج

(قلمی کتابوں کو ذاتی ملک نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ مال امانت ہے جو ہمارے پیش رو چھوڑ گئے ہیں۔ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن اسے ضائع نہیں کر سکتے۔ اپنے جانشینوں کے لیے اسے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ کتابوں کا گھروں میں محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کتبخانہ خدا بخش یا انجمن ترقی اردو کے حوالے کی جائیں۔ قلمی کتابوں کی فہرست بھی ضرور مرتب ہونی چاہیے، لیکن اس کے لیے بہت روپے کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگ اگر بلا معاوضہ اس کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں، تو انجمن ترقی اردو فہرست کو چھپوا دینے کا ذمہ لیتی ہے۔ معیار)

# سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

## سالنامۂ شاہکار لاہور:-

"اردو کے آغاز اور ماخذ کے متعلق بعض غلط فہمیاں" از ڈاکٹر سید محی الدین قادری (ص ۳۴ تا ۴۳) ڈاکٹر گریرسن کی کتاب کو وقت توجہ بنا کر مضمون نگار نے اس کی اصولی غلطیاں دکھائی ہیں اور ناظرین کو رسالے ... کے مقدمہ لغت ہندوستانی، ڈاکٹر گریرسن کی تاریخ ادب اردو، پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کے مقدمہ آغاز و ارتقائے بنگالی اور پروفیسر ... اور پروفیسر جیوس بلاک کی تصانیف کے مطالعے کی دعوت دی ہے۔ معیار)

(... "اردو قنوجی یا برج بھاشا سے نہیں نکلی" اردو اس وسیع زبان سے مشتق ہے جو جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت اس حصہ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف موجودہ صوبہ سرحد کا شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو بارہویں صدی عیسوی میں پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ لیکن اس بیان سے یہ بھی نہیں ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس زبان پر مبنی نہیں ہے جو اس وقت دہلی کے اطراف اور دوآبہ گنگ وجمن میں بولی جاتی تھی۔ کیونکہ جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت پنجاب کی اور دہلی کے نواح کی زبانوں میں بہت کم فرق تھا۔

جدید اردو شاعری کی خصوصیات۔ از اعجاز حسین صاحب ایم اے۔ ص ۴۰ تا ۵۰۔

دیوان افسوس۔ از سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ص ۱۲۰ تا ۱۳۳ (۱) دیوان افسوس کا انتخاب ۱۹۰۳ء میں نواب عماد الملک نے چھپوایا تھا۔ دیوان کے قلمی نسخے بہت کم ہیں (دو نسخے لندن میں اور دو کلکتے میں موجود ہیں۔ ہندوستان میں اور نسخے بھی ہیں۔ معیار) دیوان زیر نظر کے آخری صفحوں پر شاہان اودھ کے کتب خانے کی تین مہریں لگی ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| خوش است مہر کتب خانۂ سلیمان جاہ | بہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ | (نصیر الدین حیدر) |
| تبرک مہر شہ چوں شد مزین بر کتاب | خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب | |
| خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب | ثبت و پرنور باد اچوں فروغ آفتاب | |

تاریخ کتابت کہیں درج نہیں ۲۶۰ تعداد اشعار غزل تقریباً ۳ ہزار رباعیاں ۵۵، تخمیس غزل میر حسن ۳ بند، مخمس ترجیع بند ۷ بند، مثنوی ۱۴ بند، قطعہ ۹ اشعار قصیدہ ۲۰۰ اشعار۔ مضمون نگار نے افسوس کی زبان اور ان کے عہد کے املا سے بحث کی ہے اور منتخب اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ (مضمون ناتمام ہے۔ دیوان کا یہ نسخہ کل کلام پر حاوی نہیں معلوم ہوتا۔ معیار)

## جامعہ دہلی

مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب و پروفیسر محمد عاقل صاحب فریدی "نظام الملک کے آباؤ اجداد" ص ۱۱۲ تا ۱۲۹ از ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ (مضمون ناتمام ہے۔ معیار)

روش

جامعہ "ہندوستانی ڈراما" ص ۲۶۳ تا ۲۷۹، از پروفیسر محمد مجیب صاحب (۱) "یہ ضروری ہے کہ ڈراما کو جو شکل دیں وہ جانی پہچانی ہو، ہندوستانی ڈراما میں صرف ہندوستانی زندگی پیش کی جا سکتی ہے۔ اگر ہم یورپ یا کسی خیالی دنیا کا نقشہ اتارنا چاہیں گے، تو وہ بہت ٹیڑھا ہوگا اور شاید اسے ٹھیک دیکھنے کے لیے ہمیں ہم کو بڑی فکر ہو کیونکہ اپنی زندگی کی تصویر دکھاتے وقت ہمیں ہر طرح سے مناسبت کا خیال رکھنا چاہیے، مکان، رہنا سہنا، لباس ہر چیز کو ایسا ہونا چاہیے کہ ڈراما لکھنے والے کا مطلب، قصے کا رنگ اور قصے کے اشخاص... کی کیفیت اس سے جھلکتی ہو... (۲) "جیسی ہم نے چند آدمیوں کی چند قسمیں بنائی ہیں اور ڈرامے میں دکھایا جانا انہیں کا حق سمجھتے ہیں... وہ خوبصورت لڑکی جسے کوئی بدمعاش پکڑے جاتا ہے، وہ شریف ڈاکو جو اسے چھڑاتا ہے، وہ لڑکی جو باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرنا چاہتی ہے اور وہ بیچارہ جو اس کارروائی میں اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی چند قسمیں ہیں، مسخرا، انگریزی، شیخی، سودائی، ظالم باپ، جوتا، اور جھاڑو چلانے والی بی بی اور اس کے حسب حال جوتا کھانے والا شوہر۔ اب ان میں ایک نئی قسم دیس سیوک کی شامل کر دی گئی ہے...... اس تقسیم کو چھوڑ کر ہمیں بیچ بیچ کے ہندوستانیوں اور گھومتے ہوئے کرداروں کے بجائے جیتے جاگتے آدمیوں کی تصویر اتارنی چاہیے۔ ڈراما لکھنے والے کو اس کا حق نہیں کہ وہ کیرکٹر کو خاص مطلب کے لیے بنائے کیونکہ وہ خدا کی طرح نئے نئے آدمی نہیں پیدا کر سکتا اور ایسے کیرکٹر لکڑی کے کھلونے یا گڑیوں کے ریکارڈ ہوتے ہیں اور ڈراما کھلونوں کی دکان یا اسکول کا کلاس روم بن کر رہ جائیگا، اصل زندگی کی اس میں بوباس نہ ہوگی۔"

نظام الملک کے آباو اجداد (بسلسلۂ گذشتہ ۲۳۵ تا ۲۵۲) (اصل مضمون انگریزی میں لکھا گیا تھا، جامعہ میں ترجمہ شائع ہوا ہے۔ معیار)

**ہمایوں** لاہور اپریل "ذوق کا حلیہ" ص ۲۰۵ (ماخوذ آزاد)

• "غالب کا حلیہ" از خواجہ حسن نظامی صاحب ص ۲۰۶ تا ۲۰۷

"ذوق و غالب" از بشیر احمد صاحب بی اے اگست ص ۲۹۸ تا ۳۰۰ (ذوق و غالب کے کلام کا مختلف زبانوں میں جو اثر ہوا، اس کا ذکر ہے۔ آخر میں ان دونوں کے مزاروں کی موجودہ حالت کا بیان ہے۔ معیار) (۱) غالب کی قبر پر یہ اشعار کندہ ہیں:-

یا حی یا قیوم

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد | اسداللہ خاں غالب مرد
کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں | تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح | ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"
۱۲۸۵ھ

(۲) ذوق کی قبر پر یہ عبارت مرقوم ہے:-

۲۰۶۔ | مرقد | خاقانیِ ہند ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق کا۔

قطعۂ تاریخ قدیم:-
شبِ چار شنبہ بہ ماہِ صفر — بحکمِ خداوندِ جاں داد ذوق
ظفر روئے اردو بہ ناخن زغم — خراشید و فرمود استادِ ذوق

قطعۂ تاریخ جدید:-
کیا اس کو محمد رضا نے آشکارا — یہ شہرِ خموشاں سے آئیں صدائیں ۱۲۷۱
سنِ سالِ تعمیرِ مرقد جو پائی — لحدِ ذوقِ استاد کی آپ کہہ دیں ۱۳۵۵

مئی: عشق و محبت کا مشرقی تصور، اردو غزلوں کا تمدنی پس منظر ص ۲۰۰ تا ۲۰۳ از حمید محمد خاں صاحب ایم اے۔

## ادبی دنیا

مارچ: غالب کی شخصیت اور اردو ادب میں اس کا رتبہ ص ۲۹ تا ۳۱ از جناب برجموہن دتاتریہ کیفی۔ (۱) "غالب اول درجے کا روادار، وضعدار اور بھی دوستدار تھا۔ ہرگوپال تفتہ، جواہر سنگھ جوہر، منشی بہاری لال مشتاق اور پنڈت شنکر ناتھ نادر کے ساتھ جو تعلق غالب کا تھا وہ ایسا ہی تھا جیسے پرانے زمانے میں گرو چیلے... کا ہوا کرتا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں... رائے بہادر ماسٹر پیارے لال... دہلی سے بدل کر لاہور جانے لگے۔ شہر کی طرف سے ان کو الوداعی ایڈریس دیا گیا۔ دہلی کے معزز انگریزوں اور ہندوستانی شرفا کے اس ایڈریس پر دستخط ہیں۔ میرزا غالب نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ لفظ اپنے قلم سے لکھے" فقیر اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم دہلی والوں کو ہوا ہے وہ میرا جی ہی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں"... میرزا کا خلوص اور تعلق مذہب و ملت سے نہیں بلکہ انسان اور انسان کی ذاتی خوبیوں سے تھا" (۲) "غالب جس جوہر کی وجہ سے مانا جاتا ہے وہ اس کی تخیلی صناعی ہے.. غالب پہلا شخص تھا جس نے اردو میں یہ بات پیدا کی، وہ سہل ممتنع کا استاد مانا جاتا ہے"۔ (۳) "غالب کا فلسفۂ شاعری اخلاقی اور عالمگیر تھا، جن چیزوں کو وہ اچھا اور افضل جانتا تھا، وہ جہاں کہیں بھی ملتیں اور جس مذہب کے انسان میں بھی پائی جاتیں، غالب کی ممدوح تھیں"۔

اپریل و مئی: "اردو کا پہلا گلدستہ جسے ایک خاتون نے جاری کیا" ص ۹ تا ۱۱ از جناب تمکین کاظمی (۱) اس گلدستے کا نام گلدستۂ ناز ہے، اس کی مالکہ بلقیس جہاں بیگم ناز تھیں اور وہی اس کی مرتب بھی تھیں، مقامِ اشاعت بمبئی، اس کے پرچے جناب تراب علی خاں باز کے پاس ہیں۔ ان میں سے چھٹا نمبر ۱۵ جون ۱۸۹۵ء کا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پہلا نمبر ۱۵ جنوری ۱۸۹۵ء کو نکلا ہوگا۔ رائل سائز کے ۲۰ سطری مسطر پر ۲۴ صفحے ہوا کرتے تھے اور طرحی غزلوں کے علاوہ غیر طرحی غزلیں بھی درج کی جاتی تھیں، ہر گلدستے کے آخر میں وہ تبصرے بھی جو معاصرین نے کیے تھے شائع ہوا کرتے تھے (مضمون نگار نے خورشید ہند میرٹھ، اودھ پنچ، گزٹ لکھنؤ، جامِ جمشید مراد آباد، اخبار آصفی حیدر آباد دکن کے تبصرے نقل کیے ہیں، اور مہر منور اجمیر، نیم ...، مفید ہند، منشور محمدی، خورشید آفاق، پیام عاشق کے تبصروں کا ذکر کیا ہے۔ معیار) (۲) یہ گلدستہ اخباروں اور گلدستوں اور کتابوں پر خود بھی رائے زنی کیا کرتا تھا، چنانچہ ۱۵ نومبر ۱۸۹۵ء کے گلدستے میں قصہ مہتاب بیگم، افسانۂ ایام، گلدستۂ افسون، فوائد السالکین، اخبار ناظم الہند

وسیفر گورنمنٹ لاہور وغیرہ پر تبصرے کیے گئے ہیں۔ (افسوں کا تبصرہ اس مضمون میں نقل کیا گیا ہے۔ معیار) اس رسالے کی مالی اعانت کرنے والوں میں بابو تلسی رام اور بھیا نریندر سنگھ بھی تھے۔ پہلے کا عطیہ پانچ سو اور دوسرے کا دو سو چندہ سالانہ شاہ ایک روپیہ تھا۔ لکھائی چھپائی بری نہ تھی۔ لیکن کاغذ بہت گھٹیا استعمال ہوتا تھا (۴) اس گلدستے میں امیر، ایزد بخش ریاض، مضطر، جلال، کمال وغیرہ کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں (مضمون نگار کا خیال ہے کہ مرزا داغ کی دو مشہور غزلیں "ع حشر میں اللہ کرے گر مجھ کو" اور "جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں" اسی کے لیے کہی گئی تھیں لیکن یہ غزلیں گلدستے میں موجود ہیں۔ معیار) (۵) ایک غزل دانیال گارڈنر صاحب لشکر خلف اکبر مسٹر سلیمان شکوہ جو گارڈنر صاحب (؟) رئیس کاس گنج ضلع ایٹہ کی بھی ہے۔ نہ معلوم یہ دانیال اور سلیمان شکوہ گارڈنر کون صاحب تھے؟ آخری پرچہ جو ہمارے پیش نظر ہے مارچ ۱۸۸۳ء کا ہے۔ یہ علم نہیں کہ کب تک جاری رہا (کرنل گارڈن [یہ گارڈنر کی خرابی ہے] کا ذکر کمال الدین حیدر نے تاریخ اودھ نے کیا ہے۔ ان کی پوتی سلیمان شکوہ برادر حقیقی اکبر ثانی کے بیٹے سے منسوب تھی۔ نصیر الدین حیدر شاہ لکھنؤ سلیمان شکوہ کے داماد تھے۔ اجیب داماد کی بد سلوکیوں کی وجہ سے انہیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا تو سلیمان شکوہ کاس گنج جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ اسی خاندان کے کسی فرد نے اپنا نام خاندانی تعلقات کی بنا پر سلیمان شکوہ رکھا ہوگا۔ معیار) (۶) جنتیس جہاں بیگم کا ایک قصیدہ جو مہاراجہ پدمانند سنگھ والی ٹیلی وکٹوریہ ضلع بھاگلپور کی مدح میں ہے اور کئی غزلیں گلدستے میں درج ہیں۔

نمونۂ کلام:-

کیوں غم اٹھائیں خواہش آغوش یار کا — ہم بیکسوں کو خوب ہے کونا مزار کا
سمجھے ہو جس کو حضرت موسیٰ چراغ طور — اک ذرہ تھا وہ خاک دل بیقرار کا
اٹھی شمشیر جب تیغی نظر کی — بلائیں میں نے لے لیں اپنے سر کی

مطلع قصیدہ:- رواں بزم در دولت بحر آب گوہر ہے — جدھر دیکھو ادھر اک کشتی درویش لنگر ہے

مئی، قصۂ رضوان شاہ ص ۱۰۰ تا ۱۴۵ از زین العابدین صاحب (۱) یہ مثنوی قدیم دکنی زبان میں ۱۰۴۳ھ کی نظم کیا گیا تصنیف ہے۔ مصور قلمی نسخہ کتب خانہ منولال گیا میں موجود ہے۔ تصاویر تعداد میں ۳۶ مغل اسکول سے تعلق رکھتی ہیں اور فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ برٹش میوزیم اور کتب خانہ آصفیہ میں بھی اس مثنوی کے قلمی نسخے ہیں۔ نسخۂ گیا کے کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں (۲) مصنف کا نام (یا تخلص؟ معیار) فائض یا بقول بعض فائز ہے۔ فائض کو ترجیح ہے۔ نسخۂ گیا میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ (۳) (مضمون نگار نے مثنوی کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں، اس کے املا اور اس کی زبان سے بحث کی ہے اور قصے کا خلاصہ بھی درج کیا ہے جو اس خلاصے سے زیادہ مفصل ہے جو یورپ میں دکنی مخطوطات کے مصنف نے دیا ہے۔ اس کتاب میں نسخۂ عجائب خانہ برطانیہ کا حال درج ہے، جس کا سال کتابت ۱۲۰۸ھ ہے، اور مصنف نے فائض کو بالالتزام فائز لکھا ہے۔ مضمون نگار نے مصنف اردوئے قدیم کے اس قول کی بھی تردید کی ہے کہ فائض نے یہ مثنوی دوستوں کی فرمائش سے لکھی تھی۔ انہوں نے بعض شعر نقل کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فائض کا مقصد اپنے نام کو زندہ رکھنا تھا نہ کہ دوستوں کو خوش کرنا۔ معیار)

جانِ عالم، از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت ص ۸۱ تا ۹۲ (واجد علی شاہ کے ابتدائی حالات۔ اس مضمون میں ان کی ادبی زندگی کو بحث نہیں کی گئی۔ معیار)

# محکمہ

(۱ تا ۳) تاریخ وفات نجف خاں، سال آغاز تذکرہ ہندی مصحفی، تصحیح دیوان معروف، از ق ع د

(۱) نجف خاں کا سال وفات تاریخ فرخ آباد، مصنفہ ولی اللہ میں ۱۱۹۰ھ درج ہے۔ ولی اللہ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ فرخ آباد ہی میں گزارا ہے، اور گو اس نے نجف خاں کا زمانہ پایا ہے، خیر الدین محمد اور منشا لال کے بیان پر اس کے قول کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ "آثار الصنادید" مصنفہ سر سید احمد خاں سے معلوم ہوتا ہے کہ نجف خاں کے مزار کے کتبے پر ایک قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔ "ایں تربت نجف" مادۂ تاریخ ہے، اس سے بھی ۱۱۹۶ھ نکلتا ہے۔ کمال الدین حیدر مصنف سوانحات سلاطین اودھ نے اس قطعے کو اپنی کتاب کی جلد اول میں نقل کیا ہے۔ بیت آخر یہ ہے:- "زد کلک وحی تو ام عالی بنا گہ و تاریخ سال را رقم ایں تربت نجف"۔ طبع ۱۸۹۶ء، مطبع نول کشور لکھنؤ۔

(۲) مصحفی نے تذکرۂ ہندی کے دیباچے میں تصریح کی ہے کہ اس کی ابتدا تذکرۂ فارسی کی تکمیل کے بعد ہوئی۔ "چوں ایں فقیر... از تصنیف دیوان فارسی و ہندی و تالیف تذکرۂ فارسی فراغت حاصل کردہ، ہم تالیف تذکرۂ ہندی در پیش آمد"۔ تذکرۂ ہندی مطبوعہ ص ۲۔

عقد ثریا یعنی تذکرۂ فارسی نے کتابی شکل ۱۱۹۹ھ میں اختیار کی۔ "زہے باغ باصفا" سے تاریخ نکلتی ہے (عقد ثریا ص ۳) اس تذکرے میں مصحفی ۱۱۹۹ھ کے بعد بھی اضافے کرتے رہے، چنانچہ مضطر کا حال ۱۲۱۲ھ میں لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سال تالیف تذکرۂ فارسی سے مصحفی کی مراد ۱۱۹۹ھ ہے، نہ کہ ۱۲۱۳ھ، اور اس بنا پر تذکرۂ ہندی کا سال آغاز ۱۱۹۹ھ یا اس کے کچھ بعد قرار دینا چاہیے۔

(۳)

| | | |
|---|---|---|
| ۲۴ | سیاہ کاری معروف نے سیاہ وروں | جو جو سیاہ وروں اس بشر کا منہ کالا = کار ہے |
| ۹۵ | ناز بیجا ر کا گو تھا نہیں مفہوم خوب | دیدۂ خونبار جب تک ترجماں ہوتا نہیں = ہوتا |
| ۹۷ | چشم ترے ایک پل یاں آستیں اٹھتی نہیں | پھر ادھر کیوں تیری چشم سرگیں اٹھتی نہیں = شرگیں |
| ۱۰۱ | دیدار اب خدا کا مجھے ہو چکا نصیب | یعنی ہوا ہوں اک نگہ سرگیں سے میں = مراد شرگیں |
| ۱۰۵ | یاد مژگاں گر بت غم میں ولا کے ہی تو رو<br>یاد مژگاں گر تپ غم میں ولا کی ہے تو رو | یعنی غیر از آب پاشی کچھ نہیں خاروں کی بچھاؤں = |
| ۱۰۶ | مستی میں ہم کو تلقل مینا خوش آئے ہے | تو اک حیات بادہ گرہ در گلو نہ ہو = لے حباب |
| ۱۱۱ | گر زعاشق عشق میں ہو تو کو کن ہو کامیاب | لیک مر تو جائے تیشہ مار کر اتنا تو ہو = جوں |
| ۱۱۸ | اپنے سینے کے گل جو دکھلاؤں | بلبلیں ہوں گلے کے ہار ابھی = گل، کا ؟ |
| ۱۲۰ | جب دیکھی ہے یہ تصویر سی صورت میری | ہوش کھوئے ہوئے منہ تکتے ہیں دو چار گی = تیری |

۱۴۸ پیرہن میں نمودِ تن سے تری — بجلی اک تہ شباب کی سی ہے = شہاب

۱۳۵ بیٹھ نہ جب جا پ یوں ہجر میں سرا فتہ — تو تیرے حق میں اور سوا زہر ہے = ترے حق میں کوہا؟

۱۳۶ کہے ہے دشت میں ہر نقش پائے ناقۂ مجنوں — بھٹکنا مت کہ جانے آج لیلیٰ یوں نہیں دوں ہے =

ناقہ لے مجنوں، جاتی۔

۱۵۰ کہیں ہیں دل کو شب خانہ معروف = سب ۱۵۰ ایسی روتا ہے تو طوفان خطر کیونکر نہ ہو = کا خطر

۱۵۲ رہتی تھی عاشق سے تجھے کو کس قدر بیگانگی = تجھے کو

۱۵۴ نہ پوچھ مجھ سے غم و درد صدمہائے فراق = غم و درد

۱۵۵ ایک عالم تجھے کو تجھے پہ کھڑا دیکھے ہے — مر گیا شب ترے عارض کی صفا دیکھے ہے

ہم تو ہم ماہ بھی حیران رہا دیکھے ہے — مہ جبیں روئے عرقناک ترا دیکھے ہے

غرق دریائے خجالت ہوئے اختر لاکھوں" = مخمس کا ایک بند ہے۔ چاروں مصرعوں میں ہے کی جگہ سے ہے

۱۵۸ تو سب کو قتل کیا اور مجھی کو ترسایا — گلے پہ تشنہ کے میرے تجھے نہ رحم آیا = گلوئے تشنہ پہ میرے؟

۱۷۰ یہ زندگی کی جو صورت گر اشتہار کریں — کہاں میں آئینہ کو گر تو سنگسار کریں = گر کو تو

۱۷۵ اس کی کھو دے ہے یہ بیخ و بن — ہیزم خشک کو جوں کھائے گھن = کی یوں، گھن

۱۷۸ تجھ کو اپنے دل بے غم کی قسم + حلقۂ دام تغافل کی قسم = تغافل اور بے غم کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔

۱۷۸ وحشت شوق کے تمکیں کی قسم = تمکیں ۱۸۰ ارشتۂ نازِ رگِ گل کی قسم = تار

۱۸۲ تیغ بردار آپ کا بلا ہی ہے = تیغ دار ۱۸۳ کیا ہی تعریف اب لکھوں پس خیر = بس

۱۸۴ اس طرف بھی کرم کیا کیجیے — گاہ گاہے خبر کیا کیجیے = لیا

۱۸۵ کوئی خواہاں بھی ہو شاید تیرا — دور ہی سے دیکھ کے ہوتا ہوا = کوئی جو، ہوتا

۱۸۷ واں سے جب آگے بڑھیگا تو پھر = تو تو ۱۸۸ آپ نظر آئیگا ان کا مکاں = آپ

۱۸۸ میں بہت آنے کو چاہا گیا = میں تو ۱۸۸ بھیجیے اس کا جواب آپ بھی = اب اس

۱۸۸ جس کی وہ کیجیے گا رقم طبعزاد = جن کے ۱۸۸ چھوڑ قلم کو گئی تھک قلم = کو کہ

۱۹۱ اے برادر قصۂ خوں پیمانہ است — معنی اندر وے میان دانہ است = چوں، بسان

۱۹۱ گوش رو اپنے ہے یہ اس طور سے = گوش زد ۱۹۲ پاس نام ننگ دل بے صبر تھا = نام و

۱۹۵ اپنا نفس مدعا کہنے لگا + تھا جو قسمت کا لکھا لکھنے لگا = کہنے

۲۰۳ کیا کہوں مستی عجب ہنگامہ تھا — مرگ کا آیا نوازش نامہ تھا = تم سے

# ہماری زبان

(۱) از سید رضا قاسم صاحب (۲) از ق ع و

(۱) نورچشمی: کیا لفظ نورچشمی مخصوص عورت ہی کے لیے ہے یا مرد کو بھی لکھ سکتے ہیں؟ میرزا قتیل کا تو خیال تھا کہ مرد کو بھی لکھ سکتے ہیں کیونکہ حرف ی اس لفظ میں نسبتی ہے یعنی وہ نور جو منسوب ہے آنکھ کی طرف دوسری صورت اس ی کی متکلم ہوسکتی ہے یعنی میری آنکھ کی روشنی۔ جیسے عزیز سے عزیزی۔ لیکن میرے اکثر ذی علم احباب کا خیال ہے کہ لفظ نورچشمی میں سوا یائے تانیث کوئی دوسری ی نہیں ہوسکتی، کیونکہ نورچشم فارسی زبان کا مرکب لفظ ہے اس کے ساتھ یائے متکلم یا یائے نسبت کی ترکیب درست نہیں ہوسکتی۔ مگر میرے خیال میں تو قتیل کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس قسم کی ترکیب غلط ہے تو پھر قبلہ گاہی کا لفظ بجائے عورت کے مرد کو لکھنا کس طرح درست ہوسکتا ہے، جو عام طور پر مرد ہی کے لیے مستعمل ہے:

" نویسد نورچشمی آفتاب آں صفحۂ رو را مہ تو قبلہ گاہی گوید آں محراب ابرو را "

(۲) **نورچشمی** اہل اردو کی بول چال میں داخل نہیں، گو اس میں شک نہیں کہ بعض اہل اردو اور چند ہندوستانی فارسی داں خطوں میں لڑکیوں کو خطاب کرتے ہوئے اسے استعمال کرتے ہیں، فارسی الفاظ کے ساتھ عربی کی یائے متکلم کا استعمال تو یوں ناجائز ہے۔ اگر نورچشمی میری آنکھ کی روشنی کے معنی میں صحیح ہے تو راحت جانی، سرودلی بھی جائز ہونا چاہیے۔ رہی یائے نسبتی، اس کے متعلق گزارش ہے کہ اول تو اس کی کوئی ضرورت نہیں، نورچشم سے وہی مطلب نکلتا ہے جو نورچشمی (بحالت اضافۂ یائے نسبتی) سے نکل سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نورچشم میں ترکیب اضافی ہے، ایسی صورت میں یائے نسبتی کا اضافہ قاعدہ کے خلاف ہے۔ قتیل نہ اردو میں مستند ہیں نہ فارسی میں۔ مطلع جو نورچشمی اور قبلہ گاہی کے جواز کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے اس میں نورچشمے اور قبلہ گاہے ہے۔ ہماری رائے میں نورچشمی میں یائے تانیث ہے، یہ ہندی ی ہے۔ لیکن اردو والوں نے جس طرح صاحبزادہ سے صاحبزادی، شاہزادہ سے شاہزادی بنالیا، ہندوستانی فارسی دانوں نے نورچشم سے نورچشمی بنالیا۔ اس کا استعمال ہمارے نزدیک مناسب نہیں، اور نہ اردو کو اس کی کوئی ضرورت ہے۔ اگر نورچشمی ہمارے روزمرے میں داخل ہوتا تو اور بات تھی۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بعض الفاظ و محاورات پر جو معیار کے مضمون نگاروں نے استعمال کیے ہیں اپنے خط میں اعتراض کیے تھے۔ ہم ذیل میں ان کے خط کے اقتباس اپنی رائے کے ساتھ درج کرتے ہیں:

**نوشتہً**: "نوشتہ فارسی لفظ ہے، عربی الفاظ کی طرح تنوین کے ساتھ اس کا استعمال ناجائز ہے۔" اعتراض صحیح ہے۔

**کراہیت**: کراہیت صحیح نہیں کراہت صحیح ہے۔ کراہیت اور کراہت دونوں عربی لغات میں موجود ہیں۔ کراہیت ہمارے ہاں لوگوں کی زبان پر بہ کثرت ہے، ممکن ہے صوبجات متحدہ میں لوگ کراہت کو ترجیح دیتے ہوں لیکن کراہیت جب لغت میں ہے تو اسے غلط نہیں کہا جاسکتا۔

ق ع:

**ترجمہ**

آپ کا ترجمہ بتذکرہ خوش گو سے کیا ہے کرس وم۔ ترجمہ فارسی میں اس معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اردو میں اجنبی معلوم ہوتا ہے اردو والوں کے لیے لفظ حال اس سے زیادہ قریب الفہم اور مانوس ہے۔ بایوگرافیکل نوٹس کا مفہوم ادا کرنے کے لیے ہمیں ترجمہ سے بہتر لفظ نہ مل سکا۔ اردو والوں نے شبلی اور مصنف تذکرہ کے سوا کسی نے معنی مفہوم میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ تلاش سے اور لوگوں کی تصانیف میں بھی ملیگا۔ لفظ حال اس موقع پر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر کسی کتاب میں ضمنی طور پر کسی کا ذکر آجائے اور دو چار باتیں اس کے متعلق لکھ دی جائیں۔ لیکن لفظ ترجمہ صرف اس موقع پر استعمال ہوگا، جب مصنف نے کسی کا حال باقاعدہ درج کیا ہو اور وہ کتاب کا لازمی جزو ہو۔ مثلاً کہ مآثر الامرا میں جن جن لوگوں کے نام بطور عنوان موجود ہیں، ہم ان کے حالات کو تراجم کہیں گے۔ لیکن جن لوگوں کے حالات دوسروں کے حالات کے تحت میں درج ہیں، ہم انہیں تراجم نہ کہیں گے لفظ حال دونوں صورتوں میں مستعمل ہو سکتا ہے، تاہم ہمیں اس لفظ کے استعمال پر اصرار نہیں۔

**تبادلہ**

صحیح لفظ مبادلہ یا تبادل، مگر تبادلہ اردو میں لکھا اور بولا جانے لگا ہے۔ بلکہ مکاتبات میں بھی لوگ اسے استعمال کرنے لگے ہیں۔ مثلاً تبادلہ خیالات کیا گیا۔ آج کل کے نزدیک اس لفظ کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب اس سے تعرض نہ کرنا چاہیے۔ تبادلہ ایک خاص معنی میں ابتداءً اردو کا لفظ بن چکا ہے۔ ہم زندگی بھر سے سنتے آئے ہیں کہ فلاں شخص کا دلی سے میرٹھ کو تبادلہ یعنی ٹرانسفر ہوگیا"۔ تبادلہ اردو والوں کی ایجاد ہے۔ عربی لغات اور کتب فارسی لغات میں بھی نہیں ملتا، اس کے استعمال میں ہمیں بھی تامل تھا۔ لیکن جب آرزو لکھنوی کو نظام اردو کی تمہید میں تبادلہ خیالات لکھتے ہوئے دیکھا تو اس کے جواز کا قائل ہونا پڑا، تاہم اگر کسینچ کے معنی میں مبادلہ استعمال کیا جائے اور ٹرانسفر کے معنی میں تبادلہ حسب سابق رہنے دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

**سونگھنا یا سوچنا**

"راستے میں یہ سونگھتا تھا کہ اگر میں اکیلے اندر جاؤں"۔ مصدر سوچنا ہے نہ کہ سونگھنا، اور اگر کبھی تھا تو اب متروک ہے۔ اکیلے کی جگہ اکیلا چاہیے ص ۲۲ اعتراض صحیح ہے

افعال مرکب اور حرف نفی "جیسی چاہیے ویسی مقبولیت نہیں حاصل ہوئی" ص ۲۹۔ "اخلاقی جرات نتیجہ نظر آتا" ص ۲۳۔ "میں نے اس وقت غور نہیں کیا تھا" ص ۲۳ "اور ہمیں بہت غمگین نہیں نظر آنا چاہیے" ص ۳۰۔ ان مثالوں میں حرف نفی کو پورے فعل کے پہلے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن مرکب افعال میں حرف نفی فعل کے ہر دو اجزا کے درمیان آنا چاہیے، مثلاً "مقبولیت حاصل نہیں ہوئی" "نتیجہ نظر نہ آتا" اعتراض صحیح ہے۔

**قبلہ گاہی**

یائے معروف کے ساتھ پنج آہنگ غالب میں موجود ہے۔ نظم طباطبائی مرحوم رسالہ اردو کے سلسلہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء ص ۔ میں لکھتے ہیں: "یہ محض ہندیوں کا تصرف ہے ..... اسی طرح عندالخواہش ..... مخدوم الانامی ..... قبلہ گاہی وغیرہ بجز شوخیٔ قلم کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں"

# عالم ادب

(۱) ادارہ کلیم دہلی کی طرف سے کتب ذیل جلد شائع ہونے والی ہیں۔ خمارستان (جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی کی نثر) جناب جوش ملیح آبادی کی نظم و نثر، جلدوں میں، آتش کدہ، شعر و حکمت، بادہ سرجوش، روح ادب، گل بانگ، نعرت، افکار، نقش و نگار۔

(۲) لطیف الدین احمد صاحب اکبرآبادی کے مختصر افسانوں اور شاعرانہ نثر کا مجموعہ نغمات کے نام سے جلد شائع ہونے والا ہے۔

(۳) آرزو جلیلی صاحب شیخ غلام علی راسخ کے حالات زندگی لکھ رہے ہیں۔ وہ حالات کے ساتھ کلیات کا انتخاب بھی شائع کرنا چاہتے ہیں۔

(۴) بابو راجندر پرشاد نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر کی حیثیت سے ناگپور میں جو خطبہ پڑھا تھا، ہم اس کے ضروری اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

ہندی قومی زبان ہونے کی حقدار ہے۔ صوبجات متوسط، گجرات، برار، مہاراشٹر اور بنگالے میں بڑی تعداد ہندی سمجھنے والوں کی ہے، لیکن مردم شماری کی رپورٹ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان صوبوں میں ہندی سمجھنے والوں کی تعداد کیا ہے۔ شمالی ہند کے مسلمان سب کے سب ہندی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ جنوبی ہند میں بھی مسلمان ہندی بولتے اور سمجھتے ہیں۔ پنجاب کی زبان پنجابی ہے لیکن وہاں زیادہ تر لوگ اپنی ضروریات کے لیے ہندی کو برتتے ہیں۔ لفظ ہندی کو میں نے وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اگرچہ خود ہندی زبان کے عالموں میں اس مسئلے کے متعلق اختلاف ہے کہ اردو، ہندی الگ الگ زبانیں ہیں یا ایک۔ پنڈت گوبند نرائن مشر نے دوسری ساہتیہ سمیلن میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا، اس میں اس امر کا ثبوت پیش کیا تھا کہ دونوں الگ الگ زبانیں ہیں۔ بابو رادھا کرشن داس نے اپنے اس مضمون میں جو "ہندی کیا ہے؟" کے عنوان سے لکھا گیا تھا، فرماتے ہیں کہ ہندی ہندوستان کے باشندوں کی زبان کا نام ہے۔ اگر کوئی زبان عام طور پر ہندوستان میں برتی جاتی ہے تو وہ ہندی ہے۔ اردو ہندی سے بالکل الگ نہیں۔ لفظ ہندی مسلمانوں کا ایجاد کردہ ہے۔ زمانۂ سابق میں امیر خسرو، میر تقی، انشا اور ملک محمد جائسی کے سے شعرا نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ ملک محمد جائسی پدماوت میں لکھتے ہیں:۔

تولیا ترکی ہندوی بھاشا جیتی آہی ۔۔۔ جا میں مارگ پریم کا سہائے سراہیں تاہی

[میر نے زبان اردو کو ہندی بھی لکھا ہے۔ اور انشا کی دریائے لطافت میں لفظ اردو سینکڑوں جگہ آیا ہے۔ قدما نے لفظ ہندوی یا ہندی ہر اس زبان کے لیے استعمال کیا ہے جو ہندوستان میں بولی جاتی تھی۔ یہ لفظ اس زبان کے لیے مخصوص نہ تھا جو پرانے زمانے میں موجودہ اردو اور ہندی کی جگہ مروج تھی۔

۱۲۲۵ھ میں ایک مسلمان شاعر حقیقت نے امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کے قصے کو منظوم کیا تھا وہ اپنی زبان کو ہندی کہتا ہے

"طوطیٔ ہند کا میں خوشہ چیں　　ہندی میں اب لکھوں ہوں اس کے تئیں" ہشت گلزار حق

اس مثنوی میں اشعار ذیل ملتے ہیں۔ بابو راجندر پرشاد انہیں ہندی کہتے ہیں یا نہیں؟

"ہے وہ لب جواب مغزِ سخن　　خار بن ہے یہ اور وہ گلبن
بس کہ بے حد شمار ہے تھے فتن　　مرکشانِ جہاں تھا اس کے زبوں
فیلسوفِ زمان و دانشور　　راست کار و امین و نیک سیر
سینۂ باز خوابگاہِ تدرو　　چنگ شاہین کا پناہ تدرو" معیار]

قواعد زبان یا لسانیات کے رو سے اردو ہندی ایک ہوں یا نہ ہوں، ہم کاروباری نقطۂ نظر سے ان تمام لوگوں کو جو بالعموم اس زبان میں بات چیت کرتے ہیں جسے ہم ہندی مانتے ہیں، ہندی بولنے والا قرار دیں گے۔ خواہ ان کی ہندی قواعد کے لحاظ سے کتنی ہی غلط ہو، اور ان کی زبان پر ایسے الفاظ کیوں نہ ہوں جو کسی ہندی لغت میں نہیں ملتے۔ ہندی قومی زبان اسی وقت ہوگی جب ہم ان کو شامل کرلیں۔ ورنہ کتابی ہندی سمجھنے والوں کی تعداد کسی صوبے کی زبان بولنے والوں کی تعداد سے بھی کم ہے۔ بہار کو لیجیے جو ہندی بولنے والا صوبہ کہا جاتا ہے۔ یہاں بہت سی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بھوجپوری، مگدھی، میتھلی وغیرہ۔ ان بولیوں کے بولنے والے اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوں تو کتابی ہندی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ یہی حال صوبہائے متحدہ اور دوسرے صوبوں کا ہے۔ جب میں ہندی کا تصور قومی زبان کی حیثیت سے کرتا ہوں تو ان تمام لوگوں کو جو ہندی کو برت سکتے ہیں، ہندی بولنے والوں میں شمار کرتا ہوں۔ قومی زبان سے ہماری مراد وہ زبان ہے جو مختلف صوبوں کے درمیان تجارتی ضروریات اور دوسری اغراض کے لیے استعمال ہوتی ہے اور جو سارے ہندوستان کے لوگوں کے لیے مبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

طرح طرح کے اختلافات ہوتے ہوئے بھی ہندی ان شرطوں کو پورا کرتی ہے۔ تیلگو، تامل، ملیالم اور کنڑی زبانیں ہی صرف ایسی ہیں جن کو ہندی کے ساتھ کوئی سیدھا ناتا نہیں ہے اور جن کے بولنے والے نہ ہندی سمجھ سکتے اور نہ جن کی بولی ہندی بولنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ ان میں بھی سنسکرت لفظوں کی کثرت لینے سے تھوڑی ہی کوشش سے کامیابی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی اتر پچھم میں جہاں آریائی بھاشائیں بولی جاتی ہیں ہندی کا پرچار آسان ہے اور دکن کے علاقوں میں جہاں دراوڑ بھاشائیں رائج ہیں یہ کام بلاشبہ کٹھن ہے۔ قومی زبان ہونے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت ہندی میں آنی چاہیے۔ اس کے پرچار کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرنا چاہیے۔ ہندی کی خامیوں کو دور کرکے اسے مکمل بنانا چاہیے۔ اس لیے ہندی کی شکل پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

زبان کے دو حصے ہیں۔ الفاظ اور صرف ونحو۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایک عبارت کس زبان کی ہے اس پر اتنا منحصر نہیں ہے کہ اس جملے کے لفظ کس زبان سے لیے گئے ہیں یعنی ان کا رواج کہاں سے اور کیونکر ہوا ہے بلکہ اس کا فیصلہ جملے کی ترتیب حروف عطف اور افعال پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹے جملے کو لیجیے۔

"رام نے حکم دیا، موٹر لاؤ۔"

اس چھوٹے جملے میں رام نام ہے۔ حکم عربی لفظ ہے۔ و داخل ہے۔ اس میں ہندی، عربی اور انگریزی کے لفظ آئے ہیں۔ مگر انگریزی اور عربی کے لفظ رہتے ہوئے بھی یہ ہندی ہی کا جملہ ہے۔ اس لیے اگر ہندی میں ایسے لفظ آجائیں جو کسی دوسری زبان سے لیے گئے ہیں تو وہ ہندی ہی رہے گی۔ جتنی زندہ زبانیں ہیں وہ اپنے لغات کو برابر بڑھاتی جاتی ہیں اور ان کے شاعر اور مصنف دوسری زبان کے نئے نئے لفظوں کا استعمال اپنی تصنیفوں میں کرتے ہیں۔ باہر کی بات جانے دیجیے، ہندوستان کی بھی بنگلہ، مرہٹی، گجراتی وغیرہ سبھی زبانوں میں دوسری زبانوں کے لفظوں کا استعمال دھڑلے سے ہو رہا ہے۔ اردو والے بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اردو کے بڑے شاعر اکبر ہندی لفظوں کو بڑی آسانی سے لے لیا کرتے تھے۔ جیسے:-

"سخن ان سے سنورتا ہے، سخن سے میں سنورتا ہوں"

"آغوش سے سدھارا، مجھ سے یہ کہنے والا"

حالی نے ایک جگہ "اُبھی" اور "جالا پورنا" استعمال کیا ہے۔ ہندی زبان کی خوبیوں میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ہندوؤں کی زبان ہوتے ہوئے بھی اس نے عربی، فارسی ہی کے نہیں بلکہ ترکی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے لفظوں کو بھی اچھوت نہیں سمجھا۔ اگر ایسا نہیں کیا ہوتا تو کتنے ہی لفظ جو ہمارے گھروں میں پہنچ گئے ہیں آج نہ ہوتے اور ان کے ہم معنی لفظ ہمارے پاس شاید اتنے موزوں نہ ہوتے۔ اس طرح کے لفظ انسانی زندگی کے سبھی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا۔ مثلاً:-

سوغات، غالیچہ، بہادر، چلکا، قلی، قینچی، چاقو، لاش، داروغہ، توپ، چک وغیرہ ترکی سے۔

الماری، اچار، بوتل، کرا، آل پن، گملا، گوبھی، گودام، چابی، مستری، میز، تمباکو، نیلام، تولیہ، پرات، بوتام، سنتری وغیرہ پرتگالی سے۔

حد، باغ، حلوائی، امیر، مجلس، توشک، تکیہ، حقہ، اسباب، بخار، کیث، بلوہ، غلہ، جیب، دلال وغیرہ عربی سے۔

چوزہ، غلیل، اخبار، نوکر، بیل، دنگل، سنار، جلیبی، زندہ، دوات، بیعانہ، بے باق، چک، چشمہ، وکیل، لالہ، بیمہ، بابا، پاپی، دادا، تالاب، بخیہ، تماشہ وغیرہ فارسی سے۔

ہندی کے پرانے مشہور شاعروں کی شاعری میں بھی بہتیرے لفظ ایسے ملتے ہیں جو بدیشی زبانوں کے ہیں یا بدیشی زبانوں سے مشتق ہیں۔ مثلاً:-

جایسی:- شیر شاہ دلی سلطان۔

سورداس:- اب ہری سب پتی تن کو نائک۔
کوکری سکے پاری میری آتے مان کو لائق

تلسی داس:- گئی بہوری غریب نواز ۔۔ سرل سبل صاحب رگھوراجو

بسی بخشش جاچکن دنہی
جا باز از نہ جائے بکھانا
جنوائے گونے مودت سکل محبوب بیر تاج
کم عکرن کپی فوج جاری
اکپ جاکے بندی خانہ
جو کچھ جیو ٹھ سیخزی جانا
بیٹھے بجاج، صراف، بینک، بنک منھو کو بیرے
غنی غریب گرام نزماگر
کوئی کنگورن چڑھی گئے کوئی کوٹی رندھیر۔

بودھا :- ہوئے بیزور تو پے دونی بیزوسی کیجیے۔ لگم جیلے دبے جو تاسوں لگم تا تولیے۔

پدماکر :- اپنے گج بخشے حبیب رگھوناتھ راؤ پاہی گج دبو کھے کبوں کا ہوشیے ڈارنا۔

بھوشن :- روم رونڈ ہی ڈواے خراساں کھوندی مارے خاک کھا درون جھا ڑے ایسی سا ہو کی بہار ہے۔ راجا سو راج کے لگارن کی دوا کس سن کیتے پادشاہن کی چھاتی درکتی ہے۔

متی رام :- سو بنکو موتی دلی دل دلیپے کو جیو سوسبٹ توہن سوا کی اُمبتی ہے
کہے متی رام تا ہی ردکبے کو سنگویں کا ہو کے نہ ہمتی ہیے میں اُلبتی ہے
ستر و سال نند کے پرتاپ کی لپٹ سب گرنی غنیم برگین کو دہتی ہے
پتی پادشاہ کی اجتی امراون کی، اتنی ربلیا را دبھا وسند کی رہتی ہے

بہاری :- کنکن بیٹھی جا کی بیجی گہی گہی گرب غرور
بھے نہ کیتے جگت کے چتر چتیرے کور
بچے نہ بڑی سبیل ہوں چیل گھونسوا مانس

تلسی داس اور ہندی کے قدیم شاعروں کی تصنیفوں میں عربی فارسی کے لفظوں کا ہی نہیں، اُردو میں آج کل کے رائج محاوروں کا بھی استعمال ملتا ہے۔ جیسے :-

"بالم باسی اودھ کا بوجھیے نہ خاک کو"

مطلب :- اجودھیا کے رہنے والے خاک بھی نہیں سمجھتے۔

"کیو دار کہی پیے ابھوں نہ آئے باج" مطلب :- اے سوامی میں نے کئی بار کہا تم ابھی تک باز نہیں آئے۔

(باقی آئندہ)

# مطبوعاتِ جدیدہ

(۱) سالنامہ شاہکار از جتندی (۲) سالنامہ مساوات از جتندی
(۳) ادب لطیف افسانہ نمبر از جتندی (۴) پیدہ حیرت از جتندی۔

## سالنامہ شاہکار (لاہور)

مرتبہ جناب تاجور، ص ۵٦، جہازی تقطیع، تصاویر ۱۲، قیمت ۲/

جناب تاجور نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان کی زبان و قلم ہمیشہ اردو کی خدمت کے لیے وقف رہے ہیں، نوجوانان پنجاب میں ادبی خدمت کا جو ولولہ پایا جاتا ہے اس کے پیدا کرنے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ اردو سے انہیں جو محبت ہے وہ مصلحت اندیشی کی حدود سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ادبی دنیا نکال کر انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو عمر بھر کے لیے اس شغل سے باز آجاتا۔ لیکن تاجور صاحب اور مصلحت بینی میں تطبیق کا اختلاف ہے۔ اور وہ اسی شان کا ایک دوسرا پرچہ نکال کر رہے ہیں۔ تاریخ کو بھی یہ مرض ہے کہ اپنے کو دہراتی رہتی ہے۔ چنانچہ پہلے ہی سال میں ۵ ہزار روپے کا خسارہ انہیں برداشت کرنا پڑا ہے۔ مجھے علم نہیں کہ ان کی جیب کی گرانی کیا ہے، لیکن ان کی ہمت بہت بہت بلند معلوم ہوتی ہے۔ شاہکار مفید اور دلچسپ رسالہ ہے، میری آرزو ہے کہ یہ کامیابی کے ساتھ مدتوں زندہ رہے۔

اس کا سالنامہ مارچ اور اپریل کے پرچوں کو ملا کر نکالا گیا ہے۔ تاجور صاحب نے اپنے مشیروں کی یہ رائے نقل کی ہے کہ "سالنامہ شاہکار، سالناموں کا شاہکار ہے"۔ جناب تاجور اس رائے سے نہ اتفاق کرتے ہیں نہ اختلاف۔ وہ صرف اسی قدر کہنے پر قانع ہیں کہ میرا جو فرض تھا اور جو تھا میں نے دونوں کی ادائیگی میں کسر نہیں کی ... بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا"۔ انصاف مجھے بھی اس اعتراف پر مجبور کرتا ہے کہ انہوں نے اپنا فرض بہت اچھی طرح انجام دیا ہے۔ اور سالنامے کو مفید اور دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں کی۔ یہ سالنامہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اس قابل ہے کہ وہ اصحاب بھی جو شاہکار کے مستقل خریدار نہیں بن سکتے، اسے منگوا کر پڑھیں۔

نثری افسانوں میں خواجہ غلام السیدین صاحب کا "قانونی مجرم" خصوصیت کے ساتھ قابل داد ہے۔ خواجہ صاحب نے غالباً افسانہ نویسی کے میدان میں پہلی مرتبہ قدم رکھا ہے۔ لیکن ان کا انداز بہت مشق کا ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ کا افسانہ "سفر زیر دفعہ ۱۰۰ ضابطہ ملازمت" ان کے خاص رنگ میں لکھا گیا ہے۔ "منظر العجائب" اور "گیان" بھی قابل ذکر افسانوں میں ہیں۔ حصہ نظم میں فانی، جوش، اختر، شاقی، وردانی، جلیل، آرزو، محروم، تاجور، حسرت، سیماب، کے اشعار ہیں۔ حضرت اختر کی نظم "نظم ہستی" کا یہ مصرع مجھے کھٹکتا ہے۔ "جانے کون سے عالم میں رو رہا ہوں"۔ کہہ رہا ہوں، بہہ رہا ہوں، سہہ رہا ہوں، میں تامل نہیں، رو رہا ہوں، مکمل نظم ہے۔ "تاروں کا کھیت" جناب آغا شاعر کی نظم ہے۔ اس کے کئی مصرعے نظر ثانی سے بظاہر محروم رہ گئے ہیں "نیلی شب سہاگ میں کیا بن گئی دلہن" "یا آسماں کے چاند سے بھر و براتی ہیں" "کالا لباس پہنے شب تار آ رہی ہے" "شب سیاہ" کی ترکیب پرانے زمانے میں جائز رہی ہو۔ لیکن اب متروک ہے۔ "براتی" کی "ی" بری طرح دبتی ہے۔ "شب تار" کافی ہے "تار تار" کیا

کیا ضرورت ہے؟ شاکی کی نظم کا یہ مصرعہ ناموزوں ہے "ذوقِ طلب کا آغوش تو تھا طلسمِ شوق" آخر میں زمانے سے مفر کی بھی ہے۔

تحقیقی مضامین میں کئی قابلِ داد ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کرنے کی جگہ نہیں۔ (بعض کا خلاصہ معیار میں درج کیا گیا ہے۔ معیار)

## سالنامہ مساوات

۱۹۳۶ء مرتبہ محمد منیر الدین صاحب ص ۳۲ علاوہ تصاویر تقطیع معیار قیمت ۸ر

رسالہ مساوات بھلواری نے اب اپنی عمر کے چوتھے سال میں قدم رکھا ہے۔ اس رسالے کے مقاصد حسب ذیل ہیں: (۱) مسلمان خود ساختہ نسبی بتوں کو توڑ کر صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں (۲) مسلمانوں سے آپس کی فرقہ بندیاں دور ہو جائیں (۳) مسلمانوں میں تحصیلِ علم کا سچا شوق پیدا ہو جائے (۴) مسلمان اقتصادی و معاشرتی زندگی کا بہترین نمونہ بن جائیں (۵) مسلمان بیکاری کی زندگی کو چھوڑ کر محنت و مشقت کے عادی ہو جائیں۔" سالنامۂ زیرِ نظر کے مضامین سے مقاصد بالا کے حصول میں مدد مل سکتی ہے۔ بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں:۔ "خاندان پرستی"، "اسلامی مساوات پر ایک نظر"، "اچھوتوں کا مسئلہ اور سنتِ اسلامیہ کا نصب العین"، "اسلام اور طلاق"، "اسلام کا پیغامِ اخوت"، "صوفی اقبال"۔ حصۂ نظم میں غزلوں کی کثرت ہو، یہ ممکن ہے کہ کسی مصلحت پر مبنی ہو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزلوں کی اشاعت کس طرح مسلمانوں کی اصلاح میں معاون ہو سکتی ہے۔ ایک مشہور استاد کے چند شعر ملاحظہ ہوں، حیرت ہے کہ بیسویں صدی میں بھی ایسے اشعار لکھنے والے اور ان سے لطف اٹھانے والے موجود ہیں!۔

"جال زلفوں کا ہے بچھا دل پر  کیوں نظر بار بار جاتی ہے"
"بزم میں تیرے روئے روشن پر  جان پروانہ وار جاتی ہے"

## ادبِ لطیف لاہور

افسانہ نمبر ص ۱۴۲ تقطیع معیار، تصاویر اس کے علاوہ قیمت ۱۲ر

اس رسالے کو نکلے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ لیکن "ہمارے رنگوست از بہارش پیداست"۔ جنوری میں اس کے کارکنوں نے سالنامہ نکالا تھا، اور چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ افسانہ نمبر شائع کر دیا۔

افسانے تعداد میں ۱۳ ہیں، ان میں سے ۲ انگریزی سے ماخوذ ہیں اور ان کے مصنفوں کے نام بھی بتائے گئے ہیں۔ تین افسانوں کے متعلق یہ اعتراف تو کیا گیا ہے کہ دوسری زبانوں سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ لیکن مصنفوں کے نام بتانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی، ۷ افسانوں کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ طبع زاد ہیں۔ ان میں کم از کم ایک انگریزی سے ماخوذ ہے، اسلم صاحب نے ایک تمہید اپنی جانب سے بڑھا دی ہے، اصل نام بدل دیے ہیں۔ اور ایسی باتیں جو خاص انگریزی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں حذف کر دی ہیں، لوگ اسے سرقہ کہیں گے لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی کو اسلم صاحب پر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ کیا ہمارے یہاں ابتدا ہی سے یہ رسم جاری نہیں، کیا شاہ گلشن نے ولی دکنی کو یہ ہدایت نہیں کی تھی کہ ریختہ میں فارسی کے مضامین باندھو، اور کیا ہمارے

شعرا کا آج تک اس ہدایت پر عمل نہیں ہے؟ افسانہ نگاروں کے لیے ایک دوسرا معیار کیوں قائم کیا جائے؟ کلیہ بہت
کے علاوہ جو طبع زاد افسانے ہیں ان میں بحیثیت مجموعی "جس کا سلام" سب سے بہتر ہے۔ اگرچہ اس کا پلاٹ ذرا پامال سا ہے
تاہم یہ سب سے بہتر ہے۔ "جواری" جو ہندی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ڈکنس اگرچہ عہد کو دنیا کے برگزیدہ افسانہ نگاروں
میں ہے۔ لیکن اس کے مختصر افسانے چنداں بلند پایہ نہیں۔ سر کونن ڈوائل ایک خاص طرز افسانہ نویسی کے بانی ضرور ہیں اور
انہیں حیرت انگیز مقبولیت بھی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن جو سراغ رسانی کی بنیاد عقل نہیں۔ اس قسم کی سراغ رسانی اگر ہے
تو وہ اگر تھوڑی سی انگریزی میں ہے جو اوستن فریمین کے افسانوں کا جوہر ہے۔ ڈوائل کے بہت سے افسانے اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں
مترجمین کو اب فریمین وغیرہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ ناقدانہ مضامین میں ایک بہت دلچسپ ہے۔ اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ
شیخ سعدی دنیا کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ ایسی باتیں کسی رسالے میں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ لیکن ادب لطیف کے اڈیٹر
صاحب نے غضب کیا کہ اسی پرچے میں ایک کہانی "دنیا کی قدیم ترین کہانی" کے عنوان سے چھاپ دی اور ایک دوسرا مضمون شائع
کر دیا جس میں دنیا کے سب سے پہلے افسانہ نگار لقمان حکیم بتائے گئے ہیں۔ اڈیٹر صاحب کو اپنے مضمون نگاروں کی دل شکنی اس طرح
نہیں کرنی چاہیے۔ رسالے کی ظاہری حالت قابل تعریف ہے۔ لیکن طباعت کی غلطیاں کثرت سے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک صفحے
کے اغلاط ملاحظہ ہوں۔ ص ۴۰ "جسم کی عزت فاقوں کے ہاتھ نہ رک سکی" = روک "ہر چند اس نے حوصلہ کرنے کی لیکن دل تھا
= ؟" "بچی وہ چیزیں جو اس کی بے چینی کا باعث بنی ہوئی تھیں" = تھیں۔ "اتنے میں ٹن ٹن! برگھڑی نے کچھ بجا دیا جسے وہ پھر بھی
نہ سکی" = گن سکے گا۔ اس صفحے میں املا کے اغلاط کے علاوہ چار غلطیاں ہیں۔ اگر اوسط فی صفحہ ۲ بھی رکھا جائے تو اغلاط کی
تعداد ۲۰۰ ہوتی ہے۔ رسالے کا صحیح چھپوانا اگر ممکن نہیں تو غلط نامہ ہی شامل کر دیا ہوتا۔ پڑھنے میں اتنی الجھن تو نہ ہوتی۔ یہ سچ ہے
کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو غلط نامے کی صورت دیکھتے ہی بھڑک اٹھتے ہیں۔ لیکن سننے میں آیا ہے کہ اب اس کا علاج بآسانی ہو جاتا ہے۔

## دیدۂ حیرت

ایسے مقامات میں جو اردو کے مرکز سے دور ہیں مشاعروں کے منعقد کرنے سے کم از کم یہ فائدہ ضرور
ہوتا ہے کہ نئے لوگوں کو اردو سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے اور پرانے لوگوں کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ دیدۂ حیرت
ایک گلدستہ ہے جو ڈھاکے سے وقتاً فوقتاً جناب خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب ذبیح کی نیابت کی بدولت شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس میں خاص
ڈھاکے کے باشندوں کے کلام کے علاوہ ان بیرونیوں کا کلام بھی چھپتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے آج کل وہاں مقیم ہیں۔ ذیل میں ہم
ایک مشاعرے کی طرحی غزلوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں کہ ناظرین کو ڈھاکے کی زبان اور وہاں کی طرز گفتار کا اندازہ ہو سکے۔

| | | |
|---|---|---|
| غم نہیں مجھ کو وہ برا جانے | بیدار | گر اپنا ہی مبتلا جانے |
| کلمہ پڑھتے ہیں سب اسی بت کا | " | اس میں کیا بھید ہے خدا جانے |
| رام کرونگا وہ ہی باتوں میں | " | دیکھیے ان کو جب تک آ جانے |
| ترے اظہار شان قدرت ہے | ذبیح | نے جو تم ہو گئے خدا جانے |

انجمن ترقی اردو صوبۂ بہار کا ادبی رسالہ

# معیار

(بانکی پور، پٹنہ)

مرتب
قاضی عبدالودود

معاون
آرزو جلیلی

تصویر:- ڈاکٹر ابو الحلم نظام الدین پی ایچ ڈی صدر شعبۂ فارسی جامعۂ عثمانیہ

جلد ۱ شمارہ ۵، ۶ | جولائی، اگست ۱۹۳۶ء

## فہرست



محمد عظیم الدین پرنٹر اور پبلشر نے برقی پریس پٹنہ میں چھپوا کر دفتر معیار واقع انجمن اسلامیہ ہال بانکی پور سے شائع کیا۔

**معذرت** :- معیار کی پہلی جلد مکمل ہو گئی، اس میں ۴۴ مضمون کی کمی ہے جو اسی سال پوری کر دی جائیگی، ہمیں افسوس ہے کہ معیار ابتدائے اشاعت ہی سے وقت پر شائع نہیں ہو رہا ہے، ہم پوری کوشش کریں گے کہ ستمبر کا پرچہ ستمبر ہی میں نکل جائے اور آیندہ سے رسالہ ہر ماہ وقت مقررہ پر شائع ہوا کرے۔ ستمبر کا معیار ۱۱۲ صفحات کے بجائے ۲۰۰ صفحات پر شائع ہوگا۔

**شملہ کی برکھا** :- ہمیں افسوس ہے کہ کاتب کی غلطی سے جس کا علم پرچے کے تیار ہو جانے کے بعد ہوا، اس نظم کے بندوں کی ترتیب غلط ہو گئی۔ پانچویں بند "ہر ایک شکل پر نکال، دکھتی ہے ندرت میں کمال" کے بعد یہ بند درست ہے یعنی "یہ آتش و دھواں، یہ حیرت گنبد اے مرداں" لیکن اس کے بند ہائے ذیل ہونے چاہئیں چھٹا بند: "چھپتے ہوئے خرشید کی، اللہ ری جلوہ گری" ساتواں بند: "یہ سحر یا اعجاز ہے، یا اور کوئی راز ہے"۔ آٹھواں بند: "قدرت کی نادرہ کاریاں، کیا کیا کرے کوئی بیاں" ان بندوں کے بعد نواں بند: "نیلا ابھی تھا آسماں" دسواں بند: "لو پھر برس کر کھل گیا" گیارہواں بند: "کچھ طرہ والی بجلیاں" بارہواں بند: "چشم تماشا کے لیے"۔

**تصحیح** س ۵۔۳۰ چمن گل سے مدت میں معمور ہے = ندرت ص ۳۳۲ س ۱۰ اشنا زدہ = تلامذہ ص ۳۳۵ س ۱۱ کا آخری کی آخری س ۱۱ زمانے کی = زمانے کی قصابتیں ص ۳۳۶ س ۱ لے کر = لے لے کر ص ۲۲۰ س ۳ یقین = تعیین۔

**انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کی شاخ** ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ چھپرا ضلع پلاموں میں سید رضا قاسم صاحب اور دوسرے اصحاب کی کوششوں سے انجمن کی شاخ قائم ہوئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو مقامات بھی فوراً انجمنیں قائم کر کے صوبے کی مرکزی انجمن سے ملحق کرالیں گے۔

# معروضات

معیار نے اپنی زندگی کے چھ مہینے پورے کر لیے۔ معاصرین نے اس کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ نہایت حوصلہ افزا ہیں اور ہم اُن کے نہایت ممنون ہیں۔ بعض معاصرین نے معیار کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کے نقائص کی طرف بھی ہمیں توجہ دلائی ہے۔

ایک معاصر کو شکایت ہے کہ معیار کے اغلاطِ کتابت کی تصحیح کے لیے غلط نامہ شامل کیا جاتا ہے اور اغلاط کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کے متعلق ہماری گزارش یہ ہے کہ ہمیں اس کا افسوس ضرور ہے کہ معیار اتنا صحیح نہیں چھپتا جتنا ہم چاہتے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ اور رسالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں۔ ہم فخریہ نہیں لیکن بیان واقعہ کے طور پر کہنا چاہتے ہیں کہ اردو کے تین رسالوں کو چھوڑ کر معیار سب سے زیادہ صحیح چھپتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دوسرے رسالے غلطیوں کی تصحیح کے لیے غلط نامے نہیں شائع کرتے، اس لیے سرسری نظر سے پڑھنے والوں کو غلطیوں کا علم نہیں ہوتا۔ اپنی غلطی کا اعتراف اور اعلان اگر جرم ہے تو ہم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں۔

لاہور کے ایک انگریزی روزنامے کو معیار کی زبان پسند نہیں۔ اس کی دانست میں ثقیل عربی اور فارسی الفاظ معیار میں بہت استعمال ہوتے ہیں۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ اردو کے کسی رسالے یا اخبار نے معیار پر یہ اعتراض نہیں کیا۔ بظاہر اس روزنامے کا تبصرہ نگار اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جو اردو کی جگہ ہندوستانی کو رواج دینا چاہتی ہے، اور زبان سے سوا ان عربی اور فارسی الفاظ کے جو عوام کی زبان پر ہیں کل عربی فارسی الفاظ کو خارج کرنا چاہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صحیح و فصیح اردو نظم و نثر عربی فارسی کا ایک لفظ داخل کیے بغیر لکھی جا سکتی ہے لیکن یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ بغیر ان دونوں زبانوں کی مدد کے اردو میں سنجیدہ علمی اور ادبی مباحث پر ایک سطر لکھنا بھی ناممکن ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ عربی فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت کے اجنبی الفاظ استعمال کیے جائیں۔

ایک رسالہ جس نے معیار کی خوبیوں کی 'دل کھول کر' داد دی ہے یہ لکھتا ہے کہ بعض تبصروں میں تبصرہ نگارانِ معیار حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ مثال میں دیوانِ معروف کا تبصرہ پیش کیا گیا ہے جس کے آخر میں صفحے اغلاط کی تصحیح میں صرف ہو گئے ہیں۔ ہم اس رسالے کے فاضل مرتب کے نقطۂ نظر کا احترام کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ معروف ایک مستند استاد ہے جس کے کلام سے سند بھی دی جاتی ہے اور جس کے اشعار اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے بھی ناقابلِ التفات نہیں۔ ایسے شاعر کے کلام کی صحیح تصحیح بے دیدہ ریزی کے تو نہیں ہو سکتی، لیکن ان لوگوں کے لیے جن کے پاس مطبوعہ دیوان موجود ہے یا جو اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں ہرگز فائدے سے خالی نہیں اور یوں تو کتابوں کی تصحیح کیا، خود تمام کتابوں کے متعلق 'اناتول فرانس' کا قول ہے کہ کتابوں کے لکھنے سے کرم کلے کی کاشت کرنا زیادہ مفید ہے، اور اقبال کے نزدیک 'ذوقِ سخن' کارِ بیکاراں ہے۔

"جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے"
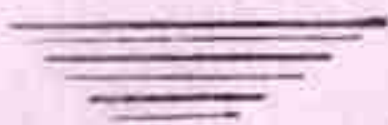
# تعارف

میر حسن کی مثنوی جو آگے شائع ہو رہی ہے اس کے ابتدائی اشعار جون کے پرچے میں چھاپے گئے ہیں۔ میر حسن نے چھوٹی بڑی دس مثنویاں لکھی ہیں ان میں چار اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ معیار کو تین مثنویوں کی اشاعت کا فخر حاصل ہوا ہے لیکن ان کی صحت کا انتظام جیسا چاہیے نہ ہو سکا۔ کلیات کا صرف ایک نسخہ ہمارے پاس تھا اور وہ بھی بہت غلط لکھا ہوا تصحیح کے لیے ہمیں مجبور محض قیاس پر بھروسا کرنا پڑا۔ کلیات حسن کے کئی قلمی نسخے ہندوستان میں موجود ہیں، کیا کوئی صاحب ان مثنویوں کی تصحیح کی طرف توجہ فرمائیں گے؟

طالب، سلیمان اور رقت کے اشعار دیوان صنعت سے ماخوذ ہیں، صنعت نے ان اشعار کی تضمین کی تھی، انہوں نے اس امر کی تصریح نہیں کی کہ یہ اشعار کن شاعروں کے ہیں، لیکن مقطعوں میں تخلص موجود ہیں اور قرائن کہتے ہیں کہ طالب محافظ طالب رام پوری ہیں، سلیمان شہزادہ سلیمان شکوہ اور رقت آقا سام علی شاگرد جرأت۔

سیخ آہنگ کے جس نسخے کا ہم تعارف کرا رہے ہیں وہ ہمارے خیال میں پہلا اڈیشن تھا، لیکن مضمون کی کتابت کے بعد ہمیں جمعیت پرشاد صاحب سے معلوم ہوا کہ اس سے قبل کا بھی ایک اڈیشن ہے اور اس قدر کمیاب ہے کہ خود جمعیت پرشاد صاحب کی نظر سے بھی نہیں گزرا ہے۔ اگر کسی صاحب کے علم میں اس کا کوئی نسخہ کہیں ہو تو براہ مہربانی ہمیں اطلاع دیں۔

آقا سہیانی نے عظیم آباد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی ایک قسط ابھی باقی ہے۔ انہوں نے فیض آباد، لکھنؤ، مرشدآباد وغیرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی قابل دید ہے۔

حکیم حبیب الرحمٰن خاں صاحب کے مضمون کی کتابت ہو چکی تھی کہ انہوں نے اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہا، معیار کی طرف سے جو نوٹ ہے وہ اسی وجہ سے ص ۲۴۳ کی بجائے ص ۲۴۹ کے آخر میں آگیا ہے۔ حکیم صاحب نے ان بہاری شعرا کی فہرست بھی بھیجی ہے جن کا کلام انہیں نتیجۂ سخن میں ملا ہے۔ یہ فہرست ستمبر کے معیار میں شائع ہو گی۔

ڈاکٹر ابو الحلم نظام الدین نے اپنا مضمون انگریزی میں لکھا تھا، ہم جناب بیدل کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر اس کا ترجمہ کر دیا۔

اندر سبھا کے متعلق جو مضمون ہے اس میں نام کے تذکرے کی عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں ایک جگہ یہ الفاظ آئے ہیں "مثنوی میر انیس"۔ ہماری رائے میں یہ کاتب کی غلطی ہے "مثنوی میر حسن" ہونا چاہیے۔

"کیتھرین پارک" اسی نام کی تمثیل کا ترجمہ ہے "عیاریاں" اور واسپی کے انگریزی نام "ٹرنڈ ٹرائی ٹیڈ" اور "دی مین ہو گیم بیک" ہیں۔

کلیم عجم کا تبصرہ بہت طویل ہو گیا، اس پر بھی تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ بہت سی باتیں لکھنے سے رہ گئیں۔

# یادِ رفتگاں

## میکسم گورکی

روس کے شہرۂ آفاق افسانہ نویس گورکی نے ۱۸ جون ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ اس کی پیدائش شہر نزنی نوگوروڈ میں ۲۸ مارچ ۱۸۶۸ء کو ہوئی۔ اس کا باپ رنگریز تھا۔ گورکی کے بچپن ہی میں اس کے والدین انتقال کر گئے۔ نو سال کے سن میں اس نے ایک جوتے کی دکان میں کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس نے باورچی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں تک جہاز پر کام کیا اور پھر مالی کا کام کرنے لگا۔ جب اس کا سن پندرہ سال کا ہوا، تو شہر قازان کے ایک اسکول میں اس نے نام لکھوایا۔ لیکن مجبوریوں کے باعث اسے اسکول سے علاحدہ ہوجانا پڑا۔ اب وہ نان بائی کا کام کرنے لگا۔
غرض گورکی نے ہمیشہ اسی قسم کی زندگی بسر کی۔ اسے باورچیوں، مالیوں، بھنگیوں، فقیروں، چوروں اور بدمعاشوں کے حالات پر غور کرنے کا کافی موقع ملا۔ گورکی نے اپنے ناولوں میں اسی قسم کے لوگوں کی زندگی کی مصوری کی ہے۔ اس نے اپنے کرداروں کے حالات اس فطری طریقے سے بیان کیے ہیں۔ اس کی تصانیف پڑھنے سے، روس کے گندے، بھنگیوں اور گنواروں کی زندگی کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

گورکی نے اس عہد میں جنم لیا جب روس میں ادبی اور سیاسی جد و جہد کا فقدان تھا۔ ترگنیف اور دستووسکی کے انتقال کے بعد روسی ادب کا میدان سنسان ہوگیا۔ یہ کیفیت جنگ روس و جاپان کے زمانے تک قائم رہی۔ اسی بے حسی کے عہد میں روس نے چیخوف اور گورکی جیسے ادیب پیدا کیے۔ چیخوف اور گورکی کے افسانوں میں بہت نمایاں فرق ہے۔ چیخوف نے متوسط طبقے کے حالات لکھے ہیں۔ اس کے کرداروں میں ہمیں عموماً طلبہ، اداروں کے اساتذہ، تجار، مجسٹریٹ اور حاکم وغیرہ نظر آئیں گے۔ اس نے روس کے عہد بے حسی کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس زمانے میں روسیوں کی یہ حالت تھی کہ انہیں کسی بات کی مطلق پروا نہ ہوتی تھی۔ ان کی بے حسی عروج پر تھی۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا۔ چیخوف کے افسانوں اور ڈراموں کے کردار، اسی قسم کے بے حس لوگ ہیں۔
گورکی کے افسانوں میں کچھ اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔ کشمکش حیات کے فطری مناظر، سماج کے باغیوں کا حوادث سے سربگریباں رہنا! گورکی، روسی افسانے میں ایک نئے طرز کا موجد ہے۔ اس نے روسی زندگی کے ایسے پہلو پر توجہ کی، جس پر اس کے قبل کے افسانہ نگاروں نے مطلقاً غور نہیں کیا تھا۔
اسی باعث، روسی ادب میں گورکی کی بہت زیادہ عظمت ہے۔
گورکی کا پہلا افسانہ: ماکر چندرا ( Makar Chudra ) جو رسالہ کو کاز ( Kavkaz ) میں

میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں وہ شہر طفلس کے ریلوے کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ گورکی کا اصل نام الکسی میکسیمووچ پیشکوو تھا۔ لیکن اس کا پہلا افسانہ "گورکی" کے نام سے شائع ہوا۔ اس نے اپنے افسانوں کے لیے یہی نام اختیار کرلیا تھا۔ آج تک وہ اسی نام سے مشہور رہے۔ ۱۸۹۵ء میں اس کا ایک افسانہ "چلکاش" شہر پیٹرس برگ کے ایک رسالے میں شائع ہوا۔ اس کے دو سال کے بعد اس کے مختصر افسانوں کا مجموعہ چھپا۔

گورکی کی ادبی زندگی دو دور میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلے دور میں ۱۸۹۹ء تک اس نے صرف مختصر افسانے لکھے۔ ۱۸۹۹ء سے اس نے ناول اور ڈرامے لکھنے شروع کیے۔ اپنے ناولوں میں اس نے روسی زندگی کے نقشے کھینچے اور معاشرتی مسائل سے بحث کی۔ ۱۹۰۵ء میں اس نے روس کی انقلابی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۰۶ء میں اس نے اٹلی کے ایک شہر کیپری میں سکونت اختیار کرلی۔ ۱۹۱۳ء میں وہ روس واپس آیا اور پیٹرس برگ سے ایک رسالہ "لی ٹوپس" نکالا۔ تندرستی خراب ہوجانے کی وجہ سے ۱۹۲۲ء میں اسے جرمنی جانا پڑا۔ اس کے بعد اس نے سارینٹو (اٹلی کا ایک شہر) میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

اس کے چند مشہور ناولوں کے نام یہ ہیں:۔ بے خانماں (۱۹۰۲ء) تین آدمی (۱۹۰۰ء) ماں (۱۹۰۷ء) ڈیکاڈونس (۱۹۲۵ء) مقناطیس (۱۹۳۱ء) اس کے اکثر ناولوں میں تعمیری خامیاں ہیں۔ لیکن اس نے روسی زندگی کی کامیاب تصویری کی ہے۔ اور اس کی ادبی عظمت محض ان خامیوں کی وجہ سے کم نہیں ہوسکتی مختصر افسانوں اور ناولوں کے مقابلے میں اس کے ڈرامے بالکل ناکام رہے۔ اس نے اپنے حالات زندگی کئی جلدوں میں لکھے ہیں اور ایک روزنامچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دونوں اس کی بہترین تصانیف میں ہیں۔

## ضمیر احمد عرش گیاوی

ہمیں یہ معلوم کرکے نہایت رنج ہوا کہ ماہ جولائی میں جناب عرش گیاوی کا انتقال ہوگیا ہمیں مرحوم کے پسماندوں سے دلی ہمدردی ہے۔ عرش مرحوم پرانی طرز کے خوشگوار کہنہ مشق شاعروں میں تھے، اور اس صوبے میں ان کا دم غنیمت تھا۔ نثر میں بھی رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے چند غزلیں شمشاد کو دکھائی تھیں اس کے بعد تسلیم کے شاگرد ہوگئے ان کی تصانیف سے حیات تسلیم، حیات مومن اور دیوان عرش شائع ہوچکے ہیں بعض کتابیں ابھی ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

| | |
|---|---|
| بے داغ الم دل میں بھیو لا نظر آیا | اس نخل میں پھول آنے سے پہلے ثمر آیا |
| اک چھیڑ نکالی وہیں پیکان ستم نے | کچھ دیر کو بھی دل کا جہاں زخم بھر آیا |
| جی ہی تو ہے اپنا جسے چاہا اسے چاہا | دل ہی تو ہے ظالم جدھر آیا ادھر آیا |
| اب رات نہیں صبح کے آثار ہیں ظاہر | بیدار ہو لے عرش کہ وقت سفر آیا |

## افسانے



# ایک ہونہار نوجوان

(از تماشائی)

میں جب ۱۹۳۲ء میں کیمبرج پہنچا تو وہ وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس کا دوسرا سال تھا اور میرا پہلا۔ کسی نے مجھے اس سے ملا دیا، اور اس نے مجھے ایک دن اپنے کالج لنچ پر بلایا۔ لنچ میں کچھ تکلف نہ تھا، وہی نفاست آمیز سادگی تھی جو کیمبرج کی زندگی کی جان ہے۔ میز پر شراب سپید کی ایک بوتل بھی تھی۔ قریب قریب پوری بوتل اسے خود ہی پینی پڑی، اس کے مہمان (تین بجز راوی) یا تو بالکل پیتے ہی نہ تھے، یا محض برائے نام۔ لنچ کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ برج کھیلا جائے جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ میزبان نے یہ کہہ کر کہ میری ان کی بار جیت نہیں، سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ اس نے کئی بار اپنے ساتھی سے اس بات کی معذرت کی کہ وہ شراب زیادہ پی گیا ہے، اور اچھی طرح نہیں کھیل سکتا۔ یہ معذرت مجھے اور میرے ساتھی کو قطعی غیر ضروری معلوم ہوئی، کیونکہ ہماری دانست میں اس نے نہ کبھی غلط کال دی اور نہ کبھی غلط پتا چلا۔ سات بجے شام کو کھیل موقوف ہوا تو میزبان اور اس کے ساتھی نے ہم دونوں سے سترہ سترہ شلنگ جیتے تھے۔ ہم دونوں نے جیب سے روپے نکال کر ادا کرنا چاہے۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ کل پھر کھیلیں گے، تم لوگوں کو انتقام کا موقع دینا چاہیے۔ آج تمہاری قسمت بڑی خراب تھی۔ یہ بات طے ہوئی کہ دوسرے دن غزنوی کے یہاں لنچ رہے اور لنچ کے بعد تاش کھیلا جائے۔ دوسرے دن بھی وہ اور غزنوی ایک ساتھ ہو گئے، اور قسمت پھر ہمارے خلاف رہی، دونوں دن ملا کر ہم دونوں نے تیس تیس شلنگ ہارے جو ہم نے فوراً ادا کر دیے۔

اس کے بعد سے برابر ملاقات ہوتی رہی۔ اس کا انداز مربیانہ تھا، لیکن وہ کوشش کرتا تھا کہ یہ بات ظاہر نہ ہونے پائے۔ اس نے وہی مضمون لے رکھا تھا جو میں نے لیا تھا، وہ مجھے مشورے دیتا کہ کن لکچروں میں شریک ہوں، کن لکچروں میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں، کن سوسائٹیوں کا ممبر ہوں، لندن جاؤں تو کہاں قیام کروں، کس درزی سے کپڑے سلواؤں، کہاں جوتے بنواؤں۔ میں جوانانِ سعادت مند کی طرح اس "پیر دانا" کی باتیں سن لیا کرتا تھا۔ حالانکہ عمر میں وہ مجھ سے سال دو سال کم ہی ہوگا۔

کیمبرج میں مجھے رہتے ہوئے جب کچھ دن ہو گئے اور ملاقاتوں کا دائرہ وسیع ہو گیا تو وہ لوگ جو اپنے کو مردم شناس سمجھتے ہیں، اس کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔ ایک صاحب مدتوں سے کیمبرج میں مقیم تھے، اس وقت تک کوئی امتحان انہوں نے نہیں پاس کیا تھا، جب ان سے کوئی ہمدرد اس بارے میں کچھ کہتا تو وہ پوپ کا مصرع پڑھ دیتے: "دی پراپر اسٹڈی آف مین از مین کائنڈ" اور کہتے "آپ کو کیا معلوم کہ میں نے اتنے دنوں میں کیا کچھ سیکھا ہے، امتحان پاس کر لینا کوئی بڑی بات نہیں، اصل چیز مردم شناسی ہے"۔ وہ اس کی رائے میں پرلے سرے کا، خود غرض، کینہ ور اور اسنوب تھا۔ اور اس سے زیادہ اتحاد خطرے سے خالی نہیں۔

"تم نے کبھی اسے ڈسلوا کے ساتھ بھی دیکھا ہے؟ اس کے ساتھ ٹہلتا ہے تو واقعی اس کا قد انچ دو انچ بڑھ جاتا ہے۔ اور ڈسلوا ہے کہ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا۔ میاں ورما اگر وہ گالیاں بھی دے تو شیر مادر سمجھ کر پی لینے کے لیے تیار ہیں۔ اور یہ سب اس لیے کہ وہ ارگنگ بلو ہے۔ انگلینڈ سے ورما کی ملاقات نہ تھی۔ ادھر اس کا آئی سی ایس میں کامیاب ہونا تھا۔ اور ورما کو علم ہوا کہ وہ تیرے ہی صوبے میں جانے والا ہے۔ اس نے اس سے جس طرح ممکن ہوا ملاقات پیدا کی اور خاطر مدارات سے اس قدر راضی کر لیا کہ اس کا سب سے بڑا دوست ہو گیا ہے۔ ایک بار کا تمہیں واقعہ سناؤں۔ انگلینڈ وہ ایک دن کے لیے لندن گیا۔ وہاں جا کر بیمار پڑ گیا۔ ورما ہر دوسرے تیسرے روز اسے لندن دیکھنے جایا کرتا تھا اور جب نہ جاتا خیریت کے لیے جوابی تار دیتا۔ مجلس میں سب لوگوں کے سامنے داؤدیا نے اسے جس بری طرح ڈانٹا ہے۔ تم نے بچشم خود دیکھا ہوگا۔"

داؤدیا ایک پارسی لڑکا تھا جو بڑے ٹھاٹھ سے رہا کرتا تھا۔ جس واقعے کی طرف شرما نے اشارہ کیا تھا، اس کا شاہد میں بھی تھا۔ اس کا محل وقوع لانبیر ہوٹل تھا جہاں اس زمانے میں انڈین مجلس کے ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے۔ ابھی باقاعدہ کارروائی نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ پریزیڈنٹ کی کرسی کے پیچھے داؤدیا، کوسٹیلو، غزنوی وغیرہ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ورما اندر آیا۔ سب سے پہلے تپاک سے وہ داؤدیا سے مخاطب ہوا اور بے تکلفانہ انداز میں "ہلو کیکی" کہا۔ کیکی، داؤدیا کا پہلا نام تھا جس کی سوا اس کے خاص احباب کے کسی کو خبر نہ تھی۔ یہ سننا تھا کہ داؤدیا نے نہایت غضب ناک ہو کر پوچھا: "سنس وھن ہیو آئی گون یو دی رائٹ ٹو کال می بائی مائی فرسٹ نیم؟" (کب سے میں نے تمہیں اس بات کا حق دیا ہے کہ تم میرا پہلا نام لے کر مجھے پکارو؟) ورما تو بالکل ہکا بکا ہو گیا۔ ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ لیکن کوسٹیلو کو جو داؤدیا کا سب سے بڑا دوست تھا۔ یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ اور اس نے داؤدیا سے کہا: "میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے اجازت کی ضرورت ہے۔ تمہارے بغل میں بیٹھنے کے لیے تو پہلے سے اجازت کی ضرورت نہیں؟ آؤ ورما، ادھر بیٹھو" کوسٹیلو داؤدیا کے بغل میں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی جگہ خالی کر دی، اور ورما کو زبردستی وہاں پر بٹھایا۔ اس واقعے کے بہت دن بعد جب میں داؤدیا سے بے تکلف ہو گیا تو اس کے واقعے کا میں نے ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ "میں اب بھی جب اسے یاد کرتا ہوں تو مجھے شرم آتی ہے۔ کوسٹیلو کی خفگی بجا تھی۔ لیکن میرا غصہ بھی بے سبب نہ تھا۔ تم جانتے ہو کہ ساری دولت میرے والد کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ان کا بچپن اور جوانی بڑی تنگ دستی میں کٹی ہے۔ انہوں نے میری تربیت خاص طور پر کی ہے۔ وہ بچپن ہی سے میرے کان میں یہ بات ڈالتے رہے ہیں کہ ان لوگوں کی قدر کروں جو بے غرض مجھ سے ملتے ہیں۔ اور غرض والوں کی دوستی پر بھروسا نہ کروں۔ ان کی یہ نصیحت رہی ہے کہ خوش آمد ہرگز بے وجہ نہیں ہوتی۔ اور ضرورت سے زیادہ خوش اخلاقی ڈرنے کی چیز ہے۔"

"ال نے ترو پولی پو راتے تونیت" (جو ضرورت سے زیادہ خوش اخلاق ہے وہ ایماندار نہیں ہو سکتا) میں نے ایک فرانسیسی مقولہ اسے یاد دلایا۔

"یہ کس کا قول ہے؟ میرے دل کی بات چھین لی۔"

"مجھے مصنف کا نام یاد نہیں۔" "لیکن کیا تمہارا پہلا نام لے کر پکارنا بڑی خوش اخلاقی کی بات ہے؟"

واقعہ تو سنو! یہ تو اونٹ کی پیٹھ پر آخری اسٹرا تھا، ورما سے مجھ سے زیادہ ملاقات نہ تھی، سوا صاحب سلامت کے کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ ایک دن بڑے اصرار سے اس نے مجھے لنچ پر بلایا، مجھے انکار کی کوئی صورت نظر نہ آئی، میں نے قبول کر لیا۔ جس دن اس نے مجھے بلایا تھا، صبح ہی سے بڑی برف باری ہو رہی تھی۔ جی میں آیا کہ گھر سے باہر نہ نکلے، لیکن بادلِ ناخواستہ نکلنا ہی پڑا۔ میں نے اس کے یہاں پہنچ کر گھنٹی بجائی، لینڈ لیڈی کے بجائے خود ورما نے دروازہ کھولا، میرا اوورکوٹ اتار کر کھونٹی پر رکھا، اور کمرے میں لیجا کر سب سے آرام دہ کرسی پر آگ کے سامنے مجھے بٹھایا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے اور لوگوں کو بھی بلایا ہوگا۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے کھانا لانے کا حکم دیا۔ کھانا آیا۔ اتنا کھانا اور ایسا کھانا کیمبرج میں تو مجھے کبھی کسی نے نہیں کھلایا تھا، اس پر طرہ یہ کہ شیمپین کی بھی ایک بوتل تھی۔

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "سم پیپل ہیو آل دی لک ان دی ورلڈ"۔ (کچھ لوگ قسمت کے بڑے دھنی ہوتے ہیں)

"جی ہاں: دن کا وقت اور شیمپین! میں نے بہت منع کیا کہ نہ کھولو، ورما، اور مجھے بھی اس کی خاطر سے تھوڑی سی پینی پڑی۔ لیکن تم یقین کرو کہ شیمپین اور لنچ کی اس کی گفتگو کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ تعجب نہیں کہ اسے سن کر میرا وزن بڑھ گیا ہو۔ خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا، لیکن جب گفتگو میں بار بار یہ جملہ آنے لگا کہ "یو آر دی اونلی فرینڈ آئی ہیو"۔ ممکن ہے کہ یہ شیمپین کا اثر ہو، لیکن میں بھی تو آخر آدمی ہوں۔ اس کا برداشت کرنا میری طاقت سے باہر تھا، اور قہوے کی پیالی ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس سے رخصت ہو کر چلا آیا، اجازت اس نے بڑی مشکل سے دی تھی، لیکن میری طبیعت کا اندازہ یہ تھا کہ اگر وہ اجازت نہ بھی دیتا تو اسے میں چھوڑ کر چلا آتا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں اسے اپنے یہاں بلاتا، لیکن بلانا تو بڑی بات ہے اس کے سلام کا جواب بھی بڑی رکھائی سے دیا کرتا تھا، اس کے بعد اس کا اس قدر بے تکلف ہونا میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھے نہایت ناگوار معلوم ہوا، اور مجھ سے وہ حماقت سرزد ہوئی جس پر اب تک شرمندہ ہوں"۔

ورما کی حمایت کرتے ہوئے میں نے شرما کو یہ جواب دیا: "آخر تمہارا اعتراض کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ورما کی دوستیوں میں خود غرضی کا پہلو شامل ہوتا ہے اور ان کی بنیاد اتحادِ ذوق پر نہیں، یہ کوئی بڑی بات نہیں، آگے چل کر تم، ہم سب یہی کریں گے، ورما اگر سچ پوچھو تو قابلِ مبارکباد ہے کہ اسے اس کم سنی ہی میں یہ معلوم ہو گیا کہ دو چڑیوں کا شکار ایک ہی پتھر سے ہو سکتا ہے، دوستی کو اگر اپنے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جائے تو اس میں کیا مضائقہ کیا ہے؟ یہ انسانوں کی عام کمزوری ہے"۔

شرما کی نصیحت کے باوجود میں ورما سے ملتا رہا۔ اس نے وقتاً فوقتاً مجھ سے روپے بھی قرض لیے اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا۔ زمانہ جوں جوں گزرتا گیا مجھے بھی اس کا احساس ہوتا گیا کہ ورما بد دیانت نہیں، لیکن پرلے سرے کا کائیاں اور خود غرض ضرور ہے۔ ایک بار تعطیل میں قطعی فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ حلیم اور میرے ساتھ ایسٹ بورن چلے گا لیکن عین وقت پر اس نے آ کر کہا کہ "میں سوئٹزرلینڈ جا رہا ہوں"۔ اس سے میں نے لاکھ کہا کہ میں تم سے اور حلیم سے ایسٹ بورن جانے کا وعدہ کر چکا ہوں لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے جرم کے استخفاف میں یہ دلیل پیش کی: "تم جانتے ہو انگریز نواب جا رہا ہے اور مجھ پر شفقت کرتا ہے، اس کی دوستی میرے لیے بڑی مفید ہوگی

میں جانتا ہوں کہ تمہارا اور حلیم کا مجھ پر زیادہ حق ہے، لیکن کیا کروں مجبور ہوں"۔ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ سہی، لیکن اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ میرا اس کا ساتھ لندن میں بھی رہا۔ پہلی بار جو میں اس کے ساتھ تھیٹر گیا، تو میرا ٹکٹ بھی اسی نے خرید لیا دوسری بار میں اسے اپنے خرچ سے تھیٹر لے گیا۔ تیسرے مرتبہ، اس نے ٹکٹ خریدنے کی آمادگی تو ظاہر کی، لیکن اس کا ہاتھ جیب کی طرف اتنا آہستہ آہستہ جا رہا تھا، کہ سنیما کی سلو موشن پکچرز کا لطف آ رہا تھا، جب تک وہ بٹوا نکالے میں نے ٹکٹ خرید لی تھی۔ چوتھی بار غلطی سے وہ بٹوا گھر ہی بھول آیا تھا۔ پانچویں مرتبہ جو اس نے تھیٹر ساتھ چلنے کی تحریک کی تو میں نے کہہ دیا کہ میرے پاس کافی روپے نہیں" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "تم بہت تکلف کرتے ہو، تمہارے پاس نہیں ہیں تو کیا ہوا، میرے پاس تو ہیں"۔

ورما کو کیمبرج سے ڈگری مل گئی، لیکن قانون کے امتحان باقی تھے۔ اس نے کہا تھا کہ دو برس اور رہوں گا، لیکن اس نے امتحان جلد ختم کر لیے اور ایک برس کے اندر ہی ہندوستان واپس چلا گیا۔ اس کو پانچ چھ مہینے گزرے تھے کہ ایک دن پکیڈلی میں شرما سے ملاقات ہوئی۔ وہ سمتھ کی دکان سے باہر نکل رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، جو بعد میں معلوم ہوا کہ پیرانڈیلو کے ڈراموں کا انگریزی ترجمہ ہے۔ شرما مجھے پکیڈلی ہی کے کسی قہوہ خانے میں لے گیا، اور ملازمہ کو قہوہ لانے کا حکم دینے کے بعد یوں گویا ہوا:۔

"تمہیں ورما کا آخری کارنامہ بھی معلوم ہے؟" میں نے جواب دیا کہ ہندوستان جاتے وقت وہ مجھ سے ملا بھی نہیں۔ شرما نے دریافت کیا کہ میرے روپے تو اس کے ذمہ نہیں نکلتے تھے۔ یہ صاف بات تھی کہ شرما کو ورما کی ایمانداری میں شک تھا۔ اور میں نے اس کے شک کو دور کرنے کی کوشش کی۔

"یہ بات نہیں۔ ورما میں اور جو کچھ برائیاں ہوں، وہ بد معاملہ نہ تھا۔ مجھ سے اس نے بارہا قرض لیا، اور ہر بار وقت سے پہلے ادا کر دیا۔"

"تم نے کبھی انگریزوں کا یہ مقولہ بھی سنا ہے؟ 'آنسٹی از دی بسٹ پالیسی'۔ ایمانداری کسی اخلاقی اصول پر مبنی تھی، وہ محض اپنی ساکھ قائم کر رہا تھا کہ بعد میں اچھی طرح اٹھانے کا موقع ملے۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ چلنے کے وقت کیمبرج کے مختلف دکانداروں سے اس نے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ کی چیزیں خریدیں، اور ایک پیسا ادا کیے بغیر، ہندوستان روانہ ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسے موقع ملا ہوگا تو اس نے لندن کے دو چار دکانداروں کو بھی چرکے دیے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی دکانداروں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ قرض کا بیوہار نہ کیا جائے۔ مجھے یہ بات چھ سات روز ہوئے پیل ہائیڈ، ایمیز کے یہاں معلوم ہوئی۔ میں نے وہاں پندرہ سولہ شلنگ کی ٹائیاں اور موزے خریدے تھے اور تین قمیصوں کا آرڈر دیا تھا، وہیں نے میرا آرڈر تو لکھ لیا، لیکن منیجر اوسے کہنے لگا کہ "قیمت آپ ابھی وقت ادا کریں گے یا جس وقت چیزیں آپ کے یہاں پہنچ جائیں گی؟" میں نے کہا کہ "میں کوئی نیا خریدار تو ہوں نہیں، آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" میری آواز ذرا بلند ہو گئی تھی، منیجر قریب ہی تھا، وہ اور قریب آ گیا، اور اس نے مجھ کو کہا کہ "مسٹر شرما ذرا تکلیف کر کے آپ میرے آفس میں چلیں"۔ میں منیجر سے اچھی طرح واقف تھا، اس کے ساتھ آفس میں گیا تو اس نے ورما کا قصہ بیان کیا۔ ورما تین برس مسلسل اس دکان سے چیزیں خریدتا رہا، اور کبھی اس نے بل کے ادا کرنے میں ایک دن کی بھی دیر کی

کیمبرج سے ڈگری لینے کے بعد اس نے ان لوگوں کو کہہ دیا تھا کہ ابھی قانون کے امتحانات میں شریک ہونا ہے، کیمبرج میں ابھی دو سال قیام اور رہیگا، باوجود اس کے کہ اب یونیورسٹی کا ممبر نہ تھا، اس کا اعتبار اتنا تھا کہ یہ لوگ برابر اسے ادھار دیتے رہے، جانے سے قبل ورما نے تیس پونڈ کی چیزیں کچھ بنوائیں اور کچھ بنی بنائی مول لیں - بل جب اس کے مکان پر بھیجا گیا تو لینڈ لیڈی سے معلوم ہوا کہ ورما ہندوستان چلے گئے ہیں۔ ورما کے بتائے ہوئے پتے سے اس وقت تک تین چار خط بھیجے جا چکے ہیں، لیکن وہ خط اس وقت تک واپس آ چکے ہیں، ڈاکخانے والوں کو مکتوب الیہ کا پتا نہیں ملتا۔ میں نے خود رجسٹر منگوا کر دیکھا، ورما نے رہتک کا پتا دیا تھا، حالانکہ رہتک سے اس کو کوئی تعلق نہیں، میں نے منیجر سے کہا کہ تم حق بجانب ہو اور آج سے میں تو عہد کرتا ہوں کہ بھولے سے بھی کسی دکان سے کوئی چیز ادھار نہ منگواؤنگا، منیجر نے مجھ سے بہت معذرت کی اور یہ کہا کہ میرا حکم آپ کے لیے نہیں، آپ دکان سے حسب دستور چیزیں منگوا سکتے ہیں، لیکن میں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھانا منظور نہ کیا، اس کے بعد تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہارڈ وک، پلنڈ بیچ، بیز، ایڈمس، تھرسل، ٹوکسٹر، ہنفرا سمتھ سب کے ساتھ ورما نے یہی سلوک کیا ہے، ان کے علاوہ اور دکانداروں کو بھی اس نے ڈبویا ہے، کہاں تک سب کا نام لوں، میری تحقیقات ابھی مکمل نہیں، ہنفرا کا تو ابھی پتا چلا ہے، اب آپ فرمائیں کہ ورما کی ایمانداری کے متعلق، آپ کی کیا رائے ہے"؟

میں نے ایک لمبا چوڑا خط ورما کو لکھا، ورما نے فوراً جواب دیا جو ذیل میں درج ہے۔ بعض فقرے حذف کر دیے گئے ہیں:-

"تمہاری شکایت بجا ہے، ہندوستان 'جنت نشان' (جو لوگ اسے جنت نشان کہتے ہیں، میں ان کے تخیل کی عسرت پر حیران ہوں) کی فضا اور ہی ہے، جسمانی اور ذہنی دونوں حیثیت سے یہاں آ کر انسان بالکل کاہل ہو جاتا ہے، ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور حوصلے پست ہو جاتے ہیں، تم میرے والد صاحب سے نہیں ملے، بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، لیکن ذرا سی کسر ہے کہ قوت تخیلہ سے بالکل محروم ہیں۔ انہوں نے میری تعلیم میں پچیس تیس ہزار روپے صرف کیے، واپسی پر قانون کی کتابیں منگوا دیں، اور ہائی کورٹ میں داخل کرا دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ محض میری وجہ سے لاہور میں قیام اختیار کیا، اس کے بعد انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کی ذمہ داری ختم ہو گئی، اور میں چھ مہینے کے اندر شادی لال، شفیع یا فضل حسین نہ بن جاؤں تو یہ میرا قصور ہے۔ تفصیل کہاں تک لکھوں، مختصر یہ ہے اگر والدہ صاحبہ کی مہربانی نہ ہوتی تو ورما کو عبداللہ کے بدلے کیپی سگرٹ پینے پڑتے اور کلب کا خرچ نکالنا تو قطعاً ناممکن ہوتا سن چکے میری داستان! پھر بھی شکایت کرو گے کہ میں نے خط نہیں لکھا؟

اب اپنی اور شکایتوں کا جواب سنو:- دکانداروں کو دھوکا دینے کی میری نیت نہ تھی، جس وقت چیزوں کا میں نے آرڈر دیا بینک میں میرے ڈیڑھ سو پونڈ سے زیادہ موجود تھے، ایک تو والد صاحب ہی نے سفر کے اخراجات کے لیے کافی روپے بھیجے تھے دوسرے یہ کہ میں نے والدہ صاحبہ کو لکھ کر اور روپے منگوائے تھے، کیمبرج سے روانہ ہونے سے ایک دن قبل میں نے لائیڈز بینک سے کل روپے نکال لیے اور اپنا کھاتا بند کرا دیا، ارادہ تھا کہ دکانداروں کے روپے اسی وقت جا کر ادا کر دوں، لیکن گھڑی دیکھی تو یہ معلوم ہوا کہ لنچ کا وقت آ گیا ہے، میں نے اس کو تیسرے پہر کے لیے اٹھا رکھا، اور بس پر سوار ہو کر چیری ہنٹن روڈ پہنچا - گھر آ کر جو دیکھتا

# واپسی

از ولیم گرہارڈی — مترجمہ محمد ادیب صاحب.

مجھے جس عورت نے چائے پر بلایا تھا وہ نہایت حسین تھی لیکن مجھے افسوس کے ساتھ اس بات کو ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس کے باپ کے سامنے، اس کی تصویر جو میرے ذہن میں ہے بالکل ماند پڑ گئی ہے، اس کا باپ غضب کا ذہین تھا، اور اس کا دماغ بڑی سرعت کے ساتھ کام کرتا تھا، یہ لوگ ایک سفید رنگ کے مکان (ولا) میں رہتے تھے، جو خاکنائے کے دوسرے کنارے پر سمندر سے قریب پائن کے جنگل کے درمیان تھا، ٹاؤن سے وہاں پہنچنے میں کشتی کے ذریعے آدھ گھنٹا صرف ہوتا تھا.

وہ میرے آنے کے دو ہی ایک لمحے کے بعد آیا، وہ نہایت ضعیف اور بیمار تھا، اس کی مونچھ نیچے کی جانب جھکی ہوئی تھی، زیر پائیاں جو خواب گاہ کے لیے مخصوص ہیں اس کے پاؤں میں تھیں اور اس کا گدی دار جیکٹ گلے تک بند تھا.

یہ معلوم کرکے کہ میں ناول لکھتا ہوں اس نے خوش اخلاقی سے ادبیات کے متعلق گفتگو کرنا ضروری سمجھا، وہ اپنی معلومات کا اظہار بڑے تکلف کے ساتھ کر رہا تھا، نہ اسے کوئی چیز روک سکتی تھی اور نہ کوئی اس کی گفتگو میں مداخلت کر سکتا تھا. اس کی بی بی بھی شاعرہ ہونے کی مدعی تھی، اس نے کئی بار اس بات کی قابل رحم کوشش کی کہ مجھے اپنے متعلق اخبارات کی حوصلہ افزا رائیں دکھائے، لیکن بالکل بے سود، بڈھے کو بہت کچھ کہنا تھا، اور ایک ذوق ادب رکھنے والے مہمان کے سامنے اپنی واقفیت کی نمائش کا جو موقع اسے ملا تھا، اُسے اپنی بی بی کی خود نمائی کی خاطر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا. اس کی بی بی کے اشعار، جیسا کہ اس نے مجھے بتایا، محض ادنیٰ درجے کے تھے، وہ بہت سخت بیمار تھا، اور ہر شخص دیکھ سکتا تھا کہ بولنا، اس کے لیے تکلیف دہ تھا، لیکن اس کے باوجود خاموش رہنا اس کے لیے ناممکن تھا، اس کے مصنوعی دانت اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر کہتا تھا: "معاف کیجیے گا، میں ذرا لیٹ رہوں، میں ذرا ٹھیک ہو جاؤں گا": اس کی بی بی ایسے ہی موقع پر کود پڑتی تھی، اور اپنی نظموں کا ذکر کرنے لگتی تھی لیکن زیادہ دیر کے لیے نہیں بڈھا صوفے پر اپنے پاؤں کو سمیٹ کر بیٹھ گیا، اور پھر سلسلۂ گفتگو شروع ہو گیا. عہد الیزبتھ کا دور اشاعت جس کا میں دلدادہ ہوں ۔۔ اس کا علم حیرت انگیز تھا، اس کے علم کی وسعت کل ممالک پر حاوی تھی اور بالکل ابتدائی زمانے سے شروع ہو کر موجودہ زمانے پر ختم ہوتی تھی، انگریزی ادب میں چاؤسر کے وقت سے ڈیوڈ گارنٹ کے وقت تک کے مصنفین سے اسے واقفیت تھی، غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ انگریزی ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا. پڑھنے میں وہ ایک ایک لفظ سمجھ لیتا تھا، لیکن انگریزی الفاظ کا تلفظ اس کے لیے مشکل تھا، اگر احیاناً کوئی لفظ اس کی زبان پر آتا تو اس کا تلفظ غلط ہوتا تھا اس کا علم مجھے نہایت صحیح اور اس کی ناقدانہ رائیں منصفانہ معلوم ہوئیں، ہاں یہ ضرور تھا کہ مواد

کی زود ادائی کی وجہ سے وہ کسی مصنف کے کمالات ذاتی کے متعلق اظہار رائے کی بجائے یہ پتا چلانے کی کوشش کرتا تھا کہ اس پر کس کس کا اثر ہوا ہے۔

صوفیانہ شاعری کا ذکر آیا۔ تو میں نے اس کی رائے بقائے روح کے متعلق دریافت کی۔ وہ رک گیا جب سے وہ بیچ پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھا تھا، اس سے پہلے وہ ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں ہوا تھا۔ اس کی بی بی نے تیور لے ہی کہا کہ "میں نے اپنی نظموں میں کوشش کی ہے......" لیکن بڈھے کے جوش و خروش نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ "نہیں میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ اس قدر مشقت سے جمع کی ہوئی علمی پونجی میرے مرجانے کے بعد خاک میں مل جائیگی۔ میں نے نہ تو کوئی کتاب لکھی ہے اور نہ کبھی ان کے متعلق کوئی لکچر دیا ہے۔ میری عمر ملازمت میں گزری ہے (وہ فرانسیسی کونسل برس میں رہا تھا) اور مجھے شاذ و نادر ہی ایسے ذہین لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جو میرے علم سے مستفید ہو سکتے۔ مجھے ایسے مواقع بھی کم ملے کہ میں اپنا علم دوسروں کے سامنے ظاہر کرتا، اس علمی سرمایہ کا ایک لفظ بھی میرے بعد نہ بچیگا اور اگرچہ مجھے اس کا صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر نوشتہ قدرت کے مقابلے میں سوائے سر جھکانے کے چارہ ہی کیا ہے۔ اس پر بھی میں کتب بینی سے باز نہیں آتا۔ میں پڑھتا اس لیے ہوں کہ میں علم کا پیاسا ہوں، اور اس تشنگی میں میرے لیے یہی ایک واحد ذریعہ تفریح ہے باوجودیکہ میری موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، میں پڑھتے جاتا ہوں، بلکہ یہ معلوم کر کے کہ میری زندگی اب تھوڑی ہے میں اور زیادہ کتب بینی کرتا ہوں، انتہائی عجلت کے ساتھ مجھ سے ان باتوں سے آگاہی حاصل کرنی ہے جن سے میں اب تک نابلد ہوں، سوتے سوتے وقت تک پڑھتا رہتا ہوں، صبح کو اٹھنے کے ساتھ ہی پڑھنے میں مشغول ہو جاتا ہوں اور دن بھر پڑھا کرتا ہوں، کبھی کبھی میں اپنے آپ سے یہ سوال بھی کرتا ہوں کہ اب جب کہ میں سال دو سال سے زیادہ جی نہیں سکتا کیا کتابوں کے مطالعے سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے؟"

ایک برس کے بعد جب میں اس سے پھر ملا تو، اتنا بیمار تھا کہ بیٹھے بیٹھے بات چیت نہیں کر سکتا تھا، اور اس نے مجھ سے اجازت چاہی کہ لیٹے ہی لیٹے گفتگو کرے۔ دوران گفتگو میں وہ کبھی کبھی یکایک قلب پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور چپ چاپ ہو جایا کرتا تھا، افاقے کے بعد پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کرتا۔ "کومیڈی آف ہیومرس (زود افسانہ نویسی وقوف ... تھی، لیکن یہ خیال کہ سیرت کی انفرادیت اعادے سے نمایاں ہو جاتی ہے، بلاشبہ صحیح تھا، اور جونسن کے سے وقت پسند مصنف جانتے تھے کہ محض کسی بات کے دہرانے سے نازک خصوصیات بھی ظاہر کی جا سکتی ہیں۔"

"اب تم سنتا، میں ہندوؤں کی ایک نظم کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے سناؤں گی، مجھے یقین ہے کہ مسٹر...... لیکن وہ بولتا ہی رہا "شیلی کی شاعری کا موضوع مابعد الطبیعیات ہے، لیکن میں فرانسس ٹومسن کے ہونڈ آف ہیون (آسمان کا شکاری کتا) کو میں صوفیانہ نظم سمجھتا ہوں" اور اسپنسر کی فیری کوئین (پریوں کی ملکہ...) اس نے اپنے

قلب پر ہاتھ رکھا اور دس منٹ تک خاموش رہا۔ جب اسے افاقہ ہوا تو اپنی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:
میرا کتب خانہ مکمل ہے۔ یہ خیال کر کے بڑی اذیت ہوتی ہے کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گا۔ ابھی ایسی کتابیں بھی ہیں
جو میں نے اب تک نہیں پڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں رات دن پڑھتا رہتا ہوں۔ مجھے وقت کا مقابلہ کرنا ہے۔ آپ کہہ
سکتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی ہوس ہے۔ لیکن یہ خیال کہ میں ایسی کتابیں چھوڑ جاؤں جو میری نظر سے نہیں گزری ہیں میرے
لئے ناقابل برداشت ہے۔ کتابیں میری نظر میں انسانوں کی طرح ہیں۔" اس نے اپنے مصنوعی دانتوں کو جو کسی سرکش
بڑیا کی طرح جسے کسی نے پنجرے میں بند کر رکھا ہو، ہر وقت باہر نکلتے آتے تھے، بڑی کوشش سے درست کیا۔ اور پھر گویا ہوا
"اگر ہماری روح موت کے بعد باقی رہتی ہے، تو میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنا بہشت اپنے دل کی خواہش کے مطابق
بنانے کا موقع دیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو میرے بہشت میں بڑے بڑے ہوادار کمرے ہونگے۔ جہاں بے شمار کتابیں ہوں گی،
ان گنت کتب خانے۔ جہاں میں ہمیشہ کتابیں پڑھتا رہوں اور تنگی وقت کی بھی شکایت نہ ہو۔"

"لیکن کس قسم کی کتابیں؛ نئی کتابیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں، بہت سی کتابیں ابھی ایسی ہیں جنہیں میں مرنے سے قبل ختم نہیں کر سکتا، وقت قریب آتا جاتا ہے۔"

میں رخصت ہو رہا تھا کہ اس نے میز پر جو پارسل رکھا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"فارسی شاعری۔"

"اچھی کتابیں ہیں؟"

"ابھی تک پارسل کھلا نہیں، پھر ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔"

اس کے بعد جو میں گیا تو رات کا وقت تھا۔ ہفتہ پڑ رہا تھا (میرے چند دوستوں نے جو خاکنائے پر مقیم تھے مجھے مدعو کیا تھا
دعوت کی تاریخ مجھے غلط یاد تھی اور وہ آخری گاڑی جو قصبہ تو جاتی تھی چھوٹ گئی تھی) ملازم نے کہا کہ بیبیاں ٹھہر کو گئی ہیں اور
غالباً آدھی رات سے پہلے واپس نہیں آئیں گی۔ میں کتب خانے میں ان کے انتظار میں ایک کتاب نکال کر پڑھنے
لگا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مجھے قدموں کی آہٹ نے چونکا دیا، یہ اُنسے والا وہی بڈھا تھا جو وہی لباس پہنے تھا جس
میں پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا، چاندنی کی روشنی میں جو برآمدے کے شیشوں سے گزر کر اندر آرہی تھی یہ ضعیف شخص بھوت
کی طرح سفید معلوم ہو رہا تھا۔ یہ اپنی خواب گاہ سے کتب خانے میں کوئی کتاب لینے آیا تھا میں کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی ٹھہر کر
مجھے دیکھنے لگا۔ بعد ازاں الماری کی طرف جا کر اس نے دو بڑی بڑی جلدیں نکال لیں۔ اور پھر دروازے سے
باہر چلا گیا۔ میں نے سمجھا کہ یا تو اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں، یا وہ خواب کی حالت میں یہاں چلا آیا تھا یا
بیماری نے اس کی بینائی کو کم کر دیا تھا۔

صبح کے وقت جب اس کی بی بی اپنی لڑکی کے ساتھ قصبہ سے واپس آئی تو میں نے اس سے کہا: "آپ کے شوہر شب کو

کتابیں لینے کے لیے نیچے اُترے تھے، لیکن وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ یہ سن کر وہ مجھے تعجب کے ساتھ گھورنے لگی، "وہ تو تین ہفتہ ہوا ہے جیسے کہ وہ انتقال کر گئے۔"

"میں نے تو رات انہیں دیکھا تھا اور وہ دو کتابیں کتب خانے سے نکال کر ساتھ لے بھی گئے۔"

ہم لوگ فوراً اس بات کی تحقیقات کے لیے کتب خانے میں گئے۔ اس کی بی بی نے ان جلدوں کی خالی جگہ کو فوراً دیکھ لیا۔ اور فہرست دیکھ کر ان دونوں کتابوں کے نام بھی معلوم کر لیے۔ یہ لارڈ بائرن کے خطوط تھے، پہلی اور دوسری جلد۔

یہ ہے سارا قصہ۔ میں اس واقعے پر کوئی رائے زنی نہیں کرتا۔ بلکہ من و عن حالت جو کچھ دیکھی۔ بیان کر دیتا ہوں۔ اگر آپ لوگ مجھے مخبوط الحواس سمجھتے ہیں تو مہربانی فرما کر کسی ڈاکٹر سے میرا طبی معائنہ کرائیے۔ اگر ڈاکٹر دیکھ بھال کے بعد مجھے صحیح الدماغ قرار دے اور آپ اس بنا پر سمجھیں کہ اس کا دماغ خود مختل ہے تو پھر اس کے لیے کسی پروفیسر کو بلائیے۔

خاتمہ "ہونہار نوجوان"

ہوں تو جیب میں ٹٹولا اور دو کسی نے جیب سے نکال لیا۔ یا خود بخود گر پڑا۔ لنچ کھانے کا کسے حواس تھا، فوراً گھر سے نکلا اور ریلوے اسٹیشن ٹٹولتا تلاش کرتا ہوا گیا، لیکن نہ معلوم کہاں گرا تھا، کچھ پتا نہ چلا۔ اس کے بعد میں نے فوراً لوسٹ پراپرٹی آفس کو اطلاع دی اور پولیس کو بھی خبر کر دی کیمبرج اور لندن دونوں جگہ کا پتہ دے دیا کہ اگر پتا چلے تو مجھے فوراً اطلاع دی جائے۔ دوسرے دن سخت پریشانی کے عالم میں لندن پہنچا۔ بجائے اس کے کہ کیمبرج ہی کسی سے قرض لوں یا لندن میں کسی کو تکلیف دوں، میں نے گھر تار دے کر ۳ پونڈ اور منگوائے۔ ٹکٹ میں نے پہلے ہی سے خرید رکھا تھا، لندن میں دو چار روز اور ٹھہر سکتا تھا، لیکن طبیعت بالکل اچاٹ تھی۔ جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ پیرس میں بھی نہ اترا۔ سیدھا مارسیلز پہنچا اور جہاز پر سوار ہو گیا۔ دکان داروں کو روپے ادا کرنا خارج از بحث تھا، ڈیڑھ سو پونڈ محض کم کر دینے سے ترازو برابر نہ آتے۔ خیال آیا کہ چیزیں واپس کر دوں۔ لیکن کل سامان میں نے پہلے ہی لندن روانہ کر دیا تھا۔ اور وہ چیزیں جو خاص میری فرمائش سے بنی تھیں وہ دوکانداروں کے لیے بیکار بھی ہوتیں۔ تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا کرتے؟ یہ اعتراض کہ میں نے اصلی پتا نہیں بتایا بہت مضحکہ خیز ہے۔ میرے والد صاحب جس زمانے میں میں نے ذاتی پتا دیا ہے، رجسٹر میں تھے، اب پنشن لے کر لاہور میں مقیم ہو گئے ہیں۔ رجسٹر کا خط اگر لاہور پہنچے تو میرا کیا قصور؟ تم میرا نیا پتا سب کو دے دو اور جس جس کے یہاں جانا ہو، میری طرف سے اطمینان دلا دو کہ جہاں تک جلد ممکن ہوگا، میں روپے ادا کر دوں گا۔ آئینگر ابھی کلکتے میں ہے۔ اس کے اجلاس میں، میں کئی بار کام کر چکا ہوں، لیکن اب وہ آئینگر نہیں۔ تفصیل کسی دوسرے وقت۔ تمہارے واپسی کے دن بھی اب تو زیادہ نہیں۔ اگر زیادہ تکلیف نہ ہو تو دو تصویریں لیتے آنا۔ قیمت میں یہاں آ جاؤ گے تو ادا کر دوں گا۔ ایک تو وہ تصویر ہے جو میں نے بمبئی کے ساتھ کھنچوائی تھی اور اس ڈنر کا گروپ ہے جو میں نے اس کے کیمبرج سے رخصت ہونے کے وقت آئینگر کو دیا تھا۔ میں یہ دونوں تصویریں ساتھ لایا تھا، لیکن راستے میں وہ بکس ہی غائب ہو گیا جس میں یہ تصویریں تھیں....."

میں نے یہ خط شرما کو سنایا۔ وہ دیر تک ہنستا رہا۔ جب اسے ہنسی سے افاقہ ہوا تو میں نے اس سے پوچھا: "تمہارا پیر اندیلو اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟ ورما ایماندار ہے یا بے ایمان؟" "یہ تو مجھے علم نہیں کہ پیر اندیلو کیا کہے گا، لیکن یہ میں خود جانتا ہوں کہ ورما تمہیں کیا سمجھتا ہے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ 'علم ہے بازِ جہل ہے'۔ لیکن میں نے یہ معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہ کی کہ ورما مجھے کیا سمجھتا ہے۔"

# عیّاریاں

از ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ جیکبس — مترجمہ عطارد

جوزف گبس نے "رڈلائن" (شراب خانے کا نام) کے پرائیوٹ بار (شراب خانے کا وہ حصہ جہاں زیادہ ہجوم نہیں ہوتا) میں اپنا لصف پائنٹ (آدھا گھر) ٹھہر ٹھہر کے ختم کیا گویا یہ آخری گلاس ہے جو وہ پی رہا ہے اور اس کی خبر نہیں کہ آئندہ کہاں سے آئیگا۔ اس نے گلاس کو تختے پر رکھا، پڑیا سے تمباکو نکال کر پائپ بھرا اور اپنے ساتھیوں کی طرف رُخ کرکے بڑبڑانا شروع کر دیا:

"صبح دس بجے سے یہ پہلا گلاس ہے جو میں نے پیا ہے"۔ اس نے کرخت آواز میں کہا۔

"ہمت ہارنی نہیں چاہیے"۔ جورج براؤن نے مشورہ دیا۔

"یہ حالت ہمیشہ نہ رہیگی"۔ بوب کڈ نے ہمت بڑھانے کے لیے کہا۔

"میں کسی سے کچھ مانگتا تو ہوں نہیں، صرف یہ چاہتا ہوں کہ کام ملتا رہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ میں کام چاہتا ہوں، غلامی نہیں"۔ گبس نے زوردار لہجے میں کہا۔

"ان دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے"۔ براؤن نے جواب دیا۔

"بعض لوگوں کے لیے تو خاص طور پر مشکل ہے"۔ کڈ نے اضافہ کیا۔

"کہہ لو بھائی جو کہنا ہو، میں بھلا مانوں یا بُرا تمہیں کیا کام! لصف پائنٹ بیر پلائی ہے نہ، تمہارا حق ہے! کل دوبار جی میں آیا کہ ذرا یہ تو دیکھوں کہ پانی میں ڈبکی لگانے میں کیا لطف ملتا ہے"۔ گبس اداس ہو کر زبان لایا۔

"بہت سے لوگ ڈوب کر جان دیدیتے ہیں"۔ براؤن نے سوچ کر کہا۔

"اور بی بی بچوں کو فاقہ کشی کے لیے چھوڑ جاتے ہیں"۔ گبس نے بڑی رکھائی کے ساتھ اضافہ کیا۔

"اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ بی بی کی حالت پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے، کچھ اور نہیں تو ایک کھانے والا ہی کم ہو جاتا ہے۔ چندے سے بھی کچھ نہ کچھ وصول ہی جاتا ہے۔ بڈھا ایل مرا تو کنگز ہیڈ (شراب خانے کا نام) میں یاروں نے جلسہ کرکے ستر ہ پونڈ اس کی بی بی کے لیے جمع کر ڈالے"۔ اس کے دوست نے جواب دیا۔

"تمہاری بڑھیا کے لیے اس سے زیادہ ہی مل رہیگا، بال بچے تو ہیں نہیں، بڑے آرام سے گزرے گی، کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں خودکشی کی ترغیب دے رہا ہوں"۔ کڈ نے کہا۔

گبس کی پیشانی پر بل آ گیا، گلاس کو ٹیڑھا کرکے اس کے اندرونی حصے کو دیکھنے لگا۔

"میاں جو پانی میں ڈوبنے والے لوگوں میں ہمیں بیر ہوتی تو . . ." براؤن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
گبس کا قد تو صرف ۵ فیٹ ۲ انچ تھا، لیکن وہ تن کر کھڑا ہو گیا، اور اپنے دوست پر خشم آلود نگاہیں ڈالنے لگا۔
"میں یہ سوچتا ہوں کہ ڈوب مرنے کی بالکل ضرورت نہیں، صرف اس کو شہرت دے دینا کافی ہے۔ اس کے بعد جو چندہ ہو وہ آپس میں بانٹ لیں۔" کڈ نے یہ تجویز پیش کی۔
"ہاں ہاں، تین حصے برابر کر لیں گے، مگر اس کی صورت کیا ہوگی؟" براؤن نے سوال کیا۔
"ارے میاں تھوڑی بیر اور پیو، کوئی نہ کوئی بات سوچ ہی لیں گے"، کڈ بولا جو خود جوش سے پیلا پڑ گیا تھا۔ تین گلاس بیر اور منگوائی، کڈ اور براؤن نے تو اپنے اپنے کوزے اٹھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا، لیکن گبس اپنے کوزے کے دستے سے کھیلتے ہوئے بولا۔
"میں وعدہ نہیں کرتا۔ یہ نہ سمجھو کر بیری کر میں اپنا قول دے رہا ہوں، جو تم سب باتیں مجھ پر چھوڑ دو۔" کڈ نے کہا۔
گبس راضی نہ ہوتا تھا، لیکن بیر آتی رہی، اور اپنا کام کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کل باتیں آپس میں طے ہو گئیں۔ دوسرے دن براؤن دو تین دوستوں کے ساتھ اسی شراب خانے میں بیٹھا تھا کہ کڈ طوفان کی طرح داخل ہوا۔ اس کا بدن سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ ایک بنچ پر پڑ گیا اور زور زور سے سانس لینے لگا۔
"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" کئی آدمیوں نے پوچھا۔
"جو بیچارہ ڈوب گیا! میں اسٹمر کے لکڑ والے گھاٹ کو اپنی جگہ سے جھانک رہا تھا کہ جو مدد دینے کے لیے آ گیا۔ وہ اسے پاؤں سے دھکیل رہا تھا کہ . . ." کڈ بولتے بولتے یکایک رک گیا، اس پر لرزہ طاری تھا۔ وہ بیر کا ایک کوزہ جو کسی نے اس کی نذر کیا تھا، آہستہ آہستہ پینے لگا، اس درمیان میں برانڈی کا ایک گلاس آ رہا تھا، جو اس کے لیے کسی دوست نے منگوایا تھا
"یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا، جب تک میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچوں، وہ تیسری بار نیچے جا رہا تھا میں نے نیچے جھک کر اسے پکڑ لیا۔ کالر اور ٹائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں خود گرتے گرتے بچا،" کڈ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
کڈ نے کالر اور ٹائی لوگوں کو دکھائی۔ وہ سرے سے گرد سٹ کوٹ کے بیچ والے بوتام تک بھیگا ہوا تھا۔ لوگوں کو یہ بات پسند آئی کہ اس نے اپنے دوست کو بچانے کی کوشش کی۔
"یہ غریب تو ابھی آدھا گھنٹہ ہوا یہیں تھا" شراب خانے کے مالک نے کہا۔
ایک گاڑی والا بولا کہ "اب اسے بیر پینا نصیب نہ ہوگا۔"
"یہ کون کہہ سکتا ہے؟ میں نے کبھی کوئی بات اس کے خلاف نہیں سنی، جہاں تک میں جانتا ہوں وہ اچھی زندگی بسر کرتا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اب وہ بیر نہیں پیے گا؟" مالک شراب خانہ نے تند ہو کر جواب دیا۔

اس نے کڈ کو براؤن کا ایک چھوٹا گلاس اپنی طرف سے دیا، اور یہ پوچھا کہ بی بی بچے تو نہیں چھوڑے؟
"بی بی کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس بیچاری کے پاس یہ خبر کون لے جائیگا؟ وہ تو اس پر جان دیتی تھی، اس کی بسر اوقات کا کیا سامان ہوگا؟ مجھ سے تو جو کچھ ہو سکتا ہے کرنے کو تیار ہوں"۔ کڈ نے کہا۔
"میں بھی تمھارے ساتھ ہوں"۔ براؤن بولا۔
گاڑی والے نے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہیے۔
"پہلی بات تو یہ ہے کہ پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ پولیس کا کوئی آدمی مسز گبس کو بھی خبر کر دیگا۔ ان لوگوں کو مشاہرہ اسی کا ملتا ہے"۔ مالک شراب خانہ نے تجویز پیش کی۔
"یہ حادثہ اس قدر اچانک ہوا ہے کہ تیر تو اوسان جاتے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے گھر میں ایک دھیلا بھی نہ ہوگا، جو کے دوستوں کی کمی نہیں، روپے کا بھی کسی نہ کسی طرح سامان کرنا چاہیے"۔ کڈ نے کہا۔
"میاں، پہلے پولیس کو تو اطلاع دو، اور باتیں پیچھے ہوتی رہیں گی"۔ مالک شراب خانہ نے ہونٹ دباتے ہوئے کہا۔
کڈ نے گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا اور براؤن کے ساتھ تھانے میں گیا۔ پولیس نے اس خبر کو اس طرح سنا کہ گویا بالکل معمولی واقعہ ہے۔ یہ دیکھ کر ان دونوں کو بڑا اطمینان ہوا اور تیزی سے لندن برج سے گزرتے ہوئے ایک پست قامت شخص کی طرف چلے جو بورو مارکٹ میں ایک کھمبے سے پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔
"کہو کیا ہوا"؟
"سب ٹھیک ٹھاک ہے، ہم لوگوں نے پیچ لگا دیا ہے"۔ کڈ نے جواب دیا
"کیا لگا دیا ہے؟" گبس نے دریافت کیا۔ کڈ نے سب باتیں سمجھائیں۔
"جب تک یہ درخت اُگے اور پھل پھول لائے، میرا کیا حشر ہوگا؟ سونے کا کیا انتظام ہوگا، اور کھانا کہاں سے ملے گا؟ میں گھر تو جانے سے رہا"۔ گبس نے کہا۔
براؤن اور کڈ نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، دوسری باتوں نے انہیں اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ وہ ان باتوں کو بالکل بھول ہی گئے تھے۔ گبس کی عادات کے طول اور تکلیف دہ تجربے نے انہیں سمجھا دیا کہ معاملات کا رخ کس طرف ہے۔
"تمہیں سونے کا انتظام تو اب کے اس بار ہی کرنا پڑیگا۔ کسی قہوہ خانے میں یا کہیں اور جگہ مل رہیگی، اور تمھارا سا چلتا پرزہ اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو اس کے لیے پیسے حاصل کر لینا کوئی بڑی بات نہیں"۔ براؤن نے دھیمی آواز سے جواب دیا۔
گبس ہنسنے لگا۔
"یہ خیال رہے کہ اس درمیان تم جو روپے ہم لوگ تمہیں قرض دینگے وہ تمہیں اپنے حصے میں سے واپس کرنا ہوگا، اور یہ بھی یاد رہے کہ

جب تک تم اپنی مونچھیں نہ منڈواؤ گے، ایک وصیلا تمہیں نہیں مل سکتا۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی تمہیں پہچان لے، اور راز طشت از بام ہو جائے۔" کڈ نے ہنسی کے جواب میں جھنجلا کر کہا۔

گبس اپنی پشت کھمبے سے اڑائے تقریباً آدھ گھنٹے تک اپنی مونچھوں کے لیے لڑتا رہا۔ بڑی رد و کد کے بعد وہ راضی ہوا، دونوں دوست اسے حجام کی دکان میں لے گئے اور بڑے تفنے اور بیدلی سے اس نے داڑھی مونچھ دونوں مونڈ دینے کی درخواست کی۔ گبس نے اپنے بے ریش و بروت چہرے کو آئینے میں دیکھا تو اس کی افسردگی اور بڑھ گئی۔ تعجب سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کڈ اور براؤن کی خوش اخلاقی پر ان کا تحیر غالب آ گیا

"اب یہاں آ گیا ہوں تو سر کے بال بھی کٹوا لوں"۔ گبس نے دیر تک اپنے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

"اور شیمپو بھی؟" حجام نے سوال کیا۔

"جیسی تمہاری خوشی، آخر یہ ہے کیا بلا؟" گبس نے جواب دیا اس کے مالی مددگار ہزار مخالفت کرتے رہے لیکن اس نے ایک نہ سنی۔

جب تک حجامت ہوتی رہی، اس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس حیرت میں ہے کہ کس عذاب میں مبتلا ہوا۔ جب اس سے فراغت ہوئی تو اس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ طبیعت بہت ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ گویا ایک بڑا بوجھ سر سے اترا۔ دوستوں نے اس اطلاع کو کامل خاموشی کے ساتھ سنا۔ تھوڑی دیر تلاش کرنے سے انہیں ایک شراب خانہ مل گیا جہاں زیادہ شور و ہنگامہ نہ تھا۔ اس کے ایک گوشے میں بیٹھ کر ان لوگوں نے مالیات کی ایک کمیٹی قائم کر لی جو انہیں تینوں پر مشتمل تھی۔

"سر دست تمہارے لیے یہ کافی ہوگا، مگر یہ نہ بھولنا کہ یہ سب تمہارے حصے میں سے کاٹا جائیگا" براؤن اور کڈ نے گبس کو کچھ نقد دیتے ہوئے کہا۔

گبس نے جواب میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "میں روز شام کو یہیں رہونگا، ملنا چاہو تو یہیں ملاقات ہوگی۔ بیر یہاں کی بہت اچھی ہے۔ اب تمہیں مسز گبس کے پاس جانا چاہیے۔" گبس نے کہا۔

دونوں دوست اس سے رخصت ہو کر مسز گبس سے ملنے چلے، جب مکان کے قریب آئے تو انہیں ایک چھوٹا سا مجمع نظر آیا انہیں یہ دیکھ اطمینان ہوا اور یہ خیال گزرا کہ مسز گبس کو پہلے ہی خبر مل چکی ہوگی۔ دونوں کو تجھے پہنچے، وہاں مسز گبس ہاتھ میں ایک بھیگا ہوا رومال لیے ہوئے نظر آئی، اس کے ارد گرد اس کی جان پہچان کے لوگ بیٹھے تھے، نحیف آواز میں اس نے کڈ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے گبس کو بچانے کی کوشش کی۔

"کڈ ابھی تک خشک نہیں ہوا" براؤن نے کہا۔

"مجھ سے جو ہو سکتا تھا میں نے کیا، گبس کے سے دوست کہیں ملتے ہیں"۔ کڈ نے جواب دیا۔

"بیچارہ ہر وقت مصیبت زدوں کی مدد کو تیار رہتا تھا" براؤن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک شخص نے اس کی تائید کی۔

"اب ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر ہم اس غریب کی کچھ بھلائی نہیں کر سکتے، تو اس کی بی بی کی تو مدد کر سکتے ہیں" کڈ نے جوش کے ساتھ کہا۔

کڈ براؤن کے ساتھ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور دو ایک آدمی جن سے نگاہیں چار ہوئیں، انہیں اس نے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ رفتہ رفتہ اس کے پیچھے ایک اچھا خاصہ مجمع ہو گیا اور سب کے سب ڈولائن کی طرف چلے۔

تین چار دن دونوں دوستوں نے بڑی محنت کی، اس مضمون کے کارڈ تقسیم کیے گئے کہ ڈولائن میں مسٹر گبس کی مدد کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوگا۔ ایسی حکایتیں جن سے مرحوم کے اوصاف حمیدہ اور اطوار پسندیدہ پر روشنی پڑتی تھی، ہر کہ ومہ کو سنائی گئیں۔ دونیگ کو بعد از وقت احساس ہوا کہ اس کا ایک بڑا محسن جو نیکیاں کرتا تھا، لیکن خود منظر عام پر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا ہے۔

گبس اپنی عزلت گاہ میں اپنے دوستوں کی سرگرمیوں کا حال بڑے ذوق و شوق سے سنتا تھا، اس کے دوستوں کو یہ معلوم کر کے بڑی الجھن ہوئی کہ وہ خود بھی جلسے میں موجود رہنا چاہتا تھا، اور جب اس نے منہ میں کالک لگا کر حبشی مطرب کا روپ بھر کر اہل مجلس کے سامنے گانے پر اصرار کیا تو کڈ کو اسے زبردستی باہر لے جانا پڑا۔۔۔۔۔

"اس کے دماغ کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ اس نے ضرورت سے زیادہ روپے ہم لوگوں سے وصول کیے ہیں۔ اب اسے ایک کوڑی نہیں دینی چاہیے"۔ براؤن نے راستے میں کڈ سے کہا۔

"وہ شاہانہ زندگی بسر کر رہا ہے اور ہم لوگ غلامی کرتے کرتے مرے جا رہے ہیں۔ میں نے تو اسے کبھی اتنا موٹا تازہ نہیں دیکھا۔ اسے ہم لوگوں کے برابر حصہ لینے کا کوئی حق نہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کے سوا، اس نے کیا ہی کیا ہے؟" کڈ بولا۔

اس کی بدمزاجی جلسے کی رات تک قائم رہی۔ جلسہ ایک ماہی گیر جس نے گھوڑدوڑ میں خوب روپے بنائے تھے اور اس کے دوستوں کی بدولت خوب کامیاب رہا۔ آمدنی منتظمین کی توقعات سے کہیں زیادہ ہوئی۔ ماہی گیر نے ابتدا ہی میں طشتری میں پانچ پاؤنڈ کا ایک نوٹ رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر سامعین نے اس قدر گہری سانس لی کہ چندہ جمع کرنے والے کو اپنی ذمہ داری ایک بار خفیف سی معلوم ہونے لگی۔ مسٹر گبس مرحوم کے مداحوں نے ۸۰ پونڈ ۱۴ شلنگ اور ۹ پنس کی صورت میں خراج تحسین ادا کیا۔

"ایک حصہ بارہ پونڈ سے زیادہ ہوتا ہے۔ بات اتنی اچھی ہے کہ مشکل سے اس پر یقین ہوتا ہے"۔ کڈ نے خوش خوش رخصت ہونے کے وقت اپنے ساتھی سے کہا۔

کام ختم ہو گیا تھا۔ دونوں کو گبس سے ملنے کے لیے شام کا انتظار تھا۔ شام ہوئی تو کڈ براؤن کو لندن برج کے اُس پار لے گیا۔ کڈ، براؤن سے جو ملتی مزاج کا تھا، گز دو گز آگے تھا۔ گبس دھیل بائٹ آئس میں اپنی پرانی جگہ پر موجود تھا۔ جمع شدہ رقم سے وہ خوش نہیں ہوا، بلکہ اس نے اشارۃً کہا کہ اگر مجھے اس معاملے میں حصہ لینے دیا جاتا تو اس سے زیادہ رقم وصول ہوتی۔

"میں نے جو زحمت گوارا کی ہے اس کا یہ کافی معاوضہ نہیں"، اس نے اپنا سر ہلا کر کہا۔ "یہاں تنہائی میں میرا جی نہیں لگتا جو رقم مجھے تمہیں دینی ہے، اس کے علاوہ جب تم اپنے حصے لوگے تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔"

"میں تم سے کسی دوسرے وقت گفتگو کروں گا"، کڈ نے کہا۔ اور اس کو تیز نگاہوں سے دیکھا۔ "اب تمہیں ہمارے ساتھ وہیلک اس پار چلنا چاہیے۔"

"کس لیے؟" گبس نے پوچھا۔

"قبل اس کے کہ تمہاری بی بی اس رقم کو خرچ کرنا شروع کر دے جو اس کی ملک نہیں، ہم لگے یہ خوشخبری سُنانا چاہتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔" کڈ نے کہا۔ "اور ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی ہم لوگوں کے قریب ہی کہیں پر رہو، کیونکہ شاید وہ ہماری بات کا یقین نہ کرے۔"

"یہ خبر یکایک نہ سنا دینا"، گبس نے کہا۔ "ہم نہیں چاہتے کہ وہ رونا پیٹنا شروع کر دے۔ یا اسی قسم کا کوئی اور کام کر بیٹھے میں اس کی حالت سے جس قدر واقف ہوں، تم نہیں ہو سکتے۔ اور میں تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ سہولت سے کام لو۔"

وہ ان لوگوں کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گیا، اور ذرا تامل کے بعد عینک لگانے پر بھی راضی ہو گیا تاکہ کچھ اس کا حلیہ بدل ہو جائے۔ یہ عینک کڈ کی ساس کی تھی، وہ آٹھ بجے صبح سے لے کے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان تھی۔

"تم دس منٹ تک یہیں پر ٹھہرو"، کڈ نے مونومنٹ کے قریب پہنچ کر کہا۔ "اس کے بعد ہم لوگوں کے پیچھے پیچھے آؤ۔ جب تم روشنی کے کسی کھمبے کے قریب سے گزرو تو رومال سے منہ چھپالو، اور سڑک کے کنارے ہم لوگوں کا انتظار کرو۔"

کڈ براؤن کے ساتھ تیزی سے چلنے لگا، لیکن جب دونوں مسز گبس کے مکان کے پاس پہنچے تو ان کی چال حد سے زیادہ دھیمی ہو گئی۔ مسز گبس مکان پر تنہا تھی اور رسمی گفتگو کے بعد اس نے ان لوگوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔

"میں تو غریب ہو کے لیے اس سے بھی زیادہ کرتا"، براؤن نے کہا۔

"ابھی تک وہ ملے تو نہیں؟" بیوہ نے پوچھا۔

کڈ نے اپنا سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کہ ان کی تلاش بیکار ہے"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"دریا کا دھارا بہا لے گیا۔" براؤن نے کہا اور کڈ کی افتتاحی تقریر کا مقصد فوت کر دیا۔

"وہ جہاں بھی ہو، اچھی ہی حالت میں ہوگا"، مسز گبس نے کہا۔ "اب نہ بے کار رہنے کی پرواہ نہ کسی قسم کا تردد ہے، نہ تکلیف ہم سب کو ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا ہی پڑے گا۔"

"ہاں" کڈ نے کہنا شروع کیا: "مگر......."

"میری خواہش یہ ہرگز نہیں کہ وہ واپس آجائے" مسز گبس نے کہا: "ایسی خواہش رکھنا ارتکاب گناہ کے برابر ہے۔"

"لیکن اگر وہ خود واپس آجانا چاہے" کڈ نے بات کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اور... ویسے کو ترجیح کرنے میں تمہاری مدد کرے"۔ براؤن نے اپنے دوست کی غضب آلود نگاہوں کی بالکل پروا نہ کی۔

مسز گبس متحیر ہو گئی "... ویسے ترجیح کرنے کا کیا مطلب ہے؟" اس نے کہا۔

"فرض کرو" کڈ نے کہا "تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ وہ ڈوبا ہی نہ تھا، میں نے کل رات کو خواب دیکھا ہے کہ وہ زندہ ہے"۔

"میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے"۔ براؤن نے کہا۔

"وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا"۔ کڈ نے رقت آمیز آواز میں کہا

"بوب! وہ کہنے لگا اچھا ذرا دیر میری بی بی سے کہہ دو کہ میں زندہ ہوں، یہ خبر ذرا نرمی سے سنانا"۔

"حرف بہ حرف یہی بات اس نے مجھ کو بھی خواب میں کہی" براؤن نے کہا۔ "تعجب کی بات ہے"!

"بڑے تعجب کی بات ہے"۔ مسز گبس نے کہا۔

"میرا خیال ہے" کڈ نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا "کہ تم نے تو ایسے خواب نہ دیکھا ہوگا؟"

"نہیں، میں کبھی شراب نہیں پیتی"۔ بیوہ نے کہا۔

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا، کڈ نے معاملے کو انجام تک پہنچا دینے کا ارادہ کر لیا۔

"اگر جو اس دروازے سے مکان کے اندر آجائے تو تم کیا کرو گی؟" اس نے پوچھا۔

"چیخ چیخ کر مکان کی بنیاد ہلا دوں گی"۔ بیوہ نے برجستہ جواب دیا۔

"چیخ چیخ کر مکان کی بنیاد ہلا دو گی؟" کڈ نے کہا۔

مسز گبس نے اپنا سر ہلایا "میں چیخوں گی، پاگلوں کی طرح چیخوں گی"۔ اس نے تیقن کے لہجے میں کہا۔

"لیکن اگر وہ زندہ ہوگا، جب تو نہ چیخو گی؟" کڈ نے کہا۔

"میں نہیں سمجھتی کہ تم کیا چاہتے ہو"۔ مسز گبس نے کہا۔ "صاف صاف کیوں نہیں کہتے، جو تو ڈوب کر مر چکا ہے، تم تو یہ جانتے ہی ہو، تم نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور پھر بھی تم مجھ سے خواب کی باتیں کر رہے ہو"

کڈ نے، اس کی طرف جھک کر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔ "وہ بچ گیا" اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا: "وہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے"!

"کیا؟" مسز گبس نے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"یہ بالکل سچ ہے۔ اتنی ہی سچی، جیسی یہاں پر میری موجودگی"۔ مسٹر کڈ نے کہا "یہ بات سچ ہے نہ جھوٹ ہے"۔

"سچ سے بھی زیادہ سچ ہے" مسٹر براؤن نے ایک وفادار دوست کی طرح کہا۔

مسز گبس نے گہری سانس لی "زندہ!" اس نے کہا۔ "لیکن کس طرح؟ وہ زندہ کیوں کر ہو سکتا ہے"؟

"اس قدر زور سے نہ بولو" کڈ نے اس سے گزارش کی۔ "اگر کوئی دوسرا سن لیگا، تو تمہیں وہ رقم واپس دے دینی پڑے گی"۔

"اگر وہ مجھے واپس مل جائے تو میں اس رقم سے بھی زیادہ قربان کرنے کو تیار ہوں"۔ مسز گبس نے جوش میں آکر کہا۔ "شاید تم مجھے دھوکا دے رہے ہو"۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں" کڈ نے کہا۔ "وہ قریب ہی ہے۔ اگر تمہارے چیخنے کا خوف نہ ہوتا تو میں ابھی جا کر بلا لاتا"

"نہیں نہیں، وہ زندہ ہے تو میں چلانے کیوں لگی۔ تم اسے ساتھ ہی کیوں نہ لائے؟ وہ ہے کہاں؟ مجھے اس کے پاس لے چلو"۔ مسز گبس نے کہا۔

"اتنی بے قرار نہ ہو، ہر بات اپنے وقت پر ٹھیک ہوتی ہے۔ میں ابھی اسے لے آتا ہوں، لیکن، اچھی طرح یاد رکھو، چیخوگی تو سب کام خراب ہو جائیگا"۔ کڈ نے براؤن کو مسرت آمیز تبسم کے ساتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ خوش خوش کمرے سے باہر نکل کر نیچے اترا۔ مسز گبس نے براؤن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور منھ کھولے ہوئے انتظار میں دروازے کے پاس کھڑی رہی۔ تین چار منٹ گزر گئے۔

"آگئے، چیخنا چلانا نہیں!" براؤن نے سیڑھی پر آواز سن کر کہا۔

مسز گبس پیچھے ہٹ گئی، یہ دیکھ کر سب خوش ہوئے کہ وہ بالکل خاموش تھی، کڈ اس کے شوہر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا، لیکن وہ منتظرانہ انداز میں دروازے کی طرف دیکھتی ہی رہی۔

"وہ نہیں آئے؟" مسز گبس نے پوچھا۔

"یہی تو ہیں، تم پہچانتی بھی نہیں؟"

"سوسن، میں ہی تو ہوں"، گبس نے کہا۔

"مجھے سمجھنا تھا کہ تم لوگ مذاق کر رہے۔ یہ بے رحمی کی انتہا ہے، تم لوگوں سے کیوں کر یہ بات ہوئی"۔ مسز گبس نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا اور کرسی پر گر پڑی۔

کڈ نے غصے میں گبس کو دھکیل دیا۔ "وہی تو ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ اب مونچھیں نہیں ہیں، تم سسکیاں لیکر چیخو نہیں، لوگ چلے آئیں گے"۔

"ابھی یہاں سے اسے ہٹا لے جاؤ، ایسا مذاق کسی دوسری دل شکستہ سے جا کر کرو"۔ مسز گبس نے کہا۔

"تمہارا شوہر ہی تو ہے"۔ براؤن بولا۔

"ابھی اسے یہاں سے لے جاؤ"۔ مسز گبس نے چیخ کر کہا۔

کڈ نے دانت پیستے ہوئے سوچنے کی کوشش کی اور گبس سے مخاطب ہو کر اس نے دریافت کیا: "تمہارے بدن پر کوئی نشان تو نہیں ؟"

"بالکل نہیں۔ میرا بدن ہر قسم کے داغ دھبے سے پاک ہے، میرا بدن اتنا ہی سفید ....." گبس نے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

"بس بس، بدن کی باتیں نہ کرو"

"میں دس تک گنتی ہوں، اگر اس درمیان میں تم لوگ یہاں سے نہیں چلے گئے، تو میں چلاؤں گی۔ ایک آبرو دار عورت کے سامنے تمہیں کیوں کر جرأت ہوئی کہ اپنے بدن کو ذکر کرو ..... اب جاتے ہو یا نہیں ؟ ایک ! دو ! تین ! چار ! ! پانچ !" ہر ہندسے کے ساتھ اس کی آواز اونچی ہوتی گئی۔ سب سے پہلے خود گبس اٹھ کر چلا اور اس کی تقلید اس کے دوستوں نے بھی کی۔

"تھوڑی دیر میں گھر بھر کو خبر ہو جاتی، اور پھر ہماری مٹی پلید ہونے میں کوئی کسر نہ رہتی، میں پہلے ہی خیال کر رہا تھا کہ مونچھیں نہیں منڈوانی چاہییں۔ اس نے مجھے کبھی بغیر مونچھوں کے دیکھا ہی نہیں، ابھی میرا لڑکپن ہی تھا کہ مونچھیں نکلنی شروع ہو گئی تھیں، وہ مختصر لڑکے ....." گبس اپنی پیشانی آستین سے پونچھتے ہوئے بولا۔

"بکو نہیں !" کڈ نے چیخ کر کہا۔

"بس جناب، بس، اب میں آپ کا حکم ماننے کا نہیں۔ آج ہی مونچھیں بڑھانا شروع کر دیتا ہوں۔ وہ مونچھوں کے بغیر مجھے پہچاننے والی نہیں۔ اور اب میں زیادہ دنوں تک گھر سے باہر نہیں رہ سکتا۔" گبس نے اس انداز سے کہا کہ گویا اب وہ کسی کی جھاڑ پھونک سننے والا نہیں۔

"گبس ٹھیک کہتا ہے، بوب"۔ براؤن نے یقین کے ساتھ کہا۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ جب تک اس کی مونچھیں نہ نکلیں ہم انتظار کریں اور اسے کھلاتے پلاتے رہیں ؟" کڈ نے غصے ہو کر کہا۔

"میرے حصے سے تمہیں سب کچھ واپس مل جائیگا۔ مگر میں کچھ نہیں چاہتا، جو تمہاری خوشی ہو کرو۔ اگر اس معاملے کو یہیں پر ختم کرنا چاہتے ہو تو میں اس پر بھی راضی ہوں"۔ گبس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

براؤن اپنے دوست کڈ کو جو غصے سے بھوت ہو رہا تھا، الگ لے گیا اور دونوں میں آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں۔ گبس اس درمیان میں بے پروائی کے انداز سے کھڑا ہوا سیٹی بجا رہا تھا۔

"مونچھیں کتنے دنوں میں بڑھیں گی ؟" کڈ نے

گبس نے اپنے کالر کو جنبش دی: "ٹھیک ٹھیک کہنا مشکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں دو یا تین ہفتے کافی ہونگے۔ اگر اس پر اکتفا نہ کیا تو ایک آدھ ہفتہ اور سہی"۔

"تمہارے حصے میں سے کچھ باقی نہ رہیگا، اس کو یاد رکھنا۔" کڈ نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"نہ سہی، بار بار اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" گبس نے کہا۔

اس کے بعد وہ تینوں خاموش رہے۔ دو ہفتے تک ہر شب دونوں دوست آکر یہ دیکھتے کہ گڈ کی شکل میں کتنا تغیر ہوا ہے' انہیں بڑا رنج اس کا تھا کہ تغیر کی رفتار اس قدر سست کیوں۔

دو ہفتے گذر گئے، تو گڈ نے کہا کہ "آج کی رات آزمائش کرنی چاہیے" "میں قرض دیتے دیتے تنگ آگیا ہوں"

گبس نے دانشمندانہ انداز میں یہ مشورہ دیا کہ جہاں اتنے روپے قرض دیے ہیں، تھوڑا اور سہی، لیکن گڈ اپنی بات پر اڑا رہا۔

"اب مونچھیں اتنی ضرور نکل آئی ہیں کہ تمہاری بی بی تمہیں پہچان لے۔ ہمیں دوسرے لوگوں سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ کل رات کو آٹھ بجے مونیومنٹ میں ملنا اور پھر اس معاملے کو ختم کریں گے۔" گڈ نے سختی کے ساتھ جواب دیا۔

"جو حکم ہو"۔ گبس نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"اپنی ٹوپی خوب نیچی کر کے پہننا کہ تمہیں اچھی طرح نہ معلوم ہوں' وہ عینک بھی لگا لینا جو میں نے تمہیں دی ہے اور ہاں خوب یاد آیا۔ لال فلالین کا ایک ٹکڑا بھی منھ پر لپیٹ لینا۔" گڈ نے سختی کے ساتھ اپنے احکام دیے۔

"رہنے بھی دو، میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، تمہاری ہدایت کی ضرورت نہیں، میں شرط بدتا ہوں کہ اگر کل رات کو تم دونوں میں سے کسی نے بھی مجھے پہچان لیا تو میں سب کو بیر پلاؤں گا، ورنہ تمہیں پلانی پڑے گی۔" گبس نے کہا۔

شرط قبول کی گئی اور دوسرے دن آٹھ سے پونے نو بجے تک گڈ اور براؤن شرط جیتنے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ جب گبس نظر نہ آیا تو گڈ نے پریشان ہو کر بہت سے فاضل الفاظ کے ساتھ براؤن سے یہ دریافت کیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

"وہ اکیلا ہی چلا گیا ہوگا۔ چلو ہم لوگ بھی وہیں چلیں"۔ براؤن نے جواب دیا۔

مسز گبس کے یہاں جو پہنچے تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے، انھوں نے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ بغل کے مکان سے ایک عورت نے اپنا سر نکالا اور انہیں بتایا کہ مسز گبس چلی گئی۔

"چلی گئی! کہاں چلی گئی؟" دونوں بیک وقت چیخ کر بولے۔

"کناڈا، آج ہی صبح کو تو گئی ہے۔"

گڈ کو کھڑا رہنے کے لیے دیوار کے سہارے کی ضرورت ہوئی' براؤن کا فرط حیرت سے منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور قوت گفتار سلب ہو گئی۔ "مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی! مسز گبس نے بتایا کہ میں دو ہفتے سے چپکے چپکے تیاری کر رہی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی بات بات پہ ہنستی تھی۔"

"ہنستی تھی!" گڈ نے ہولناک لہجے میں دہرایا۔

"اور جب میں نے اسے یاد دلایا کہ تمہارا شوہر ابھی مرا ہے، اس طرح ہنسنا مناسب نہیں سمجھا تو وہ زینے پر بیٹھ گئی اور اتنا زور سے قہقہے مارنے لگی کہ اس کی آنکھوں سے پانی کی طرح آنسو بہنے لگے۔"

براؤن نے عالم تحیر میں اپنے ساتھی کی طرف دیکھا: "یہ ہنس کس پر رہی تھی؟" "وہ پیدائشی احمقوں پر۔" گڈ نے جواب دیا۔

# تمثیل

# کیتھرین پار

مصنفہ موریس بیرنگ — مترجمہ متعلم

## افرادِ تمثیل

شاہ ہنری ہشتم — ملکہ کیتھرین پار — پیج

**منظر۔** لندن۔ شاہی محل میں ناشتے کا کمرا۔ شاہ ہنری ہشتم اور ملکہ کیتھرین پار، ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ دونوں کے درمیان ایک میز ہے، جس پر ناشتے کا سامان رکھا ہے۔ بادشاہ ایک اُبلا ہوا انڈا توڑ رہا ہے۔)

**ہنری:-** یہ انڈا کچا ہے، بہت خراب ہے۔

**کیتھرین:-** کل تم شکایت کرتے تھے کہ انڈا بہت سخت ہے۔

**ہنری:-** کل کے انڈے یقیناً سخت تھے، میں نہ سخت انڈے پسند کرتا ہوں نہ نرم۔ انڈوں کو اندازے سے اُبالنا چاہیے۔

**کیتھرین:-** تمہیں خوش کرنا بہت مشکل ہے، یہ انڈا کھولتے ہوئے پانی میں ساڑھے تین منٹ تک رکھا گیا تھا۔ میں نے خود اِسے اُبالا ہے، اگر تمہیں پسند نہ ہو تو یہ انڈا مجھے دیدو میں ایسا ہی انڈا پسند کرتی ہوں۔ تمہارے لیے دوسرا انڈا اُبال دوں گی۔

**ہنری:-** نہیں، بہت دیر ہو جائے گی۔ سچ پوچھو تو تمہیں انڈا ابالنا آتا ہی نہیں۔ کاش یہ کام تم خادموں کے سپرد کر دیتیں کہ باورچی خانے میں انڈے ابالا کریں۔

**کیتھرین:-** باورچی خانے میں انڈے ابالے جاتے ہیں تو یہاں تک انڈے لانے میں دیر ہوتی ہے اور اگر تم قبل از وقت پہنچ گئے تو شکایت کرنے لگتے ہو کہ انڈے کہاں ہیں، اگر انڈے پہلے سے لا کر رکھ دیے جاتے ہیں تو تم اعتراض کرتے ہو کہ انڈے ٹھنڈے ہو گئے۔

**ہنری:-** میں کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کرتا۔ باورچن کو انڈے ابالنے میں کمال حاصل ہے۔

**کیتھرین:-** کل سے باورچن ہی انڈے ابالے گی۔

**ہنری:-** تمہاری جیسی تجربہ کار عورت کو کم سے کم انڈے ابالنا تو جاننا چاہیے۔ مجھے کچے انڈوں سے نفرت ہے۔ (متفکر ہو کر) غریب کیتھی انڈے ابالنے میں مشاق تھی۔

**کیتھرین:-** کون کیتھرین؟ کیتھرین ہوورڈ یا کیتھرین اراگن؟

**ہنری:-** میں اپنی محبوب کیٹی ہووارڈ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ کیتھرین اراگن میری بی بی نہ تھی۔ اس سے جو شادی ہوئی وہ ناجائز تھی۔

**کیتھرین:-** کیتھرین ہووارڈ کو انڈے ابالنے میں مشاق ہونا چاہیے تھا، کیونکہ اس کی ماں باورچن تھی۔

**ہنری:-** بالکل غلط! اس کی ماں رو کنفورڈ خاندان سے تھی۔

**کیتھرین:-** غالباً تمہاری مراد اپنی بہن سے ہے۔

**ہنری:-** ہاں ہاں، کیٹی کی ماں یقیناً سومرسٹ کے خاندان سے تھی۔

**کیتھرین:-** غالباً تمہیں جین سیمور یاد آ رہی ہے۔

**ہنری:-** ہرگز نہیں۔ جین سیمور، سومرسٹ کی بہن تھی۔

**کیتھرین:-** میں تو یہی جانتی ہوں کہ کیتھرین ہووارڈ کی ماں باورچن تھی، تمہیں اس کا نام میرے سامنے نہ لینا چاہیے۔ شاید تمہاری تمنا یہ ہے کہ وہ زندہ ہوتی اور تم اس سے میرے مقابلے میں زیادہ محبت کرتے۔

**ہنری:-** میں نے تو یہ نہیں کہا۔ بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ اُسے انڈے ابالنے میں کمال حاصل تھا۔

**کیتھرین:-** تمہاری بات کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو خوبیاں اس میں تھیں وہ مجھ میں موجود نہیں۔

**ہنری:-** تم خواہ مخواہ یہ مطلب نکالتی ہو۔ میرے وہم میں بھی یہ خیال نہ تھا۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مجھے کچے انڈے پسند نہیں اور آج صبح کا انڈا کچا ہے۔

**کیتھرین:-** (اٹھتی ہے اور غصے میں دروازے کی طرف بڑھتی ہے) تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے طلاق دے دو۔ اور کسی دوسری عورت سے شادی کر لو، جو انڈے ابالنا جانتی ہو۔

**ہنری:-** کیتھرین! ادھر آؤ۔ میں تمہیں رنج کرنا نہیں چاہتا۔ تم تو انڈے ابالنے میں ماہر ہو۔

**کیتھرین:-** اس قدر جاں فشانی کا یہی نتیجہ ہے؟ اب میں تمہارے لیے کبھی انڈے نہ ابالوں گی۔

**ہنری:-** اس وقت گانا سننے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے ایک گیت بنایا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم اسے گاؤ۔ یہ گیت بیلے اور بانسری کے ساتھ گانے کے لیے ہے۔

**کیتھرین:-** مجھے گانے کی مہلت نہیں۔ اس گیت کا نام کیا ہے؟

**ہنری:-** اس کا نام ہے "محبت کی فتح" اور یہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

سنو سکندرِ اعظم کے کارنامے تم
وہ بادل آیا تھا چڑھ کر سفید گھوڑے پر
بیاں اس کی شجاعت کا کس کے بس میں ہو
نظیر اس کی زمانے میں مل نہیں سکتی

**کیتھرین** :- "سکتی" کا قافیہ "پر" نہیں ہو سکتا۔

**ہنری** :- میرا خیال یہ نہیں کہ "پر" اور "سکتی" ہم قافیہ ہوں۔ صرف گیت میں زور ڈالنے کے لیے میں نے ایسا کیا۔

**کیتھرین** :- سکندر سے مراد سکندرِ اعظم ہے؟

**ہنری** :- بے شک!

**کیتھرین** :- مگر اس کا گھوڑا تو سیاہ تھا۔

**ہنری** :- نہیں۔ تم غلطی پر ہو۔ اس کا گھوڑا سفید تھا۔

**کیتھرین** :- سیاہ! کوئلے کی طرح سیاہ!

**ہنری** :- مگر میں تحقیق کر چکا ہوں کہ اس کا گھوڑا سفید تھا۔

**کیتھرین** :- سکندر کا گھوڑا سیاہ تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا گھوڑا سیاہ تھا۔

**ہنری** :- اس کا گھوڑا سفید تھا۔ جس سے جی چاہے پوچھ لو۔

**کیتھرین** :- اس کے گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔ وہ سیاہ گھوڑے ہی کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس کی سیکڑوں تصویریں ہیں جس میں وہ اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار ہے۔ میرے والد ماجد کے پاس بھی ایک تصویر ہے۔

**ہنری** :- مصور نے غلطی کی ہوگی۔ پلوٹارک، زینوفون، ارسطو، غرض سبھوں نے اس کے سفید گھوڑے کا ذکر کیا ہے۔

**کیتھرین** :- سیاہ!

**ہنری** :- تم کس قدر ضدی ہو! میں جانتا ہوں کہ اس کا گھوڑا سفید ——

**کیتھرین** :- سیاہ! کوئلے کی طرح سیاہ!

**ہنری** :- تم نے زینوفون کی کتاب پڑھی ہے؟

**کیتھرین** :- تمہیں کوئی دوسری بات یاد آ رہی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن کے زمانے میں میرے والد مجھے وہ تصویر دکھایا کرتے تھے۔ جس میں سکندر اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار ہے۔

**ہنری** :- میں بہت آسانی سے اپنا دعویٰ ثابت کر سکتا ہوں۔ پلوٹارک کی کتاب یہیں پر موجود ہے۔

[کتابوں کی الماری میں سے ایک کتاب نکالتا ہے]

**کیتھرین** :- مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے بھائی کا ایک سیاہ گھوڑا تھا جس کا نام، سکندر کے سیاہ گھوڑے کی یاد میں بوسیفالس رکھا گیا تھا۔

**ہنری** :- [کتاب کے اوراق الٹ پلٹ کر] اگر وہ گھوڑا سیاہ ہوتا تو اس کا نام بوسیفالس ہرگز نہ ہوتا۔ سیاہ گھوڑے کو بوسیفالس کہنا لغو ہے۔

**کیتھرین:-** اتنا لو نہیں جتنا سفید گھوڑے کو بوسیفالس کہنا۔

**ہنری:-** اس نے سیاہ گھوڑے کا انتخاب ہرگز نہ کیا ہوگا، وہ تو وہم پرست تھا۔

**کیتھرین:-** تم تو وہم پرست ہو، دیوتاؤں کے وجود کے قائل ہو اور مورتیوں کی پوجا کرتے ہو۔ اس لیے ہر شخص کو اپنی طرح سمجھتے ہو۔ حقیقت میں سکندر وہم پرست نہ تھا اور اسی لیے اس نے قصداً سیاہ گھوڑا انتخاب کیا تھا۔

**ہنری:-** وہ عبارت گئی۔ سنو۔ "زالیوس آئنانے کا لی ٹی میڈے وسنر ریکٹوس:" "وہ گھوڑا نہایت وحشی تھا اور اس کو سدھانا بہت مشکل تھا ـــــ سچ پوچھو تو اس میں تھیسالیا کے سفید گھوڑوں کی کل خصوصیات موجود تھیں۔

**کیتھرین:-** لیکن اس عبارت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ گھوڑے کا رنگ سفید تھا اور تھیسالیا کے گھوڑے تو اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے مشہور رہیں۔

**ہنری:-** تم بڑی ضدی ہو۔ میں زینوفون کی کتابوں سے ثبوت تلاش کروں گا۔ اس نے صاف لکھا ہے کہ سفید رنگ کا گھوڑا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کسی نے کبھی اس بیان کی تردید نہیں کی۔

**کیتھرین:-** مگر پوٹارک کا قول ہے کہ اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔

**ہنری:-** اس کے متعلق پوٹارک نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ اس کے علاوہ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس موضوع پر وولسی سے بھی گفتگو کی تھی، جو صاحب علم تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس نے ایک دن کہا تھا "بوسیفالس جیسا سفید" یہ محاورہ فصحا کی زبان پر رائج ہے۔

**کیتھرین:-** اس نے کہا ہوگا "بوسیفالس جیسا سیاہ"

**ہنری:-** تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔

**کیتھرین:-** میں تمہیں جھوٹا نہیں بناتی، مگر صرف اتنا کہتی ہوں کہ تمہارا خیال غلط ہے۔

**ہنری:-** مگر میں کہتا ہوں کہ غلطی کا امکان ہی نہیں، میں اس حقیقت سے اسی طرح واقف ہوں جس طرح مجھے اپنے نام کا علم ہے۔

**کیتھرین:-** تمہارا حافظہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ ابھی تم نے کیتھرین ہووارڈ کی ماں کا نام بتانے میں غلطی کی تھی۔

**ہنری:-** اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟ نام تو مجھے یاد تھا۔ مگر بروقت زبان پر نہ آیا مگر گھوڑے والی بات تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور اس سے میں تمام عمر واقف رہا ہوں۔

**کیتھرین** :- میں جانتی ہوں کہ تمہارا حافظہ کیوں کام نہیں کرتا۔ تمہیں بہت سے نام یاد رکھنے پڑتے ہیں۔ غالباً تم نے غلطی سے شہنشاہ الفریڈ کے سفید گھوڑے کو سکندر سے منسوب کر دیا، حالانکہ سکندر کا سیاہ گھوڑا بہت مشہور ہے۔

**ہنری** :- خدا کی پناہ! اگر تم میں تعلیم کی بو بھی ہوتی تو تم ایسی باتیں نہ کرتیں! یہ تعلیم اور مذہب سے بے بہرہ ہونے اور لاطینی زبان نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔ تو تم ہی تعلیم حاصل کرنے سے جاہل رہنا بہتر ہے۔ این آف کلیوز جیسی عورت بھی لاطینی جانتی تھی۔

**کیتھرین** :- خدا کا شکر ہے کہ میں لاطینی نہیں جانتی! جاہل زبان! جو صرف وہم پرستوں اور متعصب مذہبی پیشواؤں کے لیے موزوں ہے!

**ہنری** :- غالباً تم مجھے متعصب سمجھتی ہو۔

**کیتھرین** :- کسی بات سے اپنی سمجھ کے مطابق مطلب نکالنا تمہارے اختیار میں ہے — میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ اس گھوڑے کا رنگ سیاہ ہے۔

**ہنری** :- میں متعصب بننا پسند کروں گا، مگر تمہارے عقیدے کا دہریہ ہرگز نہ ہونگا۔

**کیتھرین** :- تم غلط بحث کر رہے ہو اور اصل موضوع سے گریز کرنا چاہتے ہو۔ یہ ٹیوڈر خاندان کی خصوصیت ہے۔ اس خاندان کا کوئی فرد کبھی معقول دلائل سے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

**ہنری** :- تمہیں میرے خاندان کا مضحکہ کرنے کا حق نہیں۔

**کیتھرین** :- تم نے بھی تو میرے خاندان کی توہین کی، جو تمہارے خاندان سے زیادہ قدیم ہے۔ میرے خاندان کا کوئی فرد خونی نہیں تھا۔

**ہنری** :- اب میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتا (اٹھتا ہے اور دروازہ کھول کر پکارتا ہے) ڈینی، جٹس، پیج، — کوئی ہے؟ (ایک پیج داخل ہوتا ہے)

**پیج** :- شہنشاہ معظم!

**ہنری** :- جا، اور لارڈ چیمبرلین سے کہہ دے کہ سابق ملکہ کو ٹاور میں لیجانے کا انتظام کرے۔

**پیج** :- (متحیر ہو کر) بہت بہتر عالی جاہ! کیا حضور والا کا اشارہ گذشتہ ملکہ کی خاک کی طرف ہے؟

**ہنری** :- بے وقوف لڑکا! میں نے تو "سابق ملکہ" کہا تھا — ملکہ کیتھرین پار۔

**پیج** :- حضورِ عالی کا ارشاد بجا ہے۔

**ہنری** :- اور لارڈ چیمبرلین سے یہ بھی کہنا کہ ٹاور کے گورنر کو سابق ملکہ کو پھانسی دینے کا سامان کرنے کی ہدایت کر دے۔

**پیج** :- کیا کل رسوم اسی طرح ادا کیے جائیں گے، جس طرح ملکہ کیتھرین ہوارڈ کی پھانسی کے موقع پر ادا کیے گئے تھے؟

**ہنری** :- ہاں، — لیکن نقارہ صرف ایک ہی دفعہ بجایا جائے۔ اخیر میں (پیج دروازے کی طرف بڑھتا ہے) اور ڈاکٹر بٹس سے پوچھنا کہ سکندرِ اعظم کے گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا یا سفید۔

**کیتھرین** :- سیاہ! (پیج چلا جاتا ہے) اب مجھے پھانسی دی جانی والی ہے۔ اس لیے امید ہے کہ تم مجھے اجازت دو گے کہ اپنا اسباب درست کر لوں۔ تم نے کل اپنی بانسری کوٹھری میں چھوڑ دی تھی — میں اسے لانے جاتی ہوں۔

**ہنری** :- ابھی ٹھہرو۔ جلدی کیا ہے؟

**کیتھرین** :- معاف کرنا! وقت بہت کم ہے اور مجھے بہت سے خطوط لکھنے ہیں۔

**ہنری** :- (ہچکچا کر) میں گانا سننا چاہتا تھا۔

**کیتھرین** :- اب تمہیں میری شرکت کی امید نہ ہو گی؟ کسی اور کو تلاش کر لو تو بہتر ہو۔ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے بہت سی باتیں سوچنی ہیں۔

**ہنری** :- (مصنوعی ہنسی ہنس کر) میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔ کہیں تم نے سچ تو نہیں سمجھ لیا؟

**کیتھرین** :- میں اس قسم کا مذاق پسند نہیں کرتی۔

**ہنری** :- اچھا، اب ان باتوں سے درگزر کرو اور موسیقی سے دل بہلاؤ۔ میں اپنا گیت سننا چاہتا ہوں۔

(پیج داخل ہوتا ہے)

**پیج** :- عالی جاہ! مجھے لارڈ چیمبرلین کا پتا ملا۔ ڈاکٹر بٹس کہتے ہیں کہ گھوڑے کے رنگ کے متعلق حضورِ والا کا خیال صحیح

**ہنری** :- (خوش ہو کر) بہت خوب۔ تم جا سکتے ہو۔ لارڈ چیمبرلین کو میرا پیغام پہنچانے کی ضرورت نہیں (پیج تعظیم بجا لاتا ہے اور چلا جاتا ہے) چلو، اب ہم موسیقی سے لطف اٹھائیں۔ تم نے دیکھا؟ مجھے یقین تھا کہ میرا خیال صحیح ہو۔

[ہنری دروازہ کھولتا ہے]

**کیتھرین** :- پھر بھی اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا۔

**ہنری** :- (نرمی سے، گویا وہ کسی بچے سے بول رہا ہو) ہاں جی، ہاں۔ بے شک اس گھوڑے کا رنگ سیاہ تھا مگر اب ہمیں موسیقی سننا چاہیے۔ [وہ چلے جاتے ہیں]

پردہ

# نظم

## انقلاب روزگار

از پریم پجاری صاحب

چاندنی، دریا، خموشی، تیری کشتی، اور تو
مجھ کو بھی ہمراہ چلنے کا اشارہ ہوگیا

بیٹھ کر چپّو سنبھالا میں نے، کشتی چل پڑی
رفتہ رفتہ دُور جب ہم سے کنارہ ہوگیا

تو نے چھیڑا ساز اور نغموں سے گونج اٹھی فضا
دل میں جوشِ آرزو ہنگامہ آرا ہوگیا

تھی کہاں لیکن مجھے عرضِ تمنا کی مجال
جانے کیونکر حالِ دل کا آشکارا ہوگیا

بیخودی میں یک بیک آنکھیں ملیں اور جھک گئیں
پھر اُٹھیں اور پھر وہی عالم دوبارہ ہوگیا

اک ذرا پہلے فقط تیری نظر تھی برق پاش
اب ترا دل بجلیوں کا گاہوارہ ہوگیا

رکھ دیا میں نے اِدھر چپّو اُدھر تو نے رباب
دُور اب دونوں کی خود داری کا یارا ہوگیا

تیرے سینے میں ہوئی محسوس اک جنبش مجھے
میری جرأت کا یہی شاید سہارا ہوگیا

ہاتھ اٹھے اور تیری گردن میں حمائل ہوگئے
تو نے سر خم کر دیا، یا خود قضا را ہوگیا

جسم میں اک سنسنی سی، روح میں اک اہتزاز
فقط کیا بتلاؤں جو عالم ہمارا ہوگیا

ہاں، وہی میں ہوں، وہی تو ہے، مگر وہ دل نہیں
آہ، یکسر موم ہو کر سنگِ خارا ہوگیا

کیوں نہیں ملتا محبت سے محبت کا جواب
کس لیے قحطِ وفا پروردگارا ہوگیا

# آثارِ ادبیہ

(۱) مثنوی میر حسن در وصفِ قصرِ جواہر
(۲) کلام سلیمان و رقت و طالب۔

## مثنوی میر حسن در وصفِ قصرِ جواہر

در بہاریہ می گوید

پلا مجھ کو ساقی مے لعل فام
سو غنچہ صراحی ہو اور گل ہو جام
چمن گل سے مدت میں معمور ہے
خزاں اس گلستاں سے دور ہے
یہاں تک ہے اس فصل میں جوشِ گل
کہ ہے دوشِ گل سے ملا دوشِ گل
بغیر از گل و لالہ و نسترن
درختوں نے روکا نہیں واں چمن
نہیں واں درختوں کے ہر سو پہاڑ
وہ جنگل نہیں کچھ جو ہو جس میں جھاڑ
خس و خار ہوویں نہ واں جا بگیر
کہ تنکا ہے اُس آئینے پر لکیر
مرقع کہوں اس کو تصویر کا
کہ تختہ کہوں اس کو کشمیر کا
سہانی روِش اور جوشِ بہار
لہکنا وہ سبزے کا مرغزار
نہ ہو سبز کیونکر نگینِ فلک
کہ ہے ڈانک سبزے کی اس کی چمک
گر واں کی ہے چشمِ بلبل زمیں
کریں گل نہیں گوشۂ گل زمیں
صفائی خیاباں کی آئینہ دار
کہ روشنی روِش پہ ہے گل کی بہار
ہر اک شاخ و بیل اس خیاباں کی
نظر میں ہے جدول گلستاں کی
نہیں یہ بھی تشبیہ سے درکنار
یہ ہے خطِ گلزار دستِ نگار
کہیں ایسی داؤدی کھلتی نہیں
یہ خوبی ستارے کی ملتی نہیں
یہ صد برگ کا رنگ دیکھا یہاں
جسے دیکھ کر زرد ہو زعفراں
ہر اک فصل میں ہر ہر اک گل کی دھوم
بہار اپنی اپنی پہ اتنا ہجوم
چنبا ہو کہ شبو ہے اب رو بکار
ہے گویا سوادِ دیارِ بہار
نسیم اُس کی نورِ دل مشکناب
طرح اس کی شاخِ گلِ آفتاب
مہکتا ہے خوشبو سے اس طرح باغ
کہ جوں زلف سے ہو معنبر دماغ
چمن ہے لگن اس لگن کی ہے شمع
نہیں شاخِ شبو چمن کی ہے شمع
جدھر ہو کے جائے وہاں سے صبا
اُدھر سے صدا ہو کہ صلِ علیٰ
کہیں اس مکاں کہتے فرخندہ نام
یہ خوش بو ہوئی اس کی ہر پارہ تمام
ہر اک شب ہوا اس بو سے عنبر سرشت
ہر اک روز اس رو سے روزِ بہشت
ہے رنگیں حنائے کفِ پائے یار
اسی کے قدم سے ہے ساری بہار
یہ شبو یہ داؤدی و یاسمن
یہ اُجلا مکاں اور سنہرا چمن

### ساقی نامہ در سیرِ مہتاب

پلا ساقیا ایک جامِ ہلال
برائے شبِ ماہ چھت اُس پہ ڈال
نظر میں مجھے سیرِ مہتاب ہے
کہ ہم حوض و ہم عالمِ آب ہے
بلندی عمارت کی کوٹھی کی شان
کہوں کیا میں خوبی کا اس کی بیاں
چھت اوپر جو کچھ جلوۂ ماہ ہے
نہ پوچھو کہ اللہ اللہ ہے
لبِ بام ہے تا زمیں سے عزیز
عجب چشمۂ نور ہے موج خیز
لگے تو کہ فرہاد روشن ضمیر

بے آیا وہاں کو وہ جوئے شیر
شب ماہ واں کی دل افروز ہے
وہ بام خدا شب جنہیں روز ہے
کھلا چاندنی کا ہوں واں کیوں نہ جوش
کہ ہے ماہ اس در کا حلقہ بگوش
پڑے چاندنی پر جدھر کو نگاہ
نہ دے کثرت نور آگے کو راہ
نظر کو ہے مشکل وہاں سے عبور
پڑا جوش مارے ہے دریائے نور
چمک کیا کہوں حوض و تالاب کی
لگی ہے وہاں آنکھ مہتاب کی
غرض بام و در پر ہے یہ کچھ سماں
اب آگے اس ایواں کا سنیو بیاں
ہے اس میں وہ قالین کا فرش و فروش
کہ جس کا گل و غنچہ نکہت فروش
کبھی صاف ہموار یوں چاندنی
کہ ہے جوڑ مہتے کی ہو جوں چاندنی

در صفت شمع و فانوس

پلا ساقیا مجھ کو تو اک ایاغ
کہ روشن کروں فکر کا میں چراغ
دھرے نقرئی اس پہ وہ شمع داں
کہ شمعوں سے جس کی ہو روشن جہاں
وہ فانوس شیشے کی مانند دل
صفا جس سے ہو آئینے کی خجل
درخشندگی شمع کی اس میں یوں
فلک سے پڑے عکس خورشید جوں
اسے اشتعال ہولے فراغ
کہ ہے دامن دل میں اس کا چراغ
لباسِ شب اس کا ہوا پرتوا
ہوا دو سرا اس کا زلف ہوا
مرا دل ہے پروانہ اس شمع پر
کہ ہر دل کو تو اس کی ہے سر بسر
نظر میں زبس ہے مرے وہ جمال
ہے فانوس کا دل کو واں کی خیال
دل و چشم ہے اس سے لبریز نور
کہ ہے وہ جگر گوشۂ کوہِ طور

در صفت سقف

زبس سقف ہے آئینے کی وہاں
عجب عکس سے شمع کے ہے سماں
دوبالا ہوا حسن شمع و چراغ
گیا عرش پر روشنی کا دماغ
کہوں چھت میں کیا روشنی کی چمک
لیا ہے اٹھا اس نے سر پر فلک
ادھر جلوۂ شمع اس طرف ماہ
کرے کام کس کس طرف کو نگاہ
کہاں اس طرح کی بھلا سیر ہے
تکلف ہے آگے بس اب خیر ہے
خوشا وہ کہ جس جا ہو اس کا ورود
محمد پہ بھیجا کرے وہ درود
جو کچھ سیر کا حق ہے سو یاں ہے بس
اب آگے جو باغ کی ہے ہوس
نہ ہو کیوں کہ یہ باغ جنت سرشت
کہ ایسے کی خاطر ہی وہ ہے بہشت

مدح ممدوح

کہیں اس مکاں کا ہے محکم اساس
جواہر علی خاں جواہر شناس
وہ ہے سالک راہ دینِ نبی
کریں چاہیے اس کی سب پیروی
یہ عدل و سخاوت یہ جود و کرم
یہ عزم و شجاعت یہ تیغ و قلم
یہ شان و صلابت یہ حلم و حیا
یہ خلق و مروت یہ ذہن و ذکا
یہ قائم مزاجی یہ عز و وقار
یہ ایمان داری یہ طرز و شعار
یہ حسنِ سلوک و یہ علم و عمل
یہ طبع سلیم و یہ دل مستقل
نہ ہوگا کسی میں نہ ہے اب کہیں
یہ سب خوبیاں ختم ہیں بس یہیں

در تعریف بیانا کہ مسمیٰ گنگا بکرو

سبک رو کا اُس اور کیا بیاں
روانی میں مانند طبع رواں
بصد گونہ ہے اس پہ کار طلا
سنہری سا بادل ہے وہ صبح کا
دبیانا ہے وہ اور نہ ہے پالکی
وہ اک چیز ہے تخت کی نالکی
کہاں تک کروں اس کی خوبی کی بات

ہر اک چوب اُس کی ہے آبِ حیات
یہ اقبال و حشمت یہ جاہ و جلال
رہے نت ترقی میں مثلِ ہلال

## فی المدح

اگرچہ ثنا غیرِ آلِ نبی
کسی کی بھی کبھی نہیں کچھ بھلی
نہ ایسے کی کیوں مدح کریے بھلا
کہ ہے دو جہاں ہیچ جس کا صلہ
سخن کا نتیجہ ہے مدحِ امام
دیا اس سوا جو ہو اس کا غلام
کہ صاحب کی ہوتی ہے اس میں خوشی
جو بندے کی اس کے کہیے کچھ بھلی
نہیں بے جگہ مجھ کو جوش و خروش
وہ ہے اس گھرانے کا حلقہ بگوش
موالی جو ہیں اس کے صحبت نشیں
سبھی شیعے ہیں اور سبھی مومنیں
رہیں شاد و خرم صغیر و کبیر
ستارے ہیں یہ گردِ ماہِ منیر
یہ ہیں دوستدارِ علیِ ولی
نگہبان رہیں ان کے احمد علی
جگہ یاں بھی ان کو ہے جنت سرشت
ملے گا وہاں بھی مکانِ بہشت
رہے جب تلک آباد قصرِ جہاں
سلامت رہیں یہ مکین و مکاں
سدا شاد اس کے رہیں خیر خواہ
رہیں دشمن اس کے ذلیل و تباہ

یہ تحریر جو کی ہے ظاہر ہے یہ
مسمّی بہ قصرِ جواہر ہے یہ

## تہنیت قصرِ جواہر

سُنا تو نے اے ساقیِ سیم بر
مے تہنیت سے مجھے شاد کر
شمالی کا داں اک بنا ہے جواب
کہ ہے سب مکانوں میں وہ انتخاب
ہوئے جب سے دشمن کے رخ اس کے در
مٹا اس طرف کی بدی کا اثر
جہاں کے ہوا سر پہ احسان یہ
بنا نیک ساعت سے دالان یہ
عجب چو رخا وہ بنا ہے مکاں
عناصر سے خلقت کے دے ہے نشاں
کسی سرزمیں سے نہیں بے خبر
کہ رکھتا ہے چاروں طرف وہ نظر
دلوں کو ہے واں عیش و عشرت سے میل
کہ اس جا ہے چار عالم کو شغل
مربع نشینی سے صحبت ہے وہ
ہر اک سمت سے بس کہ خوش رو ہے وہ
بجا شاہ چار ابرو ہے وہ
کشادہ دل و عالی ہمت ہے وہ
صفائی کا اس کی کروں کیا بیاں
کہ دیوار اس کی ہے آئینہ ساں
نظر جس کی ہو ان ستونوں میں بند
رہے راست بازوں میں وہ سربلند
ہلالی زبس اس کی محراب ہے

وہ در لمعۂ نور کا باب ہے
عجب شان سے اس کی ہو سائباں
فلک دب گیا دیکھ کر جس کی شان
ہوا کا نہ پوچھو وہاں کی بیاں
ہوادار کیوں کر نہ ہو سائباں
نسیمِ سحر رات دن یار ہے
ہوا بھی وہاں کی ہوادار ہے

## در تعریف درخت کرکھ

عجب کرکھوں کے ہیں واں دو درخت
کہ دونوں ہیں ہمسایۂ نیک بخت
ادھر ایک کونے پہ اور اک ادھر
مقابل قرینے سے ہیں یک دگر
مشابہ جو ہیں چتر سے وہ درخت
زمیں واں کی ہے بادشاہی کا تخت
اگر دیکھنے اس کی خوبی کو آئے
تو شمشاد بھی رشک سے زہر کھائے
رہے ہفت اقلیم میں ان کا ناؤ
کہ عالم کو ہے جیسا ان کی چھاؤ
زبس اہلِ ایماں کا وہ ہے مکاں
کھڑے ہیں وہ دو سبز داری جوان
تو سایہ و نور کی دو ہشیار
شب و روز ہوتی ہیں ان پر نثار
مجھے اس کے سائے کی ہوتے ہوا
لگے اس کو اندھیر ظلِ ہما
ہوا سایۂ تاک گو مہرباں
پر ایسی ہے موزونی اس میں کہاں

کہ آ گر گرم اس کا پوچھے ہے پا تو
وہ نامِ خدا اس کا گرمی سے بچا تو
اگر ذرہ چاہے کہ واں دھوپ سے
بچا ہوتا اک واں کے ہوتوں میں سے
میں کرسی سے دوں اس کی تشبیہ کیا
فلک سے سوا اس کا ہے مرتبہ
زبس ہے وہ جائے ثریا جناب
ہے وہ شہ نشیں مطلعِ آفتاب
دقیقے کی جب کرے ہے نگاہ
تو اس شہ نشیں تک ملے اس کو راہ
فلک رتبہ جو ہو رکھے واں قدم
کہ واں کی زمیں ہے فلک سے بہم
مجھے لے گئی میری قسمت وہاں
وگرنہ یہ معراج اپنا کہاں
زمیں دیکھ واں کی گیا لوٹ دل
کہ اس سے صفا تھی گہر کی خجل
کھنچے صندلی خط وہ دیکھے کہ بس
رہی پھر نہ خوشبو کی مجھ کو ہوس
رہے اس کے سامنے تلے جو بشر
نہ ہوئے کبھی اس کے تئیں دردِ سر

در مدحِ فوج گوید

خبردار ہو ساقیا اور شتاب
شجاعت کے خم سے مجھے دے شراب
مفصل تو ہوئے گا مجھ سے کہاں
کروں مجملاً فوج کا کچھ بیاں
ہوا سے جو در اک طرف کھل گیا
مرا جھٹ سے دل اس طرف ڈھل گیا
زبس تھا مشرف جلو خانے پر
جلو خانہ تھا اس طرف جلوہ گر
نظر واں کی آئی یہ شان و شکوہ
جہاں کاہ سے ہو برابر نہ کوہ
زبس سبزی تھا انھوں کا لباس
ہوئی چشم کو روشنی بے قیاس
ہے آتش کا دریا کہیے تو یہ فوج
کہ جوں موج سے شعلہ مارے ہے موج
تفنگوں کی پلٹن میں یوں تھی چمک
سیہ ابر میں برق کی جوں چمک
رہے جب تلک چرخِ نیلی کبود
اس آتش سے جل جل مریں سب حسود

تعریف توپ بندوق

وہ توپ اژدہا اور جمعِ تفنگ
نگلنے کو دشمن کے کامِ نہنگ
بر آئے نہ ان سے عدو کے پلشت
ازل سے ظفر ان کی ہے سرنوشت
رہے کیوں نہ واں کی سپہ سربلند
جہاں ایسا کپتان ہو عقل مند
جو کچھ اب وہاں ہے سپاہ نجیب
یہ اشجع کسی کو ہوئے کم نصیب
انھوں کا سلامت رہے قدرداں
جواہر علی خاں والا مکاں
گر آخون صاحب کی لکھوں ثنا
قلم کی زباں پر ہو جاری دعا
کسی امر میں کچھ نہ آئے خلل
جہاں ایسا ہو عالمِ باعمل
رہے گشت سے بار وراں کا نام
کہ سرسبز ان سے ہے عالم تمام
مے عیش سے جام دے ساقیا
کہ پھر اس مکاں کی ہے مجھ کو ہوا
درِ قبلہ رو اس کا ہوئے جو باز
پڑھے اس طرف ایک عالم نماز
کھلے پڑے ہیں پٹ اس کے رنگیں کتاب
مذہب پڑیں دو مصرعے انتخاب
نہ دیکھا کوئی اس سے خوشتر مکاں
جو مدِ نظر واں سے ہے آبِ زداں

در صفتِ آبشار

خزانے سے مل چادرِ آبشار
کرے ہے وہ در دوپٹے کے پتھر نثار
اسے بھی زبس سرخوشی ہے کمال
وہ پانی بھی چلتا ہے مستی کی چال
نہ پوچھو اس کا عالم عجب آب ہے
کہے تو کہ سیماب بیتاب ہے
زبس شوقِ تسخیر مد تھا کمال
لیا سنگ نے پشتِ ماہی کا جال
نہ ہو نور کا کیونکر واں ازدحام
کیا دام میں اس نے ماہِ تمام
چمک یوں ہے پانی کی مہتاب میں

چراغوں کا جوں عکس ہو آب میں
عجب جگمگاہٹ سے ہے جلوہ گر
نظر کی ٹھہرتی نہیں واں نظر
چمک اس کی دیکھے جو کوئی دور سے
نظر اس کی لبریز ہو نور سے
کہیں بیٹھنے والے اس پاس کے
کہ جگنو ہے تختے پر الماس کے
دیا کرتا ہی کے اوپر اگر
کسی نے یہ سمجھا ہے لبریز گوہر
شب مہ میں عالم کہوں اس کا کیا
نہایت تجلی لگی ہے وہ صدا
کبھی گھر سے اور کبھی وہ دن
کہ ادا نہ بجے جیسے تانوں سے
زمرد کے شیشے سے بھر کر شتاب
پلا سا گیا آ کے مجھ کو گلاب
اِدھر سے پھری جو نظر ٹک اُدھر
گیا میں سررشتہ کی سمت پر
درون سے درختوں کا تھا رنگ یوں
کہ دیکھے مرقع کو شیشے سے جوں
تلے اس کے دیکھا تو رستہ ہے ایک
کہ چلتا ہوا شہر بستا ہے ایک
اچنبھے کا دیکھا ادھر پائیں باغ
کہ لعل و زمرد ہوا جس سے داغ
یہ ایجاد دیکھا ہے کس نے حسن
روش سرخ اور سبزے کی یہ پھبن

نہ گل اس میں ہے اور نہ ہے واں شجر
ولیکن نظر اس سے بھی بار ور
فقط سرخی اک خشت کی ہے وہاں
چمن کے بچھا دی ہے جو درمیاں
کیا ہی ہے تحریر اس کی تمام
تکلف نہیں اس میں کچھ والسلام
غرض اس پہ سادہ یہ پرکار ہے
کہ رنگ گل و لالہ انبار ہے
یہ سبزی کہ جدول ہو دیوان کی
یہ سرخی کہ سرخی گلستان کی
کروں کس روش وصف کا میں بیاں
ہے شرمندہ جس سے خط گلرخاں
یہ سرخی یہ سبزی چمن کی نہیں
بدخشاں کی سرسبز ہے سرزمیں
کسی نے یہ کاہے کو دیکھی بہار
زمرد کے تختے پہ یاقوت زار
نظارے سے اس کے پری جس کی تو
تو سوئے نہ گل کی طرف کر کے رُو
اگر اس کو دیکھے کوئی غور کر
عجب کیا کہ ہو جائے طوطی نظر
دیا ہے یہ صنعت سے کس نے بٹھا
زمرد کے گھر پر نگیں لعل کا
نہیں باغ اور باغ کی ہے بہار
عجب ہے طلسم جواہر نگار
مجھے اس کے دیکھے سے آیا یقیں

کہ ہے فی الحقیقت یہ گل زمیں
دلوں کو ہے اس کے سخن سے فرح
کہ ہے داستاں میں یہ قوس قزح
کھنچی سے وہ تھی برابر آسماں
ہوئی راست قوس قزح آ کے یاں
شفق کا ہوا دیکھ کر رنگ فق
کہ ہوتی ہے ایسی زمیں کی شفق
نہیں سبز سرخی پہ تحریر کی
یہ ہے خط یاقوت کی دھج بھی
بھری ہے یہ جام زمرد میں مے
گویا شعلہ سبز آتش میں ہے
کسی نے سلیقے سے اپنے دیا
بسے میں قرینوں سے مخمل بچھا
پڑے اس جگہ جس کسی کا قدم
ہر رنگ حنا سرخ ہو وہ قدم
کسی کی یہ سرخی نہیں درمیاں
چمن میں بھرا ہے یہ خون خزاں
زبس کثرت عیش کا واں ہے جوش
بچھائے ہیں میدان میں زیں پوش
پڑے سرخ اور سبز بانات کے
یہ چشمے ہیں گویا کہ برسات کے
لگے تو گلوں کے یہ صد برگ ساز
چمن باغباں نے کیے ہیں نیاز
خزاں کا کبھی اس پہ وار آئے نہ
کہ ہے واں مرصع کا چار آئینہ

زمیں کھب گئی اس کی رنگیں ادا
فلک نے زمیں کو دوشالا دیا

گل و لالہ جو دیکھ کر جس کو داغ
بجا ہے جو کہیے اسے لعل باغ

ہوا ہے غرض یہ عجب اختراع
ثنا لکھوں اس کی بخط شعاع

دگر نہ ہو سبزیاں قیل و قال
کہ ہے اس جگہ میں زباں اپنی لال

خدائی کی ہر رنگ میں ہے نمود
محمد کی ہو آل پر نت درود

کہے شعر شاعر جو یاں آن کر
وہ مضمون رنگیں سے ہے بہرہ ور

نہ آئے زباں پر سخن مبتذل
نئی اس کو سوجھے زمینِ غزل

مرے سر پر اس گھر کا احسان ہے
کہ میرا سخن سبز ہر آن ہے

اگر آئینہ اس کے آگے نہ ہو
سخن کیونکر طوطی کہے پھر کہو

سخن سنج کے آگے پھرتا ہے دل
نہیں اور ہوتا ہے جی مضمحل

خدا اس گھرانے کو رکھے مدام
بحق محمد علیہ السلام

---

[1] ق = قلمی نسخے میں اس نہیں ہے [2] جو ہے کہ، بہتر ہوگا [3] مردانہ یا پروانہ؟ [4] ق میں اپنا [5] ق میں زخندہ کی جگہ خندہ [6] ق میں کی نشان نہیں، یہ قیاسی اضافہ ہے؟ [7] ق کیونکر = کیوں نہ [8] ق کہ = ہے۔
[9] ق بی جوڑ = بے جوڑ [10] ق کے = کی [11] ق میں وہ متن میں ہے، حاشیے میں اس کے بدلے نت بھی ہے۔
[12] ق بھی = ہے [13] ق عزم شجاعت [14] ق ہی = بھی [15] یہ مصرع کاتب کی غلطی سے یہاں پر درج ہو گیا ہے۔ یہ اس مصرع کے بعد ہونا چاہیے "بجا شاہ چار ابرو ہے وہ" [16] ق پھر = بھی [17] ق میں ایک جگہ گمک، دوسری جگہ کمک ہے [18] ق جوڑ = حسود [19] جو ہے کہ بہتر معلوم ہوتا ہے [20] ق سیہ کی = یہ سی [21] آگے قیاسی اضافہ [22] اور سبزے کی یہ بھی قیاسی اضافہ [23] ق سمن قلمی نسخے کے کاتب نے یہ مثنوی بہت غلط لکھی ہے، جہاں قیاسی تصحیح نہ ہو سکی، اصل کے مطابق نقل کر دیا گیا ہے۔ کسی صحیح نسخے سے کوئی صاحب اس کی تصحیح فرمائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔
ایک جگہ 'سنہرا چمن' آیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ 'ستھرا چمن' ہو۔

# کلام سلیمانؔ و رقتؔ و طالبؔ

(۱)

کیا ہاتھ لگا مصر کے بازار سے اُن کے — پوچھے کوئی یوسف کو خریدار سے اُن کے
حاصل نہ ہوا کچھ کبھی اقرار سے اُن کے — محروم رہے آج بھی دیدار سے ان کے
اُترے ہوئے ہیں چرخ پہ خورشید و مہ تو — اعجاز رخ و ابرو خم دار سے ان کے
کافر ہی کیا عشق بتاں نے ہمیں آخر — تار رگِ جاں گھٹ گیا زنار سے ان کے
ہر رات پڑا ہے مجھے کالے کو کھلانا — کیا عشق ہوا طرۂ طرار سے ان کے
خورشید قیامت نے کہاں تاب یہ پائی — ہمچشمی کرے روزن دیوار سے ان کے
ہے سرخی پان کا لب معشوق میں دھوکا — ٹپکے ہے یہ خون تیر کے سوفار سے ان کے
گل کھائے تھے بلبل نے جو چھوٹا وطنِ گل — بوئے ستم آتی ہے گلی ہار سے ان کے
کرتے ہیں اب انساں بھی سلیماںؔ سے کنارہ — یا فخر تھا پریوں کو کبھی پیار سے ان کے

(۲)

اس قدر بیتاب مت ہو تیغ قاتل دیکھ کر — جائیو مقتل میں نوبت اپنی آئے دل دیکھ کر
یاں دل حیراں کے درد و غم ہوئے آئینہ دار — آئینہ لے سادہ رو تیرے مقابل دیکھ کر
کہتے ہو تم کو نہیں جانے کا بن اس کے لیے — زور ہی للچائے کچھ تم معنت کا دل دیکھ کر
چاہیے گھر میں دلا اس مرکے تب تو جائیو — سوچ ساعات اور کواکب کے منازل دیکھ کر
کی نظر مجھ پر تو اس نے ترس کھا کر رو دیا — ہنکڑی اور طوق پاؤں میں سلاسل دیکھ کر
عشق نے وحشت کے مکتب کا خلیفہ کر دیا — قیس اور فرہاد میں سے مجھ کو قابل دیکھ کر
کر دیا اس نے مقید جب بقید پیچ و تاب — کاکل پیچاں کا اپنے مجھ کو مائل دیکھ کر
ہم نے بھی جاگیر دشت ہرزہ گردی لے لیا — عشق کی اقلیم میں وحشت کا عامل دیکھ کر
اک غزل کی اور فرمائش ہے رقتؔ آپ کو — فن علم شعر میں اُستاد کامل دیکھ کر

---

اپنے دل کو آہ میں مقتل میں بسمل دیکھ کر — رہ گیا کن حسرتوں سے سوئے قاتل دیکھ کر
کب بگولا ہے یہ روح قیس کرتی وجد ہے — رونق افزا نجد میں لیلیٰ کا محمل دیکھ کر

گل کو بلبل شمع کو پروانہ قمری سرو کو — بھول جاتے ہیں تری شکل و شمائل دیکھ کر

شکل جوزا یاں حمائل زخم گردن میں پڑا — تیغ کو قاتل کی گردن میں حمائل دیکھ کر

آہ کیا کیجے کہ یاں دل بر میں تڑپا جائے ہے — ابھرے رخسارے ترے بوسے کے قابل دیکھ کر

کھل گیا احوال دل کا صاف چشموں میں آہ — قطرہ ہائے اشک میں اب خوں کو شامل دیکھ کر

داغ کھایا ہے قمر نے رشک سے اے ماہرو — جلوہ گر رخسارۂ پُر نور پر تل دیکھ کر

رقت آنکھوں پر پڑے پڑتے ہزاروں دل پہ یاں — لپٹے ان کے درمیاں پردے کو حائل دیکھ کر

---

## ۳

کبھی آنسو کبھی لختِ جگر سے برسے — اپنی آنکھوں سے تو کچھ، لعل و گہر سے برسے

اشک امڈا ہے مرا ابر سے کہہ دے کوئی — آبرو چاہے تو ہٹ کر مرے گھر سے برسے

جی گیا زور گیا آپ کا کیا یار گیا — سینے سے، چشم سے، اور دیدۂ تر سے برسے

جس قدر ابر تو برسے ہے پکوڑوں میں اگر — آتا پانی تو مرے دامنِ تر سے برسے

اس قدر ابر میں قطرات کہاں تھے یہ تو — کسی مشتاق کے ہیں دیدۂ تر سے برسے

رات بھر نالے کیے ہم نے، تو دن بھر روئے — جس قدر شام سے گرجے تھے سحر سے برسے

ان کے آنے کا ہوا وقت بھلا ابر کو دیکھ — خون دل کیوں نہ مرے دیدۂ تر سے برسے

یہ تو کہتا نہیں میں منہ پہ نہ برسے لیکن — جب وہ آجائے تو پھر جتنا یہ برسے برسے

اشک گلگوں نہیں یہ لختِ جگر ہیں طالب — آج آنکھوں سے جو کچھ اپنے شرر سے برسے

---

کل شب فرقت ہماری کیا ہی خواری سے کٹی — کچھ کٹی زاری سے، کچھ اختر شماری سے کٹی

کچھ وصال اور وصل میں اپنا نہیں ہے اختیار — زندگی اپنی بہت بے اختیاری سے کٹی

آپ نے ہم کو کیا دل سے فراموش اس قدر — اور ہمیں ہر پل تمہاری یادگاری سے کٹی

کچھ نہ پوچھو دوستو فرقت کے بیمار دل کا حال — دن کٹا نالے سے اور شب بیقراری سے کٹی

ایک دن تکتی نہ میں نے وائے حسرت شکل یار — مثل نرگس عمر اپنی انتظاری سے کٹی

مر گئے لیکن نہ کی افسوس کچھ یاد خدا — عمر کٹنے کو کٹی، پر شرمساری سے کٹی

حیف ہے صد حیف ہے افسوس صد افسوس ہے — زندگی طالب تری بے اختباری سے کٹی

# اوراق پارینہ

(۱) دیوان ہمایون بادشاہ، از جناب حافظ شمس الدین احمد صاحب ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج (۲) ادبیات لطافت حصہ عروض مصنفہ قتیل از ق ح و (۳) دیوان راغب [illegible]

## (۱) دیوان ہمایون بادشاہ

ہندوستان کی تاریخ میں ہمایون بادشاہ کی شخصیت نہایت دلچسپ ہے، بابر کی عظیم الشان سلطنت کا وارث ہونا، بھائیوں کی پیہم مخالفت اور غداری، پٹھانوں سے مقابلہ اور شکست، ہندوستان کے تخت و تاج سے دست برداری، مدتوں دشت و جبل میں آوارہ گردی، شاہ ایران کے یہاں پناہ گزینی، شاہ کی مدد سے قندھار و کابل پر قبضہ، وہاں سے پھر ہندوستان پر تاخت، فتح اور بادشاہی، یہ واقعات ایسے ہیں کہ جس شخص کو بھی پیش آتے اس کے سوانح حیات کو رنگین بنا دیتے، لیکن ہمایون ایک رنگین طبع شاعر تھا۔ زمانے کے سرد و گرم چکھنے اور مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کے باوجود اپنی فطری رنگینی سے کبھی محروم نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے واقعات زندگی اپنے اندر ایک ایسی جاذبیت رکھتے ہیں جو پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو تمام تر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اس رنگین مزاج بادشاہ کو مطالعۂ کتب جنگ و جدل سے اور شعر و شاعری اسیر و سفر سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی تھی، مگر جب جنگ و جدل پر مجبور کیا جاتا تھا تو میدان جنگ میں اپنے شیر دل باپ کا خلف الرشید ثابت ہوتا تھا۔ اور جب مصائب حیات کے طوفان میں گھر جاتا تھا تو اس کا عزم و استقلال ساتھیوں کی ڈوبتی ہوئی کشتیوں کی ناخدائی کرتا تھا اور کنارے لگا دیتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ اور پُرلطف بات یہ ہے کہ اس آوارگی کے عالم میں بھی سوائے چند جاں نثاروں کے دنیا میں اس کو کوئی اپنا ہمدرد نظر نہیں آتا تھا اور ہر طرف خطرات و مصائب اور فقر و فاقہ کی ڈراؤنی صورتیں دکھائی دیتی تھیں، اس کی طبعی شگفتگی اپنے جوہر دکھایا کرتی تھی اور موقع موقع سے دلچسپ لطیفے اور رنگین شعر اس کے دماغ سے نکل کر ساتھیوں کی کلفت کو دور کر دیا کرتے تھے۔

ایسے زندہ دل بادشاہ کے کلام کی جس قدر قدر ہونی چاہیے تھی نہ ہوئی، اور آج بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ شاعر تھا اور اس کا دیوان بھی تھا۔ ہاں وہ حضرات جن کی نظر اس عہد کی فارسی تاریخوں پر ہے، خوب واقف ہیں کہ نہ صرف ہمایون بلکہ اس کے خاندان کے اکثر افراد شاعر تھے، اور اس فن لطیف سے خواتین بھی محروم نہ تھیں، اس کی بہن گلبدن بیگم مصنف ہمایون نامہ اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھی، اس کا یہ شعر:-

زہشیارانِ عالم ہر کرا دیدم غمے دارد ۔۔۔ دلا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمے دارد

آج تک زبان زد خلائق ہے، اور واقعی عجیب کیف و سرور سے لبریز ہے، اس کے بھائی عسکری، ہندال، کامران سب شاعر تھے، خصوصاً کامران کی شاعری نہایت رنگین ہوتی تھی اور اپنے اندر ایک امتیازی شان رکھتی تھی، کامران کے دیوان کا ایک نہایت نایاب قلمی نسخہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور میں محفوظ ہے اور جناب پروفیسر محفوظ الحق صاحب ایم اے پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے اس کو اپنے تحشیہ اور تصحیح کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ خود اس کا باپ بابر نہایت قابل ادیب اور اچھا شاعر تھا

اور فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں یکساں طبع آزمائی کرتا تھا۔ فارسی میں اس کا یہ شعر :-

ور ورد و بہار دمے و دلبرے خوش نشست　　　با یکبیش کوش کہ عالم دو بارہ نیست

عجب تازگی اور کیفیت رکھتا ہے۔ جس خاندان کا یہ حال ہو کہ اس کے اکثر و بیشتر افراد تیغ و قلم دونوں کے مالک ہوں اُس میں ہمایوں جیسی ممتاز ہستی کو ممتاز تر ہونا چاہیے تھا اور یہی ہوا۔ وہ نہ صرف تلوار کا دھنی تھا بلکہ قلم کا بھی بادشاہ تھا۔ علوم و فنون سے اس کو خاص شغف تھا۔ ریاضی اور ہیئت کا وہ ماہر تھا، زائچہ و احکام میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ ایجاد و اختراع کا مادہ اس کی طبیعت میں بدرجہ اتم تھا۔ وہ ایسی ایسی چیزیں بنایا کرتا تھا، جو عام لوگوں کے ذہنوں میں بلکہ خواب و خیال میں بھی نہیں آتی تھیں۔ اس کے مخترعات میں سے "باغ رواں" اور "خرگاہ فلکی" اپنی آپ مثال تھے۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ علمی چرچے رہا کرتے تھے اور شعر و شاعری بذلہ سنجی و بدیہہ گوئی گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی، خود بابر کو اس کی ان صفات کا اعتراف تھا اور وہ کہا کرتا تھا کہ ہمایوں　　بہت اچھا رفیق و مصاحب ہے۔

ہمایوں کی شاعری کے متعلق اہلِ تاریخ و سیر کا اتفاق ہے کہ اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ سام مرزا اپنے تحفۂ سامی[1] میں ہمایوں کے متعلق لکھتا ہے کہ " در نظم اشعار خسرو ارباب نظم و در حسن گفتار و حسن المقال سرو فتر ارباب فہم ...... این مطلع زادۂ طبع شریف ایشانست۔ ؎

" آن نہ سرو است کہ در باغ سرافراختہ است　　　شمع سبزیست کہ پروانۂ او فاختہ است "

اسی طرح صاحب تاریخ خاندان تیموریہ[2] اس کے متعلق کہتا ہے کہ " شعر بغایت نیکی می گفت و در انشا ید بیضا داشت " ملا نظام الدین اپنی طبقات اکبری[3] میں فرماتے ہیں کہ " در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود و شعر نیکو گفتے " غرض اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ ہمایوں شاعر تھا اور اچھا شاعر تھا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کلام کا کوئی مجموعہ بھی ہوگا، اس زمانے میں اور اس سے بہت پہلے سے دواوین کا رواج تھا۔ خود اس کے بھائی کامران کا دیوان جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے موجود ہے۔ لیکن ہمایوں کا دیوان کہیں نظر نہیں آتا۔ نہ صرف ہندوستان کے کتب خانے اس سے خالی ہیں بلکہ یورپ میں بھی جہاں ہندوستان کا بیشتر علمی سرمایہ منتقل ہو چکا ہے، اس کا پتا کہیں نہیں چلتا۔ ہمایوں کے متعلق کسی ایسی وارستہ مزاجی کی بھی شہادت نہیں ہے کہ جس سے یہ قیاس ہو سکے کہ اپنے کلام کی تدوین کی طرف اُس نے کبھی توجہ نہیں کی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی زندگی بے اطمینانی اور آوارہ گردی میں گذری اس لیے دیوان

---

[1] تحفۂ سامی مصنفہ سام مرزا صفحہ ۱۶۲ نسخۂ قلمی نمبر ۶۹۲ کتب خانۂ مشرقی بانکی پور۔ پٹنہ۔
[2] تاریخ خاندان تیموریہ صفحہ ۱۹۵ نسخۂ قلمی نمبر ۵۵۱ کتب خانۂ مشرقی بانکی پور۔ پٹنہ۔ یہ نسخہ نہایت نایاب اور بے مثل ہے۔
[3] طبقات اکبری صفحہ ۱۹۲ نسخۂ قلمی نمبر ۵۳۵ کتب خانۂ مشرقی بانکی پور۔ پٹنہ۔

مرتب نہ ہو سکا تو قریب قریب یہی حال اس کے بھائی کامران کا بھی رہا پھر آخر کار دیوان کیونکر مرتب ہو گیا ؟ ہمایوں بادشاہ وقت تھا اور اس کے ادنیٰ اشارے پر اس کا دیوان مرتب ہو سکتا تھا ۔ قیاس یہی بتاتا ہے کہ اس کا دیوان بھی ضرور ہوگا اور اس کی شہادت بھی موجود ہے ۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں صاف لکھا ہے کہ " آنحضرت بشعر و شعر انگیز داشتند و از انجا کہ طبع موزوں از خصائص فطرت سلیم است در خلال اوقات الادت قدسی و اکثر از حقیقت و چہ از مجاز در سلک نظم می کشیدند ۔ دیوان شعر آنحضرت در کتابخانۂ عالی موجود است " ۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہمایوں کا دیوان تھا اور اکبر کے زمانے میں شاہی کتب خانے میں موجود تھا ۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ دیوان کیا ہو گیا ؟ یہ یقینی امر ہے کہ بہت سے ایسے شعرا کے دیوانوں کی طرح جو باوجود حسن کلام مقبول عوام نہیں ہوئے اور ان کی نقلیں کثرت سے نہیں ہوئیں ، ہمایوں کے دیوان کی بھی بہت کم نقلیں ہوئیں ۔ اور جو ہوئیں بھی وہ ضائع ہو گئیں ۔ چنانچہ اکثر تذکروں میں اس کے شاعر ہونے کا ذکر اور اس کے کلام کا نمونہ ملتا ہے مگر اس کے دیوان کا ذکر نہیں ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان کا وہ نسخہ بھی جس کا ذکر ابوالفضل نے کیا ہے ، زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رہا اور جلد ہی ضائع ہو گیا ۔ بہرحال یہ تقریباً مسلم ہو چکا تھا کہ ہمایوں کا دیوان مفقود ہو چکا ہے ۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ راقم کو اس کے عزیز دوست سید حسن عسکری صاحب پروفیسر پٹنہ کالج کی وساطت سے مل گیا ۔ یہ گوہر بے بہا در اصل سید ناصر علی صاحب دیوان کھجوہ ضلع چھپرہ کے موقوفہ کتب خانے میں تھا اور وہیں سے حاصل ہوا ۔ اور جناب نواب سید مبارک علی صاحب نے جو دیوان صاحب مرحوم کے اوقاف کے متولی ہیں خاکسار کو بہ توسط پروفیسر حسن عسکری صاحب اس کی اجازت دی ہے کہ اس دیوان کا ایک تنقیدی اڈیشن شائع کرے ۔ چنانچہ دیوان مذکور کے متعلق تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری ہے اور انشاء اللہ مستقبل قریب میں وہ منظر عام پر آجائیگا ۔

دیوان ہمایوں کا زیر نظر نسخہ کافی قدیم ہے اور ڈھائی تین سو برس سے کم پرانا نہیں معلوم ہوتا ۔ پرانے دیسی کاغذ پر جو نہ صرف کرم خوردہ ہے بلکہ اپنی قدامت کی وجہ سے نہایت کمزور ہو گیا ہے روشن اور خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے ۔ حاشیے پر سنہری جدولیں ہیں اور ہر ورق پر اور مختلف اوراق کے گوشوں پر نہایت خوبصورت رنگین نقش و نگار ہیں ۔ مسٹر ہائٹ بارایٹ لا بانکی پور کا جن کے پاس قلمی نوادر کا بیش بہا خزانہ ہے اور جن کو اسلامی مخطوطات اور تصاویر کے متعلق کافی معلومات ہیں ، یہ خیال ہے کہ دیوان مذکور کشمیری فن کتابت کا نمونہ ہے اور ایرانی فن کتابت کے انداز پر ہے ۔ لیکن اس نسخے میں بہت بڑی کمی یہ ہے کہ نہ تو اس پر کاتب کا نام ہے ، نہ سن کتابت ہے ، نہ کسی کی ملکیت کا کوئی ثبوت ہے ، نہ کسی قدیم شخص کی مہر یا دستخط ہیں ۔ اس اعتبار سے یہ نسخہ دیوان کامران کے نسخے سے جو کتبخانہ مشرقی بانکی پور میں ہے بہت کم رتبہ ہے اور قدامت میں بھی اس سے بہت پیچھے ہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ یہ دیوان ہمایوں ہی کا ہے کسی دوسرے شاعر کا دیوان نہیں ۔ راقم اپنی تحقیقات سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ دیوان بلا شک و شبہ بادشاہ ہمایوں کا دیوان ہے ۔ اس کے دلائل انشاء اللہ آئندہ مضمون میں پیش کیے جائیں گے ۔

---

لہ اکبر نامہ نسخۂ قلمی صفحہ ۱۲۹ جلد اول ۔ کتبخانہ مشرقی بانکی پور پٹنہ ۔

## (۲) دریائے لطافت حصۂ عروض مصنفہ قتیل

یہ حصہ ص ۳۶۶ کے آخر سے شروع ہو کر ص ۳۹۰ پر ختم ہوتا ہے: اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔ جزیرۂ چہارم در عروض ا کیفیت شہر دل آویز دراں تماشائی تواں کرد، ورد ہندی خاص سوائے اردو بیگل نامند۔

قتیل نے عروض کی اکثر اصطلاحوں کو اپنے حال پر رہنے دیا اور ان کا ترجمہ کرنے یا ان کے بدلے ہندی الاصل الفاظ وضع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ان کا سارا زور طبیعت اس پر صرف ہوا ہے کہ تقطیع کے لیے ان الفاظ کی جگہ جو عرب عروضیوں نے تجویز کیے ہیں، جہاں تک ممکن ہو اپنے زمانے کی طوائفوں کے نام بھر دیں، چنانچہ مفاعیلن کی جگہ پری خانم کو دی گئی ہے اور مستفعلن لکھنؤ پہنچ کر چنچل پری بن گیا ہے۔ بقیہ ارکان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

فاعلاتن = نور بائی، متفاعلن = چھوٹ بہنی، مفاعلتن = بنا سی بی، فاعلن = چیت لگن، فعولن = پیاذو، مفعولات = صاحب بخش۔

زحافات یہ ہیں:۔ قلندر و، طاگیر، گجراتی، بی جان، چیت لگن، پیاذو، لگوڑ۔ (ایں لفظ نام ہیچ محبوبہ نباشد بلکہ از جملہ صفات است برمزد وزن، بر و صادق می آید) جان، ابی (جان وجی) و لگوڑ ہر چند نام نمی باشد لیکن در تسمیہ جائے انکار نیست پری خانم سہ کنیز خود را موسم بایں نامہا کرد)۔ البیلی، انمول، چیت لگن، نور بخش، جاوی، گجراتی، بیگمی جان، پری، سجنی، سجنی جان، بی جان، مال دہی، دیدار بخش، گوری، پیاذو، مراد بخش، بڑی پیاذو، راج دلاری، نیری (بزبان برج بمعنی عروس)

قتیل نے تغیر کا نام گھٹ بڑھ رکھا ہے اور زحاف کا سنگار، رکن سالم کو یہ صاحب طائفہ رقاص و خانگی کہتے ہیں اور فروع کو کنیزان خانگی، یا نوچہ۔

اردو ہندی بھاشا کے تعلقات باہمی کے متعلق قتیل کے حسب ذیل اقوال قابل توجہ ہیں:۔

(۱) "در ہندی خاص سوائے اردو بیگل نامند" ص ۳۶۶

(۲) "برائے متفاعلن لفظے در ہندی بنا شد در فارسی ہم نیست الا بزبان برج ایں رکن را بدو لفظ حاصل می تواں کرد مانند چھوٹ بہنی یعنی دیدہ آں زن محبوبہ" ص ۳۷۲

(۳) "البیلی لفظ اردو نیست، لیکن چوں الفاظ برج در زبان اردو مستعمل است بنا بر ضرورت مثل چھوٹ بہتی ایں ہم مضائقہ ندارد" ص ۳۷۷

(۴) زبائی از دو نور سن و جمال در برج۔ انمول بر وزن فعلات بمعنی بے قیمت ملقب شد ایں لفظ اردو بود لیکن از جہت فقدان نفاست (یعنی ن) زبان اردو تماند ص ۳۷۸ قتیل نے اس باب میں مختلف شعرا کے حسب ذیل اشعار اور مصرعے نقل کیے ہیں، اور چار شربت کا بھی ایک جگہ حوالہ دیا ہے:۔

(۱) ہم ہیں قربان ان اداؤں کے
(۲) جہاں میں جنس مروت کا جا بجا ہے قحط — میں جانتا ہوں کہ دشمن مرا ہے یار مرا
کچھ تعجب نہیں اگر یہ شعر خود قتیل کا ہو۔
(۳) ہمارے پاس تراجب کسی نے نام لیا — (۴) کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا
(۵) ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی — (۶) میں ڈھونڈھتا ہوں ڈھونڈھے دلبر کو گلی گلی گھر بگھر یارو
(۷) در فراق او ہری فرض کن کہ شبہا را — جری شیرازی — می تواں بروز آورد روز را کسے چہ کند۔
(۸) جو کوئی ہم سے ستم کشوں کو عبث ستا کر خفا کریگا — انشا — یہی کہیں گے کہ جاؤ صاحب خدا تمہارا بھلا کریگا
(۹) نور تجلی شعلہ روئے دود لطیفش زلف چلیپا — قتیل — صبح قیامت چاک گریباں فتنۂ دوراں قامت زیبا

(۳) **دیوان راغب** "تذکروں میں راغب کا نام محمد جعفر خان درج ہے۔ لیکن کاتب دیوان نے جعفر علی خان لکھا ہے۔ ان کے حالات زندگی کسی دوسرے موقع پر پیش کیے جائیں گے۔ اس وقت صرف اسی قدر کافی ہے کہ ان کا اصلی وطن پانی پت تھا۔ لیکن ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ نواب لطف اللہ خان صادق کے پوتے تھے۔ تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ جاکر فارسی میں مرزا فاخر کے شاگرد ہوئے تھے۔ وہاں سے عظیم آباد آئے تھے اور یہاں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۱۵۹ھ اور سال وفات ۱۲۱۲ھ ہے۔ علاوہ ان تصانیف کے جو فارسی میں ہیں، اردو کا ایک بڑا دیوان اور دو چھوٹے دیوان مرتب کیے تھے۔ ان کی تصانیف بہت کمیاب ہیں۔ اردو کے ایک مختصر سے دیوان کے علاوہ جو کتب خانہ مشرقی بانکی پور میں موجود ہے ان کی کوئی تصنیف ہماری نظر سے نہیں گزری ہے۔ دناصحی کا یہ قول کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کے کتب خانے میں راغب کا دیوان موجود ہے صحت سے دور ہے۔ اس کتب خانے میں راغب تخلص کے ایک شاعر کا دیوان ضرور موجود ہے، لیکن وہ ترکی زبان میں ہے۔
دیوان راغب چھوٹی تقطیع کے ۳۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ ابتدا کے کچھ ورق (ایک یا دو) غائب ہیں۔ آخری ورق موجود ہے لیکن اس کے قبل کے کچھ ورق ضائع ہو گئے ہیں۔ انتیسواں ورق اس مصرع پر ختم ہوتا ہے "مستی چشم بتاں تو ہی ہے" اشارۂ کاتب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کا ورق "لن ترانی" سے شروع ہونا چاہیے۔ لیکن تیسویں ورق کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ہر تار ساتھ اس کے ہے وابستہ میری جان — کاکل کا تیری ایسا گرفتار کون ہے۔

کیڑوں نے اس نسخے کو بہت خراب کر دیا ہے۔ صحاف نے بڑی محنت سے اسے درست کیا ہے، لیکن بہت سے اشعار بالکل ضائع ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کے بعض الفاظ غائب ہیں۔ مسطر پندرہ سطروں کا ہے، لیکن کوئی صفحہ ایسا نہیں جس میں ۱۵ اشعار ہوں۔ آجکل اس نسخے میں ۳۱۰ اشعار موجود ہیں کاتب نے یقیناً اس سے زیادہ لکھے تھے۔ کتاب کی ابتدا مصنف کے دیباچے سے ہوتی ہے جو بجنسہ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔
" دنا العشق است در سنہ یک ہزار و ... دو ہست ہجری نبوی بعد تدوین کلام فارسی و ترتیب گلزار جعفری و رز جعفری،

و بہار جعفری کہ ہر یک نسخہ ایست علیحدہ مرتب ساخت و کوس شاعری در قلمرو سخندانی با ایں ہمہ نادانی نواخت ازجناب آفرینندہ سخن آفرینان چشم آن است کہ از چشم بد بیناں و نکتہ چینیاں محفوظ گرداند و قبول طبائع منصفان سخنداں رساند تا وسیلۂ یادگار ایں بدکردار شود، و ایں ذرّۂ بے مقدار از گوشۂ ضمیر خورشید نظیر اجلا .. اعزہ استقبال برد۔ زیادہ سکوت بجز خاموشی خوشتر، شعر نثری :-

"کم خندہ و تبسم، بسیار چشم تر بہ     جز تعمۂ غم دوست ہر تعمۂ منقر بہ"

و السلام احسن الکلام تمت کلام دیباچہ

دیوان کے پہلے صفحے میں ۸ شعر اور ایک مصرع ہے۔ پہلی غزل کے تین شعر یہ ہیں :-

مقدور ہے انساں کو کہاں اس کی ثنا کا    مطلع بر دیوان    بندے سے بھلا وصف ہو کس طرح خدا کا

روشن ہے جہاں اس کی تجلی سے سراسر     خالق ہے وہی مہر و مہ و ارض و سما کا

ممنوں ہیں ترے غلم کے مشکور جفا ہیں     توحیف نہیں قدر شناس اہل وفا کا

ایک غزل میں اپنے مذہبی خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنے کلام کی مقبولیت کی دعا کی ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں :-

۱   درخواست مری تجھ سے ہے یہ بار خدایا    گفتار کا میری ہو مددگار خدایا

۲   ہو سحر سے ما نا مری گفتار خدایا    تاثیر سخن میں ہو مرے حد سے زیادہ

۳   مقبول جہاں ہوں مرے اشعار خدایا    رہتا ہوں شب و روز میں تجھ سے یہی خواہاں

۵   شافع ہو مرا حیدر کرار خدایا    خالق قیامت کے غلاموں میں سمجھ کر

۶   وے آل پیمبر جو ہیں اطہار خدایا    ان کی نگہ لطف رہے حال پہ میرے

ایک شعر میں اپنے استاد مکین سے استفادے کا اعتراف کیا ہے :-

"ہوا .. مرتب شکر صد شکر     مکیں کے فیض سے دیوان راغب"

فراق دہلی میں ایک شعر کہا ہے :-

"تازہ ہیں دلی کی فرقت میں ہمارے دل کے داغ     .. آنکھوں میں ہماری باغ ہے ویراں ہنوز"

ایک مقطع میں میر کے ایک مصرع کی تضمین کی ہے :-

راغب یہ مضطرب ہے نہایت بقول میر     "سمجھاؤں کس طرح دل خانہ خراب کو"

تعلی کا انداز نہیں ہے لیکن اس رنگ کا صرف یہی شعر دیوان میں ملا ہے :-

راغب کے تئیں کیسے گر استاد بجا ہے     اس کا تو ہر اک شعر ہے دیوان کے برابر

ایک شعر میں نام کی رعایت معلوم ہوتی ہے :-

پھولی یہ جبنری ہے گلستان عشق کی / راغب کا جو لباس ہے اے مہربان زرد

ذیل میں ان کے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں :-

اے خوشا دل کہ ہمت بے پندار رہا / آئے غفلت کدۂ دہر میں ہشیار رہا

پھولتے ہی رہے ہر لحظہ گل داغ اس کے / ساحت سینہ مرا گلکدۂ گلزار رہا

نہیں شاہوں کے در پر شوق ان کو جبہہ سائی کا / جنھوں کو یار کے کوچے میں دعویٰ ہے گدائی کا

ان دنوں جوش پہ یہ دیدۂ تر ہے اپنا / کام اب گریہ وزاری پر شام و سحر ہے اپنا

آگے جائیں تو کہاں جائیں ہم آوارۂ شوق / کوچۂ یار ہی تک سیر و سفر ہے اپنا

صد پارہ ہوا آہ دل اپنا جگر اپنا / اے آہ عجب تو نے دکھایا اثر اپنا

از بس کہ نم آلود ہی پایا اسے عمر بھر / سوکھا نہ کبھو دامن مژگان تر اپنا

ہمارا سیل اشک آخر ہمارے تا گلو پہنچا / ہم ایسے روئے تجھ بن پر نہ ہم تک آہ تو پہنچا

نہ جرأت ہو سکی حرف و حکایت کی حضور اس کے / رہے خاموش ہم جب آہ وقت گفتگو پہنچا

بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور اس گل کا اب / ہماری بزم عشرت میں جو تو لے کر سبو پہنچا

نہیں کوئی گلی ایسی جہاں چرچا نہیں میرا / مری آوارگی کا شور اب تو کو بکو پہنچا

خفا ہو کر یہ بولا پھر تو آیا سامنے میرے / جو میں میں بعد یک مدت کل اس کے روبرو پہنچا

مجھے بخت رسا پر اس کے راغب رشک آتا ہے / حریم وصل میں جو یار کے بے جستجو پہنچا

ہے آٹھ پہر میرے تئیں دھیان کسو کا / میں محو خود رفتہ ہوں ہر آن کسی کا

کیا جانیے کوئی جان سو جاتا رہے تجھ بن / کہتا ہوں نہ جا یاں سے کہا مان کسی کا

پردہ جو تو نے مکھڑے سے اپنے اٹھا دیا / دل سے ہمارے طور کا جلوہ بھلا دیا

جب تلک میں نہ جان سے گزرا / وہ نہ یک امتحان سے گزرا

موم سمجھے تھے دل یار سو آہن نکلا / جانتے تھے جسے ہم دوست سو دشمن نکلا

سینہ چاکی و جگر کاوی کسے آتی تھی / ہم ہی دو چار دوانوں سے یہ فن نکلا

دونا ہوا غرور مرے مست ناز کا / خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا

دلا صبح چمن کی سمت ہوس کر / خیال شام مرغان قفس کر

دل پر شور راغب کے تو آگے / نہ یہ ہرزہ درائی اے جرس کر

کیا ضبط اس کے ڈر سے نالہ و زاری کو میں یاں تک / کہ آہیں لب تک آکر پھر گئیں اور اشک مژگاں تک

گئے خنداں ہوں اپنے حال پر اور گہ گریاں ہوں — عجب حالت ہے میری اے عزیزو سخت حیراں ہوں
نہ ہو آوارہ اے شور جرس میری تگ و دو میں — کہ میں وحشت زدہ دور آپ ہی قید بیاباں ہوں
سخن کی تہ کو جو پہنچے وہی پائے مجھے راغب — کہ ہوں میں معنیٔ نازک سخن میں اپنے پنہاں ہوں

منزل کبھی نہ پہنچے از بسکہ ناتواں ہوں — پس ماندہ ہوں کارواں کا میں گرد کارواں ہوں
میں مرغ پر شکستہ ہوں ننگ بوستاں کا — نہ زینت قفس ہوں نہ زیب گلستاں ہوں

تازگی ہر لحظہ ہے داغ دل ناکام کو — چراغ ایسا نہیں جس کو جلائیں شام کو

مثل گل اس باغ سے سب ہوئے خنداں لے چلے — شبنم آسا چشم گریاں ہم پریشاں لے چلے

سفر کا عزم ہے اس کو کہو اس آفت جاں سے — اتی منت بڑھ کے کرنا حسرت دل کے بیاباں سے

دیوان کا آخری شعر یہ ہے:-

بجھ گلی میں پھرے ہے راغب آج — دل کے ٹکڑے بغل میں مارے ہوئے

خاتمہ:- تمام شد نسخہ دیوان راغب کہ اسم مبارک شاں نواب جعفر علی خاں بود۔ بتاریخ سوم ماہ شوال روز پنجشنبہ از خط خام احمد حسین۔

کاتب کچھ بہت خوشخط نہیں، ذی علم بھی نہیں معلوم ہوتا، نقارہ کو ایک جگہ نقنارہ لکھا ہے، اس قسم کی اور غلطیاں بھی ہونگی۔

راغب کی زبان وہی ہے جو مصحفی وغیرہ کی ہے، ان کا پایۂ شاعری چنداں بلند نہیں، غزلوں میں اشعار کی تعداد کم ہوتی ہے۔ بعض زمینوں میں تو صرف دو تین شعر ہیں، بعض زمینوں میں دو غزلے بھی لکھے ہیں۔ لیکن اس پر بھی اشعار کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔

---

۱ گلزار ابراہیم مطبوعہ و قلمی، ۲ نشتر عشق قلمی جلد اول، ۳ تذکرہ عشقی قلمی، ۴ نشتر عشق جلد اول، ۵ تذکرہ عشقی، ۶ تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی میں

۷ اس تعداد میں وہ اشعار شامل نہیں جن کے دو دو تین تین لفظ دیوان میں باقی رہ گئے ہیں یا جن کی جگہ پر سادہ کاغذ چسپاں ہو گیا ہے، جہاں پر یک ہزار دو صد و ہشت ہوگا، جہاں جہاں نقطے دیے ہوئے ہیں وہاں سے الفاظ غائب ہیں، ۸ دہلی کا نام ایک اور شعر میں آیا ہے۔

اس شوخ تیز باز کی پلکوں کو یاد کر — دہلی میں گر ہیں روؤں تو پہنچے دکن میں آب

۹ یہ غزل ہولی کی تعریف میں ہے، مطلع اور بعض اشعار یہ ہیں:-

ہولی میں ہو گیا ہے جو سارا مکان زرد — محفل ہر اک ہے جوں چمن زعفران زرد
دعوت میں کس طرح نہ زعفر ہو جا بجا — مہماں سے لے کے آتے ہیں تا میزبان زرد
بندہ ہو جو زرد و پوش نہ کیوں جیب کر ہولی میں — پہنے لباس صاحب والا مکان زرد

(صاحب والاشان سے کوئی انگریز تو نہیں؟)

# غالب

(۱) پنج آہنگ غالب، از ق ع و (۲) غالب کے دو لطیفے، از ق ع و
(۳) سراپا سخن اور غالب، از ق ع و (۴) تذکرۂ سرور اور غالب

## پنج آہنگ

پنج آہنگ، ۸½ انچ × ۵½ انچ تقطیع کے ۲۴۴ صفحوں کی کتاب ہے۔ پہلے صفحے پر عبارت ذیل درج ہے:۔

بحمد توفیق ایزد متعال کتاب در علم قواعد فارسی و اشتقاق و تقسیم الفاظ و انشائے رنگین بہر قسم مصنفۂ نخلۂ ارباب جود و کرم محیط فیض اتم شہنشاہ ممالک علوم عربی و فارسی ملک الشعرائے دوراں جناب فرخندہ خطاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ دام اقبالہم در مطبع دار السلام دہلی خاص جنب اقل العباد عنایت حسین بتصحیح حضرت المصنف دام برکاتہم باہتمام نور الدین احمد لکھنوی در ماہ اپریل سنہ ۱۸۴۹ء بحلیۂ اختتام پوشید فقط

[پنج آہنگ]

دوسرے صفحے میں ۶ سطریں ہیں، تیسرے سے ۵۰ تک ہر صفحے میں ۱۲ سطریں، اس کے بعد سے آخر تک ہر صفحے میں ۱۵ سطریں۔ پہلے صفحے کی پہلی سطر یہ ہے:۔ "بعد تقدیم نیایش دادار جہاں آفرین و تمہید ستایش حضرت سید المرسلین"

دیباچہ علی بخش خان خلف الہی بخش خان معروف کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے، کہیں کہیں اصل فارسی عبارت بھی قوسین کے اندر نقل کر دی گئی ہے:۔

علی بخش خاں، دہلی میں کم رہتے تھے، ان کا زیادہ وقت فیروزپور میں ان کے چچا فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ کے ساتھ گزرتا تھا۔ ("در سایۂ رافت آں والا پایہ پرورش می یافتم") فیروزپور میں ہر قسم کا عیش و آرام مہیا تھا اور امیروں کے لڑکوں کی طرح لہو و لعب میں وقت صرف کرتے تھے۔ شباب کی ابتدا تھی، اور ہر قسم کی فکر سے آزاد تھے۔ میرزا غالب کو علی بخش خان سے دہرا رشتہ تھا، انہیں اس کا خیال رہتا تھا کہ کچھ لکھ پڑھ لیں ("مصرفے ... روزگاری من ... دانست") علی بخش خان نے میرزا سے درخواست کی کہ چند اوراق میں ایک ایسا رسالہ لکھ دیجیے جس سے ہر قسم کے لوگوں کو خط لکھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ ("حسب التماس من ورقے چند از آداب و القاب و شکر رسید خطوط و شکوۂ عدم رسید مکاتبات بر من عطا نمود") میرزا نے ان کی خواہش کے مطابق رسالہ لکھ کر ان کے حوالہ کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد میرزا کا کلکتہ جانا ہوا اور اس کے بعد ہی احمد بخش خان کا انتقال ہو گیا۔ ("عم نامدار کہ شفقت پدری بجگر رحمت ایزدی از ذوات بار ... برداشت") ان کے بڑے بیٹے شمس الدین خان جانشین ہوئے، یہ بالکل ناتجربہ کار تھے، اوباشوں کی صحبت میں انہوں نے برے ڈھنگ اختیار کیے، ریاست کا انتظام بالکل ابتر ہو گیا۔ علی بخش خان کو ترک وطن کرنا پڑا۔ لکھنؤ اور بھرت پور گئے، لیکن وہاں کامیابی کی صورت نہ نکلی۔ ۱۸۳۵ء کی ابتدا میں شمس الدین خان کا حادثہ ہوا۔ اس کے بعد علی بخش خان بھرت پور سے دہلی پہنچے اور میرزا غالب کے یہاں مقیم ہوئے۔ اس زمانے میں میرزا کا دیوان (مسمی بہ "میخانۂ آرزو سرانجام است تازہ فراہم آمدہ") مرتب ہوا تھا، علی بخش خاں اور میر حسین نے میرزا سے

اس کی نثر سبقاً پڑھی، ان کے دل میں خیال گزرا کہ دیوان سے اگر نثر نکال لی جائے اور اس میں وہ رسالہ جو میرزا نے ان کے لیے لکھا تھا، اور متفرق عبارتیں شامل کر دی جائیں تو ایک کتاب مرتب ہو جائے، حکیم رضی الدین حسن خاں بہادر اور میر محمد حسین خاں کا اصرار اور یہ خیال کہ یہ کتاب غلام فخر الدین خاں کے کام آئیگی، ان کے ارادے کو پختہ کرنے کا باعث ہوا اور پنج آہنگ تیار ہو گئی۔ کتاب کے پانچ باب ہیں۔ پہلے میں یہ بتایا ہے کہ خط کس طرح لکھا جائے، کون کس طرح مخاطب کیا جائے اور اسی قبیل کی دوسری باتیں۔ دوسرے میں مصادر، مصطلحات، و لغات فارسی درج ہیں، تیسرے میں میرزا کے اشعار ہیں جو خط لکھنے والوں کے لیے کار آمد ہیں، چوتھے میں میرزا کے لکھے ہوئے خطبے اور تقریظیں اور متفرق عبارتیں ہیں، پانچویں میں میرزا کے خطوط ہیں۔

آہنگ اوّل: میرزا کی تمہید کا خلاصہ اردو میں یہ ہے کہ ۱۲۲۱ھ میں انگریزوں نے بھرت پور پر لشکر کشی کی تھی اور قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، میرزا اور علی بخش خاں اس یورش میں احمد بخش خاں کے ساتھ تھے۔ میرزا نے (عمر غالب معتد الملک ہے) علی بخش خاں نے فرمایش کی کہ ایک رسالہ ایسا لکھ دیجیے جس سے خط لکھنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ میرزا نے ان کی فرمایش کو منظور کیا اور مختصر سا رسالہ لکھ دیا، باوجود اس کے کہ میرزا کی روش کے یہ بات خلاف تھی کہ دوسروں کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے مطابق القاب و آداب لکھیں، اور خیریت گوئی اور عافیت جوئی کو وہ بالکل فضول جانتے تھے، میرزا کے الفاظ یہ ہیں:-

"بیگانگی ایں روش از شیوۂ غالب ستمند نہ چنداں است کہ بہ گفتن نیاز داشتہ باشد و داد شناس داند کہ ہنجار من در نگارش این است کہ چوں کلک و ورق بگیرم مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ زاخور حالت اوست در سر آغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زاید است ... و عزیزے ناشناسد کہ دریں شیوہ گنجایش سخن گستری تا کجاست۔"

اس کے بعد میرزا نے یہ بتایا ہے کہ خط کی عبارت کس طرح کی ہونی چاہیے، میرزا کی ہدایتوں کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) لکھنے میں گفتگو کا رنگ ہونا چاہیے۔ (۲) عبارت ایسی نہ ہو جس کا سمجھنا دشوار ہو (۳) اگر خط میں کئی باتیں لکھنی ہیں تو اس پر غور کرنا چاہیے کہ کسے مقدم رکھا جائے اور کسے مؤخر (۴) بات کو پیچ دے کر نہیں کہنا چاہیے (۵) دقیق استعاروں، مشکل و نامانوس لفظوں سے بچنا چاہیے (۶) مکتوب الیہ کے رتبے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے (۷) طوالت اور تکرار الفاظ سے احتراز چاہیے (۸) قواعد مقررہ کی پابندی ضروری ہے اور لوگوں کے مذاق کا خیال ضرور کرنا چاہیے، لیکن نظم کی میں ہندوستانی فارسی نویسوں کے تصرفات کو قبول نہیں کرنا چاہیے، عربی الفاظ ضرورت سے زیادہ نہ استعمال کیے جائیں۔ (۹) معاملات کے خطوط میں خاص طور پر ان خطوط میں جو حکام کے پاس بھیجے جائیں، مبالغے اور اغراق سے بچنا ضروری ہے، اشاروں اور استعاروں سے کام نہ لیا جائے۔ لہجہ سنجیدہ، زبان نرم اور آسان ہونی چاہیے۔

اس کے بعد ہر درجے کے لوگوں کے القاب ہیں، گورنر جنرل کے لیے یہ القاب:-

جناب مستطاب، معلی القاب، جہانیاں مآب، انجم جاہ، انجم سپاہ، سپہر بارگاہ نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ وزاد افضالہ۔

القاب میں ایک آدھ جگہ قبلہ گاہی بھی آیا ہے، بظاہر ہندوستانی فارسی دانوں کا یہ تصرف مرزا کی نظروں میں مقبول تھا۔ دوسرے اور تیسرے ابواب میں کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ ان کے متعلق اوپر جو کچھ لکھا جا چکا ہے کافی ہے۔ چوتھے باب کے مندرجات کی فہرست یہ ہے:-

(۱) دیباچۂ دیوان فارسی (۲) دیباچہ گل رعنا (۳) دیباچہ دیوان ریختہ (۴) خاتمۂ گل رعنا (۵) خاتمۂ دیوان فارسی (۶) تقریظ تذکرۂ اردو تالیف نواب مصطفی خان بہادر (۷) نثر جو قصیدۂ مدحیہ کے عنوان کے اوپر لکھی گئی تھی (۸) نثر جو دیوان ریختہ کی پشت پر لکھ کر امام بخش ناسخ کو بھیجی گئی (۹) نمودار صبح (۱۰) ظلمت شب (۱۱) تقریظ دیوان حافظ (۱۲) دیباچۂ دیوان مرزا رحیم الدین بہادر (۱۳) عبارت در صفت مقطع الحروف (۱۴) عبارت تقریظ رسالہ [illegible] صنعت تعطیل (۱۵) دیباچۂ دیوان ہرگوپال تفتہ (۱۶) تقریظ آثار الصنادید (۱۷) دیباچۂ دیوان ریختہ نواب حسام الدین حیدر خان بہادر نامی (۱۸) دیباچۂ تذکرۂ طلسم راز مؤلفہ میر مہدی۔

---

۱؎ شمس الدین خان کو پھانسی کی سزا ملی

۲؎ علی بخش خاں کے بیٹے

---

# غالب کے دو لطیفے

(۱) پرانے زمانے میں راجا بھرت پور کے یہاں ایک منشی تھا جسے انشا پردازی کا سلیقہ تو نہ تھا لیکن باتیں خوب بناتا تھا۔ راجا کسی بات پر اس سے خفا ہو گیا، اور ایک نیا منشی بحال ہوا۔ پرانے منشی کو بہت ناگوار گزرا اور اس فکر میں رہنے لگا کہ کسی طرح نئے منشی کو ذلیل کرے۔ ایک دن نیا منشی راجا کی طرف سے ایک سردار کو جو راجا کے دوستوں میں تھا اور جس کی خاطر راجا کو بہت عزیز تھی، خط لکھ رہا تھا۔ پرانا منشی سرنامے کو دیکھ کر مسکرانے اور منھ بنانے لگا۔ راجا اس وقت تو کچھ نہ بولا لیکن جب خلوت ہوئی تو پرانے منشی کو بلا کر راجا نے اس حرکت کا سبب پوچھا۔ اس نے پہلے تو راجا کی مدح میں زبان کھولی اس کے بعد بولا کہ حضور! ہم لوگ پرانے نمک خوار ہیں۔ سرکار کا ہمیشہ بھلا چاہتے ہیں۔ نئے ملازموں کو اس کی کیا پروا۔ یہ دلی والے تو خاص طور پر نمک کا پاس نہیں کرتے ہیں سردار صاحب کو برابر والا تعظیم مہربان بڑی طرح سے لکھا کرتا تھا اس نئے منشی نے انہیں مہربان چھوٹی طرح سے لکھا ہے۔ اب جو وہ یہ فرق دیکھیں گے تو حضور کی طرف سے ان کے دل میں غبار آئیگا

یا نہیں؟ یہ بات راجا کے دل کو لگ گئی۔ منشی کو بلا کر بہت خفا ہوا اور کہنے لگا کہ جب ہماری طرف سے
برابر بڑی طرح سے مہربان لکھا جاتا ہے تو تم نے سردار صاحب کو چھوٹی وجہ سے مہربان کیوں لکھا۔ منشی صاحب برطرف
ہوئے اور مرزا نے اپنی جگہ پر آ گئے۔ (ماخوذ از پنج آہنگ ص ۲۰ و ۲۱)

(۲) مرزا کے ایک شناسا یا دوست الف بیگ نامی تھے۔ ان کے یہاں بڑھاپے میں لڑکا ہوا۔ مرزا سے درخواست
کی کہ نام رکھ دیجیے۔ مرزا نے حمزہ بیگ نام رکھا اور خط تہنیت کے ساتھ یہ رباعی لکھ بھیجی۔

چوں الف بیگ در کہن سالی ۔۔۔ پسرے یافت مہر بسر عزّہ
نام او حمزہ بیگ کردیم ۔۔۔ الف تنہی بود ہمزہ (پنج آہنگ ص ۲۲۵)

# سراپا سخن اور غالب

سراپا سخن کا سال تکمیل ۱۲۶۹ھ ہے۔ اس تذکرے میں مرزا کا حال اور ان کی ایک غزل درج ہے۔

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ولد عبد اللہ بیگ خاں قوم ترک اولاد میں گشتاسپ کے، مولد اکبرآباد، مسکن دہلی
دیوان فارسی اور ریختہ اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے۔ مشاہیر شعرائے دہلی ہیں۔ مولف کو یہ غزل اپنے خط میں شیخ
فدا حسین فدائی قصبۂ دیبائی سے بھیجی تھی۔

"وہ سادگی سے جان پڑے کوہکن کے پاؤں ۔۔۔ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں"

کل ۹ شعر ہیں۔ شعر ذیل دیوان مطبوعہ میں نہیں۔

بیچارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی ۔۔۔ کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں

جن صاحب کا تخلص فدائی لکھا ہے ان کے بارے میں ۱۳۰ پر لکھا ہے "شیخ فدا حسین فدا خلف شیخ کریم اللہ باشندۂ قصبہ
دیبائی ضلع بلند شہر، صاحب دیوان، ارشد تلامذۂ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ"

مرزا نے اس تذکرے کے لیے ایک قطعۂ تاریخ بھی لکھا تھا جو کتاب کے ص ۲۹۲ اور ۲۹۳ پر درج ہے:-

اس کتاب طرب نصاب نے جب ۔۔۔ اور پھر بند سے تھا بارہ کا ۔۔۔ سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
آب و تاب اس طرح کی پائی ۔۔۔ بارہ اماں ہزار زیبائی ۔۔۔ بہ امید سعادت افزائی
فکر تاریخ سال میں مجھ کو ۔۔۔ سال ہجری تو ہو گیا معلوم ۔۔۔ غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم
ایک صورت نئی نظر آئی ۔۔۔ بے شمول عبارت آرائی ۔۔۔ جن سے ہے چشم جاں کو بینائی
بندے پہلے سات سات کے دو ۔۔۔ مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو ۔۔۔ اور بارہ امام ہیں بارہ
دیے ناگاہ مجھ کو کھلائی ۔۔۔ ہے جدا گانہ کار فرمائی ۔۔۔ جن سے ایمان کو ہے توانائی

ان کو غالبؔ یہ سال اچھا ہے جو ایسے کے ہیں تو لائق۔

غالب مادۂ تاریخ نکالنے سے گھبراتے تھے۔ طلسم راز سنہ میر مہدی کی تاریخ بھی انھوں نے اسی طرح نکالی ہے۔

# تذکرۂ سرور اور غالب

تذکرۂ سرور میں غالب کا ایک شعر ہے جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں، لیکن یہ شعر یا تو غلط نقل ہوا ہے یا اصل نسخے ہی میں صحیح درج نہیں (مئی کے معیار میں غالب کے اشعار اس تذکرے سے لے کر درج کیے جا چکے ہیں)

جگر سے ٹوٹنے ہوئے کی سناں پیدا دہان زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

میرزا کے متعلق سرور نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ بعض الفاظ چھوٹ گئے ہوں:-

« اسد اللہ خان است، عرف مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش اکبرآباد، جوان قابل یارباش، درد مند، ہمیشہ بخوشی معاش بسر بردہ، ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن، غنچہائے عشق مجاز تربیت یافتہ نم گرد نیاز، در فن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا بیدل در ریختہ و محاورات فارسی موزوں می کند۔ الحمد موجد طرز خود است، و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ مضامین موزوں کردہ، رونیۂ خیال بندی بیش از بیش نہاد خاطر [illegible]۔ (عمدۃ المنتخبہ نسخۂ قلمی دفتر ہند لندن)

اعظم الدولہ سرور ساکن دہلی سے تھے، ان کا سال ولادت معلوم نہیں، لیکن قرائن سے الٰہی بخش خان معروف کے ہم عمر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا تذکرہ عمدۃ المنتخبہ سنہ ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں شروع ہوا اور نو دس برس میں اس نے کتابی شکل اختیار کرلی، جگر اس کے بہت بعد بھی اس میں اضافے ہوتے رہے۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو غالب کا حال اس میں نہ ملتا کیونکہ غالب کی پیدائش سنہ ۱۲۱۲ھ کی ہے۔ سرور اور معروف کے مساویانہ تعلقات ہوں گے، معروف نے اپنے دیوان دوم میں یاد کیا ہے:-

« لکھ غزل اک اور بھی معروف سرور کے لیے آج اس پر نکتہ فہمی نکتہ دانی ختم ہے »

غالب سے بھی باوجود تفاوت عمر دوستانہ تعلقات تھے، سرور غالب سے ملنے آیا کرتے تھے، اور غالب نے انھیں مرزا طپاں ابن ہادی بیگ خاں مقیم کلکتہ کا حال اور کلام بھی دیا تھا کہ اپنے تذکرے میں داخل کریں، جیسا کہ پنج آہنگ ص ۳۲۲ اور ۳۳۹ کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ طپاں کا حال کسی وجہ سے تذکرۂ سرور میں داخل نہ ہو سکا۔

---

۱؎ طبع سوم ص ۳۳۷۔

طبع اول ۱۳۷۷۔

# بہار و بنگالہ

(۱) ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد۔ ماخوذ از مرآۃ الاحوال، آقا بہبہانی، مترجمہ جناب یوسف الدین احمد بلخی صاحب ایم اے۔

(۲) بنگال کا پہلا گلدستہ، ایک بہاری کا ادبی کارنامہ، نتیجہ فکر، از جناب حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب۔

## ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد

ماخوذ از مرآۃ الاحوال آقا بہبہانی۔ مترجمہ جناب یوسف الدین احمد بلخی

آقا محمد حسن، طاب اللہ ثراہ اور ... میر صفدر علی لکھنوی، خلف سید بہر علی موسوی کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر عظیم آباد کی طرف چلا۔ میر صاحب، نہایت مقدس اور صالح آدمی ہیں۔ راستہ خوش صحبت رفیقان سفر کی وجہ سے بہت اچھی طرح کٹا۔ ماہ مذکور کو رات کے تقریباً دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ہم لوگ جنت البلاد عظیم آباد پہنچے۔ پائین مدرسہ سیف خان کشتی باندھ دی اور خود مدرسے میں قیام کیا۔ ... سید کاظم علی خان بہادر اور ... امیر علی خان صاحب اور دوسرے اعزہ اسی شب ملاقات کے لیے آئے۔ دن کو ... مہاراجا تجاؤلعل ... نواب ... عباس قلی خان بہادر نصرت جنگ ... خلف ... نواب ... منیر الدولہ بہادر ... کے ساتھ تشریف لائے۔ رمضان قریب تھا، میں یہیں ٹھہر گیا، اعزہ اور معتقدین، میرے دل کو خوش رکھتے اور مسائل کی تحقیق کرتے رہتے۔ دوستوں کی مہربانی اور محبت کی بدولت یہ مہینا بڑے لطف سے کٹا۔ ... سلالۃ السادات، علامی فہامی آقا سید حسن، داماد جنت آرام گاہ جناب مرزا محمد مہدی شہرستانی۔ قبل ہی سے اس شہر میں وارد تھے اور اب فیض آباد اور لکھنؤ کی طرف جانا چاہتے تھے۔ انہیں تامل تھا کہ فیض آباد و لکھنؤ میں کسے ترجیح دیں۔ انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا، میں نے فیض آباد کے حق میں رائے دی، اسے قبول کر کے فیض آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈھاکے میں مجھے ان کا خط ملا جو بنارس سے انھوں نے لکھا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے بنارس سے لکھنؤ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے حیرت اور پریشانی ہوئی، اس لیے کہ یہ ابن حسین ہیں اور وہ گروہ دیکھا گیا ہے کہ دوں کے منافق ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ خدا انہیں محفوظ رکھے۔

عالی شان ... مسٹر ہنری ڈگلس صاحب بہادر کہ جج اور مجسٹریٹ یعنی اس شہر کے صاحب عدالت دیوانی و فوجداری ہیں، اپنے ابنائے جنس میں نہایت ممتاز ہیں، صفات حمیدہ اور فضائل جمیلہ سے متصف ہیں اور ہمیشہ لوگوں کی بھلائی کی راہ نکالنے میں معروف رہتے ہیں۔ جب میرے آنے کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنی سرکار سے ایک ہرکارہ مقرر کر دیا کہ میرے پاس حاضر اور میرے احکام کی تعمیل کرتا رہے۔ اس شہر کے صاحب عدالت اپیل ... ناظم الملک صمصام الدولہ مسٹر ہاکنس صاحب بہادر ہیں جو فرقۂ انگریز کے منتخب شرفا میں ہیں اور طبقۂ امرائے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں ہر ملت اور طریقے کے ارباب کمال اور ناموران علم سے ملنے کا شوق ہے۔ علوم و ادبیات عربیہ سے انہیں اتنی واقفیت ہے،

کر اپنے امثال و اقران میں درجے آگے ہیں۔ اس شہر کے صاحبان عدالت میں سے۔۔ مسٹر کرتی ہمت صاحب بہادر بھی ہیں، یہ بھی اپنی قوم کے اچھے لوگوں میں ہیں، اور انہیں بھی باکمال اور دانشمند۔۔۔ لوگوں کی ہم نشینی سے رغبت ہے یہ بھی دو صاحبوں کی طرح جن کا ذکر اوپر گزرا ہے، نہایت متدین ہیں، کسی فریق کی پاسداری نہیں کرتے اور ذرا سی توجہ سے مشکل سی مشکل باتوں کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں۔

میں اسی شہر میں تھا کہ مرشد آباد سے محترمہ مکرمہ بہو بیگم صاحبہ حرم مرحوم کا خط پہنچا کہ فرح باغ۔۔ آپ کی سکونت کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے، آپ مرشد آباد آئیں تو وہیں قیام کریں۔ اس شہر کے بزرگان و اعیان مثلاً جعفر میں۔۔ نواب عباس قلی خان بہادر۔۔ نے اصرار کیا کہ میں عظیم آباد سے نہ جاؤں، مجھے ذرا تامل تھا کہ کسے ترجیح دوں، دل کا میلان عظیم آباد کی طرف تھا کہ یہاں کے امرا اور اعزہ بخلاف دارالضرب مرشد آباد، بہ تقدس، متدین اور نیک کردار ہیں۔ اسی اثنا میں پے بہ پے سننے میں آیا کہ۔۔۔ نیکی کا دروازہ اس شہر میں بالکل بند ہو گیا ہے، اور وہاں کے لوگوں میں پہلے سے بھی زیادہ خدا بیگانگی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ بات اور بھی عظیم آباد کی ترجیح کا باعث ہوئی۔۔۔۔ القصہ چند دنوں کے بعد نواب۔۔ کریم علی خان بہادر خلف اوسط نواب منیر الدولہ بہادر۔۔ ملاقات کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے بھی اصرار کیا کہ عظیم آباد میں قیام کروں۔ نواب کریم علی خان بہادر بڑی شان اور نام و نشان کے امیر ہیں، مدتوں شاہ عالم۔۔ کی خدمت میں عزت و امتیاز کے ساتھ رہے، بادشاہ سے مقرب الخاقان، ضیاء الملک ضیاء الدولہ فرزند خان بہادر تہور جنگ خطاب ملا۔ فارسی اور ہندی کے شعر کہنے اور سمجھنے میں ان کی طبع رسا ہے اور گفتگو اور مجلس آرائی کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کی دوستی میں ثبات نہیں، نہ انہیں شریعت کی طرف جیسا چاہیے التفات ہے اور نہ سچائی میں استقامت ہے بزرگی اور سرداری کے بازار میں نام و اجلال کے سوا کہ ایک نہایت کاسد اور بے رونق متاع ہے، کچھ اور سرمایہ ان کے پاس نہیں۔ ان کے فرزند ارشد۔۔ مہدی قلی خان پاکبازی اور دینداری میں ان سے بڑھ کر ہیں۔ اور کریم قلی خان بہادر کو تعزیہ داری کے سوا جو طول امل کے ساتھ ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے لوگوں کا بہت اجتماع ہوتا ہے، کوئی اور نیک کام کرتے نہ سنا اسی خاندان کے نیک لوگوں میں محمد صادق خان خلف مرحوم نواب محمد شجاع خان خلف اکبر منیر الدولہ ہیں۔ ان کے بھائیوں میں سے اکثر نیکی کی طرف مائل ہیں اور برابر مجھ سے مل کر میرے دل کو خوش کیا کرتے تھے۔۔ اسی سفر میں۔۔ سید یوسف علی خان خلف مرحوم میر غلام حیدر خان ہراتی کہ انہیں ضلع مظفر پور میں کہ اضلاع عظیم آباد سے ہے بد معاشوں نے مار ڈالا سید یوسف علی خان سید ہونے کے علاوہ، رقیق القلب اور خجستہ اخلاق ہیں، اور علوم شرعیہ کے حاصل کرنے کا بہت شوق رکھتے ہیں، چنانچہ ملا محمد علی ترشیزی خراسانی کو کہ نقلی کتابوں کے ترجمہ میں اس شہر کے دوسرے طلبا سے فی الجملہ بہتر ہیں، اپنے گھر لے جا کر رکھا اور ان کے کل اخراجات کے متکفل ہوئے اور ان سے شرائع الاسلام کا ترجمہ پڑھتے ہیں۔ اس شہر کے علما میں۔۔ میرزا رستم علی خلف مولوی عبدالحکیم کشمیری بھی تھے۔ میرزا رستم علی علوم معقولات میں اس شہر میں بے نظیر ہیں۔

اور ان کی گفتگو بڑی اچھی ہے۔ یہ بھی مجھ سے استفادہ کرتے رہے۔ ... اس شہر کے علما میں ... اخوند ملا ابوالقاسم سمنانی
بھی تھے۔ ان کی طبیعت سلیم اور ذہن کجی سے پاک ہے۔ اکثر علوم خصوصاً اور علی الخصوص تاریخ و تمام مختلفہ سے خوب
واقف ہیں۔ دوسروں کی طرح جتنا جانتے ہیں اس سے زیادہ دعویٰ نہیں کرتے۔ اسی سفر میں عالی شان ... کلب علی خان
صاحب، برگزیدہ صاحب خلف شیخ نصر اللہ ساکن پرسہ (ضلع عظیم آباد کی ایک بستی) سے ملاقات ہوئی۔ یہ آدمی رقیق القلب
اور بھی واقع ہوئے ہیں۔ علما اور سادات سے انہیں بڑا خلوص ہے۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت .... ہے۔ اسی سفر میں
... میر خادم حسین خان خلف میر شاہ علی خان صفوی سے ملاقات ہوئی جو میر محمد باقر خان اسلام خانی[۳] کے بھانجے ہیں۔ یہ
ایک ظریف خوش صحبت ... جوان ہیں اور علوم عقلیہ کی تحصیل کا شوق رکھتے ہیں۔ برابر ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے،
دل ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس سفر میں اور بھی بہت لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ لیکن چونکہ ان کا نسب اچھی طرح معلوم
نہیں، ان کا ذکر نہیں کیا۔ سب لوگوں کو مجھ سے محبت و دوستی بدرجہ غایت تھی۔ لوگ برابر میرے پاس حاضر ہو کر مسائل
کی تحقیق کیا کرتے تھے ... چند روز کے بعد ... محمد نجم الدین خان قاضی القضات ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز بہادر،[۴]
وارد شہر ہوئے اور مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ یہ کاکوری کے رہنے والے ہیں جو لکھنؤ کے قصبات سے ہے۔
میں جب فیض آباد میں تھا، یہ اپنے اقربا سے ملنے کاکوری پہنچے تھے۔ میرے بعض رسائل ان کی نظر سے گزرے
تھے اور مجھ سے غائبانہ محبت رکھتے تھے۔ ان کا فیض آباد آنا ہوا تو میری ملاقات کے لیے بھی تشریف لائے تھے۔
اور دوستی درجہ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ خدا کرے کہ انہیں سعادت دارین نصیب ہو۔ رمضان تمام ہوا تو میں نے مرشد آباد کا
عزم کیا۔ اور ۸ شوال کو دوستوں سے رخصت ہو کر براہ دریا رفقائے سابق الذکر کے ساتھ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔

---

۱ے مصنف ہر شخص کو نہایت ورجے ساتھ نام لیتا ہے۔ بہت سے غیر ضروری الفاظ ترجمے میں نکال دیے گئے ہیں۔ ۲ے میر تقی کے ذکر کے بعد یہ عبارت ہے:
"وو در قریہ [illegible] کہ محل [illegible] است و [illegible] بالطراف می بود [illegible] روانہ شدیم۔" چونکہ دونوں نسخوں میں اسی طرح ہے کہ [illegible]
۳ے یہاں پر یہ عبارت ہو تو اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ "بسبب ضعیف ناخرشی فاخرہ [illegible] مرشد آباد و واز صلب برادر میران [illegible] نسبی است" ۴ے یہاں تک
یہ عبارت ہو زیرا کہ امثال این فقیر را دوستی با ہر کس خود زیادہ از راہ نیکی ذات مجرہ صفات و اطوار [illegible] است با آن کہ بجہت [illegible] اموز فقرا و
ذوالحاجات است [illegible] علی السویہ [illegible] در خاطر خود محترم کردم کہ بسبب حرکت [illegible] عیال [illegible] عالی حضرت
آقا محمد حسن خراسانی [illegible] امور ولایت [illegible] مرشد آباد [illegible] مراجعت کنم۔ ۵ے شجاعت قلی خان نام تھا۔ بیٹے کا نام بھی میر محمد صادق
خاں نہ ہو گا۔ لیکن دونوں نسخوں میں اسی طرح ہے۔ ۶ے اصلی عبارت: "خلف ... میر شاہ علی خان صفوی از بطن ہمشیرہ ... میر محمد باقر خان اسلام خانی۔"
۷ے فارسی کے نسخوں میں [illegible] عبارت [illegible] ترجمہ نہیں کیا گیا [illegible] است عالی شان [illegible] تجربہ اخلاق و [illegible] سرکار کمپنی [illegible] العہد [illegible] دست
فتاوی و احکام عزل و نصب قضات [illegible] متعلق است۔"

# بنگالہ کا پہلا گلدستہ

## ایک بہاری کا ادبی کارنامہ

## نتیجۂ سخن

از جناب حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب

منشی محمد وزیر وزیر عظیم آبادی کلکتہ میں بہ شغل تجارت مقیم تھے، اور سندریہ ٹی میں ان کی دکان تھی۔ دکان کیا بیٹھک تھی، ملک بھر کے رئیسوں سے شناسائی تھی، اور کلکتہ سے متعلق ان کی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے، گویا اس زمانے کے کمیشن ایجنٹ یا آرڈر سپلائر کی حیثیت رکھتے تھے، شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے، اور انہیں حکیم سجاد مونگانی سے شرف تلمذ تھا۔ حکیم صاحب مرحوم آج سے پچاس برس قبل کلکتہ کے ممتاز حکیم اور بڑے قابل طبیب تھے۔ میں ان کے صاحبزادے حکیم سید بشیر حسن مرحوم سے ملا ہوں، وہ بھی قابل اور ذی علم طبیب تھے، حکیم سجاد کے اشعار میں نے [illegible] دیکھے لیکن ان کا مطب شعر و سخن علم و ادب کی درسگاہ تھا، اشعار بنا دیا کرتے تھے، مشاعروں میں شریک ہوتے تھے مگر خود نہیں پڑھتے تھے (مجھے یہی روایت پہنچی ہے) منشی آبد مرحوم مجھ سے خود فرماتے تھے کہ میں اور وزیر مرحوم نے شروع شروع میں خواجہ محمد شاہ شہرت عظیم آبادی سے اصلاح لی ہے، ممکن ہے کہ قیام عظیم آباد کے زمانے میں شہرت نے اصلاح دی ہو اور کلکتہ میں حکیم سجاد سے اصلاح لینے لگے ہوں، کیونکہ اس گلدستے میں آبد کے نام کے ساتھ بھی تلمیذ حکیم سجاد مونگانی لکھا ہے۔ منشی عبدالرحیم آبد عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۱۳۱۰ھ میں ڈھاکہ آئے اور برسوں یہیں مقیم رہے ایک نکاح بھی کر لیا تھا، لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ محلہ بخشی بازار میں رہتے تھے، نوجوانوں کے شعر و سخن کی پرداخت ان کے ذمے تھی اور اسی پر معاش تھی، تقریباً ۲۲ برس یہاں رہے، بی بی کے مرنے کے بعد ڈھاکہ چھوڑا۔ کلکتہ چلے گئے وہاں مچھوا بازار میں قیام تھا، میں نے دو ایک بار تلاش بھی کیا، مگر کچھ پتا نہ ملا۔ سنتا ہوں کہ سات آٹھ برس ہوئے انتقال ہو گیا، شروع سے نعت کہتے تھے، غالباً سنہ ۱۳۱۳ھ میں صحفِ آبد کے نام سے پہلا دیوان شائع ہوا تھا۔ ان کے بعض اشعار اب تک میلاد خوانوں کی زبانوں پر ہیں۔

نتیجۂ سخن، جنوری سنہ [illegible] میں کلکتہ سے نکلا، یہ معلوم نہیں کہ کب تک زندہ رہا، لیکن فروری اور اپریل سنہ [illegible] کے پرچے میرے پاس موجود ہیں، طرحی اور غیر طرحی کلام شائع ہوا کرتا تھا۔ بڑی خصوصیت یہ تھی کہ طرح میں ترتیب

حروف تہجی کا خیال رکھا گیا تھا، اس میں غزلیں چھپوانے رہنے سے ہر شاعر کا دیوان مرتب ہو سکتا تھا۔ فروری [illegible] کی غزلیں ردیف ش پر اور اپریل [illegible] کی غزلیں ردیف ص پر ہیں۔ پہلے پرچے میں مصرع طرح الف پر ختم ہوتا تھا اور چوتھے میں ث پر۔

اس گلدستے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ فارسی گو شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا، کوئی پرچہ بھی اس سے خالی نہیں۔ اکثر سوانح یا حالات ہوتے تھے، چنانچہ اپریل [illegible] کے پرچے میں حادثہ جاں گزا و سانحہ غم افزا کے عنوان سے نواب ہمایوں قدر انجم نواب ناظم بنگالہ کے خلف اصغر کی بیماری، علاج، رحلت کا حال اور انتقال کی تاریخیں ہیں۔
کبھی کبھی تصویر بھی شائع ہوتی تھی، مگر کیسی تصویر؟ ایک صفحے میں حاشیہ بنا کر درمیان میں تصویر لگانے کی جگہ رکھی جاتی تھی اور اس میں فوٹو لگا دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں البتہ یہ بہت فخر کی بات تھی، گر مجھے جہاں تک معلوم ہے ایسی تصویریں کم ہی نکلیں۔

فروری [illegible] کے گلدستے سے معلوم ہوتا ہے کہ فن سخن کے قدرداں دور دور کے لوگ تھے۔ افسوس ہے کہ اس پرچے کے دو صفحے غائب ہیں تاہم جہاں جہاں اس کے سرپرست اور مربی موجود تھے، اس کی ایک ناقص فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ اس میں ٹونک، مرشد آباد، بھاگل پور، ڈھاکہ، اودھ، کشن کوٹ، پرتاب گڑھ، میسور، پٹنہ، حیدر آباد، بنگلور، بجنور، للت پور، اور دھ، نشل، جام نگر، کشمیر، کاٹھیاواڑ، مٹیا برج، ٹالی گنج، زیادہ نمایاں ہیں۔

اس گلدستے کے ہندو دوست بھی قدرداں اور مربی تھے، چنانچہ مہاراجا چندر مان سنگھ آف تبلی افسر تخلص، راجہ اندر سنگھ والی سبن پرسا۔ مہاراج بیر بہادر ٹھاکر کرشن سنگھ ولی عہد کشن کوٹ متخلص بیدار شاگرد منشی بینی رام قائم۔ رائے امر ناتھ للت پور۔ بابو جھنو لال رئیس کلکتہ کے نام فروری [illegible] کے پرچے میں موجود ہیں۔

تعجب ہے کہ نساخ نے وزیر کا ذکر اپنی کسی تصنیف میں نہیں کیا حالانکہ اس گلدستے کے وہ بھی مربیوں میں تھے۔ اگر اس کے سب پرچے مل جائیں تو بنگالہ و بہار کے اکثر شعرا کا نام و کلام مل سکتا ہے چنانچہ کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ کلکتے کے نامور وکیل مولوی محمد یوسف بھی شاعر تھے۔ یا مہاراجا چندر مان سنگھ شاعر تھے اور افسر تخلص کرتے تھے اور حکیم سجاد حسین ہمدانی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

میرے پاس جو دو پرچے موجود ہیں ان کے سرسری مطالعے سے کلکتہ، مٹیا برج، ٹالی گنج کے باشندے یا مقیم حسب ذیل شعرا کا پتا لگتا ہے۔

حکیم سید حسن ایجاد دہلوی شاگرد داغ۔ مستند الشعرا خواجہ محمد مرتضیٰ بقا لکھنوی، حامد الدولہ بہادر برتر شاگرد جان عالم اختر، رئیس الدولہ بیدار شاگرد مہتاب الدولہ، شیخ الٰہی بخش محتشم، کاظم حسین جوہر شاگرد مہتاب الدولہ درخشاں، منشی عبدالصمد خلیل شاگرد عابد مرزا بیگم، مہتاب الدولہ کوکب الملک درخشاں، منشی رضا شاگرد جوہر، امداد حسین خاں رضا شاگرد گلشن الدولہ

منشی عباس شاؔد شاگرد اخترؔ، اسماعیل خان شوکت شاگرد انشیؔ، منشی شرفؔ شاگرد مولوی سید علی حیدر حیدرؔ۔ میرن جان شیفتہؔ شاگرد بقاؔ، سید عبدالغفور شہبازؔ دانا پوری۔ مرزا علی شاگرد منشی بحرؔ۔ سید فرخ شاگرد سید علی حیدر حیدرؔ طباطبائی۔ مرزا فدا حسین فداؔ شاگرد گلشن الدولہ۔ سید مہدی قسیمؔ شاگرد بحرؔ، سید عبداللطیف کلکتی شاگرد بقاؔ، مولوی صادق علی طالبؔ شاگرد جان عالم اخترؔ، خواجہ حسن علی عظیم آبادی شاگرد انشیؔ۔ آغا مرزا اخترؔ شاگرد مولوی حیدرؔ۔ منشی فرزند علی ناظمؔ رئیس کلکتہ۔ مولوی دلدارؔ شاگرد گلشن الدولہ بہارؔ، سید علی ہمایونؔ شاگرد بہارؔ۔ میر یوسف علی لکھنوی شاگرد بہارؔ، محمد حسین عظیم آبادی حنیفؔ شاگرد آیدؔ عظیم آبادی۔ شیخ محبوب نجمؔ خلف شیخ محمد علی کلکتہ۔ مولوی وحید رئیس کلکتہ شاگرد فریادؔ عظیم آبادی، منشی عابد مرزا بیگم ریختی گو، حاجی قمرالدین اچھی ریختی گو، شیخ افضل حسین افضلؔ رئیس کلکتہ، معتمد الدولہ محسنؔ، صاحبزادہ احمد شاہ کیوانؔ شاگرد حیدرؔ۔ حافظ مرحباؔ شاگرد انشیؔ، منشی نیرؔ۔ صاحبزادہ محمد اکبر شکوہ شاگرد انشیؔ، خواجہ سرتؔ شاگرد حیدرؔ۔ صاحبزادہ ابراہیم شاہ رساؔ شاگرد حیدرؔ۔ مولوی سید علی حیدر حیدرؔ طباطبائی ناظمؔ لکھنوی مدرس مدرسہ سلطانیہ مٹیا برج۔ منشی رضوی، مالک الدولہ صولتؔ شاگرد منشی بحرؔ، منشی عبداللہ صابرؔ، صاحبزادہ مرزا محمد بخت فریدونؔ شاگرد رضوی۔ فرخ شاگرد حیدرؔ۔ صاحبزادہ محمد غلام حسین معینؔ۔ منشی برخوردار علی مظلومؔ شاگرد انشیؔ

منشی نثار حسین نثارؔ شاگرد حیدرؔ،

شاعرات کی بھی ایک فہرست موجود ہے۔ اس میں سب کی سب طوائف ہیں اور اکثر کلکتہ کی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان بیچاریوں پر شاعری کی تہمت لگائی گئی ہے اس لیے اس فہرست کو نظرانداز کرتا ہوں۔

اس گلدستے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ٹالی گنج (کلکتہ) میں خاندان میسوریہ کی سرپرستی میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے اور وہاں کے صاحبزادے اور ان کے متعلقین سب کے سب مولانا علی حیدر نظم طباطبائی کے شاگرد تھے۔ نظم مرحوم اس عہد میں حیدر تخلص کرتے تھے مگر ان کی شہرت مٹیا برج سے نکل کر کلکتہ میں انہیں استاد بنا رہی تھی اور اہل لکھنؤ کی طرح مولانا نظم مرحوم بنگالی اردو دانوں سے نفرت نہیں کرتے تھے۔

وزیر مرحوم نے اس پرچے کے لیے رپن پریس نام ایک پریس بھی کھولا تھا اور غالباً نیر مشرق کے بعد کلکتہ کا سب سے پہلا پنچ جرنل گوہر اصفی انہوں نے نکالا تھا۔ یہ پرچہ ہفتہ وار تھا۔ اور رنگین کاغذ پر چھپتا تھا۔ بہترین ظریفانہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب لکھنؤ سے منشی سجاد حسین کا اودھ پنچ، بانکی پور سے ایچ پنچ، مراد آباد سے کرزن نکلا کرتے تھے بلکہ ہر صوبے سے پنچ اخبار نکلا کرتے تھے۔ یہ اخبار بھی کئی برس تک جاری رہا اور غالباً وزیر مرحوم کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔

ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ اس گلدستے کے شاعروں میں میرے خیال میں سوائے نواب احمد حسین صاحب رئیس پریا نواں کے اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔

داغ کی غزلیں تقریباً ہر گلدستے میں میں نے دیکھی ہیں۔ شاد مرحوم بھی حاضر باش ہیں، کبھی فرصت ملی تو شاعران عظیم آباد کی فہرست بھی۔۔

تکمیل مضمون کے بعد ہی مئی ۱۸۸۶ء کا پرچہ مل گیا۔ اس کے دو صفحے ابتدا کے غائب ہیں۔ تیسرے صفحے سے مارکوئس آف رپن کے حالات شروع ہوتے ہیں۔ تصویر بھی ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ کسی انگریزی مطبع میں چھپی ہے اور کاٹ کر خالی جگہ میں جو اس مصرف کے لیے رکھی گئی تھی، چسپاں کردی گئی ہے۔ تصویر نہایت اچھی اور کاغذ بہی اچھا ہے۔ پانچویں صفحے سے ترجمہ تواعد تار برقی کا آغاز ہوتا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس پرچے میں بھی یہ مضمون ناتمام ہے۔ اس کے بعد ڈاکخانے کے قواعد ہیں، یہ بھی تتمہ سابق مضمون کا ہے۔ بارہویں صفحے پر نثر کا خاتمہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اصل گلدستہ ہے۔ اس پرچے پر جلد ا نمبر ۳ درج ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جنوری نہیں بلکہ فروری میں پہلا پرچہ نکلا تھا۔ مصرع طرح ث پر ختم ہوتا ہے۔

اس پرچے سے کلکتہ اور حوالی کلکتہ کے حسب ذیل نئے ناموں کا علم ہوتا ہے:- حافظ انعام اللہ انعام کان پوری و خواجہ حسام الدین حسام و عبد الرزاق شاد تاجر دہلوی، حکیم عبد الصمد قسمت کان پوری منتظم گلدستہ، الشیخ محمد عارف مہوا گڑوی عزیز جہاں، قاسم سابق الذکر، حافظ منشی اختر، منشی مظفر علی نیر، حامد اللہ دلبر تر، مولوی صادق علی آئل، امداد اللہ منظر تلامذہ جان عالم دخر، میر اصغر علی اصغر، مولوی زین العابدین دقار تلامذہ گلشن اللہ دلدار، منشی عبد الاحد احمد خلف قسمت سابق الذکر، شاگرد سالم کان پوری، حافظ محمد امین امین کان پوری تاجر کتب، مولوی عزم کان پوری، مالک اللہ دلمو لکت، خواجہ محمد عاشق عاشق لکھنوی، آغا مرزا محمد حسین شیرازی ظلم، منشی پیر بخش کرم ش آبد، محمد امین نکہت مہتمم چکوال اجملم، ش الشیخ، الشیخ نور محمد ندیم ش حافظ امین، بیگن ہنگ بیگن، محمد یحییٰ یقین ش نفیس کان پوری۔

غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب داغ کلکتہ آئے تھے، چنانچہ ان کی مشہور غزل "داغ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پہ لے چلا" اس پرچے میں موجود ہے۔ اس زمین میں ایک آدھ غزل اور ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ مشاعرے کی زمین ہے۔

اس گلدستے میں شاعرہ پردہ نشین کے عنوان سے فضل النسا بیگم صاحبہ متخلص بہ مطلوب تقیم شملہ کی طرحی غزل ہے۔ بازاری عورتوں میں کلکتے کی ساری نامور طوائفیں جلوہ افروز ہیں۔

یہ گلدستہ ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے، تقطیع ۲۰ × ۲۶ ہے۔ مجھے روایت پہنچی تھی کہ وزیر مرحوم سندریہ چی میں بستے تھے، اگر اس پرچے کی اخیر سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۲۰ کوٹھی کولو ٹولہ بائی لین میں رہتے تھے اور وہیں ان کا رپن پریس تھا۔

[ بعض نام مکرر ہوگئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مضمون کا آخری حصہ ابتدائی حصے کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا گیا ہو۔ نتیجۂ سخن کے متعلق ایک سلسلۂ مضامین جناب حسرت موہانی نے اردوے معلی میں لکھا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس گلدستے کی ابتدا فروری ۱۸۸۵ء سے ہوئی اور جنوری ۱۸۸۸ء کے بعد تک نکلتا رہا۔ جناب حسرت نے یہ نہیں بتایا کہ کب بند ہوا۔ اردوے معلی، جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۱۲ء۔ معیار ]

مولوی سید عبدالغفور شہباز دانا پوری کی غزل ملاحظہ ہو۔ یہ غزل فروری ۱۸۹۳ء کے پرچے میں چھپی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم شہباز کی طبیعت ابتدائے غزل گوئی سے نغز تھی۔ بعض اشعار حذف کر دیے گئے ہیں :-

ہمیں ہے علم کے شجر کی تلاش    شجرِ علم کے ثمر کی تلاش
علم انسان کا دل ہے علم جگر    تم کو ہو اس دل و جگر کی تلاش
قتل کرنے کو جہل موذی کے    کیجیے تیغ کی تبر کی تلاش
ہو نہ جس شخص پاس نقدِ عمل    نہ کرے علم کے ثمر کی تلاش
یاد رکھو رباعیِ وحدت    ہے یہ دانش کی عمر بھر کی تلاش
قول سے پہلے ہو عمل مطلوب    آہ سے پہلے ہو اثر کی تلاش
کیجیے سو کام چھوڑ کر دل سے    بہرِ ترویجِ علم، زر کی تلاش
شامِ اقبال کو ہے ویرے یاں    عز و اقبال کے سحر کی تلاش

تا اڑیں عرشِ مجد تک شہباز
اس لیے ہے یہ بال و پر کی تلاش

خود مالکِ گلدستہ محمد وزیر وزیر کے دو چار شعر اس زمین میں سنیے :-

شبِ فرقت پھر آنے والی ہے    شام سے ہو گی پھر سحر کی تلاش
کیوں مری خاک اڑتی پھرتی ہے    ہے اسے کس کے بام و در کی تلاش
تم سے کیا تھا عدو کو ڈھونڈھا    تم نے دیکھی مری نظر کی تلاش

غیر طرح میں، نواب سید آسمان قدر اسد علی مرزا ثریا خلف نواب ناظم مرشد آباد۔

جاتا ہوں سر کو پھوڑنے میں کوہسار کو    وحشت بڑھی ہے آمدِ فصلِ بہار سے

نواب ابراہیم علی خاں والی ٹونک متخلص بہ حافظ۔

نہ پوچھو حال شبِ جدائی جو دل کو رنج و محن ہوا ہے    تمہارے سر کی قسم ہے صاحب کہ صبح کرنا کٹھن ہوا ہے

نواب والا قدر سید حسین علی مرزا، نواب ناظم بنگالہ۔

آئیں کیونکر ہم سے بدقسمت تری محفل کے پاس    ڈوبنے والے پہنچ سکتے نہیں ساحل کے پاس
پوچھنے جاتے ہیں قبروں سے پتا دلدار کا    لے چلی ہے جستجوئے حق ہمیں باطل کے پاس

اپریل ۱۸۳۲ء، خواجہ ولایت علی سرور شاگرد خواجہ آتش۔

نالے سے کچھ غرض ہے نہ فریاد سے غرض    مجھ کو ہے چپکے چپکے تری یاد سے غرض

## مقالات

(۱) ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات از ڈاکٹر ابو الحلم محمد نظام الدین پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ و ترجمہ جناب عبد المنان صاحب بیدل ایم اے پروفیسر پٹنہ کالج (۲) سکندر اور ضحاک از قاضی عبد الودود (۳) اندر سبھا کے متعلق چند غلط فہمیاں از ز۔ د جیلی۔

# ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات

از ڈاکٹر ابو الحلم محمد نظام الدین صاحب مترجمہ جناب عبد المنان صاحب بیدل

ایران پر جب مسلمانوں کا تسلط ہوا تو اس ملک میں ایک نئی زبان وجود میں آئی جسے پہلوی کے مقابلے میں فارسی کہتے ہیں۔ اس زبان نے بے شمار شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کا تماشا دیکھا ہے اور اس کا ادب ہزار سال سے زیادہ کی مدت میں جو تغیرات ہوئے ہیں اُن کا آئینہ دار ہے شاید ہی کوئی اور زبان جو ادبی حیثیت اختیار کر چکی ہے فارسی کا اس خصوصیت میں مقابلہ کر سکے۔

رودکی کا عہد فارسی شاعری کے بچپن کا زمانہ ہے، فردوسی نے اسے رزم سے آشنا کیا، خاقانی اور نظامی کا عہد قصیدہ گوئی اور افسانہ نگاری کا زمانہ تھا۔ سعدی و رومی کی صوفیانہ اور اخلاق آموز شاعری میں تاتاری حملے کے اثر نمایاں ہیں۔ حافظ اور جامی نے تغزل کو اوج کمال پر پہنچایا، قاآنی کے ہاتھ میں فارسی شاعری ایک موسیقی کا ساز بن گئی جس سے دلکش صدائیں نکلتی تھیں لیکن یہی شاعری آج کل اصلاح معاشرت اور احیائے ملت کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔

اس زبان میں نثر کی ابتدا عربی تواریخ اور تفاسیر کے ترجمے سے ہوئی، بلعمی، ناصر خسرو، نظام الملک طوسی، نظامی عروضی سمرقندی اور سعدی نے تاریخ اخلاق اور ادب میں ایسی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کا جواب نہیں ہو سکتا۔ تاتاریوں کے فوجی کارنامے جامع التواریخ، تاریخ جہاں کشائے جوینی، تاریخ وصاف اور تاریخ گزیدہ مصنفہ حمید اللہ مستوفی کے صفحات میں ایسے الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں جو قوں زندہ رہیں گے محقق طوسی اور واعظ کاشفی نے اخلاق رسالے لکھے، ابو الفضل و فیضی کے زمانے میں اعلےٰ درجے کے سیاسی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنی، آخری دو صدیوں میں تشیع سے متاثر ہوئی اور اب اسی کے ذریعے سے حب وطن کی تبلیغ کی جا رہی ہے۔

فارسی ادب کے پانچ دور۔ فارسی ادب کی تاریخ پانچ دور میں منقسم ہو سکتی ہے۔ پہلا دور ([illegible] سے ۳۹۹ھ تک) سامانیوں اور طاہریوں کا دور حکومت اسے رودکی کا دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں حنظلہ بادغیسی اور دقیقی جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ یہ فارسی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اس زمانے میں دوبیتی یا رباعی قصیدے اور مختلف اقسام کی مثنویوں کا رواج ہوا۔

دوسرا دور (سنہ ۱۰۰۰ء سے سنہ ۱۲۲۰ء تک) فارسی ادب کا دور زریں تھا اور یہ غزنویوں، سلجوقیوں اور خوارزم شاہیوں کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں فارسی ادب میں ہر قسم کی نظم اور مختلف طرح کی نثر کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اس زمانے کے مشہور شعرا عنصری، فردوسی، عمر خیام، ناصر خسرو، سنائی، خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی، عطار اور سعدی ہیں۔ بیرونی اور بیہقی سے مورخین، بوعلی سینا سے فلسفی، نظام الملک سے سیاست داں، غزالی سے منطقی، ابوسعید ابوالخیر سے صوفی، اور نظامی عروضی سمرقندی سے ادیب نے ادبیات ایران کو مالا مال کر دیا۔

تیسرا دور (سنہ ۱۲۲۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک) مغلوں کے حملۂ ایران سے شروع ہوتا ہے۔ اور تیمور کے زمانے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اسی دور کو "مغلائی تیموری" دور کہہ سکتے ہیں اس دور کے مشاہیر ادب رومی، ناصر الدین طوسی، رشید الدین فضل اللہ، عطا جوینی، وصاف، عراقی، اوحدی، شبستری، ابن یمین، خواجو کرمانی، عبید زاکانی، سلمان ساوجی، حافظ شیرازی، میر علی شیر نوائی، جامی اور واعظ کاشفی ہیں۔

مغلوں کے حملے کے بعد ہی فارس کی تمام ذہنی اور ادبی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں، لیکن تیموریوں اور ان کے اخلاف کا زمانہ اس زبان کا دور تجدد ہے، اس دور کا آخری حصے میں فارسی شاعری کے درخت میں پھر پھل پھول آئے۔ اس زمانے کی بہت ہیں لیکن کچھ زیادہ بلند پایہ نہیں، اور ان میں وہ جدت اور آزاد خیالی بھی نہیں ہے جو مغلوں کے حملے سے پیشتر ادب فارسی کی ممتاز خصوصیت تھی۔

چوتھا دور (سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک) جو ایک طویل دور ہے۔ صفویوں، مغلوں اور قاچاریوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ دور خاندان صفویہ کے عروج سے شروع ہوتا ہے۔ اور ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل اور حکومت مشروطہ کے مطالبے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتا ہے۔ ادبی لحاظ سے یہ دور انحطاط و جمود کا دور تھا۔ صفویوں نے آزادیٔ خیال بالکل چھین لی تھی، صرف مذہبی علوم کی ترویج کے درپے تھے اور ان کے زمانے میں سارا زور طبیعت مذہبی مناظروں میں صرف ہوتا تھا۔ البتہ مغلوں نے جو ہندوستان کے فرماں روا تھے اس زبان کے وقار کو باقی رکھا اور فارس کے شعرا اور مصنفین کی خاطر خواہ ہمت افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی تہذیب کا ایک نیا مرکز ہندوستان میں قائم ہو گیا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کی طرز بیان پیدا ہو گئی جس کا معتد بہ اثر وسط ایشیا کے ادبیات پر پڑا۔

قاچاریوں کی حکومت کی ابتدائی زمانے میں شعرا اور مصنفین قدیم طرز کا تتبع کرتے رہے۔ اور کوئی قابل قدر کتاب نہیں لکھی، لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جبکہ ایرانیوں کو ان یورپی اقوام سے ملنے کا موقع ملا جو فارس میں اپنا اقتدار اور اثر قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل تھیں تو فارسی شاعری میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا، اور اس زبان میں نئی طرز کا ادب پیدا ہونے کی راہ کھل گئی۔

اس جدید تحریک کی ابتدا قا آنی سے ہوئی، وہ انگریزی اور فرانسیسی زبان سے واقف تھا اور اس لیے متعدد

کتابیں ان زبانوں سے ترجمہ بھی کی گئیں۔ شیبانی اور یغمائے جندقی نے بھی زبان کی صفائی میں اچھی طرح کوشش کی۔ اصلاحِ زبان کے لیے ایک تعلیمی ادارہ دار الفنون کے نام سے کھولا گیا۔ جس کا مقصد مغربی علوم کی تعلیم تھی۔ اس ادارہ کا پہلا ناظر رضا قلی خان لالہ باشی مصنف مجمع الفصحا المتخلص بہ ہدایت تھا۔

ادب فارسی کا پانچواں اور آخری دور ۱۹۰۵ء کے انقلاب فارسی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور "نہضت مشروطہ خواہی" اور شورش ملی کا دور ہے۔ اسی دور میں خاندان پہلوی کو جو اب تک قائم ہے عروج ہوا۔ معاشرتی اقتصادی اور ملی جنگ وجہد اور نئی طرح کی حکومت نے ایک نئے قسم کا ادب اس زبان میں پیدا کر دیا۔ اور ایک جدید تہذیب کی بنا ڈالدی۔ اس دور کے ادبی رجحانات کے تصور کے لیے ایران کے آخری تیس برس کی سیاسی اور تاریخی حالات سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر براؤن کی کتاب "انقلاب ایران" میں انقلاب فارس ۱۹۰۵ء لغایت ۱۹۰۹ء کے دور جمہوری کے وحشت خیز واقعات بوضاحت درج ہیں یورپ کے جنگ عظیم کے قبل اور بعد کے چند ضروری واقعات درج کرتا ہوں:-

قاچاریوں کے عہد میں ایران کا اقتدار و وقار بہت کچھ زائل ہو گیا تھا۔ ایران انگلستان اور روس کے شکنجے میں تھا، اس کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ بلوچستان ہندوستان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ہرات اور قندھار برطانیہ کے زیر نگیں آچکا تھا، اور آذربائیجان سلطنت روس کا جزو ہو گیا تھا، ایران اپنے مقبوضات کی حفاظت سے قاصر تھا۔ بیرونی حکومتوں کو طرح طرح کی رعایتیں اور تجارتی آسانیاں دیدی گئی تھیں۔ ایران روس اور برطانیہ سے کڑے شرح سود پر قرضے لیتا اور شرمناک اور ذلیل معاہدے کرتا تھا مثلاً ۱۹۰۷ء کا برطانوی روسی عہد نامہ ایران سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ بادشاہ اور وطن پرستوں کی کشمکش روز بروز سخت تر ہوتی جا رہی تھی، اگرچہ پرانی حالت ۱۸۹۶ء میں ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل کے بعد باقی نہ رہی تھی تاہم رعایا عجب پراگندگی کی حالت میں تھی، آخرکار بادشاہ کی علانیہ مخالفت شروع ہو گئی۔

سیاسی بیداری۔ اس زمانے میں اصلاح حکومت کی تحریک زوروں پر تھی، حاکموں کے ظلم، مذہبی مقتداؤں کے تعصب، رعایا کے افلاس، خود غرض سلطنتوں کی ریشہ دوانیوں، مظفر الدین شاہ کی قساوت بے مہری اور وزرا کے اقدامات غیر قانونی نے اہل ملک کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ خفیہ انجمنوں کی تشکیل ہوئی، باوجود سفاکانہ طریقۂ انسداد کے اہل ملک نے جان پر کھیل کر ناصر الدین شاہ کے جانشین محمد علی شاہ کو تشکیل مشروطہ کیلیے مجبور کیا۔ تبریز جو وطن پرستوں کا ماوی تھا، سلطنت کے خلاف بغاوت ہوئی، سپہدار نے وطن پرستوں کی ایک جماعت کے ساتھ طہران پر دھاوا بول دیا اور غایت جوش میں سردار اسعد نے جو سردار انقلاب تھا اپنے ہم قوم بختیاریوں سے ملکر گورنر کو معزول کرکے طہران پر فوج کشی کر دی۔ جب ان دونوں سرداروں نے مل کر

دار السلطنت پر حملہ کر دیا تو بادشاہ نے حکومت مشروطہ کو از سر نو قائم کرنے کی رضامندی تو دے دی لیکن جب مجلس کی کارروائیوں میں بادشاہ برابر رکاوٹیں پیدا کرتا رہا تو لوگوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹے احمد شاہ کے لیے تخت شاہی خالی کر دے۔ لیکن اس نے بھی اہل ملک کے ساتھ بے وفائی کی اور ملک کو اپنی حالت پر چھوڑ کر یورپ چلا گیا۔

اگرچہ جنگ کے زمانے میں ایران نے اپنے غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر لڑنے والی سلطنتوں نے جو اس کے اطراف میں قائم تھیں اس کی ذرا بھی پروانہ کی اور ایران بھی ساحت جنگ بن گیا۔ انگریزی، المانی، روسی اور ترکی فوجوں نے ملک میں گھس کر ملک کو تباہ کرنا شروع کیا۔ طہران کی مرکزی سلطنت میں نہ اپنے کو غیر ملکی حملہ آوروں سے بچانے کی قوت تھی اور نہ ملک کے متمردین کو مطیع رکھنے کی صلاحیت تھی۔

فروری ۱۹۲۱ء میں جنرل رضا خاں نے ایک دستہ فوج کی مدد سے دار السلطنت پر قبضہ کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ایک کبینٹ قائم کی اور خود وزیر جنگ بنا۔ ۱۹۲۳ء میں اس نے مشہور پہلوی کبینٹ قائم کی اور ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں اس نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

**رضا شاہ قوم کے ناخدا کی حیثیت سے۔** محض ایک زبردست ہستی کی آمد نے ملک کو بربادی سے بچا لیا۔ وہ مملکت جو صرف تیس برس پہلے غیر متمدن غیر منظم، بے سرمایہ اور بے حیثیت اور جو محض چند دنوں کی مہمان سمجھی جاتی تھی، حیرت انگیز طور پر ایک ایسی جدید سلطنت بن گئی جسے بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے۔

اس انقلاب عظیم کا سہرا رضا شاہ پہلوی کے سر ہے۔ رضا شاہ پہلوی نے ایک سپاہی کی طرح اپنی زندگی شروع کی مگر اپنی انتھک کوششوں، ہوشیاری، ذہانت، قابلیت، ہمت، اور اصول جنگ کی واقفیت سے آخرکار تاجدار ایران بن گیا۔ اس نے ترکی مصطفےٰ کمال اور ترکی سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے ایران کے مرتبے کو بہت کچھ بڑھا دیا ہے۔ اس کے یازدہ سالہ دور حکومت میں ایران نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اب ایران آزاد ہے، قرضوں سے اسے نجات مل چکی ہے، اغیار کے پنجوں سے چھوٹ چکا ہے اور اپنی قسمت کا آپ مالک ہے۔ رضا شاہ کی کارروائیوں کا خلاصہ یہ ہے۔ ایرانی امتیازات اجنبی یعنی کیپیچولیشنس منسوخ ہو چکے ہیں۔ ایران میں منظم حکومت قائم ہے۔ جمہوری اداروں کی داغ بیل پڑ چکی ہے اور ممالک غیر سے مستقل سیاسی تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ محصولات پر اب غیر اقوام کا کوئی اختیار نہیں۔ ہاں قوانین انصاف کی اصلاح کی گئی ہے۔ فوجی تعلیم ملک بھر میں جبری ہے۔ اور ملک میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے باقاعدہ فوج موجود ہے۔ جنگی جہازوں اور ہوائی بیڑے کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ ملک میں، قومی زرعی اور پہلوی بینک قائم کیے گئے ہیں، اور اینگلو پرشین آئل کمپنی سے جو نیا معاہدہ ہوا ہے اس سے توقع ہے کہ ایران کی مالی حالت بڑی حد تک ٹھیک ہو جائے۔ رضا شاہ نے سماج کی حالت درست کر دی ہے۔ قوم تعصب کی آلودگیوں سے پاک کر دیا ہے۔ نظام تعلیم کی تجدید کر دی ہے نئی اور مضبوط سڑکیں بنوائی ہیں۔ ریلوے تیار کی ہے۔ تار، لاسلکی، ٹیلیفون، اور فیکٹریاں قائم کر دی ہیں

ملکی صنعتوں کی ہمت افزائی کی ہے ایک بڑا اور سکہ رائج کیا ہے۔ درحقیقت ایران جدید کا قائم کرنے والا وہی ہے اور یہ اس کی کرامت ہی کرامت ہے۔

**ایرانی صنعتوں کی نمائش ۱۹۳۰ء** لندن میں پہلی بار ایرانی صنعتوں کی نمائش ہوئی، اس نمائش کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس سے بین الاقوامی تعلقات کے پیدا ہونے کی ابتدا ہوتی ہے۔ ورنہ آج تک ایران دنیا سے الگ تھلگ رہنا ہی مستحسن سمجھتا تھا۔ برلنگٹن ہاؤس میں جن صنعت کاریوں کی نمائش ہوئی اس نے حسن پرست یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اس نمائش سے یورپ اور ایشیا کے صنعتی تعلقات کا بھی پتا چلا اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مغرب کی تہذیب پر ممالک سے کہیں زیادہ ایران کا اثر ہے۔ ایشیا کو بھی ایران سے بہت سی چیزیں ملی ہیں۔ ہند کی منیچر پینٹنگ ایران کی فن کاری کے اثر کی ایک مثال ہے۔ اس نمائش سے اس بات کا بھی پتا چلا کہ ایرانیوں میں غیر ملکی تہذیب کے اخذ کرنے کی بڑی صلاحیت ہے، اور حالت زمانہ اور ماحول کے مطابق ان میں پرانی ترکیبوں کے درست کر لینے کی کافی استعداد ہے۔ ایران کی صنعت کا بیش بہا خزانہ تمام ملک سے جمع کر کے با اصول اور مرتب طریقے سے دنیا کے سامنے پہلی بار پیش کیا گیا۔ نمائش کی کامیابی بادشاہ کی اعانت اور ذوق کی ممنون ہے، شاہ ایران کے اس قابل قدر اقدام کا خیر مقدم تمام اقوام نے کیا اور تیس سلطنتوں نے اس نمائش میں شرکت کی۔ تیس سے زیادہ عجائب خانوں، یونیورسٹیوں اور کتب خانوں اور صدہا دوسرے لوگوں نے نمائش کی چیزیں بھیجکر اس میں بین الاقوامی مشارکت صنعتی کو کامیاب بنایا۔ برٹش میوزیم میں بھی ایران کی صنعتوں کی نمائش ہوئی۔ رضا شاہ نے پہلی بار دنیا کو دکھا دیا کہ وہ کتنا اصلاح و ترقی کا دلدادہ ہے۔ کس عمدہ اور مناسب نظم و نسق کے ساتھ کسی کام کو انجام دے سکتا ہے۔ اور ایران کے وقار قدیم کو از سر نو قائم کرنے کا کس درجہ خواہشمند ہے اور ایران کو مشرق کی قوموں کے صف اول میں لانے کے لیے کتنے بے چین تھے۔ لینن گراڈ میں جو ایران کی صنعتوں کی نمائش ہوئی۔ اس سے ایران کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں رضا شاہ کی سیاحت یورپ سے شوکت ایران بہت بڑھ گئی سیاحت سے واپسی کے بعد رضا شاہ پہلوی نے سوسائٹی کے اصلاح کی اسکیم تیار کی اور اس اسکیم پر استقلال کے ساتھ عمل درآمد ہو رہا ہے۔

**فردوسی کی ہزار سالہ برسی:** ۱۹۳۴ء میں فردوسی ایران کے مشہور رزم نگار کی ہزار سالہ برسی بڑے جاہ و جلال اور شاہانہ شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ کسی دوسری مشرقی قوم نے شاید ہی کسی شاعر کی عظمت کا اعتراف اس انداز سے کیا ہو۔ دنیا کے ہر حصے سے محبان ایران اور مستشرقین اس موقع پر اپنے اپنے ملک کی طرف سے خراج تحسین ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ایرانیوں نے جس جوش اور سرگرمی کا اس موقع پر اظہار کیا اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اب بیدار ہو چکے ہیں، اور اپنی تہذیب کو مرنے نہیں دینا چاہتے۔

۱۲ اکتوبر کا دن طوس کی تاریخ کا سب سے شاندار دن ہے۔ شہنشاہ ایران نے مختلف ممالک عالم کے

نمایندوں کے سامنے فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے متعلق کارروائیوں کا افتتاح کیا۔ ہزار برس قبل شاہنامہ کو قدرشناس مربی نہ مل سکا، لیکن ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو فردوسی کی عظمت شاہزادہ کے آگے مشرق و مغرب دونوں سر تسلیم خم کیے تھے۔

پرشیا کی جگہ ایران: ۱۹۳۵ء میں یہ اعلان کیا گیا کہ ملک کا نام ایران ہے جو قدیم سے چلا آتا ہے۔ پرشیا ایک بیرونی لفظ ہے جس کا اطلاق ملک پر نہیں ہونا چاہیے۔

لفظ ایران کا ماخذ پہلوی زبان ہے اور اس کا سلسلہ اوستا کے لفظ آریانا سے ملتا ہے جو لفظ آریہ کی صورت مضمن ہے۔ لفظ پرشیا مغربی الاصل ہے۔ غالباً ازمنۂ وسطیٰ میں ایران اس نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ لفظ پرسائی جو یونانیوں اور رومیوں کی زبان پر اکمینیڈ کے لیے تھا۔ یہ غالباً پرسس سے ماخوذ ہے جو ایران کے جنوبی مغربی حصے (جو آج کل فارس کہلاتا ہے) کا نام ہے۔ اس کا نام غالباً ایک قبیلے 'پارسوا' کے نام پر رکھا گیا تھا جس کا ذکر اسیریا کے کتبات میں ہے۔ لیکن قدیم زمانے سے لفظ فارسی خاص قسم کی بولیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جیسا کہ فہرست میں لکھا ہوا ہے۔ یہ زبان نویں صدی سے ایران کی ادبی زبان بن گئی۔ اور اسی کو ہم فارسی کہتے ہیں۔

ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے بعد لفظ ایران بہت عام ہو گیا، لیکن انیسویں صدی سے قبل ایران کے باشندے اپنے کو ایرانی اور اپنے ملک کو ایران نہیں کہتے تھے۔

جدید اجتماعی اصلاح: ایران میں سوسائٹی کی اصلاح کے لیے اور بھی تحریکیں ہو رہی ہیں اور ان پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا ہے۔ مثلاً یورپی لباس کا جبریہ استعمال کلاہ پہلوی کی جگہ پر یورپی فلٹ ہیٹ کا پہننا، اور پردہ کا اٹھا دیا جانا، جس سے عورتوں کو آزاد کیے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔

آج کل ایران اس دھن میں ہے کہ ایرانیوں کو جدید یورپی اقوام کے دوش بدوش کھڑا کرے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے اور دوسرے افادی اصول کی بنا پر وہ کوشش کر رہا ہے کہ جہاں تک حد امکان میں ہو مغربی بن جائے یہ تغیرات صرف فروع سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ اصل تک جاتے ہیں۔ آگے چل کر ان کا ملک پر کیا اثر ہوگا اس کا اس وقت فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ملک کا قدامت پسند طبقہ ان جدت طرازیوں کا سخت مخالف ہے، لیکن رضا شاہ پہلوی اپنی "مغرب سازی" کی کارروائی جاری رکھی ہے۔ ایک اور اہم کام جو اس سلسلہ میں ہوا ہے، وہ مذہب و سیاست کی تفریق و تقسیم ہے۔ نئی روشنی کے پروانوں نے دیکھ لیا کہ قوم کا صدیوں تک اپنی ناکامیوں پر ماتم کرنا فعل لاحاصل تھا، اور صرف لاحاصل ہی نہیں بلکہ مضرت رساں بھی تھا اس لیے کہ اس ماتم گساری اور سینہ زنی نے قوم کی ذہنیت کو پست کر دیا ہے۔

ان کے خیال میں مادی ترقی کی کوشش فرض ہے اگرچہ اس کوشش میں دینی اور روحانی مفاد کو قربان کر دینا پڑے اس لیے کہ مذہب کے غلط تصورات نے ایران میں سیکڑوں فتنے برپا کر رکھے تھے۔

**یوم ملت:** قدیم ساسانی تہوار کو منانے کی رسم بہت دنوں سے ایران میں رائج تھی۔ لیکن ۳ اسفند ارمذ ۱۲۹۹ء شمسی مطابق ۲۳ فروری سنہ ۱۹۲۱ء جو خاندان پہلوی کے آغاز کی تاریخ ہے "عید ملی" کی تاریخ قرار دی گئی۔ حال ہی میں یہ عید ملی بڑی دھوم دھام اور شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ ۲۳ فروری سنہ ۱۹۳۴ء کو طہران میں منائی گئی۔ یہ عید کرنل رضا خاں کے طہران پر حملہ کرنے ان کے کمانڈر ان چیف بنائے جانے اس کے بعد وزیر جنگ وزیر اعظم بننے اور بالآخر دسمبر ۱۹۲۵ء سریر آرائے سلطنت ایران ہونے کی یادگار ہے۔

**نظام تعلیم کی اصلاح:** اب تک زبان و ادب اور طریقۂ تعلیم کی درستی میں انفرادی کوششیں ہوتی رہی ہیں لیکن موجودہ دور میں حکومت نے نظام تعلیم کو اساس استوار پر قائم کرنے کی خاص کوشش کی ہے۔ پرانے مدارس توڑ دیئے گئے ہیں اور جدید ابتدائی اور ثانوی مدارس قائم کیے گئے ہیں۔ حال ہی میں ایک یونیورسٹی بھی سائنس اور آرٹ کے ہر شعبے کی تعلیم کے لیے قائم کی گئی ہے۔ سپہ سالار کا پرانا مدرسہ جو قدیم طرز کا مذہبی اور دینی مدرسہ تھا اب قانون، فلسفہ اور مذہب کی تعلیم کا کالج بن گیا ہے۔ نصاب تعلیم نئے اصول پر مرتب ہوا ہے۔ ہر سال طلبہ کی ایک معتد بہ تعداد اعلیٰ تعلیم پانے کے لیے سلطنت کی طرف سے یورپ بھیجی جاتی ہے۔ قلمی کتب کی حفاظت اور نئے اصول پر کتبخانوں کی تنظیم شروع کی گئی ہے۔ مذہبی اوقاف کا انتظام مفید اصول پر کیا جا رہا ہے۔ مشہد مقدس کے اوقاف کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔

**فرہنگستان اور اصلاح زبان کا مسئلہ:** سلطنت عالیہ ایران کے جدید ترین مساعی جمیلہ میں اس ادبی انجمن کا قیام بھی ہے جو "فرہنگستان ایران" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا مقصد زبان اور ادبیات ایران کی ترقی و توسیع ہے۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد میں زبان فارسی کی روز افزوں ضرورتوں کو پورا کرنے کی ترکیب سوچنا اور اس ڈھنگ سے زبان کی اصلاح کرنا ہے کہ اس کی بین الاقوامی اہمیت باقی رہے۔

سرکاری اعلان کے مطابق اس انجمن کا مقصد ایک لغت کا مرتب کرنا موجودہ فارسی سے بعض محاورات اور الفاظ کا خارج کرنا، ان میں اضافہ کرنا، اصطلاحات علمی کا وضع کرنا، بیرونی عناصر سے ملک کی زبان کو پاک کرنا، آئندہ کے لیے ملک کے شعرا اور ادیبوں کی رہبری کرنا اور رسم خط کی اصلاح کرنا ہے۔

یہ باتیں تحریر میں تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن دقت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب مفکرین، ادبا اور سیاست داں اشتراک عمل کی کوئی مخصوص بنیاد قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مصنف تاریخ "تنقید جدید" مسٹر جوئل اسپنگرن کا قول جدید فارسی ادب پر بالکل منطبق ہوتا ہے: "ہر قدیم بغیر جدید کے ترقی کا دشمن ہے اور جدید بغیر قدیم کے محنت

نااہل اصلاح حماقت ہے"۔ مغربی تہذیب کو تمام تر اختیار کرنا۔ یورپ کی ہر بات کو مستحسن سمجھنا اور ان کی معاشرت کو اندھوں کی طرح قبول کرنا احساس ملی کے فقدان کے نمایاں آثار ہیں۔ جدید فارسی ادب میں تین متضاد رجحانات نمایاں ہیں۔

بعض لوگوں کا مستقل خیال ہے کہ اسلامی روایات سے علیحدگی نہ کی جائے مگر ساتھ ہی ساتھ ان کا میلان خالص فارسی ادب و تمدن کی ترقی اور تاریخ ایران کی اہمیت کو واضح کرنے کی طرف بھی ہے۔ بعض خیال پرست لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہو سکے تو فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کر کے ساسانیوں کے زمانے کی فارسی کو، جسے وہ اصلی فارسی سمجھتے ہیں، رواج دیا جائے۔

ایک معتد بہ تعداد فارسی اور عربی کے موجودہ تعلق اور اختلاط الفاظ کو روا رکھتی ہے۔ اور یورپ کی بہ نسبت قاہرہ سے الفاظ کے لینے کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ ملکی مصنفین اور عربی خط تحریر کی طرف دار ہے" اس جوش کا وہ بااثر اور باعمل طبقہ مصنفین مخالف ہے۔ جو اپنے اہل وطن کو تقلید یورپ کا سبق پڑھاتا ہے۔ اور لاطینی رسم خط کو اختیار کرنے کا حامی ہے۔

جب سے ترکوں نے لاطینی خط اختیار کر لیا ہے اہل فارس بھی اس معاملے پر بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہے ہیں مگر قبل اس کے کہ تبدیل خط عمل میں آئے امور ذیل کو ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

رسم الخط کی حالت دونوں ملکوں میں بالکل جداگانہ ہے۔ "عربی خط" ترکی زبان کے لیے نامناسب تھا۔ یہ فارسی زبان کے لیے بالکل نہیں تو بڑی حد تک مناسب ہے۔ اس لیے کہ عربی زبان کے الفاظ فارسی کے اجزائے صحیح بن گئے ہیں۔

فارسی کی ادبی زبان میں بہ نسبت تکلمی اور بازاری زبان کے عربی کی اہمیت اور ضرورت کہیں زیادہ ہے۔ فارسی کا خزانہ ایسا قیمتی خزانہ ہے، جس کی نظیر کسی دوسری مشرقی قوم کے پاس نہیں، جدید طبیعیات کے سوا کوئی ایسا علم و فن نہیں جس کا بہترین نمونہ فارسی زبان میں دستیاب نہ ہو سکتا ہو۔ بہتر سے بہتر بلند پایہ اخلاقی فلسفیانہ تخیلی، اور مذہبی کتابیں فارسی میں لکھی گئی ہیں۔

سیاسی شورشوں اور ہنگاموں سے فاتحانہ نجات کے بعد ایران کو بڑے بڑے سماجی، اقتصادی، اور تعلیمی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ فارس مغرب کی کورانہ تقلید کرے یا "حیات جدید" کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مشرقی قوم کی حیثیت کو قائم رکھے۔ اس مسئلے کا حل آسان نہیں۔ ایران اب تک ناپائدار اور بے ثبات حالت میں ہے۔ ایران کے سامنے ترکی کی مثال ہے، جو فی الحال ازمنۂ گزشتہ کو بھول کر اندھوں کی طرح مادی مفاد کو پیش نظر رکھ کر یورپ کی نقالی کر رہا ہے۔ لیکن ترکی اور فارس کی جغرافیائی اور ذہنی اور ملی حالت بالکل مختلف ہے۔

ایران جدید میں ہر آدمی کو مشرق و مغرب میں ایک جنگ نظر آئے گی، مدعا یہ ہے کہ بالکل مادی مفاد کے اصول کے ماتحت اور یورپی معاشرت کی طرز پر ترقی کی جائے لیکن کلچر کے لحاظ سے یہ بھی خواہش ہے کہ ساسانیوں سے قبل کی روایات کی طرف پلٹ چلنا چاہیے، موجودہ حکومت کی اُن کوششوں کے طریقوں کو جو ایران کی معاشرت کی تبدیلی کے لیے کر رہی ہے کسی فلسفیانہ اصول یا قاعدے کی بنا پر سراہنا ناممکن ہے۔ ایران ہمیشہ سے ایک علم دوست ملک ہے، وہ اپنے قریب اور بعید کے ازمنہ گزشتہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ فارس کا منتہائے نظر ہمیشہ غیر مادی اور مذہبی رہا ہے اور یہ نظریہ سوسائٹی کے ہر طبقے میں موجود ہے۔ اسلام نے ایران میں ایک روح پھونک دی تھی جس نے ساسانیوں کے ہر جزو بدن کو نئی زندگی بخش دی تھی لیکن اگر اب وہ فتح اسلام کے قبل کی روایات کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے تو اس کی حالت اس بہتر نہ ہوگی جیسی ساسانیوں کے آخری تاجدار یزد جرد ثالث کے زمانے میں تھی۔ لیکن اسی طرح مصر کی مثال بھی مشرقی اقوام کے سامنے ہے جس نے باوجود مغربی اقوام سے براہ راست تعلق کے اپنی زبان کی امتیازی خصوصیات کو قائم رکھا اور زبان میں ایسی اصلاحیں نہیں کیں جن سے اس کا اصلی رنگ بدل جائے۔

جب ایرانیوں کو ایران کی عظمت کے خواب دکھائی دے رہے ہیں جب وہ ساسانیوں کی روایات پر فخر کرتے ہیں۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کے معاد سے کیوں کر علحدگی کا اظہار کر سکتے ہیں جس کی تہذیب اُن کی روح میں سرائت کر چکی ہے اور اسلام کے برکات کو کیوں کر بھول سکتے ہیں جو ان دونوں سب سے بڑی متحد کرنے والی طاقت ہے۔ زمانۂ ماضی میں ایران نے اسلامی اسپرٹ کو ہر شعبۂ حیات میں ممتاز جگہ دے رکھی تھی اور اب بھی جدید قوتوں کے دباؤ کے باوجود ایران اپنی برتری اور بزرگی ثابت کر سکتا ہے اور اپنے مذہب، اپنی زبان اور اپنی قومیت کو قائم رکھ سکتا ہے۔

# سکندر اور ضاحک

از ق ع و
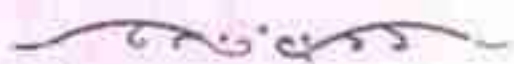
کلیات سوداؔ کے بعض نسخوں میں ایک مخمس ہے جو میر ضاحک کی ہجو میں ہے۔ اس کی شانِ نزول آزادؔ یوں بیان کرتے ہیں۔ "سوداؔ کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی ہجو جب میں دیکھتا تھا "یا رب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر"۔ تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام؟ میر مہدی حسن فراغؔ کو خدا مغفرت کرے۔ انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسب معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے، صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفا و شعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے، ان کی پرانی وضع اور لباس پر۔۔۔ صاحب عالم مسکرائے۔ میر صاحب آکر بیٹھے، مزاج پرسی ہوئی، حقہ سامنے آیا، اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے۔۔۔ سوداؔ نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں کچھ کہا نہیں، میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انہوں نے ایک مخمس کہا ہے۔ سوداؔ نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہوگئے۔ سکندر بیچارے حیران کہ ناواسطہ نہ سبب ایک آفت آگئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے، دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سوداؔ کو دیکھیے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے تھے۔"

سنبل اور اردو کے مصنف نصیر حسین خان خیال مرحوم اس روایت کو از سر تا پا لغو سمجھتے ہیں۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:۔

"یہ فراغ بھی۔۔ ایک عجب ستم ظریف ہیں مگر آزاد پر عجب ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں بھی دلی کے شرفا کو دیکھا اور ان کی تمیز داریوں کو نگاہ رکھا ہوگا، اس پر وہ ایک ایسا قصہ بیان کر گئے! سکندر کو میں نہیں جانتا، مگر ضاحک کو پہچانتا اور ان کے خاندان سے واقف، اور ان کے گھر کی شرافتوں سے آشنا ہوں۔ اس لیے میں کہوں گا کہ یہ حکایت از سر تا پا لغو ہے۔ اول تو میاں سکندر کا لکھنؤ جانا ہی ثابت نہیں، پھر یہ کہ ضاحک کے سے بزرگ کسی صحبت میں شریفوں سے یوں ہاتھا پائی کر بیٹھیں! اس پر مزید یہ کہ یہ واردات مرزا سلیمان شکوہ کے سے مہذب شہزادے کی صحبت میں ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آزاد کے وقت میں دلی کے امرا کی صحبتوں کا کیا قرینہ ہوگیا تھا اور ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے زمانے میں کیا دیکھا۔ مگر جس وقت کا قصہ انہوں نے چھیڑا ہے اس زمانے کا ہمارا کوئی امیر زادہ اتنا بے قرینہ نہ تھا کہ اس کی صحبت میں دو شریف یوں کشتی ہو جائیں۔ ہمارے آزاد اپنی قصہ گوئی میں اکثر بہت بڑھ جاتے ہیں۔" ص ۱۲۱، ۱۲۲

اسی کتاب میں ذرا آگے بڑھ کر صاف صاف یہ الزام لگاتے ہیں کہ آزاد نے یہ روایت گڑھ لی ہے۔ "آزاد مرحوم اپنے مورخ ہونے کے مدعی نہیں، اس لیے تاریخی غلطیاں کر جائیں تو قابلِ معافی ہیں، مگر تذکرے کی غلطیاں اور اس طرح کی داستان سرائیاں لائقِ معافی نہیں، جہاں سوداؔ اور ضاحک کا ذکر ڈھٹائی سے بیان کر دیا گیا ہو وہاں اور قصوں

کمائیوں کے ساتھ مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں کی ایک صحبت اور ضاحک و سکندر کی اس روایت کا گڑھ دیا گیا بڑی بات
خیال مرحوم کا استدلال زیادہ تر قیاسی ہے۔ ان کے نزدیک میر ضاحک سے شریف کا کسی دوسرے شریف آدمی سے
دست و گریباں ہو جانا، اور وہ بھی سلیمان شکوہ سے مہذب شہزادے کی صحبت میں، حد درجہ خلاف قیاس ہے۔ اس کے متعلق
گزارش ہے کہ میر ضاحک کی شرافت جب اس بات سے مانع نہ ہوئی کہ خود دوسروں کی ماں بہنوں کو گالیاں دیں اور اپنی
ماں بہنوں کو گالیاں سنوائیں، تو ہاتھا پائی کے لیے تیار ہو جانا کون سی بڑی بات ہے۔ سلیمان شکوہ کی صحبت کے رکن
رنگین، انشا، [illegible]، جرأت تھے۔ قتیل اور صاحبقران کی بھی جیسا کہ بعض کتابوں میں ہے ان کے یہاں رسائی تھی۔ یہ لوگ
ان کے یہاں ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل پر بحث کرنے کے لیے نہیں جاتے تھے، بلکہ ان کی اصلی غرض گویا محض
ہنسی مذاق سے شہزادے کا دل خوش کرنا تھا۔ ایسی صحبت میں اگر اتفاقی طور پر لوگ زبان سے ہاتھ پر اتر آئیں تو
کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایسی باتیں اچانک ہو جاتی ہیں۔ ان کی اطلاع پہلے سے تو ہوتی نہیں کہ پیش بندی کی جائے۔
خیال مرحوم کی یہ دلیل کہ سکندر کا لکھنؤ جانا ثابت نہیں، زیادہ توجہ کی مستحق ہے، اور اگر واقعی یہ ثابت ہو جائے کہ سلیمان
شکوہ کے زمانے میں سکندر کا قیام لکھنؤ میں نہیں رہا، تو پھر آزاد کی روایت کو مصنوعی سمجھنے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ سب سے
پہلا تذکرہ جس میں سکندر کا حال ملتا ہے۔ تذکرہ میر حسن ہے۔ میر حسن ان کی مرثیہ گوئی، ہندوستان کی متعدد زبانوں سے ان
کی واقفیت، مہارت فن موسیقی، اور ان کی ایک نظم کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ص ۱۲۲ :

"اگرچہ علم ندارد و لیکن بر کلام او جائے انگشت نیست۔ چوں با ہمہ مردم خوش طبعی دارد و شراب می خورد بہ نظر بعضے [illegible]
می نماید۔ غرض مرد زندہ دلے ست۔ گاہ گاہ بطرز قدیم شعری گوید۔ طبعش مائل ایہام بسیار است، سلامت باشد۔"

میر حسن نے اس کی تصریح نہیں کی کہ ان سے ذاتی ملاقات تھی یا نہیں اور نہ یہ لکھا ہے کہ ۱۱۸۸–۱۱۹۲ھ (زمانہ ترتیب
تذکرہ) میں سکندر کا قیام کس جگہ تھا، تاہم ان کے الفاظ سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ذاتی علم سے کہہ رہے
ہیں۔ میر حسن سے اگر دہلی کی ملاقات ہوتی تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ چونکہ ترتیب تذکرہ کے وقت میر حسن اور سکندر کا قیام
ایک ہی شہر میں تھا، اس لیے میر حسن نے تصریح کو غیر ضروری سمجھا۔ ممکن ہے کہ بعض اصحاب اس استدلال کو قبول نہ کریں، لیکن انکار
ہر شخص کو ناجائز لگا کر میر حسن نے ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جو سکندر کے قیام اودھ کے منافی ہو۔ یہی حال مصحفی کا ہے جو سکندر
کے متعلق لکھتے ہیں کہ ... "شخص دائم الخمر و خوش طبع و ظریف مزاج درویش، طبعش بطرف پنجاب است ... اکثر
ہم گاہ گاہے ... شعر بطور قدیم و جدید می کند۔"

مصحفی کا تذکرہ بتدریج ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوا ہے۔ مصحفی نے جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، لکھنؤ میں انہیں دیکھا۔ دہلی چلے
گئے ہوتے تو تصریح ضرور کرتے۔ میر حسن اور مصحفی کے اقوال ہم نے اس لیے نقل کیے ہیں کہ یہ تذکرے سکندر کے زمانہ حیات
میں لکھے گئے ہیں، ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ان تذکروں میں سکندر کے لکھنؤ میں قیام کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ ہم صرف یہ دکھانا چاہتے

ہیں کہ ان میں کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ سکندر کبھی لکھنؤ نہیں گئے۔ اس دعوے کے قطعی ثبوت کے لیے کہ سکندر لکھنؤ گئے تھے، ہم شاہ کمال مصنف مجمع الانتخاب کے ممنون ہیں۔ یہ تذکرہ شاہ کمال نے حیدرآباد میں سکندر کی موت کے بعد مکمل کیا ہے، اس میں انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ لکھنؤ میں سکندر سے ملاقات ہوئی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم اس تذکرے کی عبارت اس وقت نقل نہیں کر سکتے، کیونکہ اس کا قلمی نسخہ جو ہماری نظر سے گزرا ہے وہ لندن میں ہے اور ہندوستان میں جو نسخہ ہے اس سے بھی فوری استفادہ ممکن نہیں۔ دتاسی نے اپنی تاریخ ادبیات کی دوسری یا تیسری جلد میں شاہ کمال کے حوالے سے سکندر کے لکھنؤ جانے کا ذکر کیا ہے۔ دتاسی کے حوالے کبھی کبھی غلط بھی ہوتے ہیں۔ لیکن سکندر کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی مجمع الانتخاب سے ماخوذ ہے۔

سطور بالا کے مطالعے سے ہمیں امید ہے کہ ناظرین بھی ہماری طرح اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ خیال مرحوم کی دلیلیں آزاد کی روایت کو مسترد کرنے کے لیے کافی نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر ان دلیلوں سے یہ روایت غلط ثابت نہ ہو سکی، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے صحیح تسلیم کر لیں۔ ہم اس روایت کی صحت یا عدم صحت سے بحث کرنے سے قبل وہ مخمس نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جس کی شان نزول آزاد نے بیان کی ہے:۔

یارب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر (۱) ضاحک ۔۔۔۔۔ کسی بن میں قلندر
گھر اس کے تولد ہو اگر بچہ بندر گلیوں میں نچاتا پھرے وہ ٹکے کے اندر
روٹی تو کما کھائے کسی طرح مچھندر

گھر والی کو اس کی یہی اب فکر ہو دن رات (۲) بچہ کوئی بندر کا جو لگ جائے مرے ہات
سکھلا کے اسے ناچ کی بندر کے دو اک بات دوں بھڑوے نکھٹو کو جو اس کی کٹے اوقات

اک ہانڈی پرانی سی کا گھیرا میں منڈھا دوں (۳) بکرا تو کہاں لینڈی سا کتا ہی منگا دوں
جو اس کے نچانے کی طرح ہے سو بتا دوں پھر کیا کروں اتنا بھی جو ساماں نہ بنا دوں

گر ہجو موا لوگوں کی ناحق نہ بنوا لے (۴) اور اپنی موی جیتی کی گالی سے نہ شرمائے
کوئی دوست اگر اس کا ہو اس بھڑوے کو سمجھائے اس سے تو بھلا دو گھڑی بندر ہی نچا لائے

گر چہ قدر دو پولی جو میں پیدا کروں بچو نی (۵) کھا جائے اسے بھوک رکھے پیٹ پہ دولی
جم جم رہے آباد یہ بستی نہ ہو سونی بندر کے نچانے میں بھلا کیا ہے زبونی

بندر تو ہے کیا مرد ہو تو ریچھ لڑائے (۶) پیسا ہو اگر ملتا تو دو پیسے یہ پائے
پر میری نصیحت موا خاطر میں نہ لائے میں چاہتی ہوں اس سے بھلا کچھ تو بن آئے

مر جائے موا یہ تو میں دوں بی بی کی ٹڑیاں (۷) تنے روٹیاں روکھی مجھے مانگے ہے چپڑیاں

لے لے کر ٹکے پیسے کو سب شہر کی گڑیاں
سی سی میں اسے دوں جو یہ بیچا کرے گڑیاں

(۸)
یوں بھی نہ ہو اس سے تو میں تنگ آ کے بتاؤں
گر نہ بنے کے لیے کشیدہ گری کی ایک چھوٹی سلاؤں
دو چیتھڑے ہی رنگ کر حلوا خاتون بنا دوں
میں کل کی بی بی ہوں اسے کچھ تو سکھا دوں

(۹)
بھجوا دیں اسے جو رو تو اب اس کی نہ ہو نگی
رنگ چھاپ لے دو حلوا خاتوں میں ڈنگی
دو زخ کے لیے اس کے پرا تنا تو کر دو نگی
کہتا پھرے بھڑوا کر جنتیاں لال تو نگی

(۱۰)
کہتا ہوں میں اس سے جو لگے شرم ہو میری
ان باتوں سے ہونے کی نہیں پیٹ کو سیری
پھر بھو نکتا پھرے بھڑوا مری تیری
لے کر حلوا خاتون یہ کرے شہر میں پھیری

(۱۱)
کرنے حلوا خاتون کو یہ گلیوں میں ہانڈی
چادر کو بچھا چوک میں اور باندھ کے ساڑی
دس میں جڑی بوٹیوں سے کر کے یہ تھا ڈی
بیٹھا انہیں دیکھوں جنبوں کی سنت ہو . . .

(۱۲)
اک اور علاج اب نظر آیا مجھے اس کا
نتھ ناک میں ڈال اور پہنا ساری دلہنکا
منڈوا تی ہوں ڈاڑھی موئے کی نائی کو بلوا
بکواؤں گی اس بھڑوے سے کوٹھے ہی پکڑوا

(۱۳)
یوں بھی نہ ہو تو لے کے اک اوڑھنی کی چادر
جھٹا جو کرے چیل اسے جھٹ سے پکڑ کر
او ندھا ہو رہے زیر فلک . . . کو رنگ کر
جا چوک میں بیچا کرے دو چار ٹکے پر

(۱۴)
پایا یہ گدھا میں نے تو گانے میں نہ پورا
جس کام میں دیکھا تو یہ چھوڑ دے ادھورا
گاتا جو یہ سُر سے تو لے دیتی طنبورہ
آخر میں بناؤں گی اسے توپ زنبورہ

(۱۵)
ان باتوں میں سے اس کو اگر کچھ نہ بن آئے
اس طرح کو پھر مولوی ساجد کو سکھائے
اک مرثیہ کہہ کر شمر کا یہ طرح بنائے
بازو کرا سے جلد گیتھڑ کو یہ جائے

(۱۶)
گر ہجو کی لوگوں کی نہ کہیگا یہ سو گند
اب مجھ کو رکھا جاہے تو منھ اپنا کرے بند
تو ماں ہی پھر میں اس کی ہوں میرا ہے یہ فرزند
ان کاموں سے جو کام کرے اس کو ہوں خورسند

(۱۷)
آخر کہا اس نے مجھے اس پاس نہ رہنا
ان کاموں سے کب اس کے نصیبوں میں ہے گہنا
پھر بات نصیحت کی مجھے اس سے نہ کہنا
لے دوں گی میں وہ جھوکریاں بیچ کے گہنا

(۱۸)
گر یوں نہ کروں میں بھلا کیا کروں لوگو
جو چیز جہیز دو ہے مری مجھ سے کوئی لو
بھڑوائی کر جو بھڑوے کی قسمت میں لکھی ہو
گر دی اسے رکھو لے دو چھو کریاں لے دو

(۱۹)
خاموش ہو سودا نہ زباں اپنی بہت کھول
کچھ سیم شکو ہی نہ گائیں گی بجا ڈھول
جھگڑے میں خصم جورو کے آگے تو نہ اب بول
ڈنکا ہے دمامے کا کہ یہ مصرع ہے انمول
روٹی تو کسی طرح کما کھائے مچھندر

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ فراغ کس قسم کے راوی ہیں۔ ان کی سیرت کے متعلق اب کچھ نہیں کہا جا سکتا اس لیے
کہ نہ ان کی کوئی تصنیف موجود ہے اور نہ ان کے معاصرین نے کچھ اس بارے میں لکھا ہے۔ آزاد کے بیان سے ان کے
زمانۂ حیات کی البتہ ایک حد تک یقین کی جا سکتی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ یہ "میر کے قدیمی دوست اور ہم مشق تھے"[1] "میر ناسخ
کے شاگرد تھے" اور ان کی پیدائش ہرگز ۱۲۱۵ھ سے قبل کی نہیں تھی۔ اگر فراغ میر سے عمر میں بڑے بھی ہوں تو ۱۲۰۰ھ سے
قبل پیدا نہیں ہوئے ہونگے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ سودا اور ضاحک کے زمانے کی باتیں یہ آنکھوں دیکھی بیان نہیں
کر سکتے تھے۔ کیونکہ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہو چکا تھا اور ضاحک بھی ۱۲۰۰ھ سے قبل ہی فوت ہو چکے تھے۔ مصنف مغل
اور اردو[2] کی رائے میں سلیمان شکوہ سودا و ضاحک کی وفات سے قبل لکھنؤ گئے تھے۔ لیکن کل مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ غلام
قادر کے واقعہ کے بعد ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ پہنچے تھے۔ اور ۱۲۰۵ھ میں سودا اور ضاحک کا سلیمان شکوہ کی صحبت میں اکٹھا
ہونا قطعی ناممکن ہے۔ سلیمان شکوہ کا ۱۲۰۵ھ سے قبل بھی لکھنؤ آنا کسی تاریخ سے ثابت نہیں۔ حملۂ درانی سے پہلے جب
سودا اور ضاحک دونوں دلی میں تھے۔ سلیمان شکوہ نے اس دنیا میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ اس لیے مخمس کے متعلق جو روایت
آزاد نے بیان کی ہے وہ بتمام صحیح نہیں ہو سکتی۔ اور سلیمان شکوہ کا اس مخمس سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ
کہ ابھی اس روایت کا صرف ایک جز غلط ثابت ہوا ہے۔ اس کا ابھی تک امکان باقی ہے کہ سودا نے یہ مخمس سکندر کے نام
سے سلیمان شکوہ کے یہاں نہیں کسی دوسری جگہ پڑھا ہو۔ اور میر ضاحک اجیسا کہ آزاد نے لکھا ہے سکندر سے دست و گریبا
ہو گئے ہوں۔ مسئلے کے اس پہلو سے بحث کرنے سے قبل ہم ایک اور مخمس درج کرتے ہیں جو ہمیں کلیات حسن میں ملا ہے اور
جس کو پڑھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ دراصل میر ضاحک کا ہے اور غلطی سے میر حسن کے کلیات میں شامل ہو گیا ہے:۔

(۱) ضاحک نہ خوف کر تو اب کیا ہے وہ مچھندر | بکرے کا ہے وہ ...... اور زادۂ قلندر
انڈے سے تب نہ تب وہ بکرے کو باہر اندر | لکڑی کے بل نچا تو اس کو مثال بندر
.. تو اڑ رہے ہے ...... ہے سکندر

(۲) وہ صورتِ مخنث ہے ایک مسخرہ سا | تن جاوری کی داڑھی اور ڈوڑی نما سا
. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

(۳) پھر اس سے کام کر کر تو آگے چل ادھر کو | ہاں اور بھی ہوں اس کی اور مٹی ہو جدھر کو
کر عشرت گاہ اس کے جا کر تمام گھر کو | ...... کھا کے ضاحک مضبوط کر کمر کو

(۴) غیب سے صدا یوں آتی ہے مجھ کو ہر دم | یہ وقت ہے وہ بگڑا اس کا نہ کر تو کچھ غم
سارے قبیلے کو تو ...... | اور مار شوق سے حز

(۵) وہ ایک ...... بجپ ہے بگڑا | باطن میں نرم ہے ظاہر میں گو ہے کڑوا

[1] برقانی

کڑ کے اپنی مونچھیں جب آئے وہ پھوڑوا — .. کا رکھ بنا کر تو اس کے سر پہ گڑوا

دھینور کا چھوکرا ہے پورب کا ہے زنانہ (۶) ہے مار داڑیوں کے ..... دو دانا

پنجابیوں کا رکھتا ہے ...... — ایسے کی بات ہرگز خاطر میں تو نہ لانا

ہر اک زبان کا ماہر اس واسطے ہوا ہے (۷) ماں نے حرام اس کی ہر جنس سے کیا ہے

ہو نطفے جمع ہو کر ہر باب اک بنا ہے — کہہ اس کے منہ پہ جا کر ایسا وہ مخنث کیا ہے

ہے نقل اس کی اک دن جورو کا یار آیا (۸) اس ساحرہ نے جنڈھا اس کے تئیں بنایا

............ — ڈھڑنے لگا جو دھگڑا اس کے تئیں سنایا

اس نے کہا کہ گر وہ آجائے گا تو پھر کیا (۹) کہنے لگی کہ مجھ کو اس کی نہیں ہے پروا

کچھ بات میں بتاؤں ہر طرح سے سمجھ گیا — ..............

........ آ گئے اس سے تابہ خالا (۱۰) وہ بھڑوا سب طرح سے ہو خوب دیکھا بھالا

گر وہ چڑھے تو کیا ہے ہے ایک چڑیا والا — ایسا کہاں سے آیا وہ رانی خاں کا سالا

ہمسائے میں تھی اس کے اک دن کسی کی شادی (۱۱) واں کے جا کے جورو اس کی بن ٹھنی بیزادی

ننھے میاں کو سر پر جھنجھلا کے مال زادی — گر آپ کو مخاطب پھر یہ مثل سنادی

ننھے میاں جب آئے تب ایڑیاں رگڑ کر (۱۲) کہنے لگی کہ ... آئیں تو کھسیلوں سر پر

دیور لگا یہ کہنے بھائی کاہے مجھے ڈر — جھنجھلا کے پھر وہ بولی تو میرے آگے لا دھر

سودا جیا سکندر گو ہووے کوئی کیسا (۱۳) مفلس ہو وہ مخنث یا رکھتا ہو پاس پیسا

جیسا کہ کوئی ہوگا پائیگا یاد ویسا — ناحق جو ہوئے دشمن تو کیا ہے ایسا تیسا

ان مخمسوں کے مطالعے کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ یہ دونوں ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان روہیلوں کی شکست سے پہلے فیض آباد میں لکھے گئے ہیں، میر ضاحک کے تعلقات سودا اور سکندر دونوں سے خراب تھے۔ دوسرا مخمس پہلے کا جواب معلوم ہوتا ہے، پہلا سکندر کی تصنیف ہے اور دوسرا امیر ضاحک کا لکھا ہوا ہے۔ پہلا کلیات سودا میں اور دوسرا کلیات حسن میں، مرتبین کلیات کی غلطی سے شامل ہو گیا ہے، ہم نے اپنی رائے جن وجوہ سے قائم کی ہے وہ درج ذیل ہیں:-

(۱) پہلے مخمس کے [illegible] ویں بند کا ایک مصرع ہے:- "بازو کرا سے جلد کٹہر کو یہ جائے" یہ مصرع روہیلوں کی شکست کے بعد اگر لکھا ہوا ہو تو اس میں کوئی لطف باقی نہیں رہتا، شجاع الدولہ اور رحمت خاں کی لڑائی ۱۱۸۸ھ میں ہوئی ہے اور روہیلوں کو شکست فاش نصیب ہوئی ہے۔ جس نے ان کی قوت کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ اودھ والے شجاع الدولہ کی ہواخواہی میں مصلحتاً روہیلوں کو اہل بیت کا دشمن قرار دیتے تھے۔ سودا ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان فیض آباد آئے ہیں۔

# اندر سبھا کے متعلق چند غلط فہمیاں

از آرزو جلیلی

ہمارے ملک میں قیاس کو تحقیق پر ترجیح دی جاتی ہے اور سُنی سنائی باتوں پر حد سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا یا لکھ دیا تو وہ لوہے کی لکیر ہو جاتی ہے اور مٹائے نہیں مٹتی۔ کسی روایت کا ایجاد ہونا شرط ہے، پھر تو نسلاً بعد نسلٍ وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی ہے اور اعتقادیات میں اس طرح داخل ہو جاتی ہے کہ اس کی صداقت میں شک کرنا بھی کفر سمجھا جاتا ہے۔ نور الٰہی مرحوم اور محمد عمر صاحب نے سنہ ۱۹۲۱ء کے رسالہ اردو میں ایک مضمون بالاشتراک لکھا، اور اس میں اندر سبھا کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کا خیال فرانسیسیوں نے پیدا کیا اور انھیں کی ہدایت کے مطابق قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہوا۔ اس کی تصنیف واجد علی شاہ کی فرمائش سے ہوئی اور خود بادشاہ نے اندر کا پارٹ کیا۔ صاحبانِ مضمون کے پاس کوئی تحریری ثبوت نہ تھا، اور اتنا بڑا دعویٰ محض زمانۂ حال کے ایک پارسی ایکٹر کے قول کی بنا پر کر دیا تھا، روایت پرستی کی یہ مثال تاریخ ادب اردو میں یادگار رہے گی۔ شرر نے دلگداز جنوری سنہ ۱۹۲۲ء میں اس مضمون کی تردید کی اور یہ لکھا کہ واجد علی شاہ کا مقرب بارگاہ کوئی فرانسیسی نہ تھا۔ صاحبانِ مضمون نے اس کا جواب رسالہ ہزار داستان لاہور میں شائع کرایا جس کا خلاصہ ان دونوں کی مشترک تالیف ناٹک ساگر میں درج ہے۔ ان صاحبوں نے اپنے دعووں کی تائید میں جو کچھ لکھا ہے وہ مختصراً یہ ہے:-

الف ناٹک ساگر ص ۳۵۵: "جتنے اہلِ کار تھے سب اسی دھن میں لگے رہتے تھے کہ رنگیلے پیا کے لیے کوئی نیا سامان تفریح پیدا کریں ۔۔۔۔۔ اسی سلسلے میں ایک فرانسیسی مقرب بارگاہ نے مغربی تھیٹروں کا نقشہ پیش کیا ۔۔۔۔۔ یہ وہ وقت تھا کہ بہ مصداق کل جدید لذیذ فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا (یعنی وہ ڈراما جو سر بسر رقص و سرود کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے) کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ اس لیے واجد علی شاہ کے حضور میں جس فرانسیسی ڈرامے کا ذکر آیا وہ اوپیرا تھا۔ ناچ گانا پہلے ہی ایک دل پسند خاطر چیز تھی۔ اس لیے ایما ہوا کہ ہندوستانی مذاق کا اوپیرا تیار ہو۔ قرعۂ فال امانت کے نام پڑا، جنھوں نے سنہ [illegible] میں اس فرض کو بہ وجہ حسن ادا کیا۔"

ص ۳۵۹: "رہس تو خیر ہندوستان میں عام چیز ہے، لیکن پردے جو بالکل مغربی چیز ہیں اور رہس کی نمائش اُن کی دست نگر نہیں ان کا قیصر باغ میں کیسے دخل ہوا؟"

ص ۳۶۲: "اندر سبھا کا تیار ہونا تھا کہ قیصر باغ میں اسٹیج تیار ہو گیا، جس میں فرانسیسی ہدایت کے مطابق ہندوستانی حرفت نے اپنے کمال دکھائے۔ مہ جبینان قیصر باغ پریوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئیں۔

واجد علی شاہ اودھ کے تخت پر براجمان ہوئے۔ باقی پارٹ باذوق اہل دربار کو بے حد پسند آئی۔ عوام کو اس مجلس میں بار نہیں ملتا تھا اس لیے ان لوگوں کے لیے چھوٹے پیمانے پر اس کی نمائش شروع ہوئی اور اندرسبھا کو قبول عام کا خلعت ملا۔

مولفین ناٹک ساگر کے دعووں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) واجد علی شاہ کا ایک فرانسیسی درباری تھا۔

(۲) اس فرانسیسی درباری نے فرانسیسی اوپیرا کا نقشہ پیش کیا، کیونکہ اس زمانے میں فرانس بلکہ عام یورپ میں اوپیرا کا بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ اس لیے واجد علی شاہ کے دربار میں جس فرانسیسی ڈرامے کا ذکر آیا وہ اوپیرا تھا۔

(۳) پردے بالکل مغربی چیز ہیں اور جس کی نمائش ان کی دست نگر نہیں۔

(۴) امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندرسبھا لکھی اور واجد علی شاہ نے اندر کا پارٹ لیا۔

یہ چاروں دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔ ہم ہر دعوے کے خلاف فرداً فرداً تاریخی ثبوت پیش کریں گے۔

(۱) ہمارے موجودہ علم کے مطابق واجد علی شاہ کے دربار میں کوئی فرانسیسی نہ تھا۔ تاریخ کے اوراق سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ یہ بات خلاف قیاس ہے۔ نواب اودھ اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں نواب سعادت علی نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی ملازمت میں کسی یورپی کو نہ رکھے گا۔ اس معاہدے کی حقیقت میں نے تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

۱۷۹۷ء میں جب نواب آصف الدولہ کا انتقال ہوا تو اس کی جانشینی کے لیے مرزا وزیر علی اور سعادت علی میں جھگڑا ہونے لگا۔ مرزا وزیر علی آصف الدولہ کا متبنیٰ تھا اور آصف الدولہ نے اسی کو اپنا وارث نامزد کر دیا تھا۔ سعادت علی آصف الدولہ کا سوتیلا بھائی تھا۔ سعادت علی فساد کے خوف سے بنارس میں مقیم ہو گیا۔ سر جون شور کی مدد سے سعادت علی اور جنوری ۱۷۹۸ء کو مسند پر بیٹھا۔ اور اس کے عوض اس نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا۔ جس کے دفعات یہ ہیں:-

(۱) نواب چھہتر لاکھ روپے کا سالانہ خراج ادا کرے گا۔

(۲) الٰہ آباد انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔

(۳) اودھ میں انگریزی فوج کی تعداد دس ہزار ہوگی۔

(۴) (الف) نواب انگریزوں کو ۱۲ لاکھ روپے معاوضہ دے گا، کیونکہ وہ انگریزوں کی مدد سے مسند پر بیٹھا تھا۔ (ب) بغیر انگریزوں کی اجازت کے وہ کسی بیرونی ریاست سے راہ و رسم نہیں پیدا کرے گا۔ (ج) اپنی ملازمت میں کسی فرنگی کو نہ رکھے گا اور نہ کسی فرنگی کو اپنے علاقے میں سکونت اختیار کرنے دے گا۔[۱]

انگریز ہرگز نہ چاہتے تھے کہ کوئی فرنگی دربار اودھ میں آئے۔ اس پر وہ بڑی سختی سے عمل کراتے تھے۔ ۲۳ اکتوبر ۱۸۰۵ء کو

[۱] تاریخ ہند مصنفہ مل جلد ششم صفحہ ۵۵۔

ولیسلی نے اودھ کے ریزیڈینٹ کو ایک خط لکھا تھا:

"...... میری خواہش ہے کہ کمپنی کے ملازمین کے سوا ہر یورپین نکال دیا جائے۔" [1]

دس نومبر ۱۸۰۱ء کو ولیسلی نے نواب وزیر سے ایک معاہدہ کیا جس کے ذریعہ اودھ پر کمپنی کو پورا اختیار حاصل ہوگیا ان تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ سے بہت پہلے اودھ کا دربار فرنگی ملازمین سے خالی کر دیا گیا تھا نواب اودھ ادنیٰ سے ادنیٰ بات بھی انگریزوں کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔ کسی فرنگی کو اودھ میں پہنچنے کی اجازت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ واجد علی شاہ کے دربار میں کوئی فرانسیسی تھا۔ جناب محمد عمر صاحب سے گزارش ہے کہ فرانسیسی درباری کے متعلق مستند کتب تاریخ کے حوالے پیش کریں۔

(۳) **اوپیرا کی تاریخ**:۔ مولفین ناٹک ساگر کا قول ہے کہ عہد واجد علی شاہ یعنی انیسویں صدی عیسوی میں فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ ان صاحبوں نے اوپیرا کو فرانسیسی ڈرامے کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ اوپیرا کی پیدائش اٹلی میں سترہویں صدی عیسوی ہوئی۔ "اوپیرا" اطالوی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی کام کے ہیں۔ اوپیرا کی بنیاد سولھویں صدی عیسوی میں پڑ چکی تھی۔ مگر اس نے اپنی موجودہ شکل سترہویں صدی عیسوی میں اختیار کی۔ اٹلی کے مشہور ماہر طبیعیات گلیلیو کا باپ وفسنزو گالیلی اوپیرا کے اولیں بانیوں میں تھا۔ اس نے ایک مشہور قصے کو منظوم ڈرامے کی شکل میں اس طرح پیش کیا کہ اٹلی کے ماہرین موسیقی دنگ رہ گئے۔ ۱۶۰۰ء میں جیکوپو پیری کا اوپیرا "یوریڈلیس" پبلک کے سامنے پیش کیا گیا۔ اب اٹلی میں اوپیرا کا رواج عام ہوگیا۔ اس کے بعد جب یورپ میں اوپیرا کی شہرت ہوئی تو جرمنی اور فرانس میں بھی اوپیرا نے رواج پایا۔ اوپیرا کے متعلق انیسویں صدی میں کل جدید لذیذ کی مثل صادق نہیں آتی۔

یہ مان بھی لیا جائے کہ اندر سبھا ہندوستانی مذاق کا اوپیرا ہے، جب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی تیاری میں فرانسیسی ہدایت کو دخل تھا۔ اگر زبانی دعویٰ کرنا ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اندر سبھا کی تیاری میں اطالوی جرمنی، روسی اور ہسپانوی مشیروں کی ہدایت کو دخل تھا۔

(۴) **ہندوستانی تھیٹر میں پردے کا استعمال**:۔ مولفین ناٹک ساگر نے پردے کو خالص مغربی چیز قرار دیا ہے۔ یہ دعویٰ ان صاحبوں کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کا استعمال ابتدا ہی سے تھا۔ مسٹر ہوریس ہیمن ولسن نے اپنی مشہور تصنیف "تھیٹر آف دی ہندوز" میں سنسکرت کے بعض ڈراموں کا ذکر کیا ہے جن میں پردے کے استعمال کے متعلق ہدایات ہیں۔ ڈراما سنگیت رتناکر میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں اور امتنگر گاتے ہوئے داخل ہوں اور **رقاصہ پردے کے پیچھے سے آگے بڑھے**۔" سنسکرت کے

[1] تاریخ ہند مصنفہ مل جلد ششم، ص ۱۷۶

ڈراموں میں جب مثل اسٹیج پر آتے ہیں تو پردہ اٹھاکر" یا "پردہ کھینچ کر" آتے ہیں۔ اس کے لیے سنسکرت میں ایک لفظ ہے "اپاٹکشےپے" جس کے معنی ہیں "پردہ اٹھاکر" یا "پردہ کھینچ کر"۔ مُدرا راکشس سنسکرت زبان کا ایک مشہور ڈراما ہے جس کا مصنف وِیشاکھ دت ہے۔ یہ ڈراما آٹھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا، اور "بمبئی سنسکرت سیریز" میں چھپ چکا ہے۔ اس کی چوتھی اشاعت میں صفحہ ۲۰۰ پر یہ عبارت ہے:

(پردہ ہٹا کر وہ آگے بڑھتا ہے): "اے راکشس! میں وِشنوگپتا تجھے سلام کرتا ہوں۔"

یعنی وِشنوگپتا جب اسٹیج پر آتا ہے تو پردہ ہٹاکر آگے بڑھتا ہے اور راکشس سے گفتگو کرتا ہے۔ سنسکرت کی اصل عبارت میں لفظ جَونیکا (　　　) استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے معنی پردے کے ہیں اور سنسکرت زبان میں پہلی صدی عیسوی سے پایا جاتا ہے۔ سنسکرت ادب کے محققین کا متفقہ خیال ہے کہ سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کا استعمال ابتدا ہی سے ہے۔ جب سنسکرت کے ڈراموں میں پردے کے استعمال کے متعلق ہدایتیں موجود ہیں تو پھر بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ ہمیں تسلیم کرلینا پڑیگا کہ پردے بالکل مغربی چیز نہیں بلکہ ان کا وجود ہندوستان میں کم سے کم پہلی صدی عیسوی سے ہے۔

(۴) **اندر سبھا کی تصنیف کا سبب** — مؤلفین ناٹک ساگر کا قیاسی دعویٰ یہ ہے کہ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔ ان صاحبوں کے دوسرے دعووں کی طرح یہ دعویٰ بھی سراسر بے بنیاد ہے۔ انھوں نے اپنے دعوے کی تائید میں کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا۔ واجد علی شاہ کے اندر بننے کا ثبوت وہ لالا کنور سین کے قول سے دیتے ہیں[1] اور لکھتے ہیں کہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے ہماری مزید تشفی کردی۔ کنور سین جیسا یا کیفی صاحب نے امانت کا زمانہ نہیں دیکھا کہ ہم ان کے قول کو آنکھیں بند کرکے مان لیں۔ خود واجد علی شاہ کی تصانیف میں کہیں امانت کی اندر سبھا کا ذکر نہیں۔ اس موضوع پر جناب جناب مسعود حسن رضوی صاحب کا ایک مضمون رسالہ اردو (اپریل ۱۹۲۶ء) میں شائع ہوا ہے۔ جس میں جناب مضمون نگار نے شرح اندر سبھا کے حوالے اور دیگر دلائل سے مؤلفین ناٹک ساگر کے دعووں کی تردید کی ہے۔ شرح اندر سبھا کی مکمل عبارت اس مضمون کے ساتھ درج ہے۔ اس میں خود امانت نے اندر سبھا کی تالیف کا سبب بیان کیا ہے۔ امانت کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے شاگرد عبادت کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔ شرح اندر سبھا کا حسب ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

"...... ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی ............ شاگرد اول موزوں طبیعت تخلص عبادت عاشق کلام امانت نے از راہ محبت کہا کہ بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسے کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں شہرت ہووے۔ آخر الامر موافق اس کی فرمائش کے بندہ کہنے پر آمادہ ہوا۔"

امانت کے اس بیان کو پڑھ کر بھی کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔؟ اس کے متعلق رضوی صاحب مفصل بحث کرچکے ہیں۔ شرح اندر سبھا کے مطالعے سے مجھے ایک نئی بات

---

[1] ناٹک ساگر ص ۲۶۲ [2] اردو۔ اپریل ۱۹۲۶ء ص ۳۱۹۔

معلوم ہوتی ہے کہ اندر سبھا کی تیاری بڑی مشکل سے ہوئی تھی۔ امانت کا بیان ہے:۔

"دو شخص اس جلسے کی تیاری پر آمادہ ہوئے، ہجوم حد سے زیادہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ بعد ہزاراں شور و فساد کے اور بحث و تکرار کے ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا۔"

اگر امانت کو واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل ہوتی تو ڈیڑھ برس کی بحث و تکرار کے بعد کیوں جلسہ تیار ہوتا؟ وہ شخص جن کا ذکر شرح اندر سبھا میں ہے، غالباً امانت کے دوست ہوں گے۔ کیونکہ اگر وہ واجد علی شاہ کے درباری ہوتے اور واجد علی شاہ کے ایما سے اندر سبھا کی تیاری پر آمادہ ہوئے ہوتے تو امانت اس کا ذکر ضرور کرتے۔ اس کے علاوہ اندر سبھا کا جلسہ ہنگامہ و فساد کے بعد تیار نہ ہوتا۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑیگا کہ امانت کو واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات قابل غور ہے۔ امانت کو لکنت کا مرض تھا، اور کسی زمانے میں ان کی قوت گویائی بھی سلب ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے گوشہ نشین رہا کرتے تھے۔ شرح اندر سبھا میں امانت لکھتے ہیں:۔

"...... شب کو شام سے دو پہر رات گئے تک صحبت میں شاگردوں اور احباب کا مجمع رہتا تھا۔ مگر دل میں در پردہ عشق کی آگ تھی، طبیعت کو حسن سے لاگ تھی۔ وضع کے خیال سے کہیں آتا تھا نہ جاتا تھا۔ زبان کی وابستگی سے گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ حاجی مرزا عابد علی......"

شرح اندر سبھا کے مندرجہ بالا اقتباسات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ امانت کہیں آتے جاتے نہ تھے، اور جب تنہائی کی زندگی سے جی گھبرانے لگا تو انہوں نے اپنے شاگرد عبادت کی فرمائش سے اندر سبھا لکھی۔ امانت حسن پرست تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسا ڈراما لکھا جس میں ناچ گانا زیادہ ہو۔ ان کی طبیعت کا رجحان ہی کچھ ایسا تھا کہ انہوں نے جو ڈراما لکھا وہ رقص و سرود پر مشتمل تھا۔

یہ دو شخص کون تھے، جن کا اندر سبھا کی تیاری میں حصہ تھا؟ اس کی تحقیق کے لیے میں نے تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا مصنفہ ناصر لکھنوی کا مطالعہ کیا، اس تذکرے کی کتابت ۱۲۶۲ھ میں ہوئی، لیکن اس کے بعد ناصر وقتاً فوقتاً حاشیے میں اضافہ کرتے رہے۔ امانت کے حالات حاشیے میں درج ہیں اور ناصر نے اندر سبھا کی تیاری کے متعلق چشم دید حالات لکھے ہیں، خوش معرکہ ایک نایاب تذکرہ ہے۔ اس لیے میں امانت کے متعلق ناصر کا مکمل بیان نقل کرتا ہوں جسے پڑھ کر ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے کہ امانت نے اندر سبھا کیوں لکھی اور اس کی نمائش کس طرح ہوتی:۔

"صاحب، امانت و متانت سید آغا حسن تخلص امانت ابن میر آغا علی عرف میر آغا برادر زادۂ میر طالب علی اچپوتی والے مشہور، اوائل میں میاں امانت نے برائے چندے میاں دلگیر صاحب اصلاح لی تھی پھر خود استاد بن بیٹھے۔ صاحب دیوان و خمسہ و مسدس وواسوخت و غزل اور مرثیہ و سلام بھی اپنی دانست میں خوب کہا اور ان کے کلام میں جگت و ضلع ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ مرثیے بھی ان کے جگت سے خالی نہیں ہیں۔ ان کے مرثیے کا ایک مصرع یہ ہے:۔

"شامی کباب ہوگئے پسند قضا ہوئے"۔ اور میاں امانت نے ہرچند چاہا کہ میرے آگے رنگ میر ضمیر صاحب اور میرزا دبیر صاحب مٹ جائے۔ لیکن کہیں خواجہ صاحب اور شیخ صاحب کے روبرو کوئی اور شاعر ٹکا کہ میاں امانت اور میاں عشق صاحب ٹکے ان دونوں کے مچلکے۔ بقول شاعر:۔

چراغے را کہ ایزد برفروزد          ہر آں کس تف کند ریشش بسوزد

آمدم برسر مطلب۔ میر امانت صاحب کی زبان میں لکنت بھی تھی اور یہ مرض ان کو آبائی ہے۔ بلکہ ان کی اولاد تک کی زبان میں لکنت موجود ہے۔ لہذا مرثیہ تصنیف ان کا ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے اور ان کے شاگردوں میں جو اس کے تخلص کے آخر میں "ت" ہوتی ہے۔ مثل جنت و عبادت و میاں زینت وغیرہ کے۔ میاں امانت نے ایک میر ابجد کی طرح مثنوی اندر سبھا تصنیف کی تھی۔ اس میں بجائے امانت، تخلص استاد اپنا قرار دیا تھا۔ اور اس مثنوی میں غزل اور ہولی، ٹھمری اور چھند ریاں بھاکھا میں کہی تھی۔ چنانچہ بھی کوشنکر پنڈت کشمیری اور باڑی کمہار اور میر حافظ نے چند طفلان حسین اور امردان ماہ جبیں خوبصورت جمع کرکے اور لڑکوں کو مثنوی یاد کرا کے اور تعلیم راگ اور ناچ دلوا کر ایک رہس کھڑا کیا تھا۔ اور وہ پندرہ روپے فیصد پر مجرے کے لیے بھی جاتے تھے۔ بینا زخلائق نے یہ جلسۂ جدید دیکھ کر بہت پسند کیا۔ اور ہزارہا لوگ بازاری جمع ہونے لگے۔ ایک روز مولف بھی اس جلسہ رہس اور سبھا میں گیا۔ دیکھا میں نے کہ ہزارہا لوگ ان امردان حسین پر مفتون و شیفتہ ہیں۔ بقول راحت خاں:۔

ہجوم ماہ رویاں اس قدر تھا          کہ مجھ کو دل کے لٹ جانے کا ڈر تھا

اور میاں امانت مسند پر بیٹھے تھے اور ایک لونڈا امردان پارہ آگے گاتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر چندے توقف کے بعد اپنے مکان پر چلا آیا۔ غرض کہ یہ اندر سبھا خوب چمکی اور مشہور خلائق ہوئی۔ جیسے کہ میر حسن کی مثنوی سے ہزارہا عورات فاحشہ ہوگئیں ویسے ہی اس مثنوی اندر سبھا سے ہزارہا مرد لوطی و مغلم ہوگئے اور اغلام نے خوب رواج پایا۔ اور مرثیہ میاں امانت صاحب کا اچھوتیوں والے امام باڑے واقع منصور نگر لکھنؤ میں پڑھا جاتا ہے۔ قابل تعریف ہے (۲) یہ چند اشعار اچھوتے میاں امانت صاحب کی غزل کے، واسطے یادگار کے لکھے جاتے ہیں۔ وہو ہذا:۔

خیال آتا ہے دل کو شکوۂ بیداد کیا کیجئے          خدا سے لے بت کافر تری فریاد کیا کیجئے
امانت کوہ پر پہنچا تو یوں فرہاد چلایا          لبوں پر جان شیریں ہے ابھی استاد کیا کیجئے

ناظر کے مندرجۂ بالا بیان سے ہم حسب ذیل نتائج اخذ کرسکتے ہیں:۔

(۱) شنکر پنڈت کشمیری، باڑی کمہار اور میر حافظ نے اندر سبھا کے لیے اسٹیج تیار کیا۔
(۲) کم سن لڑکوں کو ناچ کی تعلیم دی گئی اور انہوں نے اندر سبھا میں پارٹ کیا۔
(۳) امانت کی زبان میں لکنت تھی، اس لیے ان کے مرثیے ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے۔

امانت نے شرح اندرسبھا میں جن دو شخصوں کا تذکرہ کیا ہے، وہ شنکر پنڈت کشمیری، بہاری کہار اور میر حافظ میں سے کوئی دو شخص ہونگے، جن کا تیسرے کے مقابلے میں اندرسبھا کی تیاری میں زیادہ نمایاں حصّہ ہو گا۔ اندرسبھا کی تیاری کی جو کچھ حقیقت ہے وہ یہی ہے۔ اس شہادت کی موجودگی میں لالا کنورسین یا مولفین ناٹک ساگر کے قیاسی دعووں کی کچھ بھی وقعت نہیں۔

ناصر کے بیان سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کمسن لڑکوں نے اندرسبھا میں پارٹ کیا۔ واجد علی شاہ یا ان کے درباریوں نے اس میں کوئی پارٹ نہیں کیا۔ میں اس کے قبل یہ لکھ چکا ہوں کہ امانت کو لکنت کا مرض تھا۔ اور جب ان کی قوت گویائی سلب ہوگئی تھی تو وہ کہیں آیا جایا نہ کرتے تھے۔ ناصر کے بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امانت کے مرثیے ان کے شاگرد پڑھا کرتے تھے۔ ایسے شاعر کا واجد علی شاہ کے دربار میں کیونکر گزر ہوا ہوگا جو اپنے اشعار خود نہ پڑھ سکتا ہو؟ لکھنؤ میں اچھے اچھے شعرا موجود تھے۔ امانت میں کوئی خاص خوبی نہ تھی کہ واجد علی شاہ انہیں اپنے دربار میں بلالیتے۔ امانت کے بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہیں واجد علی شاہ کی سرپرستی حاصل تھی۔ ناصر کے بیان سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ ناصر نے خود اپنی آنکھوں سے اندرسبھا کا تماشا دیکھا تھا۔ عہد حاضر کے کسی ادیب کے مقابلے میں ناصر کا بیان زیادہ قابل وثوق ہے، اس کے بیان سے خود مصنف اندرسبھا کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ اس لیے مولفین ناٹک ساگر کے دعوے بالکل بے بنیاد ہیں۔

---

[1] "سعادت خاں نام، ولد رسالت خاں باشندہ نگینہ مقیم لکھنؤ۔ پانچ دیوان ایک تذکرہ ان کا ہے۔ مشورہ چھوٹے مرزا مذنب سے ان کو تھا"۔ سراپا سخن مصنفہ محسن لکھنوی۔

محسن نے جس تذکرے کا ذکر کیا ہے وہ خوش معرکہ ہے، جس کا میں نے حوالہ دیا ہے۔

[2] امانت کی پوری غزل میں نے اس لیے نقل نہ کی کہ میرے مضمون سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ یہ غزل اندرسبھا میں موجود ہے۔

# سنہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین

**ہمایون** لاہور جولائی "انیس" از جناب وصی رضا ایم۔ اے۔ ص ۳۰۹ تا ۳۲۵، "میر" از جناب صفی حیدر خاں بی۔ اے ص ۳۲۶ تا ۳۳۰، "غالب" از حضرت طالب صفوی ص ۳۴۱ تا ۳۵۰
(ہمایون نے اس سوال کے بہترین جواب کے لیے انعام مقرر کیا تھا کہ اردو کا بہترین شاعر کون تھا؟ انیس و میر و غالب کے علاوہ حالی و اقبال کو بھی لوگوں نے اردو کا بہترین شاعر قرار دیا ہے۔ معیار)

**الناظر** جون لکھنؤ مرتبہ جناب ظفر الملک علوی "پدماوت (عشرت و عبرت)" از جناب حاجی امیر احمد علوی صاحب ص ۱ تا ۱۰۔ (۱) عبرت و عشرت کی پدماوت ۱۲۹۵ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے شائع کی تھی (اس کے دیباچے میں عشرت نے میرزا علی لطف کو سودا کا شاگرد رشید لکھا ہے۔ معیار)

**سالک** از جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا ص ۳۱ تا ۳۴ (۱) قربان علی بیگ سالک کے حالات زندگی۔ سوا اس کے کہ پہلا تخلص قربان تھا، غالب کی ہدایت سے بدل کر سالک رکھا۔ کل حالات خمخانۂ جاوید سے ماخوذ ہیں۔ خمخانۂ جاوید میں سالک کے چچا کا نام رن بہادر خان رکھا ہے۔ مضمون نگار نے اسے بہادر خان بنا دیا ہے۔ (نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مر دے سن وفات نکلتا ہے۔ ہم کے نزدیک اس سے ۱۲۹۱ اور صاحب خمخانہ کی رائے میں ۱۲۹۲ نکلتا ہے۔ دونوں غلطی پر ہیں۔ یہ تاریخ اگر بغیر تخرجہ کے ہے تو اس سے ۱۲۹۰ نکلتا ہے۔ سن عیسوی دونوں نے ۱۸۷۴ء دیا ہے۔ یہ ۱۲۹۱ کے مطابق ہے۔ معیار) (۲) دیوان مطبوعہ کا نام ہنجار سالک ہے۔ سال اشاعت ۱۸۷۱ء ابتدا میں حالی کی تقریظ اور سالک کا دیباچہ ہے۔ ہر دو فارسی (سالک کے کلام پر ناقدانہ رائے بھی ظاہر کی ہے۔ معیار)

**ندیم** گیا جون "بیدل عظیم آبادی" از حکیم سید احمد اللہ صاحب ص ۱ تا ۱۲
سر او پر جب کوئی نبیلی تو دشمن آپی کیس ۔۔۔ چونگری چھاڑ دوجن اب بیدل چلے بدیس
(ہم نے اس شعر کو بیدل کی طرف منسوب کر کے بہت سے نتائج نکالے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے پاس کیا ثبوت اس امر کا ہے کہ یہ شعر بیدل کا ہے۔ معیار) (۲) (ہم نے حسب ذیل تذکروں سے بیدل کے حالات نقل کیے ہیں۔ تذکرہ نتائج اورنگ آبادی، تذکرہ مخزن الغرائب مصنفہ ناصر علی سرہندی، تذکرہ قدرت اللہ شوق، تذکرہ بے نظیر، تذکرہ چمنستان شعرا۔ مخزن الغرائب ایک ضخیم تذکرہ ہے جس کا مصنف احمد علی سندیلوی ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے ناصر علی نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا۔ اگر اس نام کا کوئی دوسرا تذکرہ ناصر علی نے لکھا ہے تو اس کا ثبوت دینا چاہیے۔ معیار) (۳) بہار سخن مصنفہ عبد الرزاق خان خوافی مخاطب بہ شاہ نواز کے حوالے سے ہم نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ناصر علی نے ایک غزل لکھی:۔ "آنچو در جلوہ آئی منزل جاں سیماب می گردد ۔۔۔ تجلی می کند برقے کہ آتش آب می گردد"

ناصر علی نے یہ اعلان کیا کہ اگر کوئی اس کا جواب لکھ کر ملک سخن میں خدائی کا دعویٰ کرے تو میں اس پر ایمان لاؤں گا۔ بیدلؔ کے اشارہ سے ان کے شاگرد شیخ عبرت نے جواب لکھا۔ ناصر علی سن کر خاموش ہو رہے۔ کسی دوسرے شاعر نے ناصر علی کی غزل کا جواب نہ دیا۔ (۳) بیدل کے عظیم آبادی ہونے کے متعلق جو شہادتیں ہیں۔ ان کے باب میں مئی کے معیار میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم نے بیدل کے اُستاد کے کمال کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ عبد العزیز عزت کو بھول گئے۔ معیار)

اُردو نثر کی ارتقا میں ارباب بہار کا حصّہ: جناب سید محمد طٰہٰ اشرف صاحب ص ۲۹ تا ۲۴ (۱) حضرت سید شاہ احمد حسین "وطن منتھرا" ضلع گیا۔ سنہ ولادت نامعلوم۔ وفات ۱۳۰۳ھ عمر ۵۰ سے زیادہ پائی۔ اردو میں آپ کی تصانیف موجود ہیں (ہم نے اور حالات بھی دیے ہیں۔ معیار) (۲) القول المحمود فی بیان محفل المولود سال تصنیف ۱۲۰۳ھ مطبوعہ مطبع محمدی خواجہ کلاں پٹنہ ۱۲۹۵ھ ص ۱۹۹ کے بعد عبد الاحد الہ آبادی حبیب تخلص کی تقریظ ہے جو ایک صفحہ کے بعد ضائع ہو گئی ہے۔ (۳) ترتیب المدارج مصنفہ ۱۲۹۱ھ مطبوعہ مطبع محمدی ۱۲۹۵ھ موضوع مسئلہ ترتیب فضائل خلفائے راشدین (۴) رسالہ قلمی مصنفہ ۱۲۹۹ھ موضوع وجوب تقلید شخصی (۵) حضرت سید شاہ ظہور الحسن قادریؒ برادر مصنف رسائل مذکورہ کے بھائی تھے۔ ان کی تصانیف زیادہ تر عربی فارسی میں ہیں۔ اردو میں صرف ایک رسالہ ازالۃ الخفا عن سیادۃ الاشراف النجبا ہے جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ موضوع حضرت غوث پاک کی سیادت کا اثبات۔

**اظہار حقیقت**: پہلی قسط، معرکۂ شاد و صفیر از جناب حمید عظیم آبادی ص ۴۴ تا ۵۲ (۱) کوہ سکھ راج بہادر رحمی نے ۲۴ اگست ۱۸۸۸ء کو ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا جو لوگ اس کے مدعی ہیں کہ جناب شادؔ جناب صفیر کے شاگرد تھے ان کے قول کے مطابق اس سے ۲ برس قبل ہی اصلاح کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس مشاعرے کا گلدستہ عبد الحق انجم شیخ پوری بیگ ہمدرد نے مرتب کیا تھا۔ اس میں شاد کو فرزند کاش لکھا ہے۔ (۲) اس گلدستے میں انجم نے گیارہ ممیز شعرا اور استادوں کے نام ترتیب وار بہ حیثیت تفوق شاعرانہ درج فرمائے ہیں۔ ... شاغل دہلوی، سید شاہ حکیم احمد صوفی، محمد وحید الدین وحید الہ آبادی، حکیم عبد الحمید پریشان، محمد علی خان حیرتی، سید علی محمد شاد، سید فرزند احمد صفیر۔ ایک غیر جانب دار شخص نے شاد کو صفیر پر ترجیح دی ہے (جناب حمید کو چاہیے تھا کہ انجم کی عبارت نقل کر دیتے۔ جس سے یہ پتا چلتا کہ انجم نے ترتیب میں کس اصول کو مد نظر رکھا ہے محض اس امر سے کہ ایک خاص ترتیب سے نام لکھے گئے ہیں، کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ اگر بنا پر تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انجم صوفی کو وحید سے بہتر سمجھتے تھے اور حیرتی کو شاد و صفیر دونوں پر ترجیح دیتے تھے معیار) (۳) اس گلدستے میں شاد کی تعریف میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ "یکّہ تاز میدان فصاحت، غواص دریائے بلاغت، موجد طرز رنگین بیانی، عدیم المثال لاثانی سخن آور مقام شناس، رنگین ادائے بدیع اساس محسود حساد جناب سید علی محمد شاد" الخ صفیر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "سرو دفتر منشیان جہان، سر حلقۂ فصحائے زماں، واقف و ماہر فن سخن بیان"

شیریں سخن، دیباچۂ دیوان علم، شیرازۂ مجموعۂ حلم، رشک انوری و جامی جناب مولوی سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی کو (محسود حساد سے بھی کوئی خاص نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا، انجمن کی غرض صرف حقیقی تحسین تھی اور بس، ورنہ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ وہ واقعی صفیر کو انوری اور جامی پر ترجیح دیتے تھے۔ معیار) (۴) اسی مشاعرے میں جناب شاد نے ایک قطعہ پڑھا۔

فلک روئے نہ اب کیونکر عظیم آباد کے اوپر — نہ اب باقی بلاغت ہے نہ یاں شور فصاحت ہے

اس میں معاصرین کا بھی ذکر کیا ہے۔

عطا یاد جعفر ہنگامہ آرائے معانی ہے — مشام جاں معطر کرنے میں معروف نکہت ہے
صفیر خوش نوا کی گل افشانی کے چرچے ہیں — وحید بے بدل کے شعر سے عام رغبت ہے

(ہم نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شاد نے صفیر کا ذکر استاد کی حیثیت سے نہیں کیا ہے۔ یہ تو صحیح ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۸۸۷ء میں حضرت شاد، حضرت صفیر کو اپنا استاد نہیں مانتے تھے۔ معیار) (۵) (ہم نے شاد و صفیر کی طرحی غزلیں نقل کرکے شاد کے تعلق کا دعوی کیا ہے۔ معیار)

**جولائی: اظہار حقیقت،** از جناب حمید، ص ۵۰ تا ۵۸ (جناب شاد مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیف فکر بلیغ اور مردم دیدہ کے اقتباسات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شاد بجز صفیر کی وساطت کے دبیر کے پاس اصلاح کے لیے گئے تھے، ایک مرثیے اور ایک فارسی مثنوی کے علاوہ کسی چیز پر دبیر سے اصلاح لینے کا موقع نہ ملا۔ معیار)

**تنویر کراچی** جولائی — **آثار ادب** ص ۳۰ (۱) ثابت تخلص سید محمد تقی بن مظفر علی اسیر شعر ذیل کے علاوہ دو شعر اور عروج بہار نومبر ۱۸۹۶ء سے نقل کیے گئے ہیں:-

شاید آغاز میں انجام کی ہے فکر اسے — شمع روتی ہوئی محفل میں مری آئی ہے

(۲) مفتون تخلص، سلیمان مرزا لکھنوی بن علی اوسط رشک، ترک وطن کرکے بمبئی میں مقیم تھے، عروج بہار بمبئی اپریل ۱۸۹۵ء سے ۴ شعر نقل کیے گئے ہیں ازاں جملہ:-

رنج و الم ملے ہمیں جور و جفا ملے — ملنے سے اور تجھ سے ستمگر کے کیا ملے

(۳) وسیم تخلص منشی بشیشر سہائے پانڈے رئیس گورکھپور، شاگرد ناسخ، ۵ شعر ماخوذ از گلدستۂ شعرا:-

اس کا کیا شکوہ کہ وہ جور و جفا کرتے ہیں — اپنی تقدیر کا البتہ گلا کرتے ہیں
ملے فردوس بریں حضرت ناسخ کو وسیم — ہم شب و روز خدا سے یہ دعا کرتے ہیں

---

سلہ مئی ۱۹۳۶ء کے معارف میں بھی ان دونوں کے حالات ہیں ص ۳۴۹ تا ۳۵۲

# محکمہ

(۱) دیوان معروف از جناب ریاض حسن خان صاحب خیال (۲) تبصرۂ سہیل از ؟ (۳ و ۴ و ۵)
دریائے لطافت؛
ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد؛
شرف جہاں کو ایک شعر از قی شاہ

(۱) دیوان معروف میں ابھی بہت سے اشعار باقی ہیں جو تصحیح کے محتاج ہیں۔ بعض کی تصحیح جو معیار میں کی گئی ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ اس قسم کے چند اشعار اس وقت لکھے جاتے ہیں۔ باقی آیندہ:-

ص ۱۱۹ دل ہو جس کا فقیر کچھ اس کو نہیں مانع نیا نقیری کی = غنا

ص ۱۲۶ گر کلاہ بوریا مانگے کوئی مجھ سے فقیر = کلاہ و بوریا

ص ۱۲۷ ذوق سماع مجھ کو کیا آج سے ہنیخ سوزیدہ ازل سے ہوں ڈھب ہے مجھے سدا کی

اس شعر کی تصحیح پہلے ہو چکی ہے "سوزیدہ" کی جگہ "شوریدہ" اور "سدا" کی جگہ "صدا" صحیح ہے، لیکن "ڈھب" اپنی جگہ پر رہنے دیا ہے، یہ میری رائے میں "دھت" ہے۔

ص ۱۲۹ جس کو چوری کا پڑ گیا ٹیکا شاہ کی قدر کب وہ جانے ہے

ساہ سین مہلہ سے بمعنی تاجر، بیوپاری، بنجارا۔

ص ۱۲۹ بوسہ پایہ لیکے دل ہے کہا دل اتنا چڑھا دیا کس نے = پہ، یہ

ص ۱۳۰ میں گنہگار لیکن اے رحمت ہم کو تقوی بندھا دیا کس نے = ہیں

ص ۱۳۱ یہ لڑکے غضب شہر کے ماریں گے اگر ہاتھ سے اپنے اوسان دوگے
جنوں آچکا تھا کہ صحرا کو قیس تبھی دوڑ پڑوگے جو دیوان دوگے

مصرع سوم یوں ہونا چاہیے:- جنوں آچکا جا کو صحرا کو قیس اب

۱۳۵ جیب جو معروف کو حاکم نے کیا ہے یہ حکم کوئی اس شہر میں اس شعر نہ بکنے پائے = چُپ

۱۳۶ سہل ہو کیسی ہی گو کیسی ہی مشکل آئے پر یہ آفت تو نہ ہووے کہ کہیں دل آئے = کیسی ہی

۱۳۸ بخشے نہ کیونکر گوہر ابر مقصد وہ زیر فیض بیٹھی ہے دونوں ہاتھ صدف اب پسار کے = مقصود ابر؟

۱۴۰ دوست دشمن سب مجلے آتے ہیں لینے کو خبر تو بھی گھر تک وان چلو کیا اس میں تیرا جائے ہے = ٹک

۱۵۱ اب اٹھایا ہی ہم نے وے عقل سے کم ہے بہت عشق کا انبار خدا خیر کرے = گرانبار

۱۶۵ نہ پوچھو مجھ سے غم درد و صدمہ ہائے فراق اس کی تصحیح ہوئی ہے "غم درد و صدمہ ہائے فراق"
میری رائے میں غم درد و صدمہ ہائے فراق ہونا چاہیے۔

**(۲) تبصرۂ سہیل:-** سہیل کے ایک مضمون پر اعتراض کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا۔ ص ۳۴۳:- "ابن الدین امین کے متعلق یہ لکھنا کہ ۱۲۰۵ھ میں بہ عالمِ ضعیفی زندہ تھے، فاحش غلطی ہے۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ امین کے زمانۂ حیات و وفات کے متعلق مضمون نگار سری رام کے بیان کو مرزا علی لطف علی کے بیان پر ترجیح دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امین کا انتقال ۱۲۰۰ھ سے بھی قبل ہوچکا تھا، جیسا کہ ایک قدیم بیاض سے ثابت ہوتا ہے، جو ہمارے پاس موجود ہے"۔

سہیل اس وقت ہمارے سامنے نہیں، اور ہمیں یہ یاد نہیں کہ مضمون نگار نے مرزا علی لطف کے تذکرے کا ذکر کیا تھا یا نہیں، بہرحال، اس تذکرے میں امین کی وفات کا ذکر نہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ امین ۱۲۱۵ھ (سال تالیف تذکرہ) میں زندہ تھے۔ اس بیاض کے علاوہ جس کا حوالہ ہم نے دیا ہے، علی ابراہیم خان کا ایک خط ریاض المنشآت میں موجود ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علی ابراہیم خان زندہ ہی تھے کہ امین کا انتقال ہوچکا تھا علی ابراہیم خان کا سال وفات ۱۲۰۸ھ ہے۔

**(۳) دریائے لطافت** نسخۂ مرشدآباد کے مصحح نے ایک تمہید لکھی تھی، اس کے اقتباسات معیار، ص ۵ پر شائع ہوئے تھے، ہمارے ایک فاضل دوست نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ اس میں تین غلطیاں رہ گئی ہیں۔ سطر ۲ میں انضباط کی جگہ التقاط ہونا چاہیے۔ س ۹ میں جدالوجود کی جگہ جدید الورود، اور اسی سطر میں کار آمد کی جگہ کار آمد صحیح ہے۔

**(۴) ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد** اس مضمون میں یہ آیت نقل کی گئی تھی "اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا"۔ حاشیے میں لکھا گیا تھا کہ اس سے ۱۰۳۰ نکلتا ہے ص ۱۰۲ مرآۃ الاحوال کے دو نسخے پٹنہ میں ہیں اور دونوں میں یہ آیت اس طرح ہے، لیکن آیت دراصل یوں ہے: اِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا، اس صورت میں ۱۰۳۰ کی جگہ ۱۰۲۱ نکلے گا۔ ص ۱۰۵ س ۳ حاجی محمد ناصر قزوینی۔ ناصر غالباً ناصر ہے۔ ص ۱۰۵ س ۱۱ آقا محمد خزانی۔ ایک نسخے میں اسی طرح ہے، لیکن دوسرے میں آقا محمد خراسانی ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

**(۵) شرف جہاں کا ایک شعر** معیار ص ۱۱۶ پر اس طرح نقل ہوا ہے۔ "زبیداد تو کے خواہم جدائی برگرفتم من ... کہ از زحمت بیک حرف عتاب آلودہ برخیزم" شعرالعجم میں "برگرفتم" کی جگہ "نے رقیبم" ہے، کلیات حسن میں "برگرفتم" ہی ہے لیکن یہ صحیح نہیں شرف جہاں کا دیوان یہاں موجود نہیں کہ قطعی طور پر یہ کہا جاسکے کہ "برگرفتم" کی جگہ شرف جہاں نے کیا لکھا تھا۔

---

## ہماری زبان

(۱) جزّ اور جزو کی بحث۔ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ صدر شعبۂ عربی و فارسی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی۔

(۲) اردو میں ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں "کو" کا استعمال۔ از ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم اے پی ایچ ڈی استاذ فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی

(۳) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی و جناب ریاض حسن خاں صاحب خیال

# جزّ اور جزو کی بحث

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی)

اردو میں اس لفظ کا فصیح تلفظ "جُز" ہی ہے اور اتنی ہی دلیل اس کی صحت کے لیے کافی ہے؛ مگر میں جانتا ہوں کہ آپ فارسی عربی کی سند مانگیں گے۔ اس لیے اُدھر رجوع کرنا ضروری ہے۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ "جُزء" (ٹکڑے کے معنوں میں) عربی لفظ ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ج ز ء) ہے (ج ز و) ہرگز نہیں؛ بلکہ عربی میں (ج ز و) سرے سے کوئی مادہ (کسی اور معنی میں بھی) ہے ہی نہیں۔ آپ فرمائیں گے کہ "جزو" صحیح ہے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے مانے لیتا ہوں کہ اس لفظ میں واو ہے؛ مگر یہ واو اصلی نہیں ہو سکتا، جب اصلی نہیں تو آپ فرمائیں گے کہ زائد ہوگا، مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ واو یہاں لام کلمے کی جگہ پر ہے اور فے کلمہ، عین کلمہ، یا لام کلمہ زائد نہیں ہوتا، اصلی ہوتا ہے۔ جب وہ نہ اصلی ہے، نہ زائد تو اس کی ہستی موہوم ہے۔

اس موہوم ہستی کے متعلق آگے چل کے کسی قدر تفصیل سے عرض کروں گا، پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ فارسی لغت نویسوں نے کیا فرمایا ہے۔ فارسی لغت کی زیادہ سیر حاصل کتابیں متاخرین نے تالیف کیں اس لیے پہلے انہیں کو دیکھنا چاہیے۔

فرہنگ جہانگیری، فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع میں نہ "جزو" ملتا ہے، نہ "جز" اور نہ "جزء" اور یہ ٹھیک بھی ہے اس لیے کہ ان کتابوں میں بحیثیت فارسی لفظ درج کیے گئے ہیں، عربی لفظوں سے مطلق بحث نہیں۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ فارسی لفظ "جُز" (جس کے معنی "سوا" "علاوہ" وغیرہ ہیں) اس کو بھی نہیں لکھا ہے۔ اس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے فارسی لفظ "جز" کو بھی عربی سمجھ رکھا تھا۔ بہار عجم میں عربی لفظوں کو بھی جگہ دی گئی ہے؛ چنانچہ اس لفظ کے متعلق یہ تفصیل ملتی ہے:۔

> جُزو، بالضم، در لغت عرب بمعنی پارہ است۔ و در فارسی جُز، بدون ہمزہ تخفیف ہماں عربیست۔ و چوں آں را مضاف نمایند بہ چیزے، بجائے ہمزہ واو نویسند۔ و گویند جُزوِ طلاہم طلا است، و ہمچنیں "جزو بدن" و "جزو آں"۔ بہر تقدیر اسم است و بمعنی غیر نیز اسم

لیکن بہ اضافت مستعمل نیست۔ و بمعنی مگر حرف است، چنانچہ گوئی "آمدند ہمہ مردم جز زید......"

اس فارسی عبارت کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) عربی لفظ "جُزْء" ہے [ہمزہ کے ساتھ] (۲) فارسی میں یہ لفظ "جُز" (بلا ہمزہ) ہو گیا۔

(۳) یہ فارسی "جُز" عربی لفظ کا مخفف معلوم ہوتا ہے۔

(۴) فارسی میں اضافت کی صورت میں ہمزہ کی جگہ واو لکھتے اور بولتے ہیں یعنی "جزوِ"۔

(۵) بہر حال یہ لفظ اسم ہے۔

(۶) اس لفظ کے ایک معنی ہیں "غیر" اور اس معنی میں بھی اسم ہے، لیکن اضافت کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا۔

(۷) اس لفظ کے ایک معنی ہیں "مگر" اور اس معنی میں یہ لفظ حرف ہے۔

ان سات باتوں میں سے پہلی، دوسری اور پانچویں میں کوئی شبہ نہیں، تیسری بات میں کچھ تأمل ہوتا ہے، اس لیے کہ "مخفف" کے اصطلاحی معنی اور ہیں۔ اس لفظ میں سے ہمزہ اسی طرح گرا ہے جیسے وعاء، شفاء، حکماء وغیرہ میں سے۔ فارسی زبان میں لفظ کے آخر میں ہمزہ نہیں ہوتا (سوا اضافت کے کسرے کے جب وہ مختفی ہے کے بعد آئے جیسے "بندۂ خدا") اس لیے جن عربی لفظوں کے آخر میں ہمزہ تھا وہ فارسی میں بغیر ہمزہ کے بولے جانے لگے۔ پس "جُز" کو عربی لفظ "جزء" کا مُعَرَّب کہہ سکتے ہیں، اس کا مخفف نہیں کہہ سکتے۔ (۴) کے متعلق آگے چل کے عرض کروں گا۔ (۶) اور (۷) کو عربی لفظ سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان معنوں میں "جُز" ایک ٹھیٹ فارسی لفظ ہے۔ عربی لفظ "جزء" کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑا ہے۔ (۴) کے متعلق یہ دریافت کرنا ہے کہ ہمزہ اور لفظوں میں بھی واو سے بدلا گیا ہے یا نہیں؟ "سُوء" ایک عربی لفظ ہے فارسی میں اکیلا نہیں بولا جاتا۔ اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، جیسے سُوءِ ادب، سُوءِ مزاج، سُوءِ دماغ وغیرہ۔ یہاں ہمزہ واو سے نہیں بدلا۔ "نَوْء" میں بھی نہیں بدلا، یعنی "نوءِ آفتاب" کہیں گے، نہ کہ "نووِ آفتاب"۔ عربی لفظ "شیء" کا ہمزہ بھی فارسی زبان میں نہ آیا بلکہ "لاشیء" کو بھی "لاشی" بولنے لگے۔ واو اس میں بھی کہیں نہ آیا۔

صاحب غیاث اللغات نے بھی وہی لکھا ہے جو بہار عجم میں ہے، صرف دو باتیں زیادہ کی ہیں ایک یہ تشریح کہ:۔

"لفظ 'جز' بدون واو کلمۂ فارسی است و ہمہ جا بمعنی 'غیر' آید۔ ہر چند کہ مرادف لفظ 'غیر' است مگر بخلاف لفظ 'غیر' مقطوع الاضافۃ باشد یعنی بکسرۂ علامت اضافت است مستعمل نمی شود"

دوسری بات یہ لکھی کہ:۔

"در عبارت عربی این ہمزہ اگر مضموم باشد بصورت واو نویسند چنانکہ "ھٰذا جزؤُہٗ" واگر

مکسور باشد بصورت یا نویسند چنانکہ "عَوَّذتُ إلیٰ جُزئِہٖ"[1] واگر مفتوح باشد،
بصورت الف نویسند چنانکہ "رَأیتُ جُزْأَہٗ" [یہ ڈھنگ عربی کے غلط نویسی کا ہوں
کا ہے اور اسی سے فارسی دانوں کو دھوکا ہوا اور وہ "جُزْو" بولنے لگے۔]

عربی میں ہمزہ کی کتابت کے کچھ قاعدے مقرر ہیں۔ ان میں سے یہاں صرف دو کا بیان کر دینا کافی ہے:۔

(۱) اگر ہمزہ لفظ کے آخر میں واقع ہو اور اس کا ماقبل متحرک ہو تو ماقبل کی حرکت کا ہم جنس حرف لکھ کر اس کے اوپر ہمزہ بنا دیا جائے گا، جیسے قَرَأَ، جَرُؤَ، خَطِئَ۔

[قرأ کی را پر فتحہ تھا۔ اس لیے فتحے کا ہم جنس یا موافق حرف (الف) لکھا گیا۔ اسی طرح ضمے کا ہم جنس واو اور کسرے کی ہم جنس "ی" کام میں لائی گئی۔ یہ حرف گویا ہمزہ کی کرسی قرار دیے گئے ہیں۔ لکھے جاتے ہیں، پڑھے نہیں جاتے۔ آواز تینوں لفظوں میں ہمزہ ہی کی نکلتی ہے۔]

(۲) اگر ہمزہ لفظ کے آخر میں واقع ہو اور اس کا ماقبل ساکن ہو، تو کوئی حرف (سوا ہمزہ کے) نہ لکھا جائے گا، جیسے
جُزْءٌ، بِجُزْءٍ، اَلْجُزْءُ الْاَوَّلُ، فِی الْجُزْءِ الْاَوَّلِ، خَبْءٌ، مِلْءٌ، اَلشَّیْءُ، بِالشَّیْءِ وغیرہ۔

"جزء" کا لفظ اسی دوسرے قاعدے کے تحت میں آتا ہے، اس لیے کہ اس میں ہمزہ کا ماقبل (یعنی ز) ساکن ہے جتنی عربی کتابوں میں (چاہے وہ عربی ہوں یا ایرانی) یہ قاعدہ بیان ہوا ہے، مثالوں میں "جُزْءٌ" ضرور موجود ہے۔

پرانے ہی زمانے میں نسخے کاتبوں نے یہ غلطی کی کہ صحیح لفظ "جزء" کی جگہ "جزو" لکھنے لگے، اور ایران اور ہندوستان کے کاتبوں نے اسی غلط املا کو اختیار کیا، چنانچہ کلام مجید کے اکثر ہندوستانی نسخوں میں ہر سیپارے کے شروع میں حاشیے پر "الجزو" لکھا ہوا دیکھیے گا۔ عرب بیچارے نے اس "ؤ" کو اگر واو سے لکھ بھی دیا تھا تو تلفظ صرف ہمزہ ہی کا کرتا تھا، واو کو ادا نہ کرتا تھا۔ ایرانیوں اور ہندیوں نے واو کو اسی طرح ادا کرنا ضروری جانا جیسے عربی لفظوں "سَہْو"، "نَحْو" میں جن میں واو اصلی ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "جزو دماغ" اور "جزو بدن" اور "جزوی" اور "جزو لاینفک" فارسی زبان میں جاری ہو گئے۔

صاحب بہار عجم نے "جزو" کو اضافت کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر آگے چل کے خود ہی "جزو دان"، "جزو کشیدن" اور "جزو کشی" کو اپنی کتاب میں داخل کیا ہے اور سند میں ملا سعید اشرف اور ملا طاہر غنی کے شعر نقل کیے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب انہی کے قول کے مطابق فارسی میں "جزو" کے لیے "جز" بھی بولا جاتا ہے۔ تو "جز دان" اور "جز کشی" وغیرہ بھی صحیح ہیں۔ "جزوکی" میں تو "جز" کا لفظ ہمیشہ بغیر واو کے استعمال ہوتا ہے۔ "فرہنگ شعوری" بھی ایک مستند لغت ہے۔ افسوس کہ میں اس

---

[1] یہ عربی کا فقرہ کچھ مہمل سا ہے۔ لفظ "إلیٰ" بھی یہاں صحیح نہیں!!

براہ راست مستفید نہیں ہو سکتا، مگر فلرس کے فارسی لاطینی لغت میں شعوری کی عبارت کے ٹکڑے نقل ہوئے ہیں شعوری نے "جزدان" ہی لکھا ہے اور سند میں کسی شاعر کا یہ شعر دیا ہے :-

کر اوراق پریشاں ہر چہ دارم
ز جزدان بود ضائع بیقرارم

خلاصہ اس سب کا یہ ہے کہ فارسی میں اضافت کی حالت میں "جزوِ بدن" وغیرہ فصیح ہیں اور "جزِ جسد" وغیرہ بھی صحیح ہیں: "جزدان" اور "جزودان" "جزکشی" اور "جزوکشی" وغیرہ کی دونوں صورتیں صحیح، اس لیے کہ دونوں صورتیں اہل زبان استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں، جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں، "جز" فصیح ہے اگرچہ "جزو" پر ترجیح ہے: "جزوِ بدن" "جزوِ دماغ" وغیرہ بھی فارسی کے تتبع میں صحیح، مگر جہاں اضافت نہیں ہے، جیسے "جزدان" "جزرسی" وغیرہ "جز" (بلا واو) کو ترجیح ہے، بلکہ "جزودان" اور "جزورسی" میں سراسر تکلف ہے "جز" کو کاٹ کر "جزو" بنانا ہرگز درست نہیں۔

---

"جزو" اور اس کے مُفرّس "جز" اور "جزو" کی بحث تو ختم ہوئی، اب اس "جز" کے متعلق بھی کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا چاہتا ہوں جو "بجز" (بہ جز) میں ہے اور خالص فارسی ہے، یہ تو اوپر آ چکا ہے کہ اس لفظ کو عربی سے کوئی کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔

اس کے فارسی الاصل ہونے کے بارے میں متاخرین کی فرہنگوں میں (سوا "غیاث" کے) کہیں کچھ ملتا نہیں، متقدمین کی مختصر فرہنگوں میں سے اکثر فرہنگ جہانگیری کا ماخذ تھیں۔ ان میں سب سے پرانی تین ہیں۔ (۱) فرہنگ ابو الحفص سُغدی (۲) فرہنگ اسدی طوسی (یعنی "لغت فرس") (۳) فرہنگ حکیم قطران۔ پہلی اور تیسری کا پتا نہیں، دوسری کو جرمانی مستشرق پاؤل ہورن نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا۔ یہ ایک بہت چھوٹی سی کتاب ہے جس میں کچھ کم بارہ سو لغات درج ہیں، مگر جو سو منفے بھی ہو گیا سو سند کے شعروں کی بدولت۔ اس کتاب میں بھی "جز" کا لفظ نہیں ملتا۔ اور کتاب کے حجم کو دیکھتے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں، سغدی اور قطران نے بھی اپنے رسالوں میں غالباً اس کو درج نہ کیا ہوگا، ورنہ صاحب جہانگیری اور اور فرہنگ نگار ضرور ان سے نقل کرتے۔

پرانی کتابوں میں ایک اور چیز ہے، جس سے فارسی کے فرہنگ نگار بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہے زمخشری کی قابل قدر عربی فارسی فرہنگ "مقدمۃ الادب" جو ایرانیوں کے فائدے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس کی تالیف کا زمانہ اسدی کی لغت فرس کی تالیف سے کوئی پچاس برس بعد کا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس مصنف کی "المفصل فی النحو" اور "کشاف" نے یہ شہرت پائی، اس کی "مقدمۃ الادب" کو، اور تو اور لغت نویسوں تک نے آنکھ بھر کے نہ دیکھا۔ زمخشری کی کتاب کو بھی ایک جرمانی مستشرق (ویتس اشتائن) نے ۱۸۴۳-۴۴ء میں شائع کیا۔ اس کتاب میں عربی لفظوں کے معنی فارسی زبان میں بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ عربی لفظ "جُزؤ" کے معنی "پارہ چیزے" لکھے ہیں اور جمع "اجزاء" اور عربی لفظوں "غیر" اور "سِوی" کے

معنی یوں لکھے ہیں : "دیگر ، جز ، بجز ، چیزے دیگر"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ "دیگر ، چیزے دیگر" کا مرادف "جز" ایک فارسی لفظ ہے ۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ لفظ فارسی نظم و نثر کی کتابوں میں کثرت سے آیا ہے ۔

لفظ کے اشتقاق کے متعلق مختصر عرض کردوں کہ پہلوی میں "جناک" اور "جُت" کے معنی ہیں "الگ کیا ہوا" اور "الگ"۔ "جناک" کا کاف فارسی میں آکر گر گیا اور "ت" ذال سے بدل گئی ۔ اس طرح وہ "جدا" اور آگے چل کر "جُدا" ہوگیا ۔ "جُت" کی "ت" بدل کر ذال ہوئی تو "جُذ" ہوا ۔ اس کے ساتھ "از" آکر "آتا تھا" "جذاز" ۔ ان دونوں لفظوں کے ایک ساتھ بولے جانے سے "جُذز" ہوا اور بالآخر "جز" ۔ اسی پیچھے ہوئے "از" کے باعث اس پر اضافت نہیں آتی اور اسی لیے اسے اسم کہنا بھی درست نہیں ۔ معنوں کے لحاظ سے بھی متعلقات میں ہے ، اسم نہیں ۔

## ضمیر کے ساتھ حالتِ مفعولی میں "کو" کا استعمال

(۱) آپ نے ص ۲۱۲ پر لکھا ہے کہ داغ و جلیل کے کلام سے مفعولی حالت میں ضمیر کے ساتھ "کو" کے استعمال کی سند دیجا سکتی ہے اور ضمن میں داغ کا شعر نقل کیا ہے ۔ گذارش یہ ہے کہ میرے نزدیک نثر میں کسی لفظ یا کلمے یا اصطلاح یا محاورے کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق نظم سے استناد کرنا ہمیشہ صحیح نہیں کیونکہ نظم میں وزن اور ردیف و قافیہ کی مجبوریاں لکھنے والے سے کچھ کا کچھ لکھوا دیتی ہیں چنانچہ کل داغ کا ایک شعر نظر سے گزرا :- ہاتھ جوڑے پاؤں پران کے گرے ۔ پھر بھی وہ برہم ہی کے برہم رہے ۔ ظاہر ہے کہ "برہم کے برہم ہی رہے" ہونا چاہیے تھا ۔ مگر قافیے کی مجبوری نے کچھ کا کچھ کردیا ۔

(۲) ص ۲۱۵ کی آپ نے جو تصحیح فرمائی ہے اس سے میں سمجھتا ہوں کہ آپنے "مجھ کو" "اس کو" "مجھ کو" وغیرہ کو زبان سے خارج فرما دیا ، یہ تو تاریخ کو بھی : سو بھی تھی ۔ "مجھ کو" اور "مجھے" وغیرہ بالکل مترادف ہیں ، جس مقام پر جو صورت دونوں میں سے پسند آئے بولیے لکھیے ، البتہ بعض صورتوں میں "کو" سے زیادہ وضاحت یا تاکید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے ، گو فرق اگر ہے تو ایسا خفیف کہ قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا ۔

(۳) میرے نزدیک حالت مفعولی میں "کو" کا استعمال صحیح ہے ، بلکہ بعض صورتوں میں "مجھ کو" "تجھ کو" "مجھے" "تجھے" سے قابل ترجیح ہوتا ہے ۔ مستند شاعروں کے یہاں بے شمار ملیں گی ، ان میں سے چند ملاحظہ ہوں :-

مقدمہ حالی ص ۴۳ "سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو" ص ۱۳۹ "پھر اس کو درست کہنا کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے" اردوئے معلی ص ۱۳ "تم کو ..." ص ۱۵ "میاں سیاح کہاں ہیں اور مجھ کو کیوں بھول گئے" ۔ آب بقا خواجہ عبدالرؤف عشرت ص ۱۲ "ان کو اک جو ان کہتے تھے" ص ۴۴ "مجھ کو محض عنایت سے میر منشی کا عہدہ دیا" ۔ نظم لکھنوی رسالہ اردوئے معلی جنوری ۱۹۱۲ء "اس کو استعمال کرنا" ص ۱۱ "شعر میں بھی ان کو ممنوع کہدینا مشکل ہے" ۔ (امیر مینائی ، جمیعتِ بلگرامی ، شبلی ، آزاد کی بھی سندیں دیجا سکتی ہیں ، دہلی والے بھی اسے ... )

# عالمِ اَدَب

(۱) بابو راجندر پرشاد نے ہندی ساہتیہ سمیلن ناگپور کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا اس کے چند اقتباسات جون کے پرچے میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس بار ہم مزید اقتباسات پیش کرتے ہیں:-

ہندی کو دوسری زبانوں سے الفاظ لیکر اپنے ذخیرے کو بڑھانا چاہیے۔ ہندی میں عربی فارسی کے جو الفاظ رائج ہیں ان کے نکال باہر کرنے کی کوشش فضول ہے۔ ایک دوست نے "رومال" کے لیے "مکھ مارجن وستر کھنڈ" کا استعمال مناسب سمجھا تھا۔ یہ ہندی کے ساتھ ظلم ہے۔ ہندی کے الفاظ کے ذخیرے کی تکمیل سنسکرت سے ہو۔ لیکن دوسری زبانوں کے جن الفاظ سے ہمارا مطلب ٹھیک نکل سکتا ہو لینے میں ہچکچانا نہیں چاہیے۔ آج سے ۹۲ برس پہلے راجا شیو پرشاد نے ہندوستانی کی نیو ڈالی تھی۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں "پنڈت لوگ سوچتے ہیں کہ جتنے اصلی سنسکرت شبد رچائے [illegible] میں آئیں چاہئیں، لکھے جائیں اتنی ہی ان کی ناموری کا سبب ہے، اور اسی طرح مولوی لوگ فارسی اور عربی شبدوں کے لیے۔ غرض پل بنانے کے بدلے دونوں خندق کو گہرا اور چوڑا کرتے جارہے ہیں"۔ ہم ابھی تک اس خرابی کو جانتے ہوئے بھی اس خندق کو گہرا ہی کرتے جاتے ہیں۔ ہندی کے ایک مصنف اجودھیا سنگھ جی اپادھیائے نے لکھا ہے:-

روپو دیان پر پھیلا پرایکا ایکا، وکند و دیا بھاتا۔ شنو گی کھاسنی سر سکا گریڈا کلاتی۔ شو بھاداری وتنی کی امولیائی کی لاوینہ لیلا میائی۔ شری رادھا سترو و بھاشنی مرگدگی، مادھوریہ مورتی تھیں۔ کنا ونیا وتا دوناموہ گن نیا۔ آسا تھو نکٹ بتی کے سورنیتر الیشو دھا۔ اسی مصنف نے یہ بھی لکھا ہے:- ایک دنیا سے اٹھا سے چاہتا۔ اور ہے اٹھتی جوانی ایک کی۔ چاند اور سورج گگن میں گھومتے ہیں رات دن۔

اردو والوں میں سر محمد اقبال جو "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"، "دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب" اور نیا شوالا کی سی نظموں کے مصنف تھے خیالات کے تغیر کے بعد ایسی خشک نظم لکھنے لگے جیسے" اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے، جم اور۔ ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور۔"

ہمیں جہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ فارسی عربی لفظوں کے بائیکاٹ سے ہم مسلمانوں کے لیے ہندی کو بہت مشکل تو نہیں بنا رہے ہیں وہیں یہ لحاظ بھی رکھنا چاہیے کہ صرف فارسی عربی کے لفظوں کو لے کر اور سنسکرت کا بائیکاٹ کرکے گجراتی، مرہٹی، آسامی، تامل، ملیالم وغیرہ کے بولنے والوں کے لیے ہندی کا سمجھنا دشوار نہ ہو جائے۔ ہم نہ گجرات، مہاراشٹر، آسام وغیرہ کو چھوڑ سکتے ہیں نہ تمام ہندوستانی مسلمانوں سے الگ ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کے متعلق ہماری روش یہ ہونی چاہیے کہ (۱) جو الفاظ عربی فارسی کے ہندی میں رائج ہیں انہیں خارج نہ کیا جائے (۲) عربی فارسی کے جو الفاظ گجراتی، مرہٹی، بنگلہ، پنجابی اور دکن کی بولیوں میں آگئے ہیں اور ان کے ٹھیک ہم معنی لفظ ہندی میں نہیں ملتے انہیں بھی لے لیا جائے (۳) ان کے علاوہ ایسے لفظ جو ٹھیک مطلب کو ادا کرتے ہیں ان کو لینے میں بھی تامل کرنا نہیں چاہیے۔ ایک بہت چھوٹا لفظ "شرط" ہے جسے سب سمجھتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ

ں کی جگہ سنسکرت کا کوئی لفظ کھوج کر نکالا جائے کچہریوں میں محکمہ مال اور حکومت سے متعلق بہتیرے لفظ ہندوستان کی سب زبانوں میں رائج ہیں اگر ان کے ہم معنی لفظ ہندی میں رائج نہیں تو سنسکرت کے لفظ دھرم شاستر سے نکال کر ان کی جگہ استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں (۴) انگریزی کے بہت سے لفظ رائج ہیں انہیں رہنے دینا چاہیے۔ "ٹرین کی جگہ" "لوہ پتھ چلت واشپ یان" اور "سیٹ" "نام کی جگہ" "لوہ پتھ چلت واشپ یان ستھاپن ستھل" "ٹکٹ کی جگہ" "مولیا پتر" کا گھڑنے کی ضرورت نہیں (۵) صوبے کی زبانوں میں ایسے بہت سے لفظ ہیں جو آج کل ہندی میں رائج نہیں ہیں۔ انہیں "لاگو" "چالو" "باڑو" کی طرح ہندی میں داخل کرنا چاہیے (۶) علمی اصطلاحات ہندوستان کی کل زبانوں کے لیے ایک ہوں تو بہتر ہے۔ جیسے "کیمسٹری" کے لیے "دھاراسبھا"، "ویوستھاپکا سبھا" (۷) گاؤں کی بولی میں ہمیں بہت سے الفاظ ملیں گے جن کے ٹھیک ہم معنی الفاظ ہندی اور سنسکرت میں نہیں ملتے، گریرسن نے اپنی کتاب بہار ریورل لائف میں چرخے کے ہر ایک حصے کا نام دیا ہے گاؤں کی زبان میں نئے لفظ گڑھنے کی اچھی طاقت ہے۔ موٹر کار کے لیے ہواگاڑی، بائیسکل کے لیے پیرگاڑی، ماچس کے لیے دیاسلائی، ریلوے سگنل کے لیے سگندر، روٹ کے لیے پاوردوٹی کتنے اچھے لفظ ہیں۔ اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی طاقت جو گاؤں کی بولی میں ہے، کتابی زبان میں نہیں، لوٹنے سے لوٹاس، بکنے سے بکواس، صابن سے صبونانا، مٹی سے مٹیانا، پانی سے پنیانا، غصے سے غصانا، دھکے سے دھکیانا، شرم سے شرمانا، گھن سے گھنانا، ایسے ہی الفاظ ہیں۔ ہمارے یہاں کے بھی کچھ استادوں نے ایسی کوشش کی ہے۔ "اور جو ہاری سوامی کی نیندتی ہے" اپنگر سدل سمم" "عرب کا اونٹ کس طرح جگاتا ہے" (پنڈت پدم سنگھ شرما) نندا سے نیندنا، جگالی سے جگاتا بنایا ہے لیکن ایسی کوشش بہت کم ہوئی ہے۔

جو لوگ ہندی نہیں جانتے، انہیں تین چار باتوں کی وجہ سے بڑی مشکل پڑتی ہے (۱) ایک تو تانیث و تذکیر، اس میں بڑا جھگڑا ہے۔ بڑے بڑے لکھنے والے بھی دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسے "لفظ" اور "عام طور پر مونث مانا جاتا ہے لیکن ہندی کے ایک بڑے مصنف نے اسے مذکر لکھا ہے۔ نئے لفظوں کے لیے کوئی قاعدہ مقرر نہیں "کونسل"، "لالٹین"، "موٹر" کانگریس اور کانفرنس کیوں مونث بنا دیے گئے ہیں، اردو کے لفظ قلم اور چرچا ہندی میں کیوں مونث ہو گئے، یہ کہنا کافی نہیں کہ ان کے ہم معنی لفظ سبھا، کمیٹی، اور لیکھنی وغیرہ مونث ہیں، اور نہ سنسکرت کی سند پر ان لفظوں کی تذکیر و تانیث مقرر کی جا سکتی ہے، اگنی، آتما اور پستک سنسکرت میں مذکر ہیں، لیکن یہ ہندی میں مونث ہیں۔ بے جان چیزوں کے لیے موزوں اور سہل قاعدے بنانے کی ضرورت ہے (۲) "نے" کے استعمال میں بھی بڑی مشکل پڑتی ہے، پنجاب میں نے کا استعمال الگ ہے اور مشرقی لکھنے والے سمجھنے اور جانتے ہیں (۳) بڑی مشکل اس میں بھی ہے کہ کب فعل کی جمع کام کے مطابق ہو اور کب کام کرنے والے کے مطابق پنڈت جواہر پرشاد جی شرما کا ایک جملہ ہے "انہوں نے پہلے تو بال ہوں کی اس میں ہوت" فعل کے لیے کون سا مونث کام ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا (۴) ایک ہی لفظ کئی طرح سے لکھا جاتا ہے۔ اس میں بھی بڑی دشواری پیدا ہوتی

# مطبوعاتِ جدیدہ

(۱) دیوانِ تاباں، از ن ع د

(۲) کلیم عجم از ؟

(۱) دیوانِ تاباں، مصنفہ میر عبدالحی تاباں، مرتبہ عبدالحق صاحب سلسلۂ انجمن ترقی اردو ص ۲۰۰، قیمت مجلد عہ۔ غیر مجلد ۱۲؍۔

انجمن کی اکثر مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی حسن ظاہر سے بہرہ ور رکھتی ہے، اس لحاظ معنوی کے متعلق ہم چند مفصل واقعات ذیل کرتے ہیں۔

(۱) دیوان تاباں کے قلمی اور مطبوعہ نسخے جو اس وقت موجود ہیں حسب ذیل ہیں:۔ قلمی نسخہ ق ۱ مملوکہ رسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی ق ۲ مملوکہ انجمن ق ۳ مملوکہ جناب کیفی ق ۴ مملوکہ سری رام ق ۵ مملوکہ وزیر علی صاحب حیدرآباد ق ۶ مملوکہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد ق ۷ مملوکہ کتب خانۂ مدرسہ حیدرآباد ق ۸ مملوکہ نواب سالار جنگ، انتخاب دیوان از نواب عماد الملک سنہ ۱۲۰۹ھ و نسخۂ مطبوعۂ حیدرآباد ۔ یہ نسخہ پانچویں چھٹے اور نویں نسخوں پر مبنی ہے۔ انجمن کا شائع کردہ نسخہ پہلے، دوسرے، تیسرے نسخوں پر مبنی ہے۔

دیباچے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ متن کی درستی کس اصول کی بنا پر کی گئی ہے۔ بظاہر کسی ایک نسخے کو اصل قرار دیا ہے اور جو دوسرے نسخوں میں ملے ہیں، انہیں بھی متن میں شامل کر لیا ہے۔ الفاظ کا اختلاف تو کہیں کہیں دکھایا ہے، لیکن اس کی تفصیل سے احتراز کیا ہے کہ کون سے الفاظ کس نسخے میں ہیں۔ قلمی نسخوں کے سنین کتابت بھی نہیں دیے۔ اس قسم کی کتابیں آئندہ جو شائع ہوں گی ان میں ان دو باتوں کا خیال رکھا جائے تو بہتر ہے، ایک تو یہ ہے کہ ان قلمی نسخوں کے متعلق جن پر کتاب کا متن مبنی ہے مفصل اطلاعات فراہم کی جائیں، دوسرے یہ کہ اختلافات یا تو دکھائے نہ جائیں یا اگر دکھائے جائیں تو یہ ضرور بتایا جائے کہ کس نسخے میں کس طرح ہے۔

(۲) یہ نسخہ جتنا چاہیے، اتنا صحیح نہیں، لیکن دوسرے اداروں سے جو کتابیں نکلتی رہتی ہیں، ان کے مقابلے میں زیادہ غلط بھی نہیں، تاہم انجمن کو آئندہ صحت کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

(۳) دیوان کی جامعیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں (جس کے متعلق اس کے مرتب کا دعویٰ ہے کہ کل کلام پر حاوی ہے) کل ۹۵۵ اشعار ہیں، اور اس کے نسخے میں ۱۲۹۳، بڑی تلاش سے ہمیں چند اشعار ایسے ملے ہیں، جو اس میں موجود نہیں۔ یہ اشعار ص ۲۰۵ پر درج ہیں۔

تنگ جامے کو مت سج کے کھلی دستار + چھو بھی پائوں میں کمخواب کی پھڑکا کے ازار + سب کے تئیں جا کے ترا تے ہیں دکھاتے ہیں بہار + لالچی ایسے کہ جس پاس ٹکے زر کی بو + جا کھڑے پہلے تو تھکے ہو جو کچھ ان پہ سو ہو ۲۵۹ عجائب غرائب کو جانے ہے عیب + کہ بے شک ہے ان کے تئیں دست غیب ۲۶۳ وہ دیوان خانے میں جب بیٹھتا + تو دو پری زادوں دے بٹھا ۲۶۵ کوئی کر کے آغاز ساقی گرام ۲۶۶ سکتا تھا ان میں جو شل حباب ۲۶۷ زمیں رنگ سے جن کی ہوتی تھی لال + کبھی صحن خالی ہوں پہ بچھتا گلال ۲۶۸ تو کئی جام دے بے مجھے پے بہ پے ۲۷۲ ہو کے تب فلکیں کہیں۔ آنف نے یہ کہہ موے ہے بے میاں مضموں کیا ۲۷۲ کہتا ہوں اس سے کہ جن نے (میں اس سے یہ کہا)

اشعار ذیل دوسرے شاعروں کی جانب بھی منسوب ہیں:-

الا مرغ جو ڑے پہ ترے بیکی کناری کی جھمک + برق ساں ابر کے ہوتی ہے نثار دامن۔ یہ شعر انتخاب دیوان بیدار مرتبہ سید فضل الحق صاحب حسرت میں موجود ہے، اس ۹ مجموعہ نغز قاسم میں　　جلد اص　　یہ شعر بیدار کے نام لکھا ہے ص ۳۰۳ ، اور اسی جلد کے ص ۲۰۷ اس کے متعلق حاشیے میں یہ عبارت درج ہے: "ایں شعر در دیوان شاہ محمدی بیدار دیدہ شد و زبان زد عالم است کہ ازاں عبدالحی تاباں است ، واللہ اعلم بحقیقت الحال"

(۲)　ایں کیوں ہر کسی کے ساتھ دل اپنا لگائیے　　ہر بے وفا سے کاہے کو عاشق کہائیے
ہم ہاں ماں آئے ہیں پر ان کی منتیں　　ساجن گر آئے تو نیاز اں پڑھائیے

یہ دونوں شعر خفیف اختلاف کے ساتھ شفیق نے صابر لاہوری کی جانب منسوب کیے ہیں۔ ایک شعر اور بھی اس زمین کا دیا ہے، لیکن وہ دیوان مطبوعہ میں نہیں۔ شفیق لکھتے ہیں: "بعضے اشخاص ایں جا بختہائے میر صابر را در مولود وغیرہ برنام .. تاباں می خوانند محض بیجا است ، زیرا کہ آں اشعار از زبان اعزہ معتبرہ کہ بار ملاقات میر صابر یافتہ اند بہ سمع رسید کہ از مناسبت آں تا ہمیں تحریر در دیوان تاباں ہم دارد"۔ اس کے بعد تین شعر نقل کیے ہیں۔ ج میں بھی یہ غزل موجود ہے بلکہ ایک شعر اور بھی جو ت میں نہیں ہے:-

کچھ عیب نہیں ہو درس دکھانا تو اب ہے　　جیسا کسی پیاسے کو پانی پلائیے

شفیق کے قول سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو ان اشعار (علی الخصوص وہ دو شعر جو شفیق نے نقل کیے ہیں) کی زبان تاباں کی زبان نہیں معلوم ہوتی ہے اور یہ بخوبی ممکن ہے کہ دیوان تاباں میں کسی نے غلطی سے داخل کر دیا ہو (۳) میخانے میں کیا پھرے ہے شکل اپنی + زاہد عابد سے دور بیٹھی تشنگی + قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے کافر + یہ دختر رز ہے جس سے لگی ہو بڑی اماں وگر دوبائی ہے، کئی شاعروں کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ مجموعہ نغز جلد ا ص ۹ خفیف اختلاف کے ساتھ منسوب بہ انشا۔ کلیات انشا کے مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں ہماری نظر سے نہیں گزری، گلزار ابراہیم مطبوعہ ص ۱۱۳ پر یہ رباعی بیت قلی خاں حسرت کے نام اختلاف کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ حسرت کا دیوان موجود ہے

لیکن ہمیں اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

(۴) "بیاں میں کیا کروں دیوانگی اپنی کا افسانہ" یہ مخمس سری رام نے (خمخانۂ جاوید جلد ۲ ص ۲۰۳) سودا کی طرف منسوب کیا ہے۔ آخر کے بند مصرعے خمخانۂ جاوید میں اس طرح ہیں: "کبھو ہوتا ہے پیر ہے ساتھ سودا کبھی طفلاں تجلی اس طرح سے دیکھ کر اب خوار و سرگرداں" "کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہے دیوانہ" دیوان میں سودا کی جگہ تاباں اور تجلی کی جگہ مرے نہیں ہے۔ کلیات سودا کے مطبوعہ نسخے (نولکشوری) میں یہ مخمس نہیں ہے۔ کلیات کے کئی قلمی نسخے جو ہم نے دیکھے ہیں، ان میں نہ مل سکا۔ خمخانۂ جاوید میں مخمس کا جو آخری شعر ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غزل تجلی کی ہے اور تضمین سودا کی۔ مزید تحقیق کے لیے ہم نے تجلی کا کلیات دیکھا، لیکن یہ غزل نظر نہ آئی۔ مخمس کے دیکھنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ ایک مستقل مسلسل نظم ہے، جس کسی نے بھی اسے لکھا ہو ایک بار اسے لکھا ہے۔ یہ نہیں کہ غزل پہلے لکھی ہو بعد میں اس کو مخمس کیا ہو۔ ہمیں سودا کی جانب اسے منسوب کرنے اور تاباں کو اس سے محروم کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

**یہ اشعار دیوان میں نہیں لیکن دوسری جگہ پائے جاتے ہیں:-**

(۱) اے ناانصاف تیری تیغ تو کیا کام فرمائے　　سمجھ کر کوہ کن اپنا عاشق اپنا وستدار اپنا　(ع)

(۲) مقرر ہے تجھے عاشق کے مارے ہی سے اے ظالم　　کہ ہم تم کشتوں کا خون جیسے زہر قاتل ہے　(گلشن گفتار)

(۳) کچھ عیب نہیں ہے ورس دکھانا الخ　(ع، اوپر لکھا جا چکا ہے)

(۴) سر سبز خطا سے دونا ہوا حسن یار کا　+　آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا

مرزا علی لطف نے تاباں کے نام سے لکھا ہے، لیکن قائم و میر کے تذکروں میں عشاق کی طرف منسوب ہے۔

دیوان تاباں کا یہ نسخہ ہر صاحب ذوق کے کتب خانے میں رہنا چاہیے۔

**کلیم عجم** ۔ مصنفہ جناب سیماب اکبرآبادی (مئی کا معیار ملاحظہ ہو)

جناب سیماب نے اپنے خطبات میں غزل کا معیار خود ہی قائم کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان کا کلام انہیں کے معیار سے جانچا جائے۔ ذیل میں ہم مزید اقتباسات درج کرتے ہیں:-

(۱) ص ۲۳ "اس قسم کی شاعری جس میں تقلید اور غیر فطری جذبات کے زیادہ سے زیادہ جراثیم پائے جاتے ہیں، ایک رواجی بدعت، ایک بے اصولی، اور ایک غلط ذہنی تربیت کے ماتحت مروج ہے جس میں عام اور پست نیز قدیم ترین معاشرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ وصل و وصال، ہم خوابی اور ہم آغوشی، بوس و کنار اور ایسے ہی مخرب اخلاق اور تہذیب سوز مناظر دکھائے جاتے ہیں، پھر رونا یہ ہے کہ یہ موضوعات بھی اس صادق جذباتی کیفیت سے خالی لہجے میں ظاہر کیے جاتے ہیں جس سے تقلید اور نقالی تو ظاہر ہو جاتی ہے، لیکن حقیقت کا کہیں پتا نہیں چلتا۔"

(۲) ص ۲۵ "غزل کی تعریف میں معاملہ بندی کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے۔ تغزل کو قدرتی طور پر نفسیات

سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہیے، حقیقی تغزل وہ ہے جس کی بنیادیں جذبات لطیفہ پر قائم ہوں اور جس میں رکاکت اور ابتذال کا شائبہ تک نہ ہو۔

(۳) ص ۲۶ "جب شعر مطلق روحانیت اور ایک زائدہ الہام چیز ہے تو کیا اس کے متکلم کو مادی دنیا میں تمام عالم اور تمام کائنات پر حاوی نہ ہونا چاہیے؟"

(۴) ص ۳۰ "ہماری شاعری ماحول خصوصیات کی حامل ہونا چاہیے، اور زیادہ سے زیادہ فطری، ہمارا ہر شعر اپنی جامعیت، اکملیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہونا چاہیے، ہماری ہر نظم ضروریات زمانہ کے مطابق، اہل ملک اور فرزندان وطن کے لیے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہیے اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذبات عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں ہمارے نوجوان ماضی حال اور مستقبل کا صحیح ادراک کرسکیں، جو ہمیں تدبیر منزل اور شاہراہ ترقی بتا سکے، اور بلند و لطیف محاکات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کرے۔"

(۵) ص ۳۸ "اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت نہیں رہا، مجازی جذبات وصل و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا، حقیقی موضوعات اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت بھی نہ ملنی چاہیے۔"

(۶) ص ۴۴ "اگر یہ فکری تصویریں ہماری معاشرت اور ہمارے حالات و واقعات کی اصلی تصویریں ہوں تو کیا ہماری شاعری حقیقی شاعری نہیں کہی جا سکتی اور کیا اس میں بلحاظ واقعیت زیادہ اثر و قوت پیدا ہو جانے کا امکان نہیں؟"

(۷) ص ۴۴ "جب تک ہم اپنی شاعری کو مفید، متین، مہذب و با اثر نہ بنائیں گے، جب تک اپنے تغزل میں رفعت، اپنی نظموں میں شوکت، اپنے خیالات میں بلندی اور اپنے ادراکات میں ترفع پیدا نہ کریں گے، ہمیں دنیا میں زندہ رہنے ...... میں کبھی کامیابی نہ ہوگی۔"

(۸) ص ۴۵ "اردو شاعری کا بیشتر حصہ ایسے پست خیالات و جذبات کا حامل ہوتا ہے کہ ایک شاعر بیٹا ایک بزرگ باپ اور اپنی محترم ماں کے سامنے اپنے اشعار آزادی سے نہیں سنا سکتا۔"

(۹) ص ۵۶ "مبتدی شعرا غلط محاورے، غلط بندشیں، غلط ترکیبیں استعمال کر جاتے ہیں۔"

(۱۰) ص ۶۰ "ٹکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی سالمیت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہش مند ہے، نئے الفاظ، نئے معنی اور نئے اسالیب بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زندہ زبان کے لیے ...... مہلک ہے۔"

(۱۱) بعض لوگ مرفہ روزمرہ کی ترویج کے حامی ہیں، اور متانت خیال و الفاظ کے مخالف، وہ ... نہیں چاہتے کہ غزل ... تغزل محض سے تجاوز کرے یا اس کے اسالیب و موضوعات میں فلسفہ و تصوف کی گنجائش ہو۔

(۱۲) ص ۶۹ ...... "میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں خفیف خیال کرتا

ہوں، غزل کی ... زبان علمی، الفاظ مضبوط و لطیف، پُرشوکت اور نغز بار ہوں، اور خیالات و جذبات بلند پایہ و پاکیزہ ہوں، سادگی کے ساتھ متناسب فارسی تراکیب اگر بے تکلف استعمال کی جائیں تو یقیناً غزل میں بلندی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱۳) ص ۷۸ "جب تک ہم اپنی شاعری کی زبان کو جہلا اور عوام کی زبان سے ممیز نہ کر دیں ہمیں کوئی تفوق اور امتیاز حاصل نہیں ہو سکتا۔"

(۱۴) ص ۱۰۱ "اب موضوعاتِ غزل میں فلسفۂ حسن و عشق، عرفان، حقیقت شناسی، اسرار کشائی، درس و پیغام، واردات و جذبات اور محاکات کے علاوہ دوسرے موضوعات کی بہت کم گنجائش ہے ..... جو کیفیت حقیقتہً ہم پر طاری ہو جو واقعات ہمارے مشاہدے اور مطالعے میں آئیں وہی ہماری غزل کا اصل موضوع ہیں۔ یہ لازمی نہیں کہ اگر ایک شاعر کسی کے فراق میں مضطرب الحال نہیں ہے تو وہ فراقیہ اشعار ضرور ہی لکھے ..... اس قسم کی ... غزل گوئی تعلّی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اور اگر قائل کی حالت اس کے قول کی تکذیب بھی کر دے تو سمجھیے کہ غزل میں کچھ نقص ہے۔"

(۱۵) ص ۱۰۵ "یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے بقدر معتدل پیدا ہوا تھا۔ آگرہ اسکول بھی آج اسی رنگ کا متبع و مویّد ہے۔"

(۱۶) ص ۱۲۰ "میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسنِ محض اور عشقِ محض ہے اور تمام عناصر کا مرکز وہ ذات ہے جو منبع حسن اور مرکز محبت ہو ... میں خیالات میں تصنع ... کا حامی نہیں، میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

غزل کی زبان کے متعلق جناب سیماب کے عمل اور ان کے نظریے میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ ان کی شاعری محاورے اور روزمرے کی شاعری نہیں ہے۔ جناب سیماب کا دعویٰ ہے کہ آگرہ اسکول میرزا داغ اور میرزا غالب کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے، لیکن کیا زبان، کیا طرزِ بیان اور کیا معانی کہیں بھی تتبع داغ کا پتا نہیں چلتا۔ جناب سیماب کے کلام میں پُرشوکت فارسی الفاظ اور تراکیب کی بہتات ہے، اور ہندیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ انھوں نے اپنی زبان کو صرف جہلا اور عوام ہی کی زبان سے ممیز نہیں کیا ہے، بلکہ عام بول چال کی زبان سے بھی علاحدہ رکھا ہے۔ اگر یہ جرم ہے تو صرف جناب سیماب ہی اس کے مرتکب نہیں، آج کل اکثر مشہور غزل گو فارسیت کو ہندیت پر ترجیح دیتے ہیں۔ غالب و مومن کے بعد داغ نے دلی میں اور شاگردانِ آتش و ناسخ نے لکھنؤ میں فارسیت کے سیلاب کو روکنا چاہا تھا۔ دورِ جدید کے شعرا میں حالی بھی ان لوگوں کے ہم خیال تھے، لیکن بیسویں صدی میں کلامِ غالب کو وہ مقبولیت نصیب ہوئی کہ فارسیت کا بول بالا رہا اور اس کے آگے ہندیت کا چراغ نہ جل سکا۔

فارسیت کے غلبے سے قطع نظر کر کے بھی دیکھا جائے تو ان کی زبان میں دو باتیں قابلِ اعتراض پائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ معتدل فارسی تراکیب کے ساتھ غیر معتدل فارسی تراکیب بھی ہیں۔ غیر معتدل سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ یا تو فارسی تواعد

کے رُو سے جائز نہیں، یا اُردو میں ان کا رواج مناسب نہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں:-

۱- عداوت کی خونکاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا۔

۲- انہیں ترنتوں کی جس قسم، یونہی مخمور کا دورِ قدم قدم، کہ صد آرزو زدہ گرم، ابھی اور ایک مزار ہے

۳- کوئی دیکھے مری وحشت ہوائی — انہیں کو مانگتا ہوں میں انہیں سے

۴- تاکجا ہو انتشارِ گردِ راہِ کارواں — دو قدم بڑھ کر امیرِ کارواں ہو جائیے

۵- آمدِ فصلِ نظر کالک، وہ رسا کی راتیں — کتنی رنگین و مبارک فصلِ تعیش کی راتیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ غزلوں میں کثرت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اخبار نویس بے تامل برت سکتے ہیں لیکن غزل کی نزاکت ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ آج سے نہیں سیکڑوں برس سے ہمارے یہاں یہ بات شعرا کے مسلمات میں گنی جاتی ہے کہ ہزاروں الفاظ جو بجائے خود صحیح ہیں، اور نثر و نیز قصیدہ و مثنوی میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں، غزل میں نہیں کھپ سکتے۔ اور ہماری رائے میں کوئی وجہ اس کی نظر نہیں آتی کہ ہم غزل کو اس کی خصوصیت سے محروم کر دیں۔

جنابِ یاب ان لوگوں میں بھی نہیں جو غزل کے دائرے کو مثنوی حیثیت سے وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے یہ عذر بھی نہیں پیش کیا جا سکتا کہ نئے معانی کے لیے نئے الفاظ کی ضرورت ہے۔ مثالیں بکثرت ملیں گی۔ چند ملاحظہ ہوں:-

۱- یہ نکما پن مجبور دل کا اک انجام ہے

۲- گر میں تجزیۂ ہر نگاہ کر نہ سکا

۳- واقعاتِ عشق کا تھا ایک لمحہ اک صدی

ہر نفس میں میں نے اک رومان پیدا کر دیا

۴- سب مرے انجام پہ آمادۂ تنقید ہیں

۵- انتظامِ تمنا خراب ہو نہ سکا

۶- محبت اک بڑا احسان ہے تاریخِ انساں پر

۷- دل کی تنقید مناسب ہے نہ یوں تیور بدل

۸- روایاتِ محبت میں نہ تبدیلی ہوئی اب تک

ہزاروں انقلاب آتے رہے تاریخِ انساں میں

۹- تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا

ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں۔

۱۰- دو حقیقی اور فطری نعمتیں ہیں حسن و عشق

مادیت سے انہیں کیوں لعنت آلودہ کریں

۱۱- مخصوص میرا ذوقِ نظر تھا ترے لیے

تائیدِ عام نے تجھے دستور کر دیا

۱۲- یہ مطلب ہے کہ تنظیمِ چمن دشوار ہو جائے

۱۳- نہ پوچھ اس پاکبازِ آرزو کا سطحِ الفت

۱۴- ایک ہی سا ہے نظامِ عشق کا ماضی و حال

میری تجویزِ وفا ناکام تھی ناکام ہے

یہ عشق کا ذکر ہے یا کسی انجمن میں کسی تحریک کے نامنظور ہونے کا؟

۱۵- مری خبر ... پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں

۱۶- ابھی تبلیغ کو کیا قوم میخانہ نہیں اٹھی

۱۷- کیجیے اقدام کوئے دوست مٹ کر ہی سہی۔

جناب سیماب نے مجبوراً، حقیقتہً، النسبتہً، رسماً، متعلقتہً وغیرہ کو بڑی کثرت کے ساتھ غزل میں استعمال کیا ہے۔ ہماری رائے میں غزل میں ان سے احتراز لازم ہے۔

جناب سیماب کی شاعری کا موضوع "عورت یا اس کے متعلقات" نہیں اور نہ ان کی شاعری "امرد پرستی کی خصیات پر مشتمل" ہو، اس کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام عناصر کا مرکز وہ ذات ہے جو جمال حسن اور مرکز محبت ہو۔ ایک جگہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "تغزل کو قدرتی طور پر نفسانیت سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہیے"۔ حسن محض اور عشق محض سے جناب سیماب کی کیا مراد ہے؟ انہوں نے اسے سمجھایا ہے اور نہ ان کی مدد کے بغیر ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے اشعار میں شاہد حقیقی سے خطاب ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ افلاطون کا عالم امثال ان کے ذہن میں ہو۔ ہماری غرض ان کے نصب العین پر اعتراض نہیں (اگرچہ ہمارے خیال میں مادیت کو غزل سے بالکل خارج کرنے میں وہ غالب کے اس قول کو بھول گئے ہیں۔

"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا")

ہمارا مقصد صرف یہ دیکھنا ہے کہ جناب سیماب کا عمل کہاں تک ان کے نظریے سے مطابق ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اشعار ذیل میں مخاطبت کس سے ہے، یا ان کا موضوع کیا ہے:-

۱- وہ خود لیے بیٹھے ہیں آغوش توجہ میں — بے ہوش ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا

۲- عشق ہے اک جوش سیلاب جوانی تند و تیز — حسن ہے اک موجۂ رنگین طوفان شباب

اس شعر میں حسن و عشق کی تعریف کی گئی ہے، کیا وہ بھی عشق محض ہے؟

۳- ہو چکا ہوں بارہا عذر نزاکت کا شہید — کر چکا ہوں امتحان قوت بازوئے دوست

۴- ہے ہوس کو ہم کناری و ہم آغوشی کی شرط — یعنی اک ہنگامہ ہے اندیشۂ پہلوئے دوست

۵- نیند آ آ کر اچٹ جاتی ہے تیری یاد میں — تا لب بستر نشۂ آغوش ہے تیرے بغیر

(اس غزل کا مخاطب کوئی "غیر محسوس" ہستی نہیں ہو سکتی)

۶- سیماب آدھی رات کو آہیں وہ بے قرار — تیری دعائے نیم شبی میں اثر تو ہو

۷- یہ انکھیں ساغر، یہ جوانی نشۂ صہبا — خدا رکھے تمہیں تم بھی تو ہو تصویر میخانہ

۸- وہ چاندنی میں نظریں بچا کر ان کے مکاں کا طوف مسلسل سب سے چھپا کر راز نہانی، اے محبت اے جوانی

۹- وہ ان کا جانا، دامن جھٹک کر وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر وہ ان کا آنا وہ شادمانی، اے محبت اے جوانی

جناب سیماب کی رائے میں غزل کو رکاکت و ابتذال سے پاک ہونا چاہیے، اور اشعار ایسے ہونے چاہییں جو ہر صحبت میں بے تکلف پڑھے جا سکیں۔ ہم بلا خوف تردید یہ اعلان کرتے ہیں کہ جناب سیماب کی غزلیں رکیک اور مبتذل مضامین سے یک قلم خالی ہیں، ان کے اشعار میں چند ہی ایسے ہیں جو ایک حیادار نوجوان اپنے والدین کے سامنے نہ پڑھ سکتا ہو، یا تیرھویں صدی کا ایک

اپنی دوشیزہ لڑکی کے سامنے نہ سُنا سکتا ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ اشعار کا یہ معیار کہاں تک صحیح ہے؟ اگر ہم اسے صحیح تسلیم کرلیں تو قدیم شعرا میں خواہ وہ کسی زبان کے ہوں، دس پانچ کے سوا کسی کا کلیات معتد بہ اشعار کو خارج کیے بغیر نہیں شائع کیا جا سکتا، اور نثر کی ہزاروں کتابوں کا چھپوانا بالکل بند کر دینا پڑیگا، کہنا یہ ہے کہ اس معیار کے ساتھ ساتھ جناب سیماب غزل میں تتبع فطرت اور واقعیت کے بھی خواہاں ہیں، اس کی بحث آگے آئیگی۔

جناب سیماب غزل میں بجا طور پر تقلید اور نقالی سے متنفر ہیں، ان کے نزدیک شاعری واردات قلبی پر مبنی ہونی چاہیے۔ کسی مضمون کو محض اس لیے باندھنا کہ شعرا باندھتے چلے آتے ہیں، محض لغو اصول ہے، ہم جناب سیماب کی توجہ اشعار ذیل کی طرف مبذول کراتے ہیں، اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی انہوں نے "آپ بیتی" بیان کی ہے:-

۱- "مجھ سے پہلے کوئی جلوہ گر دل نہ ہوا
یہ وہ منصب ہے جو موسیٰ کو بھی حاصل نہ ہوا"

کیا واقعی وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مقام حضرت موسیٰ کے مقام سے آگے ہے؟ اگر نہیں تو یہ شعر محض قدما کی تقلید میں کہا گیا ہے۔

۲- "آئے جو دینے دعوتِ دار و رسن ہمیں
جب ہم نے ترک شیوۂ منصور کر دیا"

ہم نے تو نہیں سُنا کہ جناب سیماب نے کبھی انا الحق کا دعویٰ کیا ہو، بہ کثرت اشعار اس قسم کے ہیں، بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ جدید خیالات ان کے یہاں بہت کم ہیں، اور انہیں ان کے ادا کرنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ذیل میں ہم پرانی طرز کے چند کامیاب اشعار درج کرتے ہیں، اس کے بعد ہم چند ایسے اشعار نقل کریں گے جن میں شاعر نے جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:-

طرز قدیم:- دل کبھی جتنا قفس میں آشیانے کی طرف
دور اتنا ہی قفس سے آشیاں ہوگیا

توقع سے ترے فضل و کرم کو بیشتر دیکھا
مجھے شرم آگئی جب اپنا دامن مختصر دیکھا

نیاز عشق کو آزاد قید رنگ و بو پایا
جنوں کو بے نیاز بندش دیوار و در دیکھا

ترک مدعا کر کے کیا بتائیں کیا پایا
ہم نے ساری دنیا کو حسب مدعا پایا

گرے کم فرشتوں کو جبیں تو ملا دل کا
آپ کی محبت میں آدمی نے کیا پایا

شکستہ پا ہوں شریک اپنے کارواں میں نہیں
مرے نصیب کی گردش بھی آسماں میں نہیں

جنوں کی فصل کا ساماں دیکھ لیتا ہوں
بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہوں

۱۹۱۹ء سے قبل کا کلام:- میں تمہارا نہیں تو کس کا ہوں
دل تمہارا نہیں تو میرا ہے؟

ستم زدوں پہ گراں تھی ہوا زمانے کی
جھکی تو پھر نہ اٹھی شاخ آشیانے کی

بتا دیں دل میں یکساں آپ کا کیا بن کے رہتا ہے
محبت بن کے آتا ہے تمنا بن کے رہتا ہے

شرم بسمل کی ہے اب بس ترے اوسان کے ہاتھ
ہاں ذرا تول کے تلوار، ذرا تان کے ہاتھ

وضو کرتے ہیں شیشے سے خشت خم پہ سر جھکاتے ہیں
یہ رند اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناتے ہیں

خلوص دل سے سجدہ ہو تو اُس سجدے کا کیا کہنا　　وہیں کعبہ سرک آیا جبیں ہم نے جہاں رکھ دی

**جدت کا نمونہ :-** وہ نور نظر بن کر برسات میں آتے ہیں　　منظور ہے بوندوں کو پروانہ بنا دینا

رات کا جانا وداعِ شیشہ و پیمانہ تھا　　صبح کا آنا تھا قفلِ درِ میخانہ تھا

دو ہی انگارے تھے ہاتھوں میں فدائے عشق کے　　ایک کو دل ایک کو میرا کلیجہ کر دیا

ہیں تبسم ریز تارے کہکشاں انگڑائی ہے　　ہر شب ہستی میں ہے میرا ہی سامانِ شباب

جناب سیماب کی رائے میں شعر "زیادہ سے زیادہ فطری" اور "موضوع کے لحاظ سے مکمل" ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک شعر میں "جب تک واقعیت نہ ہو، اس میں اثر و قوت پیدا ہونے کا امکان نہیں"۔ شاعر کو "ہمارے حالات و واقعات کی اصلی تصویریں کھینچنی چاہیے"۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مقدمۂ حالی کی صدائے بازگشت ہے؟ یا جناب سیماب اردو والوں کے سامنے نیا پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ شعر کی خالص روحانیت کے متعلق جناب سیماب کے اقوال دیکھ کر ہماری حیرت اور بڑھ جاتی ہے کیا کوئی شاعر "سوسائٹی" کی مکمل تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے جو مادیات کے وجود کا قائل ہی نہیں۔ یا کم از کم اشعار میں انہیں کسی وجہ سے یک قلم نظر انداز کر دینا چاہتا ہے؟ جناب سیماب بظاہر اُن لوگوں میں ہیں جو "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" کے معتقد ہونا چاہتے ہیں۔ انہیں زنانہ مدارس کی استانیوں اور اہل فن دونوں کو بیک وقت خوش رکھنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہو اس کا فیصلہ اگر ان اشعار کی مدد سے جو ہم نے اس تبصرے میں نقل کیے ہیں نہ ہو سکے، تو ناظرین "کلیم عجم" کا خود مطالعہ کریں۔

جناب سیماب کے خیال میں "شاعری کو داخلی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے"۔ دوسرے لفظوں میں شاعری میں مقامی رنگ گہرا ہونا چاہیے، اس معاملے میں ان کا نظریہ ان کے عمل سے بالکل مختلف ہے۔ قیس و لیلیٰ، فرہاد و شیریں، طور و کلیم تلمیحات سے دیوان بھرا پڑا ہے :-

جہاں میں قابلِ تقلید تھی طرزِ فغاں میری　　پپیہے نے بالآخر یاد کر لی "پی کہاں" میری

اس قسم کے اشعار دیوان بھر میں دو تین سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اگر یہ اشعار نکال دیے جائیں، اور دیوان کا ترجمہ فارسی میں کر دیا جائے تو آسانی سے اسے کسی ایرانی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے :-

وہ عبا قیس کی فرہاد کا وہ جامۂ تنگ　　دشت و کہسار نے دیکھے ہیں گریباں کیا کیا

نجد کے ہرنوں سے اعجازِ محبت پوچھیے　　پڑ گئی جس پر نگاہ قیس لیلیٰ ہو گیا

پھر بھی برقِ تجلی کو نہ کر موسیٰ تو شکوہ کیا　　تماشا تھا یہ انداز تمنا رہ گیا ہو کر

جناب سیماب نے شعر کی افادی حیثیت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ شاعر اگر وہ حقیقی شاعر ہے تو کل مشکلوں کو حل کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کے لیے محض مغنی یا مصور ہونا کافی نہیں، اسے صاحب فکر بھی ہونا چاہیے۔ اس مسئلے کی مجموعی حیثیت سے قطع نظر کر کے کہ شاعر کے لیے صاحب فکر ہونا ضروری ہے یا نہیں ہم مسئلے پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ جناب سیماب کس حد تک

فلسفی یا صاحب فکر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے چند اشعار درج کرتے ہیں جن میں ان کے مذہبی، اجتماعی اور فلسفیانہ معتقدات منظوم ہوئے ہیں:

۱۔ "نہ تھا وہ بھید کہ دنیا اسے سمجھ لیتی — میں خود بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا"

۲۔ "اس کی ہستی وہم ہستی وہم اور یہ بھی وہم — نام ہے انسان اک مجموعۂ اوہام کا"

۳۔ "میرا ہی ایک جلوۂ نادیدہ حسن تھا — اپنی ہی اک ادا پہ رہا میں مٹا ہوا"

۴۔ "میں نے خاک میں مل کر نصیب نقش پایا — اے اجل بتا تو نے مجھ کو کھو کے کیا پایا"

۵۔ "جسم پھر بنتے ہیں صرف خاکداں ہونے کے بعد — جمع پھر ہوتے ہیں ذرے رائگاں ہونے کے بعد"

۶۔ "نہیں آشنا ہے حال سے کوئی آنکھ بزم مجاز میں — ہوں وہ آئینہ جو ہے ناتمام ابھی ذہن آئینہ ساز میں"

۷۔ "نکل جا ہی حدود سے نگاہ کو وسعتیں عطا کر — تمام عالم وطن ہے تیرا اگرچہ تیرا وطن نہیں ہے"

۸۔ "تراب و خود عمل ہو جائے اے سیماب — اے جناب رسالت مآب دیکھیں گے"

۹۔ "اے خاک کے پتلے تجھے ادراک نہیں ہے — کچھ اور بھی ہے تجھ میں فقط خاک نہیں ہے"

۱۰۔ "انجام ہر اک شے کا بجز خاک نہیں ہے — کیا ہے جو یہ عالم خس و خاشاک نہیں ہے"

۱۱۔ "تیری دنیا ہو دنیا ابھی مگر مطمئن ذہن دنیا نہیں ہے — کاوش زندگی، کاوش مرگ کا کچھ نتیجہ بھی ہے یا نہیں ہے"

۱۲۔ "پھول کا، خار کا، باغ و کہسار کا، علم انساں کو کس نے بخشا ہے — پھر بھی اس جلوہ گاہ پر اسرار کا کوئی راز آشکارا نہیں ہے"

۱۳۔ "سب یہ جلوے ہی جلوے تو ہیں ہر طرف ہیں حجابات اوہام باطل فقط — جتنے پردے ہیں ان میں سے پردہ کوئی حائل چشم بینا نہیں ہے"

۱۴۔ "زندگی کا ہے ادراک مقصود اگر قید ہستی سے آگے گزر جا — زندگی کے مظاہر پہ نقد و نظر فلسفہ زندگی کا نہیں ہے"

اگر کوئی شخص کوئی ایسا نظام فلسفہ جس کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے غیر مربوط نہ ہوں، ان اشعار سے نکال سکتا ہو تو ہم اس کی طباعی پر اسے مبارکباد دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ فکر کی گہرائی سے جو فلسفی کے لیے ضروری ہے جناب سیماب قطعاً محروم ہیں۔ انسان کی حقیقت، فطرت سے اس کے تعلق، انجام حیات انسانی، علم انسانی، وغیرہ کے متعلق جن خیالات کا انہوں نے اظہار فرمایا ہے، وہ محض دوسرے شعرا کی تقلید میں ہے، اور ان مسائل پر انہوں نے کافی غور نہیں کیا۔ شعر کیا ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے قلم سے نکل سکتا ہے؟ اور شعر ۸ کیا ایک وطن پرست کا نتیجۂ فکر ہو سکتا ہے؟

جناب سیماب کے بعض اشعار یا تو واقعی قابل اعتراض ہیں یا ہماری سمجھ میں اچھی طرح نہ آئے، ہم انہیں درج ذیل کرتے ہیں۔ جناب سیماب یا کوئی اور صاحب ہمارے شبہات کو دور فرمائیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

(۱) "عمر فدا ہے۔ تراب کیسا یہ دونوں تیری ہی نعمتیں ہیں — نہ اختیاری کرم ہے تیرا نہ اختیاری عتاب تیرا"

یہ شعر سب سے پہلی غزل کا ہے، جس میں اول سے آخر تک عروس فطرت سے خطاب ہے، انہیں پہلے اور دوسرے مصرعے

نظر نہیں آتا۔ دوسرے مصرعے کا مطلب غالباً یہ ہے کہ تیرے کرم اور عتاب پر میرا اختیار نہیں۔ اگر عذاب و ثواب دونوں شاعر کی نظر میں نعمتیں ہی ہیں، تو پھر اختیار نہ ہونے کی شکایت کیسی؟ اس کے علاوہ بیٹی سے قطع نظر کر کے بھی عروس فطرت کو ان الفاظ میں مخاطب کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) " برہمن کہتا ہے الحذ شیخ بول اٹھا احد
نکتہ رس دو تین تھے آپس میں جھگڑا ہو گیا "

(۳) طور موسیٰ ادل طائف، چمنستان خلیل
یادگار اس میں تری جلوہ جانانہ گیا

(۴) کہیں راز جذبات الہام ہو تم

' الحذ ' کس زبان کا لفظ ہے؟ ' دل طائف ' سے کیا مراد ہے؟ الہام کا جذبہ کیسا ہوتا ہے؟

(۵) قفس سے چھٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانا ملا
خیال سے بھی کہیں دور آشیانا ملا

' ٹھکانا ' صحیح املا ہے، اسے ہائے مختفی سے لکھ کر ' آشیانہ ' کا قافیہ نہیں بنا سکتے۔

(۶) " خلاف رسم دنیا جو شعار عشق ہوتی ہے
وہی اک بات رہ رہ کے ... وفا ہو کر "

شعار مذکر نہیں، مونث ہے۔ اگر ' بات ' کو ' ہوتی ہے ' کا فاعل مانا جائے تو الفاظ کی نحوی ترتیب ... ہے۔

(۷) " نہ ابتداؤں کسی کی نہ انتہاؤں میں
بس ایک خواب سحر ناتمام ساہوں میں "

دونوں مصرعوں میں ربط نہیں معلوم ہوتا، شعر کا مفہوم واضح نہیں۔ شاعر کا یہ قول کہ وہ کسی کی ابتدا ہے نہ انتہا بے معنی سا ہے اور اگر اس کا کوئی مفہوم ہو تو اسے دوسرے مصرعے سے کیوں کر تقویت مل سکتی ہے؟

(۸) " آج تو جنگل کا جنگل قابل تصویر ہے " قابل تصویر یا تصویر کھینچنے کے قابل؟

(۹) " انہیں تربتوں کی تمہیں قسم، یونہی تھوڑی دیر قدم قدم، کہ صد آرزو زدہ کر رہے ابھی اور ایک مزار ہے "

اس شعر میں ' قدم قدم ' محل نظر ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ' چند قدموں پر ' لیکن یہ مطلب ' قدم قدم ' سے حاصل نہیں ہوتا۔

(۱۰) " جتنے پروانے پہلے فنا ہو چکے، کر انہیں زندہ اور پوچھ ان سے، دیر میں جس کے پرتو کی ہے روشنی کیا وہ شمع کلیسا نہیں ہے "

دیر و حرم، کعبہ و کلیسا میں تقابل ہے، دیر و کلیسا کو شعرا نے قریب قریب ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ... کا مصرع ہے

" فائدہ کیا ہو جو ہوے شیخ حرم، راہب دیر "

(۱۱) سکوں نہ پر جنون شباب ہو نہ سکا
شگفتہ موسم گل کامیاب ہو نہ سکا

شگفت کو مذکر کی جگہ استعمال کیا ہے۔ اس کی سند مطلوب ہے۔

(۱۲) " چمک جگنو کی برق بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدر آشیاں معلوم ہوتی ہے "

خیالی خطروں سے ڈرنا، اور قفس میں رہ کے آشیاں کی قدر معلوم ہونا، ان دونوں میں کوئی بھی تعجب انگیز نہیں، دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ دونوں میں ربط کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

شاعر نے بظاہر ایک طائر کی نفسی کیفیت کو بیان کیا ہے جو اسیری کے بعد پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک طائر اپنے آشیانہ میں تھا، اُسے آشیانے سے کسی خاص محبت کا احساس نہ تھا۔ اسیر ہونے کے بعد اسے احساس ہوا کہ آشیانہ کس قدر عزیز تھا۔ اب اس کی زندگی قفس میں گزرتی ہے، اور اپنی جان کا بالکل ڈر نہیں، لیکن بجلی تو بڑی چیز ہے، جگنو بھی چمکتا ہے تو وہ خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ کہیں آشیانے کو جلا کر خاکستر نہ کر دے۔ اگر شاعر کے ذہن میں یہ مطلب تھا، تو ہماری رائے میں الفاظ سے ادا نہیں ہوا۔

(۱۳) "چمن کے حادثے کو دن گزر گئے اب بھی　　　چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے"

آشیانے کو جلا ڈالنے والی بجلی اور آشیانہ طائر کے ذہن میں ایک ہو گئے ہیں۔ یہ خیال الفاظ سے اچھی طرح ادا نہیں ہوا۔

(۱۴) "ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی　　　جہاں محسوس ہوتی ہے وہاں معلوم ہوتی ہے"

معلوم ہونا، نمایاں ہونے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، ورنہ شاعر کو نفسی حیثیت سے محسوس و معلوم میں فرق بتانا پڑیگا۔ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ دردِ محبت کی خلش ایسی چیز ہی نہیں جو نظر آئے، اور اگر بالفرض ایسا ہو تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ خلش ترقی پر ہے۔

## استفسارات

(۱) میرزا غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں کتب ذیل کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کسی صاحب کے علم میں یہ کتابیں کہیں موجود ہوں تو براہ کرم براہ راست یا معیار کے ذریعے سے مجھے مطلع فرمائیں۔ جن کتابوں کے سال طباعت دیے ہوئے ہیں وہ کتابیں نظر سے گزر چکی ہیں، ان کے خاص نسخے مطلوب ہیں:-

۱۔ دستنبو، مطبوعہ مفید خلائق آگرہ ۱۸۵۸ء
۲۔۳۔ دیوان اردو مطبوعہ مطبع احمدی/سلطانی دہلی ۱۸۶۱ء (۱۲۰۰؟)
۳۔ نامۂ غالب مطبوعہ دہلی ۱۸۶۵ء
۴۔ سبد چین مطبوعہ دہلی (۱۲۶۳ھ ؟)
۵۔ دیوان مختصر مطبوعہ مفید خلائق آگرہ ۱۸۶۳ء
۶۔ معارضۂ انتشار از سید مقصود عالم پھلواروی نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۶۶ء
۷۔ مثنوی دعا و صباح/ابا طیل
۸۔ مثنوی خطاب فاضل
۵۔ پنج آہنگ مطبوعہ ۱۸۴۹ء

ہیش پرشاد، ڈاکخانہ لنکا، بنارس

(۲) "دامانِ نگہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار　　　گلچین نگاہِ تو ز داماں گلہ دارد"

"در بزم وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا　　　نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد"

یہ اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کیے ہیں۔ کلیات قدسی کے دو قلمی نسخے دیکھے، ان میں یہ اشعار ملتے ہیں۔ نہ اس زمین کی کوئی غزل۔ فارسی اشعار کے ایک مطبوعہ مجموعے میں یہ اشعار عشرتی کے نام نظر آئے، مقطع کا ایک مصرع یاد ہے: "اے عشرتی از وضع تو جاناں گلہ دارد"

اگر کسی صاحب کو اس کا تحقیقی علم ہو کہ یہ غزل کس کی ہے، تو مجھے مطلع فرمائیں۔ ممنون ہونگا۔

عبدالودود

# اشاریہ

# قاضی صاحب کی تحریریں

**تحقیقات :** میر تقی میر ۱۷۹/۱۸۰ • سکندر اور ضاحک ۳۴۳/۳۴۹ • تاریخ وفات نجف خاں، ۲۶۲ • سال وفات حاتم ۱۸۱/۱۸۲ • سال وفات آبرو، ۴۴/۴۶ • دیوان راغب (نسخۂ خدابخش) ۳۱۷/۳۲۰ • سال آغاز تذکرۂ ہندی ۲۶۲/۲۶۳ • دریائے لطافت کا سال تصنیف ۲۱۰ • دریائے لطافت ۶، ۵۳/۵۸، ۳۶۱ • حصۂ عروض مصنفۂ قتیل ۱۹۸، ۳۱۶، ۳۶۱

**تبصرے :** • ندیم (بہار نمبر) ۸۶/۸۸ - • • نیرنگ خیال (سالنامہ) ۱۲۱/۱۳۳ • ادبی دنیا (سالنامہ) ۱۲۵/۱۲۶ • زمانہ (حالی نمبر) ۱۲۳/۱۳۴ • ساقی (جاپان نمبر) ۱۲۴ • ہمایوں (سالگرہ نمبر) ۱۲۴/۱۲۵ • شاہکار (سالنامہ) ۲۷۰/۲۷۱ • مساوات (سالنامہ) ۲۷۱ • ادب لطیف (افسانہ نمبر) ۲۷۱/۲۷۲ • دیدۂ حیرت (ڈھاکے کا ایک گلدستہ) ۲۷۲ • (سالنامہ) سہیل ۳۳۸/۳۴۴ ۳۶۱

▬ دیوان تاباں ۳۶۹/۳۷۵ ▬ کلیم عجم ۲۴۴/۲۴۸، ۳۷۵/۳۸۴ ▬ خطبات گارساں دی تاسی (مترجمہ راس مسعود وغیرہ، مرتبہ عبدالحق) : دی تاسی، عبدالحق اور شیخ چاند کے اغلاط ۲۳۳/۲۳۸ ▬ نکات الشعرا (مرتبہ عبدالحق) (توصیفی تبصرہ) ۹۲/۹۴ ▬ دریائے لطافت (مرتبہ عبدالحق و مترجمہ کیفی) ۷۹/۸۲

▬ دیوان معروف دہلوی (مرتبہ عبدالماجد بدایونی) : تصحیح متن ۶۸، ۱۱۴، ۱۳۴، ۱۹۴، ۲۶۸، ۳۰۷

■ سحر بنگال (طاہرہ دیوی شیرازی) ۸۳/۸۵ ■ افکار عصریہ (گبسن — مترجمہ نصیر عثمانی) ۹۰/۹۱

■ حبش اور اطالیہ (مرتبۂ اختر حسین رائے پوری) ۹۱

▲ یوسف الدین بلخی کا مضمون، "ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد" : تعارف ۱۳۹ ▲ معین الدین دردائی کا مضمون "حیدر آباد کے کتب خانوں میں اردو کی بعض قلمی مثنویاں" : تصحیح ۳۶۱

**مختلف مباحث :** ترتیب متن : اس روش پر تنقید کہ "قلمی نسخہ صحیح ہو یا غلط، مکمل ہو یا ناقص، کاتب کے حوالے ... اب کاتب جانے اور کتاب ... ؛ اس سے تو دیوان کا پردۂ گمنامی میں پڑا رہنا بہتر ہے" ۶۹؛ ۷۱ • "ترتیب متن میں اغلاط راہ پا جائیں، تو ان کی درستگی ضروری ہے"

• 'اغلاط طباعت وکتابت کی تصحیح کے لیے غلط نامہ چھپوانے کی روش' ۲۷۵ • 'عربی و فارسی سے مدد لیے بغیر سنجیدہ مباحث پر لکھنا ناممکن ہے' ۲۷۵ • 'اُردو کے بہترین شاعر: انیسؔ، میرؔ اور غالبؔ کے علاوہ حالیؔ اور اقبالؔ بھی' ۳۵۷ • **بعض الفاظ** کے بارے میں عندلیب شادانی سے اختلاف یا اتفاق: نوشتہ (اتفاق ہے) ترجیحاً (چاہنا) کراہیت (اختلاف ہے) ترجمہ (اعتراض نہیں)، تبادلہ (مبادلہ ایکسچینج _ تبادلہ ٹرینسفر کے لیے) سوچنا، اکیلے (اتفاق ہے) قبلہ گاہ (اختلاف ہے) ۲۲۴/۲۲۵ ■ شبیر احمد عثمانی کے ایک ترجمہ برقِ طیسی (= ایکٹرو میگنیٹک) کی تعریف' ۹۱ • قلمی کتابوں کے تحفظ اور فہرست سازی کے بارے میں چند سطریں ۲۵۷ • ایک فروگذاشت: 'سالنامہ سہیل کا حسن ترتیب اور اس کی تعداد اسے دوسرے سالناموں سے ممتاز کرتی ہیں۔ معیار کا تبصرہ ان خصوصیات کو اچھی طرح نمایاں نہ کرسکا ہمیں اس فروگذاشت کا افسوس ہے' ۱۳۹ • یہ بیدلؔ کا شعر ہے اس کا کیا ثبوت ہے:

سر او پر جب کوئی نہیں تو دشمن آپ کہیں ÷ پٹنہ نگری چھاڑو ہن اب بیدل چلے بوسیا' ۳۵۷

■ بیدلؔ کا عظیم آبادی ہونا ۲۴۱، ۲۵۸ ■ بیدلؔ کے استاد ۲۵۸ • سلیمان شکوہ کے بارے میں چند سطریں (بذیل 'ادبی مضامین') ۲۶۱ • امیر مینائی کے بارے میں (۹ سطریں) ۱۴۲ ■ غالب و ذوق کی قبروں کے کتبے (بذیل 'ادبی مضامین') ۱۵۶، ۱۵۷

• **مصنف اور مترجم**: 'مصنف بے چارے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے اور ان کی دماغ سوزی کی داد اس طرح دی جاتی ہے کہ بعض تراجم کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا' ۱۲۵ • اسلام اور عورت (نجم الدین جعفری کے مضمون مطبوعہ نیرنگ خیال پر تبصرے کے ذیل میں) ۱۲۲/۱۲۳ • آل انڈیا اورینٹل کانفرنس: کیا یہ صرف ہندو تہذیب سے متعلق و مخصوص ہوگی' ۱۰۷ • ہندو سوسائٹی کے نقائص کی طرف صدر اورینٹل کانفرنس کا رویہ' ۱۰۷

**معیار میں مندرجہ ذیل رسالوں کے مضامین کا ذکر، اقتباس یا ان پر تبصرہ ہوا:**

شاہکار، شاعر، الناظر (لکھنؤ)، ہمایوں (لاہور)، ندیم (گیا)، تنویر (کراچی)، اردو (اورنگ آباد)، نیرنگ خیال (لاہور)، ادبی دنیا (لاہور)، ادب لطیف (لاہور)، رفتار اردو، سہیل (علیگڑھ)، جامعہ (دہلی)، کلیم (دہلی)، کنول (اکبرآباد) معارف، شاہکار، زمانہ (کانپور)، ساقی، مساوات۔

**زبان و ادب:** دریائے لطافت: کیفی کے ترجمہ پر تنقید ۷۹/۸۲ • دریائے لطافت حصہ منطق، مصنفہ قتیل ۱۹۸/۲۰۱ • استفسارات: مصنف مغل اور اردو یعنی نفیر حسین خیال کے چند اعتراضات بشکل استفسارات ۲۰۷ • اردو کے بعض تاریخی ماخذ: ابواللیث صدیقی کے مضمون مطبوعہ سہیل پر تنقید ۲۲۶/۲۲۸ • 'یوپی میں اردو': انتظام اللہ صدیقی کے مضمون (مطبوعہ کنول، اکبرآباد) کے اغلاط ۱۳۲/۱۳۳ • بہار اور اردو شاعری: معین الدین دردائی کے مضمون (مطبوعہ سہیل علی گڑھ) کے اغلاط، ۲۳۹-۲۴۴ • صفیر بلگرامی اور دریائے لطافت ۵۳/۵۵ • علی بخش دعا کے بارے میں (آرزو جلیلی کے مضمون مطبوعہ 'ادبی دنیا'، کا ذکر کرتے ہوئے) ۲۳۱ • دیوان جوشش ۶، ۲۱۰، ۴۷/۵۲ — اشتہار: کہ دیوان عنقریب شائع ہو جائے گا، ۴ ۳۸ کے بعد میر کمال علی کمال کی مثنوی اردو کے اقتباسات (ندیم گیا سے منقول) مع تبصرہ، ۱۲۸ • شتاب رائے: ابوظفر ندوی کے مقالہ کے اغلاط (مطبوعہ ندیم بہار نمبر ۳۵ء پر تبصرہ کے ذیل میں) ۸۶/۸۷ • شیخ چاند کے اغلاط خطبات گارساں دتاسی کے حواشی ۲۳۷/۲۳۸ • دتاسی کی تعریف میں ۲۳۳/۲۳۴ • دتاسی کے اغلاط ۲۳۴/۲۳۷ • دیوان دوم معروف (قلمی) ۱۹۴/۱۹۸

**علمی تنقید:** سیماب اکبرآبادی کی شاعری پر • معروف (الٰہی بخش) کے رنگ کلام پر ۹۸، ۶ (پہلا پیراگراف)

## مختلف کتابخانوں کی قلمی کتابوں سے حاصل شدہ نوادر:

**غالب:** • غالب کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں بعض مطلوب کتابیں (استفسارات) ۳۸۴ • غالب نے قدسی کی طرف جو شعر (دگمہ دارد) منسوب کیا وہ کس کا ہے (استفسار) ۳۸۴

• رباعی شیخ علی حزیں (فارسی) بنام شیخ نرائن برادر رام نرائن موزوں ۲۵۴ • شرف جہاں قزوینی کا ایک شعر (فارسی) ۱۱۶، ۳۶۱ • کلام سلیمان شکوہ ۳۱۱ (۲۷۶ تعارف) • کلام رافت شاگرد جرأت ۳۱۱ (۲۷۶ تعارف) • کلام طالب رام پوری ۳۱۱، (۲۷۶ تعارف) • مثنوی میر حسن ۱۲ - مثلثات میر حسن 'ترکیب تضمین' ایجاد میر حسن ۱۱۳ - مثنوی میر حسن در تہنیت عید ۴۴ (۲۵۰، ۲۷۶ تعارف) • مثنوی در وصف نفر جواہر - از میر حسن ۲۵۱، ۳۰۵ • بیہانی کے مرآة الاحوال کے ایک اور نسخے کی روشنی میں بعض تصحیحات ۳۶۱

مخمس مصحفی ۹ استغاثہ بجناب آصف الدولہ ۹ غزل آصف الدولہ در جواب شمس النسا بیگم ۱۰۴، ۱۱ • غزلیات سراج و ممنون و شبیر (ایک ایک غزل) ۱۱۴ • کلام دل عظیم آبادی ۱۱۷ • کلام سید محبوب شیر دولت نظیر آبادی (فارسی) ۱۱۷

## اشخاص :

• راجندر پرشاد کے خطبے کے طویل اقتباسات اور تعریف ۲۶۶/۲۶۹ • راشد الخیری (مرحوم) ۱۰۶، ۲۶۶/۲۶۹ • رامون جیریا دل وال انکلان کی وفات ۱۰۶ • سجاد انصاری کی تعریف (سہیل پہ تبصرہ کے ذیل میں) ۲۳۸ • سلیمان ندوی (سید) پر ۸۶؛ ۱۳۵ • سیدین (خواجہ غلام السیدین) کے مضمون حالی کی معلمی (شاعری) کا طویل اقتباس، ۱۲۷ "سالنامہ شاہکار کے طبع زاد افسانوں میں خواجہ غلام السیدین کا افسانہ 'قانونی مجرم' خصوصیت کے ساتھ قابلِ داد ہے۔ خواجہ صاحب نے غالباً افسانہ نویسی کے میدان میں حال ہی میں قدم رکھا ہے لیکن انداز کہنہ مشقوں کا ہے'، ۲۷۰ • عبدالحق: اولین پرچے میں تصویر (ص ۸ کے مقابل) نوٹ ۸؛ — ان پر تنقید، ۲۳۶۔ • عبدالحمید (حکیم): ذوق کی قبر جوانی ہے ۱۸۶ • عبدالستار صدیقی کا مضمون اور سہیل کی تعریف ۲۳۹ • عرش گیاوی، نذیر احمد (۳ جولائی ۳۶) ۲۷۸ • عرشی (امتیاز علی) — نوابان رامپور کے نام، غالب کے خطوط کی جمع و ترتیب میں لگے ہیں ۸، ۵، ۱۳۸ • فرحت اللہ بیگ: ان کے افسانوں کی تعریف ۲۷ • صولت عظیم آبادی (چند سطریں) ۱۱۳/۱۱۴ • عندلیب شادانی کے چند اعتراضات اور ان کے جوابات ۲۴۳/۲۴۵؛ ۳۱۰/۳۱۴؛ ۲۱۲/۲۱۴ • طاہرہ دیوی شیرازی: کیا یہ مؤلف کی ذہنی مخلوق ہیں (سحر بنگال' پر تبصرہ کے ذیل میں) ۸۳/۸۵ • فلک پیما کی تعریف ۱۲۴ • فیاض محمود کی غیر معمولی تعریف ۱۲۴ • قاضی عبد الودود: انجمن کے لیے دیوان جوشش، مثنویات مصحفی اور تذکرۂ میر حسن ایڈٹ کر رہے ہیں ۱۱۲ • کپلنگ کی وفات، ۱۰۵ • منصور احمد: ان کی کتاب 'دنیا کے بہترین افسانے' دوسری بار آرہی ہے ۱۱۲ • مہیش پرشاد (مولوی) ۲۷۶، میر علی کی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں ۱۱۲، • نظام الدین (ابو الکلم) تصویر؛ مضمون انگریزی میں لکھا تھا۔ ہم جناب بیگ کے ممنون ہیں انہوں نے ہماری درخواست پر اس کا ترجمہ کر دیا ۲۶۲ • وحید مرزا: خسرو کی ہندی شاعری (اقتباس: ماخوذ از حالات و تصانیف خسرو مصنفہ وحید مرزا) ۲۱۳/۲۱۶ • وصی احمد بلگرامی کے بارے میں رائے، ۸۷-۸۸۔

**مقالات:** جن کا خصوصی نوٹس لے کر ان کا خلاصہ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین، مطبوعات جدیدہ، یا عالم ادب، کے عنوانات کے تحت درج کیا گیا:

• آرزو جلیلی، کلیات دعا، ۲۳۱ • آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میسور کے مقالات کی فہرست

اوران کی مثنوی اردو، ۱۳۰/۱۳۲ • عزیز احمد : غدر سے پہلے کی اردو شاعری پر ہندستانی تمدن کے زوال کا اثر، ۹۷/۹۸ • عشرت لکھنوی : جان عالم ۲۶۱ ——— جلیس ماضی ۱۲۷/۱۲۸ — تعلیم اردو ۲۲۲
• غوث (محمد) : کتبخانہ دفتر دیوانی حیدرآباد میں کرناٹک کی تاریخ کے مخطوطات، ۱۳۰ • قادری (حامد حسن) اردو شاعری کے ادوار پر، ۱۰۲ • قاضی عبدالودود : کلام جوشش عظیم آبادی ۲۱۰
• کیفی (دتاتریہ) تاریخ اردو کا مطالعہ، ۹۸/۹۹ — غالب کی شخصیت اور اردو ادب میں اس کا مرتبہ ۲۶۰ • مجیب (محمد) : ہندستانی ڈراما • مرتضیٰ حیدر نقاد (سید) : مصنف سیرالمتاخرین کی آل و اولاد، ۲۳۱ • مسعود حسن رضوی : دیوان افسوس، ۲۵۸ • نظام الدین، ابوالحلم : خطبۂ صدارت شعبۂ اسلامیات، آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، ۱۸۷/۱۹۰ • نیاز احمد ترمذی : لاہور قدیم کا علمی و ادبی حلقہ، ۱۲۸ ——— عہد شاہجہانی کا علمی و ادبی حلقہ ۱۲۹/۱۳۰ • ہندستانی اکیڈمی میں جو مضامین پڑھے گئے، ان کی فہرست ۱۱۱/۱۱۲ • وقار عظیم : شاعری پر مقامی خصوصیات کا اثر، ۱۰۱
• ولی الرحمن (شاد) : غالب و اقبال، ۱۰۲/۱۰۳ • یاس یگانہ چنگیزی : خواجہ آتش، ۹۸
• یوسف حسین خاں : نظام الملک کے آبا و اجداد ۲۵۸۔

**شعر / مصرع کا استعمال :** اقبال کے شعر / مصرع کا استعمال، ۲۷۵

شعر "جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے" ۲۷۵ • غالب کے شعر / مصرع کا استعمال: ۳۰

مصرع "ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے" • حسرت موہانی کا شعر ۱۲۴ • فارسی اشعار کا استعمال ؛

مصرع بسپردم تو مایۂ خویش را + تو دانی حساب کم و بیش را ۔

**یوروپی ادب و نفسیات کے حوالے :** اناطول فرانس کا ایک قول (دو سطر) : فائدہ کی بات : ۲۷۵ "کتابوں کے لکھنے سے کرم کلّے کی کاشت کرنا زیادہ فائدہ مند ہے" • پیرلوتی ۱۲۲ • جون میسفیلڈ ۱۰۵ • فرانک وانش یو برآنس ۳۰ • ارسل پروست ۳۱ • جورج ایلیٹ ۸۲
• تورژساں ۸۳ • پیرلوئی ۸۲ • پیرآذان ۸۵ • موپاساں ۸۵ • دو لزپیرٹر ۸۰ • فرانز اندراسکٹ ۸۵

**ادب کے بارے میں :** ادب کی وسعت (اسکوپ) : اسی قدر وسیع جس قدر انسانی زندگی؛ ادب کو سکھانے والا انسان ہوں، ۳ • ادب کی اہمیت قومی زندگی میں ۳ • تخلیق حسن تبلیغ عقاید سے زیادہ مقدم • ادب کا دوسرے علوم سے ناگزیر واسطہ : نفسیات، فلسفہ، تاریخ، ۶ • تخلیقی ادب کی اہمیت پر، ۶ • ہم کس قسم کے

ادب کے خواہاں ہیں : (i) اجتہاد کو تقلید پر ترجیح ، (ii) قواعد فن منزل من السماء نہیں (iii) غلبہ یافتہ جماعتوں کو ادب کو اپنی اغراض کے تابع بنانے کی کوشش کرنی چاہیے (iv) فن کار کی آزادی ۳ • اہم الفاظ صنعت کار (= فنکار) ۳ • ذوقیات و معنویات ، ۳

ادبی تنقید • تنقید میں توازن کی مثال : دیوان تاباں ، مرتبہ عبدالحق پر تبصرہ ۳۶۹/۳۷۰ • پنڈت کیفی کے ترجمہ دریائے لطافت پر ، ۷۹ • سحر بنگال ، از طاہرہ دیوی شیرازی پر تبصرہ ۸۳/۸۵ • خالص ادبی تنقید کی مثال : سیماب کے دیوان کلیم عجم پر تبصرہ ۲۷۵/۳۸۲ • قاضی صاحب کی ۱۹۳۶ء کی طرز انشا کے لیے : 'ضروری گزارش : پہلا پیراگراف (پہلا پرچہ) ' الف معروضات ' ۳ - رڈیرڈ کپلنگ ۱۰۵/۱۰۶ • ہجو ملیح / طنز (سید سلیمان ندوی پر) ۸۶ • روش املا : ہمزہ لکھنا صحیح نہیں (جوے ، جوی ، کیجے ، چاہیے ، لیے ہیں) پہنچا (نہ کہ پہونچا) • ہائے مختفی لکھنا صحیح نہیں (انگریزی یا ہندی لفظ کے اختتام پر) اغلاط مونث نہیں مذکر ہے : ۲ • اعلام کا ترجمہ کرنے کی روش : عجائب خانہ برطانی ۴۰ • تحریر پر انگریزی طرز فکر کا اثر ' راموں کی وفات منقلہ ۱۰۷۵/۱۰۸

افسانے : • ایک ہونہار نوجوان (طبع زاد افسانہ) ۲۷۹ • واپسی (افسانہ از ولیم گرہارڈی - ترجمہ) ۲۸۴ • عیاریاں (افسانہ ، از د - دجیکبس ، ترجمہ) ۲۸۸ • کیتھرین یاد (تمثیل / ڈراما ، از موریس بیرنگ - ترجمہ) ۲۹۸

'معیار' کے بارے میں : • اندرونی ٹائیٹل پیج پر : انجمن ترقی اردو بہار کا رسالہ (= ایک آدھ بار 'شاخ پٹنہ' کا رسالہ بھی لکھا گیا) • قواعد معیار ، (جو ہر پرچہ میں پابندی سے چھپتے رہے) : اولین پرچہ میں : ۱۳۶ کے بعد • ضخامت کی اسکیم یوں تھی کہ چھ ماہ ۱۱۲ صفحات اور چھ ماہ ۴۸ صفحات : ۱۱۳ • مرتب قاضی عبدالودود ، معاون : محمد شریف عالم آرزو جلیلی • جولائی - اگست ۳۶ ء مشترکہ شمارہ کا اداریہ ' ۲۷۶ • 'معیار' کی زبان پر دوسروں کی تنقید کا جائزہ ' ۲۷۵ • 'معیار' کے تبصروں پر دوسروں کی تنقید کا جائزہ ' ۲۷۵ • معیاد کا تعارف : معیار کی ترتیب کی اسکیم ۷/۸ (i) مستقل عنوانات : معروضات ؛ اقتباسات ؛ استفسارات ؛ آثار ادبیہ ، غالب ، اوراق پارینہ ؛ ہماری زبان ، مطبوعات جدیدہ ؛ محکمہ (یعنی فورم) ؛ ۱۹۳۶ء کے ادبی مضامین ؛ عالم ادب • (۲) افسانے ، طبع زاد یا تراجم ؛ تمثیلیں ؛ نظمیں ؛ مشہور شعرائے حال کی غزلیں

شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے]؛ مقالات، تصاویر) ۸/۱ • رسالہ کی کامیابی کے لیے چار ضروری عناصر (اولین پرچہ میں: 'ضروری گزارش' کے عنوان سے) — اوّل: نکالنے والے، جو سرمایہ لگا سکیں۔ دوم: مرتبین — جن میں علم کے ساتھ صحیح قوتِ نقد ہو۔ سوم: قلمی معاونین چہارم: خریدار، جن میں صحیح ذوق پایا جائے۔

• 'معیار' کیوں نکالا گیا (معروضات) ۳ — "'معیار' کی پہلی جلد مکمل ہو گئی اس میں ۲۴۸ صفحوں کی کمی ہے، جو اسی سال پوری کر دی جائیگی۔ ہمیں افسوس ہے کہ معیار ابتداے اشاعت ہی سے وقت پر شائع نہیں ہو رہا ہے۔ ہم پوری کوشش کریں گے کہ ستمبر کا پرچہ ستمبر میں نکل جائے اور ہر ماہ وقت پر شائع ہوا کرے۔ اگست کا پرچہ معیار ۱۱۲ کے بجائے ۱۲۰ صفحات پر شائع ہوگا۔" (لیکن ستمبر کا معیار پھر کبھی نہ نکلا اور آخری پرچہ ثابت ہوا)

• 'معیار' کے غلط نامہ شائع کرنے کی روش پر تنقید کا جائزہ ۵/۶ ۲۷۵۔

اشتہارات: (۱) مطبوعات شاد بکڈپو پٹنہ (۲) دیوان جوشش: عنقریب شائع ہو جائیگا (۳) اصلاحیہ بک ڈپو پٹنہ

••

دوسرے مضمون نگار

## مصنف وار اشاریہ :-

(مطبوعۂ کلیم' دہلی سے طویل اقتباس) ١١٩ • سنہا (سچدانند): خطبۂ صدارت ہندستانی اکیڈمی (خلاصہ) ٩١/١١١
• شمس الدین احمد: دیوان ہمایون بادشاہ' ٣١٣/٣٢٥ • ط • اشرف (سید محمد): اردو نثر کے ارتقا
میں ارباب بہار کا حصہ [١٩٣٦ء کے ادبی مضامین کے ذیل میں 'ندیم' میں شائع شدہ مقالہ کا خلاصہ] ٣٥٨
• عبدالحق: تصویر' ٨٠ — خطبۂ صدارت انجمن اسلام (اقتباسات) ١٩١/١٩٣ — بھارتیہ ساہتیہ پرشید
کی حقیقت (اس میں خصوصی زور اردو کی طرف گاندھی جی کے غیر ہمدردانہ رویہ پر ہے) ٢١٧/٢٢٥ • عبدالستار
صدیقی: 'جز' اور 'جزو' کی بحث ٣٦٢/٣٦٦ — ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں 'کو' کا استعمال ٣٦٤/٣٦٦
• عرشی (امتیاز علی): غالب کے تین خطوط (غیر مطبوعہ)' ١٥ • عروج قادری (سید احمد):
غمکدہ (افسانہ از منفلوطی: ترجمہ)' ٢٥/٢٩ • عزیز احمد: غدر سے پہلے کی اردو شاعری پر ہندستانی
تمدن کے زوال کا اثر (خلاصہ)' ٩٧/٩٨ • عطارد = قاضی عبدالودود • عندلیب شادانی: خسرو
کی شاعری پر تنقید (وحید مرزا کی کتاب حالات و تصانیف خسرو کے ایک باب پر)' ٢١٤ —
معیار کی زبان: الفاظ، تراکیب اور طرق استعمال پر تنقید ٢١٢/٢١٣ — معیار کے مضمون نگاروں کا
استعمال کردہ تلفظ الفاظ و محاورات (نمونتہً: کراہیت، زجر بمعنی حال - تبادل بمعنی تبادلہ، سونگھنا
بمعنی سوجھنا، اکیلے بجائے اکیلا، فیلہ گاہی)' ٢٦٤ — ضمیر کے ساتھ حالت مفعولی میں 'کو' کا استعمال ٣٦٦
— شکست پندار (نظم)' ٢٣ — شملہ کی برکھا (نظم) ١٤٦ — تصحیح ٢٧٤ — انقلاب روزگار (نظم) ٢٠٤
• مخمس مصحفی، غزل آصف الدولہ، مثنوی میرحسن (مرتبہ کردہ قاضی عبدالودود) کے متن کے بارے
میں ٢١٠/٢١٢ • ق - و = قاضی عبدالودود • 'مبتدی' = قاضی عبدالودود • 'متعلم' = قاضی
عبدالودود • مجیب (محمد): مکتوب بنام گاندھی جی (جو جواہر لال نہرو نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد
کے ناگپور اجلاس میں پڑھ کر سنایا اور مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون میں نقل کیا) ٢٢٣/٢٢٤ • محمد ادیب =
قاضی عبدالودود • منصور احمد: گومتی (بونین کے افسانے کا ترجمہ) ١٦/٢٤ • نظام الدین (ابوالمجد):
آل انڈیا اورینٹل کانفرنس' شعبۂ اسلامیات کا خطبۂ صدارت ١٨٧/١٩٠ — ایران جدید کے ادبی اور عمرانی رجحانات
٣٣٤/٣٤٢ • وحید مرزا: خسرو کی شاعری ٢١٤/٢١٦ • یوسف الدین احمد بلخی باطنی: ایک ایرانی مجتہد اور عظیم آباد
(ماخوذ از مراۃ الاحوال مصنفہ بہبہانی) ١٨٣/١٨٥ ، ٣٢٦/٣٢٨ • '؟' = قاضی عبدالودود۔

# معیار کے لکھنے والے

• **آرزو جلیلی** محمد شرف عالم: مجالا (ضلع دربھنگا) کے رہنے والے تھے۔ والد جلیل صاحب وکیل تھے۔ آرزو سائنس کالج پٹنہ فزکس کے لکچرر تھے۔ ہم اور وہ دونوں کل ہند اُردو کانفرنس کے موقع پر عبدالحق صاحب کے لئے بہت سی چیزیں بہار شریف سے لائے تھے نمائش کے لئے۔ ڈاکٹر رشید (تاریخ۔ بی، این کالج) اور قاضی مجاہد الاسلام ان کے اعزہ میں ہیں (عسکری صاحب کی زبانی)۔

• **اعجاز حسن خاں**: رسول پور کے زمیندار اور ریاض حسن خاں خیال کے بھائی تھے 'معارف' میں اکثر لکھتے تھے۔ امیر مینائی کے خاندان کی تصویر قاضی صاحب کو انھیں سے ملی تھی۔ ان کے والد امیر کے شاگرد تھے۔ امیر بہار ہوتے تو انھیں کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ امیر کے متعدد خطوط ان کے نام سے ہیں۔

• **پریم بہاری** = عندلیب شادانی۔

• **تمنائی (زبیر احمد)**: "زندہ جلیں" کے مصنف تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں چندے انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے۔ آج کل اسلام آباد میں مقیم ہیں (۱۔ سا اردو ٹائپ رائٹر کی تجارت میں لگے ہوئے ہیں)۔

• **حکیم حبیب الرحمٰن** (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۴۷ء) ڈھاکہ کے معروف ادیب، طبیہ کالج ڈھاکہ کے بانی، حکومت سے شفاء الملک کے خطاب یافتہ، قومی تحریک میں شمول کے بعد خطاب واپس کر دیا۔ مساجد ڈھاکہ، ڈھاکہ اب سے ۵۰ برس پہلے، شولے ڈھاکہ، آسودگانِ ڈھاکہ کے مصنف؛ بنگال کے مصنفوں پر 'ثلاثہ غسالہ' مرتب کی تھی، معلوم نہیں چھپی کہ نہیں۔ ہفتہ وار 'المشرق' اور ماہنامہ جادو (ڈھاکہ) کے ایڈیٹر رہے۔

• **عبدالحق**: (م ۱۹۶۱ء) اُردو کے معروف ادیب اور انتھک مجاہد، متحدہ ہندوستان میں اور اس کے بعد پاکستان میں انجمن ترقی اُردو کے ناظم اعلیٰ۔

• **عبدالستار صدیقی**: (۱۸۸۵ء۔ ۱۹۷۲ء) الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر تھے۔ عربی فارسی اور اُردو کے مسلّم الثبوت عالم تھے۔ اُردو کے تین چار مستند محققوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ زبان اور املا کے مسائل پر انہیں استناد کا درجہ حاصل تھا، ہندوستانی اکیڈیمی کا رسالہ 'ہندوستانی' بھی عرصہ تک ان کی نگرانی میں نکلا۔ مسلم صدیقی، ان کے صاحبزادے ان کی یادگار ہیں۔

• عبدالحفیظ تمر: پٹنہ کے وکیل عبدالماجد صاحب کے بیٹے، عسکری صاحب کے شاگرد تھے۔ ہائیکورٹ کی مسجد کے متولی تھے۔ (عسکری صاحب کی زبانی)

• عندلیب شادانی (وجاہت حسین) (م ۱۹۶۹ء): رام پور میں پیدا ہوئے، فارسی کی اعلیٰ تعلیم اورینٹل کالج لاہور میں پائی اور لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ تقریباً نصف صدی ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے جہاں وہ صدر شعبۂ فارسی و اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے منصب پر فائز تھے اور استاذ الاساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔ پُرگو اور خوش گو شاعر تھے، ناقد اور محقق تھے۔ فارسی اور اردو پر یکساں عبور تھا۔ "تحقیقات"، "دورِ حاضرہ اور اردو غزلگوئی" اور "نشاطِ رفتہ" (کلام) ان کی چند کتابوں کے نام ہیں۔

• عروج قادری (سید احمد): آجکل جماعت اسلامی کے ماہنامہ "زندگی" کے ایڈیٹر ہیں۔

• سید حسن عسکری: (پ ۱۹۰۱ء) تاریخ ازمنہ وسطیٰ کے معروف مورخ۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے منسلک رہے۔ رٹائرمنٹ کے بعد پٹنہ میں قیام ہے۔

• سید رضا قاسم: مختار تھے، عسکری صاحب کے ہم محلہ تھے۔ یعنی گوگلپور میں رہتے تھے، ادب کا اچھا ذوق تھا۔ (عسکری صاحب کی زبانی)

• سید حسن ایم اے: سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، اب پٹنہ ہی میں قیام ہے۔

• حافظ شمس الدین منیری (۱۸۹۶ء-۱۹۷۵ء): پٹنہ یونیورسٹی سے ام اے، بی ایل۔ مظفرپور میں اردو فارسی کے اور لنگٹ میں قانون کے استاد رہے۔ ۱۹۲۷ء میں اردو اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے پٹنہ کالج آئے اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ۱۹۵۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ فروری ۱۹۷۵ء میں انتقال کیا۔ کلام کا مجموعہ "گلبانگ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

• ریاض حسن خاں خیال (۱۸۷۸ء-۱۹۵۲ء): اعجاز حسن خاں کے بھائی۔ موضع رسول پور ضلع مظفرپور کے رہنے والے تھے اور داغ کے شاگرد تھے۔

• معین الدین دردائی: علیگڑھ یونیورسٹی کے ریٹائرڈ، بہار شریف کے رہنے والے، علیگڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کی تصانیف میں "جلوے" اور "تاریخ سلسلۂ فردوسیہ" قابل ذکر ہیں۔ ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو انتقال ہوا۔

• منصور احمد : پنجاب کے مشہور ایڈیٹر اور ادیب - اُس وقت ادبی دنیا کے ایڈیٹر تھے -
'ہمایوں'، 'شاہکار'، وغیرہ کی ترتیب میں شامل رہے۔ آگے زد جلیلی سے قریبی تعلق تھا۔

• مہیش پرشاد : صدر شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی و خطوط غالب کے مرتب۔

• عبدالمنان بیدل : سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، حال مقیم پٹنہ

• ڈاکٹر نظام الدین (حیدرآباد) : عربی و اسلامیات کے فاضل عثمانیہ یونیورسٹی اور دائرۃ المعارف سے ملازمت تک وابستہ رہے۔ قاضی صاحب کے کیمبرج کے ساتھیوں میں تھے دسمبر ۱۹۶۸ء میں انتقال کیا۔

• وحید مرزا : سابق صدر شعبۂ تہذیب اسلامی لکھنؤ یونیورسٹی، بعدہٗ دائرۃ المعارف اسلامیہ کے لیے 'پاک' حکومت کے پروجیکٹ ڈائرکٹر (در لاہور) اکتوبر ۱۹۷۶ء میں وفات پائی۔

• محمد ادیب ایم، اے = عطارد = تماشائی = متعلم = 'ع' = قاضی عبدالودود۔

• یوسف الدین احمد بلخی : فصیح الدین بلخی کے بھتیجے تھے۔ رانچی کالج میں فارسی کے لکچرر تھے، اچھے شاعر بھی تھے۔ قاضی صاحب کے رشتہ دار تھے۔ ۱۹۶۱ء کے آس پاس وفات پائی۔

قاضی عبدالودود (پ: ۱۸۹۵ء) والد کا نام قاضی عبدالوحید، جو احمد رضا خانی تھے، رسالہ 'تحفۂ حنفیہ' کے مالک و ایڈیٹر تھے اور ۱۳۲۶ھ میں فوت ہوئے (مغفور)۔
ابتدائی تعلیم اینگلو محمڈن اسکول (پٹنہ سیٹی) اور اینگلو محمڈن اورینٹل کالج (علیگڑھ) سے مڈل اسکول (موشل : موریسن کورٹ و مسکڈ آنل ہاؤس) بلگرامی ٹوٹوریل کالج (علیگڑھ) میں پائی میجر سید حسن بلگرامی کے انتقال کے بعد پٹنہ آکر پرائیوٹ میٹرک کا امتحان دیا، انٹر کیا اور بی اے کیا۔ پھر تحریک ترک موالات میں شامل ہوگئے اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں تکمیل تعلیم کے لیے انگلستان گئے، جہاں کیمبرج سے اکونومکس میں ٹرائی پوس لیا اور لندن سے بیرسٹری کی سند لی۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں واپس آگئے۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں 'معیار' نکالا۔

••